خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
نومبر 2012
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
عید مبارک
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

جلد 41 • شمارہ 11 نومبر 2012 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

کسی بھی طرح

جون ایلیا

کیوں! یہ میری پیٹھ سے لگا کیا سوچ رہا ہے؟ سامنے آ کے بیٹھ...... کہ جی ہی بہلے۔ جانے کیا ہو گیا ہے کہ جی نہیں لگ رہا۔

ہاں بھائی بڑی وحشت ہے، بڑی بیزاری ہے۔ ہم اپنے آپ میں بری طرح آن پھنسے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں محبوس ہونے اور اپنے آپ سے تنگ آ جانے کا آزار بڑا ہی جان لیوا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ اپنی ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں، اپنا ٹینٹوا چبا جاؤں۔ اپنی ذات کے حبس میں سانس لینا تو ایسا ہے جیسے جانکنی میں زندہ رہنا۔ او! آزاری آخر تو کس سوچ میں ہے۔ تو بھی تو کچھ بول! یہی کہ اس طرح آخر کیسے گزرے گی؟ یہی تو میں بھی سوچتا ہوں، چاہے ہمارے اندر جنت کی ہوائیں ہی کیوں نہ چل رہی ہوتیں اور ہمارے وجود میں جنت کے چشمے ہی کیوں نہ بہہ رہے ہوتے پھر بھی اپنی ذات کی قید دوزخ سے کم نہ ہوتی جب کہ ہمارا اندرون تو خود سب سے بڑا دوزخ ہے۔ آخر وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے باہر سے بھلا کیا سروکار...... اور یہ بڑے جانے ہوئے اور مانے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ یہ بات جاننے والے کم ہی ہوں گے کہ نفس کی سب سے اچھی حالت کون سی ہے اور سب سے بری حالت کون سی ہے؟ یہ تو کیا بڑبڑانے لگا اور یہ تو نے کن بکواسیوں کی بات شروع کر دی جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلا ہمیں اپنے باہر سے کیا سروکار۔ بدذات۔ یہ اپنے اندر ہوتے ہی کب ہیں جو باہر نکلیں۔ کھو کھلے۔ تو ان بے حسوں اور بے حیاؤں کی باتیں کر کے میرا جی نہ جلایا کر۔ خبردار جو اب ان بدروحوں کا نام لیا۔ یہ زندگی کے گورستانوں میں منڈلاتے پھرتے ہیں کہ بدی کی کوئی لاش کھود کے نکالیں اور اسے اپنے اوپر منڈھ کر بستیوں میں آئیں اور روگ پھیلائیں۔ یہ تو نے اچھی کہی کہ یہ لوگ اپنی ذات میں رہتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ بدذاتی...... بے ذات ہوتی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہ باہر سے بھاگتے ہیں اور لاشوں میں اپنے لیے ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں۔ ذات میں رہنا بھی کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ کیا یہ کوئی آسایش ہے؟ اس سے کڑی آزمایش اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنی پسلیوں میں پھنسا سسک رہا ہو۔ اگر انسانوں میں سے کچھ انسان اس آزمایش میں پڑ گئے ہوں تو کیا انہیں اس پر خوش ہونا چاہیے؟ جب تو یہ کہتا ہے کہ میں اپنی پسلیوں میں پھنسا ہوا ہوں یا اپنی اوجھڑی میں گٹھری بنا پڑا ہوں تو کیا اپنے آپ کو یا کسی اور کو کوئی خوش خبری سناتا ہے؟ کیا بہت دم گھٹ رہا ہے؟ ہاں، سچ مچ جان پر بنی ہوئی ہے۔ یہ کیسا ہونا ہے۔ بس یہی میرا بھی حال ہے۔ یہ تو بہت ہی عذاب ناک ہونا ہے۔ نہ ہونے کا آرام شاید بہت بڑا آرام ہوتا ہوگا۔ ہاں شاید...... اتنا نشہ کہ ہوش ہی نہ رہے۔ خون کے گھونٹ پی اور جی۔ نہیں بھائی، نہیں۔ اب زبان اور محاورے کی چاشنی کچھ مزہ نہیں دیتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ بول ہی مت، بس چپکا ہی رہ۔ ہاں تو نے ٹھیک کہا۔ اب تو اپنی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ جب اپنا آپ ہی برا لگنے لگے تو پھر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ بھلا تو اپنے آپ کو کیسا لگتا ہے؟ میں اپنی صورت تک سے بیزار ہوں۔ میں اپنے اس گمان تک سے اکتا چکا ہوں کہ میں ہوں۔ جو نہ ہونے کی طرح ہے وہ آخر ہے بھی کیوں۔ تو نے میرا جی خوش کر دیا۔ اگرچہ جاں کنی، جاں کنی کا جی خوش کر سکتی ہو۔ دمسازی اور غمگساری اسے کہتے ہیں۔ بس یہی کچھ میرا بھی عالم ہے۔ برے مارے گئے، ہاں برے مارے گئے۔

باہر کی ہوا اب کیسی ہوگی؟ ویسی ہی ہوگی جیسی تھی۔ جیسی چھوڑ کر ہم اپنے اندر بھاگ آئے تھے۔ بھاگ آئے تھے یا کھدیڑے گئے تھے۔ ہاں یوں کہہ لے، ہوا بھی یہی تھا۔ پر ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ باہر کی ہوا کا کیا کہنا۔ ہاں بھئی! باہر کی ہوا کا بھلا کیا کہنا۔ باہر کی فضا کا بھلا کیا کہنا۔ اندر تو رائگانی ہی رائگانی ہے۔ ندامت ہی ندامت ہے۔ ہم جو تھے، ہم میں سے بھلا کون کون رائگاں گیا ہوگا۔ جنہیں رائگاں نہ جانا چاہیے تھا، وہی بری طرح رائگاں گئے ہوں گے اور انہی کو اپنے رائگاں جانے کا دکھ بھی ہوگا۔ کیسے کیسے لوگ رائگاں گئے۔ رائگانی کے ان شہروں میں کیسی کیسی امنگیں پچھتاوؤں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک بات ہے۔ کیا بات؟ باہر کی ہوا تھی بھی کچھ ایسی کہ ایسا نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ باہر کی گھٹن بھی اندر کی گھٹن سے کچھ کم تو نہ تھی اور یہ کہ فضا میں قہر تھا اور ہوا میں زہر۔ ہوا کا وہ زہر اور فضا کا وہ قہر ضمیر کی ہلاکت اور ذہن کی ہزیمت تھا۔ ہم نے حکمت کو ہوس ناکی بنتے دیکھا اور دلیل کو دلالی۔ قیادت نے قزاقی کا پیشہ اختیار کیا اور قانون نے نقب زنی شعار کی۔ پھر ہو کیا؟ کیا ہم اپنے اندر اسی طرح کراہتے رہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ اندر کی ہلاکت سے باہر کی ہلاکت ہزار گنا بہتر ہے۔ اندر کی زندگی بھی موت ہے اور باہر کی موت بھی زندگی۔ کسی بھی طرح اپنے آپ سے باہر نکلنا چاہیے، کسی بھی طرح۔

عزیز قارئین
السلام علیکم!

نومبر 2012ء کا شمارہ موسم سرما کی آمد کی خوشگوار مہک کے ساتھ حاضر ہے۔ پرچے کی ترتیب کے دوران T-20 ورلڈ کپ کا دنگل اپنے عروج پر تھا کہ اچانک پاکستانی ٹیم کی شکست سے ہر سو سناٹا چھا گیا...... جوش، ولولہ انگیزی، ناکامی اور پھر مایوسی...... کسی بھی قوم کی ایک یہی ادا بتاتی ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے کس طرح مقابلے کی عادی ہے۔ شکست کے بعد سالارِ کپتان حفیظ نے جرأت مندانہ انداز میں شکست کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے اس شکست کو قسمت کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اگرچہ جیت ہار زندگی کا حصہ ہے مگر مکمل زندگی نہیں...... اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح مسلسل جیت مقدر نہیں بنتی، اسی طرح ہار کا تسلسل بھی تمام تر دلچسپیوں اور امیدوں پر پانی پھیر دیتا ہے...... اس کے علاوہ عوام کے زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لیے سیاسی بیان بازیوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ مشیر پیٹرولیم نے فرمایا کہ "سردیوں میں گیس کی لوڈشیڈنگ بھی ہوگی اور قیمت بھی بڑھے گی۔" شاید وہ اپنے بیان میں لفظ "دوگنا یا تین گنا" کہنا بھول گئے، کیونکہ گزرے ماہ و سال میں بس یہی کمال تو مستقل مزاجی کے ساتھ بہت باکمال انداز میں ہوتا رہا ہے...... سوات میں حال ہی میں وحشت و بربریت کا ایک اور ہولناک تماشا...... ملالہ یوسف زئی...... ایک معصوم، کم عمر لڑکی...... علم کی شیدائی، مضبوط ارادوں اور روشن خیالات کی سزا...... اتنی بھیانک...... یہ کون ہیں جو بے ضرر انسانوں کو کیڑے مکوڑوں کے مانند مسلتے پھر رہے ہیں...... اندھیر نگری میں پتھر سے زیادہ سنگ دل لوگوں نے اس معصوم کلی کی شعلہ بیانی کو خوف کے سناٹوں میں دھکیل دیا۔ کیسا حق اور کہاں کا انصاف...... یہ اب محض خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ بہر حال پچھلے دنوں طب کے شعبے میں بھی ایک کمال اور ہوا ہے مگر...... ذرا سا خوشگوار۔ پاکستانی ادارے ڈاؤ یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز کے ماہرین نے چند زہریلے سانپوں کے کاٹے کا علاج دریافت کرلیا ہے، جن کا علاج امریکا اور یورپ میں بھی نہیں ہے۔ اس دوا کو بیلجیم کی تجربہ گاہوں میں پرکھ کر بین الاقوامی معیار کے مطابق قرار دیا گیا ہے...... کاش کوئی مسیحا عوام کے غم کا علاج بھی دریافت کرلے...... امت مسلمہ کے دشمن مختلف حیلے بہانوں سے مسلم قوم کو آپس میں ہی الجھا کر ختم کرا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ غفلت میں اپنے گھروں کو خود آگ لگانے میں مصروف ہیں...... اے معبود! ان دشمنوں کو نیست و نابود اور امتِ مسلمہ پر اپنا کرم فرما دے (الٰہی آمین) اور جناب! انہی دعاؤں کے سائے سائے اب رخ کرتے ہیں اپنی پھلواری کی جانب جہاں مہکتے سندیسے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

☸ **شیر علی خان**، خانیوال سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "پچھلی غیر حاضریوں اور مصروفیت کے باوجود سسپنس کی محفل سے چھٹکارا ناممکن ہے، ہر طرف مالی مجبوریوں کی وجہ سے قیمت کو نظر انداز کرنا لازمی ہے۔ یوم عاشقانِ رسول ﷺ کے موقع پر جرائم پیشہ افراد کو کھل کھیلنے کے خوب مواقع میسر آئے۔ آج کل حکومت کی ہنڈیا میں پیٹرول، ڈیزل کی قیمتوں میں زیادتی اور سفارشی بھرتیوں کا سالن پک رہا ہے جو کہ آئندہ کی حکومت کھائے گی۔ جون ایلیا بات منوانے کی اہلیت حکمرانوں کے پاس ہے اس لیے ہم عوام کو راہ خود متعین کرنی ہے۔ اوراق کو پھلانگتے ہوئے محفلِ یاراں میں پہنچے تو چوہدری احمد مختصر مگر جامع تبصرے کے ساتھ سرِ فہرست تھے، ان کا تبصرہ لمبی تمہید باندھ کر تبصرہ کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔ احمد خان توحیدی اگر ایڈوانس بکنگ کے لیے ساون انتظار کرنا پڑتا تھا تو ذرا اپنی عمر سے بھی سب کو آگاہ کردیں۔ تفسیر عباس ایک بار پھر دعا دیتے ہوئے تمہیدیں اور تبصرہ کرتے ہوئے قلابازیاں مارتے نظر آئے۔ ویسے آپ کے خط میں، میں نے کافی سارے محاورے نوٹ کرلیے ہیں جو اکثر آپ عادت سے مجبور بلاجواز استعمال کرتے رہتے ہیں۔ بابر عباس خط کی حالت دیکھ کر سکتہ طاری کرنے کے بجائے "بزرگ" ہونے کا ثبوت دیں تاکہ دوسروں کی جگہ بن سکے۔ ویسے آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ اکثر لوگ ایک ہی تصویر کے دو رخ بن کر شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر وسیم کی دبئی یاترا کا سن کر مجھے ایک دوست کا قصہ یاد آگیا ہے جو اکثر دبئی کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ بھائی، اپنا گھر ہی اچھا ہے۔ سنسان دل "سنسان" ہونے کی وجہ سے بلا تبصرہ ہے۔ رمضان پاشا اگر آپ کا خون بڑھ گیا ہے تو دو چار بوتلیں بہاولپور والے ایم چوہدری کو بھی بھجوادیں۔ طاہر الدین بیگ آپ کے ڈرامے کا ڈراپ سین کب ہوگا۔ ہمیں شدت سے انتظار رہے گا۔ حافظ صاحب! جس طرح ماہا ایمان سسپنس کی خوب صورت جیل سے راہ فرار پاچکی ہیں۔ اللہ آپ کو جیل جیسی زندگی سے چھٹکارا نصیب فرمائے، آمین۔ تصویر انجمن سسپنس کے آنے تک تو عید الاضحیٰ آچکی ہوگی، آپ عید الفطر کی مبارکبادیں لیے پھر رہی ہیں۔ ماریہ فاروق نئی تو یلی ہیں اور ان پر تبصرہ نہ کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ رانا حبیب الرحمن یہ اندھیر اجالا کون ہیں۔ ہمایوں سعید مجھے ایک کیلکولیٹر مل چکا ہے، کبھی راولپنڈی آئیں نا، سب کی عمر حل کرنا ہے ہیں۔ تانا کا جھانگی کے بجائے یونیورسٹی سے ہی کوئی ڈھونڈ لیں۔ جاوید بلوچ، لگتا ہے آج کل کوئی ڈاکٹر کورس کر رہے ہیں کہ ان کی پلوشہ کے لیے ڈاکٹری نسخہ تجویز کرنے کی نصیحت اور ہکلاہٹ سمجھ سے بالاتر ہے۔ سعدیہ بخاری آف اٹک پتا نہیں کہاں اٹک گئی ہیں۔ طاہرہ گلزار کے نہ تھمنے والے آنسوؤں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ عبدالمالک کبھی صادق آباد کی بس کی طرح کافی لیٹ پہنچے ہیں۔ مداری کو پڑھ کر یہ سبق ملا ہے کہ والدین کو بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے ہیں انہیں ذہنی طور پر تیار کرنا چاہیے تاکہ وہ رشتوں کی حقیقت کو سمجھ سکیں ورنہ ان کا حال عائشہ جیسا ہوتا ہے اور اس طرح کی ایک کہانی میرے اردگرد بھی پرورش پا رہی ہے۔ ملک صفدر حیات اس دفعہ دیہاتی پس منظر سے جڑی ایک زبردست کہانی لے کر آئے۔ کشکول میں شبنم اور افضل خان کے پلانٹ اغوا نے اگلی قسط تک سنسنی خیز صورت حال پیدا کردی ہے اس لیے بہت انتظار رہے گا مگر شیخ حامد کی ناکامیوں سے کشکول کے مستقبل پر اثر پڑے گا۔ مسافر کی ہر نئی قسط ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ اللہ مسافر کی عمر دراز کرے تاکہ ہمیں اسی طرح سسپنس سے بھرپور واقعات پڑھنے کو ملیں۔ ریحانہ نے باپ سے ملنے کا طریقہ ڈھونڈ لیا، بہت زبردست۔ جہاں اسے باپ سے ملنے کے لیے اور محبت پانے کے لیے ایک دن کا ملنا کافی نہیں ہوتا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے واقعات بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ تحریر ریاض نے لگتا ہے "پہلی بار" پہلی بار لکھی ہے۔ محبت کے مخصوص جذبات سے مزین جنونِ عشق بہت پسند آئی۔ جس سے جذبۂ جہاد کو تقویت ملی۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ بلند کرے، اسیران کو رہائی نصیب فرمائے۔ آمین!" (خوبصورت اور جامع تبصرہ...... اچھا لگا۔)

☸ **محمد عمار کشف**، کوئٹہ ارب علی خان سے چلے آرہے ہیں "سسپنس کو محض ایک ڈائجسٹ سمجھنے والے کی سمجھ پر افسوس جزو لازم اور افسوس در افسوس لازم و ملزوم ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہمیں اس کی خرد کے مفقود ہونے میں شبہات و شکوک نہیں گویا ہماری بصارت میں وہ بصیرت سے محروم ہونے میں قطعی مشکوک نہیں...... کہ گوہر نایاب کو بھی جوہر شناس ہی پہچان پاتے ہیں۔ البتہ اپنی بات پایۂ ثبوت تک پہنچانے، دست بستہ و برجستہ دلائل کمر باندھے مانند شہ زور جلوہ افروز ہیں کہ فقط گفتار کے غازی نہیں ہیں عمل کے غازی بھی ہیں۔ ہمارے جیسا تہذیب و تعلیم یافتہ اور مہذب انسان بلکہ انسانیت کے ماتھے کا جھومر اور سر کا تاج کہ کوئی کتنی ہی پرلطف بات کیوں نہ ہو چہرے پر خفیف سا لطیف احساس ہی ہمارے قلب کے محور و مسرور ہونے کا غماز ہوتا ہے، بجز اگر سسپنس ملنے کی سرشاری میں سرشار رقص لگانے لگیں اور رقص بھی ایسی بلند و بالا کہ چاہیں تو زمین و آسماں کے درمیان کی وسعتیں تک ماپ لیں اور ایسا محض ایک ڈائجسٹ کی وجہ سے ہو، صنفِ نازک کے زود فہم ہونے کی طرح ناقابلِ یقین ہے۔ اب ہم یہ راز طشت از بام و زبان زد عام کردیں کہ سسپنس تو مانندِ دریا ہے جو صاحبِ ذوق کی پیاس بجھاتا اور اسے علم و ادب سے سیراب کرتا ہے۔ اس دریا کا اشنان روح تک کی تازگی اور قلب و ذہن کے لیے باعث فرحت و مسرت ہے لیکن یہ کسی خیال باز کا خام خیال نہیں ہے اور نہ ہی بعد از حقیقت کہ ترش و تلخ نہ ہو۔ مٹھاس تو رکھتا ہو، کھٹاس نہ ہو۔ یہ کھٹاس لیے ہوتا ہے سسپنس کا اثاثہ۔ استغراق، گہری فکر اور دانش و بصیرت کی منطق سے جنم لیتا ایک صاحب نظر کا منطوق نظریہ۔ پستی و تنزلی کی جانب گامزن معاشرے کی سوختگی و خستگی کی کڑواہٹ آمیز سچائی، اوصاف و اصلاف کے پایۂ استقلال کی لڑکھڑاہٹ اور ملک خداداد کی ڈوبتی معیشت و پرخطر سالمیت کا چبھتا ادراک یعنی...... سسپنس ہمارے ضمیر کی جھنجوڑ ٹھہرا۔ لیکن اس سے پہلے دل آویز و دیدہ زیب سرورق اور ہر سرورق میں مشترک حسینہ، مادہ حسینہ کی رعنائی و انداز دلربائی، پیکر حسن، جاذبِ چشم۔ گویا...... جمالیاتی حس رکھنے والوں کی حسیں بھی بیدار رکھتا ہے، جلا بخشتا ہے اور ہم جو اس کے ابھرتے جوبن میں ڈوب ڈوب جا رہے ہیں، لمحوں کو گداز ہی نہیں بنا رہے بلکہ ماضی بعید سے ادراک بھی پا رہے ہیں جو...... سسپنس کشید کرتا ہے اور بیتے پلوں پر بیتتے پلوں کی گرد جھاڑتا ہے۔ واقعات در واقعات کا ایک تسلسل ہے۔ گویا سسپنس ایک تاریخ ہے اور اہلِ نظر کے لیے تاریخ ہمیشہ ایک سبق رہی ہے۔ قصص الانبیا میں انبیا کے ایمان افروز قصے ایمان کو تقویت بخشتے ہیں۔ اردو ادب مشرقی تہذیب و تمدن کا محافظ اور اقدار کا ہالہ لیے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ انداز مغرب لیے اہلِ مغرب کی رنگینی و سنگینی، خود غرضی و بے اعتنائی، کم عقلی و دانائی اور دنیا بھر سے دنیا بھر کی روایات و ثقافت بتلاتا، معلومات سے ہمکنار کرتا ہے۔ پس سسپنس چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ محفلِ شعر و سخن کا معیار قارئین کے ذوق و وقار کا آئینہ دار ہے اور بزمِ یاراں و بزمِ جاناں تو سسپنس کی شان اور ہماری جان ہے۔ مستند تبصرہ نگاروں کے خوبصورت تبصرے، صنف وجاہت کے چہروں پر کھلے تبسم، صنفِ نازک کے بے ہنگم قہقہے اور دلچسپ نوک جھونک خوب صورت احساس لیے ہوتی ہے جو اس جریدے کو اور خوب صورت بناتی ہے۔ سسپنس ایک نہایت فرحت بخش تسکین ہے جو ادارے کی مرہونِ منت و محنت ہے اور ایسی تسکین فراہم کرنے پر ادارے والوں کی تحسین جزو لازم اور تحسین در تحسین لازم و ملزوم ہے۔ تمبر کے شمارے میں ساحر نازلدھیانوی کے نام سے چھپنے والا تبصرہ ہمارا ہی ہے لیکن بقول تمہارے اپنی شناخت کھو دینے والا اپنے آپ کو کھو دیتا ہے لہٰذا آئندہ اسی نام سے الفاظ بنتے سر دھنتے نظر آئیں گے۔" (اس قدر دماغ سوزی کا شکریہ۔)

☸ **تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے تبصرہ کر رہے ہیں "اب کی بار سرورق متاثر کرنے میں قطعی ناکام رہا۔ دوشیزہ سرورق کی ضرورت سے زیادہ پھیلی ہوئی باچھیں، یہ ذاکر صاحب نے ماہا ایمان کو کہاں دیکھ لیا؟ میدانِ کارزار سے پہلے...... جون ایلیا کی حکمتِ عملی سے مستفید ہونا لازم تھا۔ وطنِ عزیز کا زوال وزیروں اور جون ایلیا کی مرثیہ گوئی، درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا...... لیکن یہاں کچھ نہیں ہونے والا۔ مصر میں ایک شخص خوشگوار انقلاب کی بنیاد رکھ سکتا ہے صرف ایک نعرۂ حق اور ایک عزمِ مصمم کی ضرورت ہے۔ سردار وہی ہے جو سردار آئے یہاں صرف جلوس، ہڑتالیں اور...... وہ پرامن مظاہرے جس میں دنگا فساد اور بلوے، اسپتال زخمیوں سے بھر جاتے ہیں۔ ایک بے ننگ و ناموس اور رذیل کائنات امریکی فلم ساز...... توہین رسالت جیسے گناہ کبیرہ کا مرتکب ٹھہرا۔ بے بسی، بے حسی اور خود غرضی کی اس انتہا کے مقام پر، صرف رب دو جہاں سے ہی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اسلام دشمن عناصر کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرکے، نمونۂ عبرت بنادے۔ آمین۔ آپ کے فکر انگیز اداریے میں آپ کا نہیں ہر کسی کا مسئلہ ہے، صرف شہر لاقانونیت میں حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی مہنگائی جس سے ہر خاص و عام کے روزگار کاروبار اور مستقبل کو خطرہ لاحق ہے۔ نمک اور ماچس تک مہنگی ہوگئی ایسے غیر یقینی اور نامساعد حالات میں سسپنس کی قیمت میں اضافہ، کوئی بڑی بات نہیں ویسے بھی...... شوق اور محبت کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ مسندِ صدارت اور راولپنڈی سے چوہدری احمد خان کا کرب انگیز اختصاریہ...... چوہدری صاحب، بس جس درجے کوئی منقل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے، رہی بات جان کی تو، یہ جان تو آنی جانی ہے۔ اپنے تبصرے کو اعزاز مقبولیت حاصل ہونے پر مبارکباد قبول کیجیے، اب آپ کو مٹھائی کی زحمت دینے کے لیے ہم راولپنڈی آنے سے تو رہے۔ کراچی سے احمد خان توحیدی کے پراثر افکار و خیالات نے بھی دعوتِ فکر دی۔ کھاریاں سے بابر عباس کی گھاتیں اور دلچسپ باتیں، ہمیشہ کی طرح سدا بہار ثابت ہوئیں۔ کبیر والا سے سنسان ویران اور پریشان دل اگر اپنا اور ریجنل نام لکھ سکتے تو ہمیں آپ سے مخاطب ہوکر خوشی ہوتی، خیر...... خوش آمدید...... کراچی سے رمضان پاشا، پہلی ہی فرصت میں مذکورہ حقیر فقیر سے متعارف ضرور کروائیے گا۔ میرپور خاص سے مرزا طاہر الدین بیگ، روشنی رشید نئی روشنی اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں ان سے اتنی روشنی کی امیدیں مت باندھیے اور ماہا سے متعلق ہمیں تو کچھ اور ہی رپورٹ ملی ہے کہ وہ ہیں کو اب کچھ اور نظر آتے ہیں کچھ کا، پریکٹیکل ہیں۔ اوکاڑہ سے تصویر انجمن ہمیں کافی سے زیادہ افسوس ہے کہ ایف ایم سننے کا شوق و شغف ہمیں کبھی نہیں رہا۔ کیا آپ وہاں پائی جاتی ہیں؟ بنوں سے ہمایوں سعید کا دلچسپ انکشاف کہ وہ گزشتہ نصف صدی سے تبصرے اور سسپنس پڑھ رہے ہیں۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کی نہایت مہارت و مشاقی کے ساتھ کتبِ تواریخ کی ورق گردانی، یوسف صلاح الدین ایوبی، اپنے عہد کی بے مثال و منفرد شخصیت...... یقیناً اب ایسے لوگوں کا فقدان ہی وطنِ عزیز کے زوال و بحران کا باعث ہے۔ ایم اے راحت کی مداری...... ایک بے حس اور خود غرض باپ کی زر پرستی کی سبق آموز سرگزشت...... نے کافی افسردہ کیا۔ انوار صدیقی کی کشکول پراسراریت سے زیادہ انڈر ورلڈ کے حالات پر مبنی ہے۔ سلیم انور کی جلد بازی بھی خوب رہی۔ ایک اور ایک تین...... اثر نعمانی کی پراثر تخلیص و تحریر نے متاثر کیا۔ ملک صفدر حیات کا دلخراش واقعہ...... پیش منظر...... حضرت انسان کی بے حسی و سنگدلی کا ایک تماشا، افسردہ کر گیا۔ پسندیدہ مصنف کاشف زبیر کی بہترین کاوش سراب پسند نے بھی بور نہیں کیا اور شمر عباس کی قربانی بھی رائگاں نہیں گئی۔ ناصر ملک کا دل گداز سلسلہ مسافر...... شہریار خان کے اپنوں کے کھو جانے کا افسوس ہوا۔ میڈم شکیلہ نہایت پاورفل اور پراسرار کردار کی حامل ہے۔ عتارا آزاد کی پراثر و حساس تحریر۔ 364 دن بھی بے حد پسند آئی، والدین کے منفی رویے بچوں کی تربیت اور حساسیت پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جنگل و بیابان کی آواز حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ایمان افروز واقعہ...... خزینۂ علم میں ایک اور گوہر نایاب۔ تحریر

ریاض کی پہلی بار نہایت دلچسپ رہی۔ خاص صفحات کی خاص الخاص تحریر...... اسما قادری کی عشق و محبت کے لطیف، نرم و حساس جذبوں میں گندھی...... شاندار سوغات جنونِ عشق، ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے کی تفسیر...... عشق کے جذبۂ صادق نے رومی پر شادو کو آر پی سے رحمت پرویز بنا دیا، یہی اللہ کی خاص رحمت ہے۔ جب تقدیر میں کاتبِ تقدیر، لوحِ محفوظ پر دونوں کا ایک ہونا لکھ دے...... تو عشق اپنی معراج تک جا پہنچتا ہے۔"

✠ **محمد ہمایوں سعید،** بنوں سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "ذہن میں آندھیاں چل رہی ہیں، دل جل رہا ہے، کچھ سمجھ نہیں آتا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔ اسلام سے غفلت اور سنتِ نبوی ﷺ سے دوری کے اتنے بھیانک نتائج کسی کے وہم و گماں میں بھی نہ تھے۔ ہم مغرب کی اندھا دھند تقلید کرتے ہوئے بھول گئے تھے کہ مغرب میں جا کر تو سورج بھی ڈوب جاتا ہے۔ انکل جی! آپ کو مہنگائی سے متعلق کسی بھی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ چودھری صاحب کرسیٔ صدارت پر نہایت بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پائے گئے، کیونکہ ان کو ابھی تک سعدیہ جی کا پتا کسی نے نہیں دیا۔ تفسیر صاحب بلاشبہ آپ ہی سعدیہ کی قدرتی مجبوری کو سمجھ سکتے ہیں۔ بھلا ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ اولڈ ایج میں دانتوں، آنکھوں اور کانوں کی کیا پوزیشن ہوتی ہے۔ سنسان دل! ابھی ہماری محفل میں آل ریڈی ویران دل، بیاباں دل، بنجر دل، بہت سارے موجود تھے، آپ نے خوامخواہ تکلیف کی۔ ماریہ جی! آپ نے مسافر کی چند ماہ پرانی قسط کے دوبارہ شائع کروانے کا جو عاقلانہ و بالغانہ مشورہ دیا ہے اس نے ہماری عقل کے سارے تالے دروازوں سمیت توڑ ڈالے۔ رانا صاحب! اجالا کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد۔ اپنی بے کیف زندگی سے عاجز عبدالمالک کیف اتنا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ہر آنے والے کو کھلے دل سے گلے لگاتے ہیں۔ کہانیوں کی فہرست میں اسما قادری کا نام دیکھا تو بلاتردد ان کی جانب تشریف لے گئے۔ محبتوں کی بے پناہ تاثیر لیے جنونِ عشق یادگار ترین کہانی ثابت ہوئی۔ محبت اس قدر حسین جذبے کا نام ہے، اس کا اندازہ کچھ کچھ ہونے لگا ہے۔ اتنا یادگار، خوب صورت اور خوشگوار انجام دے کر اسما جی نے ہمارا دل جیت لیا۔ ملک صفدر حیات کی پیش منظر ہمیشہ کی طرح لاجواب رہی۔ اثر نعمانی مرحوم کا ایک خوب صورت تحفہ ایک اور ایک تین توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ شوہر کا بیوی سے اور بیوی کا شوہر سے بے وفائی کرنا تو مغرب کا فیشن بن چکا ہے۔ سلیم انور کی جلد باز میں ریڈ مین ہمیں کسی بھی اینگل سے جلد باز دکھائی نہ دیا۔ ایم اے راحت کی مداری کے اینڈ نے ہمیں 440 واٹ کا شاندار جھٹکا دیا۔ منشی جی کے شریفانہ کردار سے اتنی گھٹیا امید کر بھی کون سکتا تھا۔ رضوانہ ساجد کی حضرت یحییٰؑ کو ہمیشہ کی طرح دل کی آنکھوں سے پڑھا اور ایمان کو جلا بخشی۔ محفلِ شعر و سخن میں سنسان دل نے اپنے محبوب کو بددعا دے کر ثابت کر دیا کہ ان کی محبت کامل نہیں۔"

✠ **عبدالغفور خاں خٹک،** چھب ضلع اٹک سے محفل میں چلے آرہے ہیں "اس ماہ 20 تاریخ کو ڈائجسٹ کچھ مصروفیات کی وجہ سے لیٹ خریدا۔ پہلی خبر پر نظر پڑی وہ تھی ٹائٹل پر 60 کی قیمت، اس مہنگائی میں افسوس ناک خبر ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی جس میں ایک طرف تو شہر یار کو اپنی چچازاد بہنوں کے ملنے کی خوشی ملی تو دوسری طرف چچا چچی کو کھونے کا دکھ، ویری سیڈ۔ شہر یار کو فام میں دکھایا ہے، رائٹر صاحب نے یہ اچھا کیا ہے۔ اس کے بعد کشکول پڑھی، وہی پولیس کی تفتیش کے واقعات کے گرد کہانی گھوم رہی ہے۔ بس لیاقت حسین کو والدین سے ملنے کی اچھی خبر تھی صرف۔ اس کے بعد جنونِ عشق، اسما قادری کی ایک اچھی کاوش تھی اور محبت سچی ہو تو مل کر رہتی ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔"

✠ **سارہ** نیو کراچی سے محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہیں "پتا نہیں کسی ڈائجسٹ میں خط کس انداز میں لکھنا شروع کرتے ہیں یا تو سمجھا دیں یا اسی پہ گزارہ کر لیں (چلیں گزارہ کر لیا، خوش آمدید!) سرورق خوب صورت رنگ لیے اور دوشیزہ مردانہ شباہت لیے ہوئی تھی۔ خیر...... سب سے پہلے بات کروں گی فاتح کی...... بیت المقدس کو فتح کرنے والا عظیم انسان خلیفہ کے نام کو خطبے سے نکلوانے کے فرمان کو وقت پر پورا نہ کر سکنے اور اس پر سلطان کے اپنے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا خوف لیے ہوئے ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ سلطان نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی پر بہت شفقت فرماتے تھے، خطبے سے نام نکلوانے کا فیصلہ صلاح الدین ایوبی کا تھا۔ مداری پڑھ کر دل بجھ سا گیا۔ پھر سمجھایا خود کو کہ جہاں والدین اولاد کو بیچ دیتے ہوں وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے، یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ ملک صاحب ایک نئی مثال لائے اور یوں خوب لائے کہ ہم سردیوں کی طرف جانے والے ہیں اور وہ گرمی کے شروع کا قصہ سنا رہے ہیں۔ حدت، شدت کے ساتھ۔ سراب پسند، ایک سائنس فکشن اسٹوری، ویسے شکر ہے ایسا ہے نہیں ورنہ ممکن ہے ہم ہلاکو خان جیسے لوگوں کو پڑھتے پڑھتے انہیں قریب ہی پائیں، تو پہ کیا حال ہوگا ہمارا...... کشکول کا تھیم بہت اچھا ہے، اور نگزیب، سراج بہت مثبت کردار، پتا نہیں کس دنیا کے ہیں، لیاقت حسین کا اپنے والد سے ملنے کا سین اچھا لگا۔ مسافر کا سفر خوب جاری ہے، شہر یار کو ہر کام انگلی پکڑ کے سکھایا جا رہا ہے حالانکہ اسے سب پتا ہے پھر بھی وہ انجانوں جیسی حرکتیں کرتا ہے، عقل بھی اس کی دیر سے کام کرتی ہے فی الحال خالد کا کردار بھی اچھا جا رہا ہے اور رہی میڈم؟ شہرا تو گیا کام سے......! آخری صفحات کی کہانی تو کسی خواتین ڈائجسٹ کے لیے موزوں تھی۔ اسما قادری پلیز ٹرائی اگین...... ویسے کوشش اتنی بری بھی نہیں، باقی تحاریر بھی عمدہ ہیں۔ کترنیں اور اشعار اچھے رہے، میں بھی شامل ہو رہی ہوں۔ کچھ نٹ کھٹ سے لوگ محفل میں موجود تھے، کچھ فائٹ کرنے میں لگے ہیں...... کچھ خود کو ایکسپوز کرنے کے لیے تیار...... نام لینا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ویسے ایک بات بتائی جائے، یہ منڈا لوگ بیچاری ماما ایمان کے پیچھے کیوں پڑا رہتا ہے۔ کسی منڈے کا ادھار کھا لیا ماما جی نے؟ تصویر العین کا نام بھی اچھا ہے اور سندیہ بھی...... اس ماہ اتنا کافی ہے۔"

✠ **رائے قیصر عباس کھرل،** سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے چلے آرہے ہیں "کافی انتظار کے بعد شمارہ 24 تاریخ کو ہمارے ہاتھوں میں آیا۔ ہر چیز کو چھوڑ کر سب سے پہلے مسافر پر پہنچے۔ مسافر کی تو کیا ہی بات ہے۔ کہانی بڑی زبردست جا رہی ہے۔ دل کرتا ہے بندہ ساری قسطیں اکٹھی ہی پڑھ لے۔ تھینک یو فار ناصر ملک اینڈ سسپنس کہ اتنی اچھی کہانی پڑھنے کو ملی۔ مسافر کے بعد کشکول پڑھی، صفحات کم محسوس ہوئے۔ شیطانی طاقتوں کو ایک بار پھر منہ کی کھانی پڑی۔ شیخ حامد بھی ذلیل ہو رہا ہے۔ آخری صفحات پر اسما قادری کی جنونِ عشق کی کیا بات تھی۔ اسی کو محبت کہتے ہیں۔ تاریخی کہانی فاتح بھی بہت اچھی ہے۔ اس کے دوسرے حصے کا انتظار رہے گا۔ اگر آج کے مسلمانوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی جیسا جذبۂ ایمانی پیدا ہو جائے تو مسلمانوں کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ ملک صاحب کی پیش منظر بھی ٹھیک تھی۔ مداری کی اسٹوری کافی غم ناک تھی، لیکن اس میں لالچیوں کے لیے پیغام چھپا ہوا تھا۔ محفلِ شعر و سخن میں شازیہ گوہر فرام قصور کا شعر بہت پسند آیا۔ باقی اشعار میں حاجی محمد زاہد صاحب، محمد جاوید راؤ، ریاض شاہد چیمہ اور نور العین سرگودھا کے شعر پسند آئے۔ محفل میں پہنچے تو

بڑا دکھ ہوا، میرا خط بلیک لسٹ میں تھا۔ بہرحال ٹرائی اگین (اور ٹرائی اگین کام آگیا، آپ کا خط جگہ پا گیا) پھر ہماری جیل سے ہی ایک بھائی کا خط دیکھا تو افسوس ختم ہو گیا۔ حافظ شاہد چدھڑ صاحب ویلکم۔ روشنی رشید صاحبہ آپ کہاں غائب ہو گئی ہیں، اللہ آپ کو خیریت سے رکھے۔ تصویر العین صاحبہ کو مسافر پسند نہیں آرہی میڈم حیرت ہے، بہرحال پسند اپنی اپنی۔ رانا حبیب الرحمن صاحب کا تبصرہ پسند آیا۔ سرگودھا جیل والوں کو رسالے والوں نے نظر انداز کیا۔ بھائیوں کیا حال ہیں؟ (ہم نے بالکل نظر انداز نہیں کیا، خطوط ملتے تو ضرور شائع ہوتے) اور سب سے آخر میں جسے بہت مس کیا جا رہا ہے، وہ ہے ماما ایمان جی۔ ارے ماما جی کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ ایک بار پھر انٹری دیں وہ بھی خطرناک انداز میں۔ ہمیں آپ کے خط کا بہت انتظار ہے (ماما ایمان اپنی شکایات کے ساتھ حاضر ہیں) اور لطیفوں میں ساجدہ راجا سرگودھا کی شرارت اچھی لگی۔"

✠ **حافظ شاہد عمران چدھڑ،** سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے تبصرہ کر رہے ہیں "24 ستمبر کو جب سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو تب سے ہم انتظار میں جل بھن کر کباب بن رہے تھے۔ ہم جس کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار کر چکے ہیں۔ مانا کہ اس کے سوشل اسٹیٹس میں فرق ہے پھر بھی ہم خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ آخر لمبے انتظار کے بعد دوپہر 2 بجے کے قریب طرح دار حسینہ کی طرح اپنے فل فیشن کے ساتھ نمودار ہوا تو فوراً سے پہلے ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ سرورق بھی اچھا لگا۔ سب سے پہلے محفلِ یاراں میں چھلانگ لگائی اپنا خط پا کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ آپ نے اس ناچیز کا خط شائع کر کے شکریہ کا موقع دیا (خوش رہیے) رائے قیصر عباس کھرل صاحب کافی دنوں سے فرار ہو چکے ہیں۔ رائے صاحب کا فرار ہونا باعثِ تشویش ہے۔ عمران برادر یہ میری شدید ترین خواہش ہے کہ اللہ کرے ہم سب اسیران آزاد فضا میں سانس لے کر سسپنس کے لیے خط لکھیں، آمین۔ ماریہ فاروق صاحبہ آپ کا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ بہت خوب صورت الفاظ کا استعمال کرتی ہیں۔ بہت افسوس ہوا کہ ماہ مئی کا رسالہ آپ نہ پا سکیں۔ چلو کوئی بات نہیں۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی، بہت اچھی جا رہی ہے، شہر یار پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ قاتل تجر اور مخلص ترین دوستوں کی سنگت، میڈم شکیلہ کے اغراض و مفادات اپنی جگہ...... لیکن اس کی بے پایاں محبت سے انکار بھی ممکن نہیں۔ اس کے بعد کشکول پڑھی۔ کہانی بہت ہی اچھی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب آپ کی تحریر فاتح بہت ہی اچھی لگی۔ انبیائے کرام کے سلسلے میں ایک اور ایمان افروز تحریر حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ایمان تازہ کیا۔ محفلِ شعر و سخن میں تمام شعر بہت ہی اچھے تھے۔ حاجی زاہد اقبال صاحب کا شعر بہت ہی پسند آیا۔ جاوید راؤ صاحب کا شعر بھی قابلِ داد ہے۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

✠ **محمد جاوید بلوچ،** تحصیل علی پور سے محفل کی زینت بنے ہیں "اگر خدا نہ بھلائے تو شب رنگ گھنیری منتشر زلفوں کے ہالے میں لپٹی گری پڑی کوئی اور نہیں سعدیہ بخاری ہی لگتی ہیں جنہیں ان گنت نایاب قسم کی جوؤں نے گزشتہ 50 کم 100 سال پریشان کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے، لو سعدیہ بخاری کسی کا ادھار چکتا کرنا آپ کی عادت ہے تو ہم وہ دکان دار ہیں جو صنفِ نازک کو ادھار دیے بنا جانے ہی نہیں دیتے۔ وقت صبح صادق کا ہے اور میں نمازِ فجر کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد تاریخ کے جلیل القدر اوراق کا دل کی بھیگی آنکھوں سے مطالعہ کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ سوچ رہا ہوں کہ صلاح الدین ایوبی جیسے عظیم مجاہدین کی عظیم قربانیوں کو اپنی ذات، دولت اور ثروت، عیش و نشاط کی تنگ و دو کی سعی مسلسل مگر بے فائدہ میں مصروف ہو کر کلمہ گو فراموش کر چکے ہیں۔ ہندوؤں، عیسائیوں، یہودیوں کی چیرہ دستیاں فریب کاریاں روزِ اول کی طرح عروج پر ہیں گویا...... تلخ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہماری خس کم جہاں پاک قیادت اور قانون امریکا کے ایک کتے کو بھی سزا دینے کی اہلیت و ہمت نہیں رکھتے۔ یہی کچھ ایم اے راحت نے اپنی ڈگڈگی نامہ یعنی مداری میں قارئین کے گوش گزار کیا ثابت ہوا کہ دنیا کے ہر رشتے چاہے والدین ہی کیوں نہ ہوں میں وفا کا عنصر مفقود ہو سکتا ہے۔ مافوق الفطرت داستانیں رقم کرتے کرتے انوار صاحب کا شر بار قلم عام سے ماحول میں بھی پر اسرار اور ہیبت کا سماں پیدا کر دیتا ہے جہاں پرتاب کی واپسی نے اضطراری کیفیات بڑھائیں، وہاں کشکول کے سب سے پاور فل کریکٹر شیخ حامد کی عدم موجودگی سے تشنگی محسوس ہوئی۔ اثر نعمانی ہم تو ایک اور ایک تین کو گیارہ اور معنی میں لیتے ہیں، ہاہاہا دستِ الٰہی مہربان ہو تو ایک جمع ایک ٹوٹل 4 بھی لگا ہے بگا ہے دیکھنے میں آیا ہے۔ ویل ڈن صفدر حیات، آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ محض قلم کا بوجھ اٹھانے سے مسائل کا تدارک ناممکن ہے، بہترین وویر پا نتائج کے لیے قلم اور قدم لازم و ملزوم ہیں۔ سراب پسند میں چشمِ تخیل سے زمین سے خلا کے پر اسرار پر خطر سفر میں خلا بازی کے ساتھ ساتھ ذہن میں یہ خیال بھی جڑ پکڑتا چلا گیا کہ نئی نئی دنیائیں دریافت کرنے والے بے چارے خلا بازوں کی شیریں ازدواجی حیات کتنی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اشعار کی دل نشیں محفل بزم میں نور العین، جنید احمد ملک اور تفسیر عباس بابر کے تمام اشعار جانِ محفل رہے، دوسروں کے لیے جینے مرنے کا درس دیتی ہوئی قربانی بھی دوسروں کے لیے عامیانہ اسٹوری ہو مگر شاید ہمارے لیے خاص الخاص کہانی ہے۔ ناصر ملک کے دل و دماغ کی انتھک روحانی جدوجہد کا ثمر دل افزا تخلیق مسافر کا اجرا کئی روزہ شدید ترین بخار کی وجہ سے گھونٹ گھونٹ کر آنکھوں سے سہنا پڑا۔ تمام کرداروں پر بھرپور توجہ ہر کردار کا اندازِ سخن و شنید جدا جدا ہماری فطرت نا صبور میں دیوتا کے بعد مسافر ایسی کہانی ہے جسے فراغت کے فارغ لمحات میں چشمِ قلب ڈالنے کی ضرورت چاہت محسوس کرتی ہے۔ مختار آزاد کی بچوں کے حساس دل سوز و گداز جذبات کی صحیح ترجمانی کرتی 364 دن اولاد سے غافل والدین کے لیے مثل شیشہ رہی۔ روداد حضرت یحییٰ علیہ السلام کا دو مرتبہ مطالعہ کیا۔ جنونِ عشق مبالغہ آمیزی سے قطع نظر چشم سیرابی سے پیٹ پوجا یا کوئی اور کام دوجا کا خیال نہ رہا۔ جنونِ عشق کے اختتام نے ابرِ بہار کا کام کیا وہاں آر۔ پی کے ہندو شکل والدین کی مکمل طوطا چشمی نے حزن و ملال کا اثر چھوڑا۔ ہیلو انکل لیٹر چیکر 125 کے جی وزنی بندے کو میرے اوپر لا دو یا؟ قسم سے جوڑ جوڑ فریاد کر رہا ہے، اوکے کہیں پھینک کر سانس لیوا بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرتا ہوں ہاں...... انکل سے یاد آیا راجا تاقب سے اپنا سر کھجوا کھجوا کے ہمایوں سعید کے بال نوچ نوچ کر، بے حد سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں کہ سر آپ آخر ہیں کیا؟ کوئی خال آنٹی کہہ رہا ہے تو کوئی انکل؟ آپ زبر ہیں کہ زیر۔ پلیز ہماری الجھن کو سلجھن میں بدلیے کہ آخر آپ ہیں کیا......؟ بابر عباس ذرا کم بولا کریں ورنہ اہلِ سسپنس آپ پر عورت ہونے کا شک کریں گے۔ تذکرہ فی سبیل کر دیتا اب تشریف جھاڑ کے ہمارے پیچھے نہ پڑ جانا۔ ڈاکٹر وسیم خالد انکل کی مشفقانہ ہدایت پلو سے کس کے باندھ لیں اور روبار غیر سے بھی اپنوں کی محفل میں شمولیت لازمی بنائیں، حیران پریشان سنسان دل خوش و خرم رہا کرو یار یہ کیا ہر وقت پرانی مجبور جیسا منہ بنائے رہتے ہو جس کو دیکھو وہ دکھ کا ماما بننے پر تلا ہوا ہے۔ مرزا طاہر بیگ یہ بچپن سے خوامخواہ کیڑے نکالنے والی عادت ترک کریں، نازو انداز کا شیر علی کو جواب محض لطیف مذاق تھا۔ صاحب فراش ادریس احمد خان خالی دماغ سعدیہ بخاری اور سوری شیطان کا گھر ہوتا ہے لہٰذا کچھ نہ کچھ کرتے رہا کریں۔ تصویر العین عین اگر آپ کا شمار بھی بے بی میں ہوتا ہے تو حکومتِ پاکستان نے حال ہی میں

محبوب وصدت کے لیے صحت مند بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے تحفے تحائف دینے کا پروگرام شروع کیا ہے، آپ بھی مستفید ہو سکتی ہیں۔ ق م سے قتل کی شخصیت اور بن دیکھے ناپ تول کے ماہر ہمایوں راج کثیر الاشاعت ماہا ایمان کی قلمی دشمنی میں ناک ناک دھنسے دکھائی دیے۔ ماہا نامہ عرف ماہا ایمان جھوٹوں بہروپیوں کا بھانڈا اخدا وہاں پھوڑتا ہے جہاں تک ان کی سوچ کی رسائی ناممکن نہیں ہوتی۔"

☸ **چودھری احمد خان**، راولپنڈی سے تشریف لائے ہیں "سسپنس اکتوبر 17،16 کے بجائے 22 تاریخ کو ملا۔ اتنی گرانی میں ادارہ بھی مجبور ہر انسان کے بیوی بچے و گھریلو اخراجات، لیٹر کمپنی کی بے حسی، اضافہ بخوشی قبول، حکمت عملی۔ جون ایلیا، باضمیر کے لیے آپ کے چند الفاظ کافی۔ نیم حکیم خطرہ جان، بے ضمیر دشمن جان۔ وطن میں آگ کے دردناک واقعات اتنے زیادہ، اتفاقیہ یا سازش؟ آپ نے مجھے کرسی صدارت پر بٹھا دیا، میں کہاں اس قابل، ذرہ نوازی کا شکریہ۔ بھائی احمد خان توحیدی، سوغات ساتھ جاب کرنے والے ساتھیوں نے دی تھی۔ بابر عباس، سنسان دل، دیگر ساتھی محفل کی سسٹرز کے نجی حالات میں دخل نہ دیں، نہ عمر معلوم کریں۔ کبیر والا ملتان کے قریب گرم علاقہ کون دستک دے کر سنسان دل کو آباد کرے۔ ڈیم نہ بننے سے بنجر زمین پہلے ہی بہت ہے۔ دونوں محفل میں شریک نہ ہوئیں۔ کیا آپ کا کسی چڑیل سے واسطہ نہ ہے؟ تصویر العین، تفسیر عباس اوکاڑہ، ہمایوں سعید، رانا حبیب، آل عباس کھاریاں کینٹ، ماریہ فاروق، جاوید بلوچ، احمد خان توحیدی، عبدالمالک کے تبصرے اچھے۔ فاتح، میں خود جنرل تاریخ میں ایم اے، بچے والی بات نہیں پڑھی۔ مداری، فرید علی لالچ بری بلا، معصوم بچی المناک موت، قلبی دکھ۔ کشکول، سرفراز خان سے لیاقت حسین کی ملاقات، خوشی کا مقام۔ لیاقت کا دشمن سے ٹکراؤ اور شیخ حامد خاص معرکہ نہ ہوا۔ اشعار، اقبال زرگر، عون عباس، شازیہ گوہر، مرزا طاہر بیگ، کھاریاں کینٹ اچھے اشعار، جلد باز، 364 دن، ایک اور تمین اردو میں زیادہ بہتر ہوتیں۔ منتظر امام غائب ہیں۔ مسافر، شہریار کے گھر کی تباہی، پروین کا نہ ملنا، اسما کے ذریعے سردار حیدر کو شامت میں لانا۔ جنون عشق، آخری صفحات ویری گڈ اسٹوری، عائشہ کو رحمت پرویز کی محبت مل گئی، کیا اسما قادری جاسوسی گرداب والی ہیں؟" (جی ہاں)

☸ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے محفل میں اظہار ناراضی کے ساتھ شریک ہوئی ہیں "کتنے مہینے ہو گئے ہیں کہ میرا خط نہیں چھپ رہا بلکہ اب تو کالی کلوٹی خالہ ردی کی ٹوکری چپ چاپ کھا لیتی ہے۔ انکل میں آپ سے سخت ناراض ہوں (چلو دوستی کر لیتے ہیں) لگتا ہے جیسے ہمایوں سعید راج کی ہونے والی کو یرقان ہوا ہے۔ انکل اور دوستو! ایک راز کی بات بتاؤں، ہمایوں سعید راج پرایا ہو گیا ہے کیونکہ 15 دن پہلے اس کو اپنی پسند مل گئی ہے (مبارکاں بھئی...... مگر تمہیں کیسے معلوم؟) انشائیہ جون ایلیا "حکمت عملی" سرسری طور پر دیکھا۔ دل بہت خفا ہے کہ یہ آج کل کیا ہو رہا ہے، قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اللہ ہمیں عمر فاروق بن خطاب اور عمر بن عبدالعزیز جیسے حکمران عطا کریں۔ اس ملک کے حکمرانوں نے اب تک بجلی لوڈشیڈنگ، گیس لوڈشیڈنگ، مہنگائی کے علاوہ عوام کو دیا کیا ہے۔ اگر سرکاری ملازمین کی تنخواہ میں 20 فیصد اضافہ کرتے ہیں تو مہنگائی 60 فیصد کر دیتے ہیں۔ پہلے 10000 روپے میں گھر کے 8 سے 10 لوگ گزارہ کرتے تھے، اب بیس، تیس ہزار میں میاں بیوی کا گزارہ نہیں ہوتا۔ چودھری احمد خان صاحب ہم آپ کے دکھ میں آپ کے ساتھ ہیں۔ تھوڑے سے بادام ہم پشاور والوں کو بھی بھیجا کریں۔ بابر عباس بھائی، کیا آپ ماہا ایمان کے دماغ میں گھس گئے تھے جو آپ کو پتا چلا کہ وہ عقل سے پیدل ہے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر وسیم خالق کی خوش فہمی کہ حسینہ اس کے لیے پریشان اور بجھی بجھی تھی، بلکہ وہ انتظار میں تھی کہ وسیم کب آئے گا کہ سبزی منڈی سے میرے لیے سبزی خرید کے لائے۔ جاوید بلوچ اس بار آپ کا خط زیادہ متاثر نہیں کر سکا۔ آپ نے بھی طنز کا سہارا لیا۔ عبدالمالک کیف صاحب جم جم آؤ۔ جیسے ہی ڈاکٹر ساجد امجد کے فاتح میں سلطان صلاح الدین ایوبی کا نام دیکھا تو دل خوشی سے ڈانس کرنے لگا (بھئی واہ......) کہانی شروع کی تو رات کے کھانے کا بھی ہوش نہیں رہا اور صلاح الدین ایوبی کی شخصیت کی سحر میں گرفتار ہو گئی۔ ہر مقام پر اپنے مسلمانوں کی غداری کے ہاتھوں نقصان اٹھاتا ہوا کامیاب اور باہمت سپاہی۔ کاش میرے پاکستان کا ہر نوجوان صلاح الدین ایوبی بن جائے۔ دوسرے نمبر پر ایم اے راحت کی مداری پڑھی۔ انسانی جذبوں اور دولت کی لالچ کا انمول نمونہ تھا۔ میرے بھائی شیر علی خان آف خانیوال مجھ سے اس بات پہ خفا ہوں گے کہ آج جمعہ کے دن میں نے ان کو پشاور میرے پاس آنے سے روکا تو اسی وجہ سے روکا تھا کہ میرے بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ آنسو گیس کے دو شیل میرے گھر میں گرے اور گندی سی گیس کے مہلک اثر سے بمشکل بچے ہیں۔ کشکول میں نے آنسو گیس کی وجہ سے بہتے آنسو کے ساتھ پڑھی۔ اورنگزیب ایکشن میں نظر آیا، سراج ہوتی بنا اس کے ساتھ پھر تا رہا۔ ناصر ملک نے واقعی اپنی قلم کاری دکھائی، شہریار بہت تیز دوڑ رہا ہے، بھرپور ایکشن میں نظر آیا۔ میڈم شکیلہ کے ساتھ فائٹ کر کے بتا دیا کہ اب وہ دیہات کا وہ بھولا بھالا شہریار نہیں بلکہ جسمانی طاقت کے ساتھ دماغی قوت اور طاقت بھی استعمال کرتا ہے، ابھی تو میڈم کے حکم پر چلنے والا کھلونا ہے لیکن بہت جلد یہ کھلونا ربوٹ کھلونا بنے گا۔ مختار آزاد کی کہانی 364 دن مغربی طرز زندگی کی تحریر، بہت زبردست۔ ان حالات میں ایک دس سال کا بچہ ایسا ہی سوچ سکتا ہے۔ رضوانہ ساجد کے قلم سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں پڑھا، ایک ایک لفظ موتی کی طرح قیمتی لگا۔ تو یر ریاض کی پہلی بار کچھ خاص نہیں لگی۔ اسما قادری کی کہانی جنون عشق پڑھی، محبت اور پیار کے مختلف روپ پر بہت زبردست کہانی تھی، روح تک سرشار ہو گئی لیکن راج اور اس کی بیوی کملا کی منافقت نے خود ان کو بھی سکون سے نہیں رہنے دیا۔ اس کہانی نے بہت مسرور کیا مجھے۔ عمران حیدر بلوچ اور حسنین بلوچ بھائیو آپ کے لیے دعائیں ہیں کہ دونوں جلد رہا ہو جائیں۔ ماہا ایمان اور دلنشین جی جلد واپس آ جایئے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ یہ دم کٹے مرغے بہت ککڑوں کر رہے ہیں۔"

☸ **ابرار وارث** سندیلیانوالی سے محفل میں آئے ہیں "شمارہ اکتوبر 19 تاریخ کو ایک جان لیوا انتظار کے بعد موصول ہوا۔ ٹائٹل نے کچھ خاص اثر نہیں جمایا۔ محض 10 روپے کی خاطر اپنے اتنے پیارے ڈائجسٹ کو چھوڑ تو نہیں سکتے۔ ستمبر کے مہینے میں کیا کیا طوفان نہیں آئے، میرے ملک میں۔ پتا نہیں یہ ہمارے گناہ کا بدلہ ہے یا کیا ہے۔ ایک طرف لاہور کی فیکٹری میں اور دوسری طرف کراچی کی گارمنٹس فیکٹری میں آگ لگ گئی دل دہل کر رہ گیا کہ آن کی آن میں سیکڑوں لوگ جل کر راکھ ہو گئے۔ اے اللہ ہمیں معاف فرما۔ آقائے دو عالم ﷺ کی شان میں گستاخی کے واقعے پر پوری دنیا کے ممالک کے مسلمانوں نے اس موقعے پر متحد ہو کر اپنے جوش ایمانی کا جو ثبوت دیا ہے وہ ان بدبخت یہودیوں اور امریکیوں کے منہ پر طمانچا ہے۔ ہماری طرف سے چودھری احمد خان کو کرسی صدارت پر مبارکاں وا تو گرا۔ تفسیر عباس اور بابر عباس بھی تھوڑا لکھا کریں۔ دوسرے لوگوں کو بھی آنے دیں، سب کے تبصرے جاندار تھے جن میں ہمایوں سعید، تفسیر بھائی، بابر بھائی، حسن نظامی، رمضان پاشا اور مرزا طاہر الدین بیگ صاحب آپ سب کے تبصرے زبردست تھے۔ صنف نازک صرف دو ایک نئی اور ایک

پرانی۔ ماہا ایمان جی کہاں ہیں؟ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر کی طرف دوڑے۔ لیکن اس دفعہ کہانی کا ٹمپو کچھ سلو تھا سوائے میڈم کے فن کے کہ وہ بھی ایک ماہر لڑاکا عورت نکلی۔ اس کے بعد پڑھی جنون عشق، اسما قادری صاحبہ ویلڈن، آپ نے ایک کہانی میں کئی موضوع چنے جن میں مذہب، عشق، حب الوطنی، جہاد سب کچھ تھا اور بڑے بھرپور طریقے سے اسے اس کے مقام تک پہنچایا، کہانی میں کہیں بھی کوئی جھول نہیں آیا، خاص طور پر رحمت کا خواب مجھے تو کہیں دور لے گیا اور پلکوں کے گوشے بھگو گیا۔ اس کے بعد راحت صاحب کی مداری پڑھی جہاں ایک بیٹی اپنے باپ کے لالچ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اشعار میں سنسان دل کا شعر پسند آیا، و بیگم سنسان جی، خطوط کی محفل میں بھی اور مرزا طاہر الدین کا شعر بھی پسند آیا، باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔"

☸ **ماریہ فاروق**، چمن سے محفل کی زینت بنی ہیں "اس دفعہ رسالہ 60 روپے کا تھا اور معراج انکل نے جو مہنگائی کی لسٹ ہاتھ میں پکڑائی، ہمیں افسوس ہوا۔ اس بات پر نہیں کہ پرچہ کیوں مہنگا ہوا۔ ہمارے حکمران صاحبان جن کے ایک سوٹ کی قیمت 2 لاکھ سے تجاوز کرتی ہے اور ادھر غریب مسلمان 10 روپے کی سوکھی روٹی کے لیے روتے اور ترستے ہیں۔ جہاں انصاف نہیں ہوتا وہاں اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوتا ہے اور یہ قہر ہمارے وطن پر بھی زلزلوں، سیلابوں کی شکل میں نازل ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس مشکل وقت میں نیک اعمال کی توفیق عنایت فرمائے (آمین، ثم آمین) سسپنس سے محبت رکھنے والے پرچے کی مہنگائی کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اب تمام اہل محفل کو سلام اور آنے والی عید مبارک ان ایڈوانس...... ہائے Thanks alot جی کہ میرا خط شائع ہو گیا تھا ماہ اکتوبر میں۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے میرے خط لکھنے کی تعریف کی تھی اور حوصلہ دینے کا بھی شکریہ انکل (خوش رہیے، آپ خط کو سجانے پر بہت محنت کرتی ہیں) اب ذرا محفل کی خبر لیتی ہوں، عبدالمالک کیف بھائی! آپ کا تبصرہ عجیب تھا۔ عمران بھائی، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی عمر کیا ہے؟ زندگی ہے ہی کتنی! آدھی عمر جیل میں گزر رہے اور آدھی پریشانیوں میں، اس سے تو انسان ٹوٹ کے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ساتھ تمام بے گناہ قیدیوں کے دل کی آواز سن لے اور ریاض شاہد کا کیا حال ہے؟ معراج انکل، مسافر کی تیسری قسط جو مجھ سے مس ہوئی تھی آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مسافر کے خلاصے میں فقط تیسری قسط کا خلاصہ دیجیے۔ مسافر کہانی اسی قسط کی وجہ سے اسٹارٹ نہیں کی تھی اور ہر طرف سے اس کہانی کی تعریفیں سن کے مجھ سے مزید صبر نہیں ہو گا اور پلیز تیسری قسط یعنی ماہ مئی کا خلاصہ ہی پرچے میں شائع کیجیے گا (خلاصے میں یہ ضرور شامل ہو گا لیکن بہت مختصر تاہم آپ رسالہ منگوانے کے بعد رسالے میں دیے گئے نمبر پر رابطہ کر سکتی ہیں، یہ نمبر آپ کو سالانہ خریداری کے اشتہار میں مل جائے گا) تمام کہانیاں اچھی تھیں خاص کر آخری صفحات کی کہانی اچھی لگی ہے۔ کاشف زبیر کی ہر کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ باقی رسالہ بھی دلچسپ اور تفریح آمیز تھا۔"

☸ **ساجدہ راجا**، ہنڈواں، سرگودھا سے تشریف لائی ہیں "اس بار اکتوبر کا سسپنس بہت ڈھونڈنے کے باوجود بھی نہیں مل سکا جس کا بہت افسوس ہے، نزدیکی قصبے سے جہاں سے پہلے ملتا تھا وہاں سے پتا کروایا انہوں نے کہا کہ دو تین دن میں آئے گا اور جب چند دن بعد معلوم کیا تو فرمایا کہ جو آئے تھے وہ سیل ہو گئے ہیں، دوسرے دن کزن کو سرگودھا دوڑایا، وہاں سے بھی نہ مل سکا۔ دل تو چاہا کہ اتنا روؤں اتنا روؤں کہ بس...... پھر سوچا آخری چانس لینے میں کیا حرج ہے، سسپنس میں خط لکھتی ہوں، ہو سکتا ہے کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ مجھے بھجوا ہی دے۔ مدیرہ آنٹی، پلیز آپ مجھے اکتوبر کا شمارہ بھجوا دیں۔ پیسے بھجوا دوں گی، اگر آپ کے پاس Shortage ہے تو پھر قارئین میں سے کسی سے کہیں کہ مجھے سسپنس بھجوا دیں ان کے پاس تو ہو گا کیونکہ میں مسافر کی ایک قسط بھی نہیں چھوڑ سکتی اور ویسے بھی اکتوبر کا پورا شمارہ میں کیسے چھوڑ دوں۔ پرانی ہیروئنوں کی طرح ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہنا پڑے گا...... نہیں؟ مدیرہ جی آپ پلیز کچھ کریں، مجھے اکتوبر کا سسپنس ہر حال میں چاہیے۔ تو کیا میں امید رکھوں کہ مجھے اکتوبر کا شمارہ ملے گا؟" (پیوستہ رہیں شجر سے...... سسپنس کے لیے پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔)

☸ **ماہا ایمان**، پنجاب سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں "سب سے پہلے تمام پڑھنے والوں کو میری طرف سے عیدالاضحی کی پیشگی مبارک باد۔ چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر خدمت ہوں، غیر حاضری اس لیے ضروری تھی کہ ہماری ہر ماہ کی حاضری نے ہماری قدر گھٹا دی تھی جبھی تو ہمارا تبصرہ غائب ہو رہا تھا (یہاں آپ نے اندازہ لگانے میں بہت غلطی کی ہے جناب) سو سوچا کہ تھوڑا بریک لے کر دوسروں کو موقع دیا جائے لیکن اہل محفل ہماری معصوم سی سوچ پر مشتمل غیر حاضری کو ہمارا فرار قرار دے رہے تھے (ایسا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں) ابھی ابھی جنوبی افریقہ سے پاکستان کو میچ جتوا کے اٹھی ہوں اپنی دعاؤں کی بدولت، سو بہت خوش ہوں۔ غموں کی بات کروں تو پچھلے دنوں سانحہ بلدیہ ٹاؤن کی صورت بہت بڑے غم سے واسطہ پڑا جس پر ہر حساس دل دکھی ہے، تمام مرنے والوں کے لیے دعائے مغفرت کرنے کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے پیارے نبی پاک ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے ملعون کو دنیا میں ہی عبرت کا نشان بنائے، آمین۔ اداریے میں مہنگائی میں اضافے کے ساتھ ڈائجسٹ کی قیمت میں اضافے کی خبر بھی سنائی گئی ہے جو ہمیں بادل نخواستہ منظور ہے کہ ہم عاشقانِ سسپنس کو سسپنس ہر قیمت پر چاہیے (شکریہ) آپ کے خط میں کشمکش عروج پر ہے جو یقیناً ازل سے ابد تک جاری رہے گی۔ سب اپنے اپنے بدلے چکا رہے ہیں (اسی میں تو کشش ہے) ٹائٹل پر تبصرہ اس لیے نہیں کیا کہ ٹائٹل بہت ہی بکواس تھا۔ پہلے نمبر پر براجمان چودھری احمد خان کا بابر عباس کو دیا جانے والا مشورہ بہت اچھا لگا۔ بابر انکل یا دو اموں کے ساتھ منہ کی بھی کھائیں۔ احمد خان توحیدی آپ کا تبصرہ مجھے ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ تفسیر انکل عمر تو آپ کی چھیڑ ہی بن گئی ہے، ہمیں عمر رسیدہ کہہ کر آپ کو حوصلہ ملتا ہے تو یہی سہی، ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا، انکل کا اتنا احترام تو ہمیں کرنا ہی چاہیے۔ سنسان دل بھائی سمجھا کرو، ماہا ایمان کے تذکرے کے بغیر سب اپنے تبصرے کو ادھورا سمجھتے ہیں، اسی لیے میری عمر کا تذکرہ لے بیٹھتے ہیں۔ مرزا طاہر الدین صاحب، آپ کے زریں خیالات سونے میں تولنے کے قابل ہیں۔ عبدالمالک کیف یہاں اکثریت ڈھیٹوں کی ہے مجھ سمیت، سو اپنے ہی بھائی بہنوں میں آئے ہو۔ ہمایوں سعید صاحب اطلاعاً عرض ہے کہ نفع نقصان دیکھ کر کاروبار کیے جاتے ہیں، محبت نہیں۔ ہر کوئی ظاہر پہ فدا ہونے والا نہیں ہوتا اور اگر تمہیں کوئی گنوں کی پوری مل گئی تو تم کس کا کندھا ڈھونڈو گے؟ اور بات کروں گی اس خط کی جس کی وجہ سے آج اپنی بہت سی مصروفیات پس پشت ڈال کے میں یہ تبصرہ لکھ رہی ہوں یعنی طاہر یوسف زئی کا۔ طاہر بھائی اینڈ شبانہ آپ کے لیے میری بہت سی بیسٹ وشز ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کے سیر حاصل تبصرے کی طرف۔ مسافر میں شہریار نے گل و گلزار سے راہ پر خار کی طرف سفر شروع کر دیا ہے۔ بہت اچھا ٹوئسٹ آیا ہے۔ کشکول بھی ایک دم سپر فاسٹ جاری رہی ہے۔ شیخ حامد کی خوب دھنائی ہو رہی ہے۔ اورنگزیب کا بدلنا بھی یقیناً معنی خیز ہوگا۔ لیاقت حسین کا کردار بہت منفرد ہے جو دنیا میں انسانیت کی حرمت باقی رہنے کی دلیل ہے۔ ماضی کا آئینہ ہمیں ایک فاتح کی فتوحات سے روشناس کروا

گیا۔ سلطان صلاح الدین کے ساتھ ساتھ عماد الدین اور محسن اسلام نور الدین زنگی کے بارے میں بھی علم میں اضافہ ہوا۔ مختصر تحریر مداری میں منشی فرید علی اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں جا گرے۔ میرے فیورٹ کاشف زبیر کی سراب پسند تھرل سے بھرپور تھی۔ جوناتھن کلارک کا آخری فیصلہ مجھے بھی پسند آیا۔ آخری تحریر اسماء کی جنون عشق حسن، نزاکت، خوشبو، خوابوں اور جذبوں کی جنون خیزیوں کا خوب صورت امتزاج تھی۔ ملک سفدر حیات کی پیش منظر جگت ماموں کے زخمی ہونے سے شروع ہوئی اور شرمیلی کے اغوا میں ملوث اس کے چچا کے قتل پر اختتام پذیر ہوئی۔ حضرت یحییٰؑ کے ساتھ ساتھ حضرت مریم کے حالات و مشکلات کا احوال مفصل انداز میں پڑھنے کو ملا، دوسرے حصے کا انتظار ہے۔ محفل شعر و سخن میں احتشام احسان کا شعر قابل غور ہے۔ معروفیات کی وجہ سے آج کل وقت کی شدید کمی کا شکار ہوں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

⊕ **ادریس احمد خان** ناظم آباد، کراچی سے چلے آرہے ہیں ''اکتوبر کا سسپنس کافی تاخیر سے ملا۔ گارمنٹ فیکٹری میں آتشزدگی کی وجہ سے ڈھائی تین سو لوگوں کی جانیں چلی گئیں، اللہ ان سب شہید ہونے والوں کی مغفرت کرے اور زخمیوں کو جلد سے جلد صحت و تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ سرورق کو تعریفی نگاہوں سے سراہتے ہوئے حکمت و دانش سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد اپنی اور سب کی محفل میں حاضری دی۔ چودھری احمد خان کو مبارکباد۔ محفل میں اپنا خط بھی نظر آیا، شکریہ۔ تفسیر عباس صاحب، بابر عباس صاحب، تصویر العین، سعید راج میرے لیے پرخلوص نیک تمناؤں و دعاؤں کا بہت شکریہ۔ جیسے ہی توانائی مل گئی ہو۔ محفل سے نکل کر خوب صورت کہانی مسافر کے ساتھ قدم سے قدم ملاتے ہوئے مقررہ مسافت طے کی۔ اس کے بعد کشکول پڑھنا شروع کی اس کی دلچسپی میں بھی ایسا کھوئے کہ قسط ختم ہوگئی۔ کشکول بھی اپنے انداز میں اچھی چل رہی ہے۔ شیخ حامد کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد تاریخ کے جھروکوں سے ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر فاتح پڑھی، سلطان زنگی اور صلاح الدین ایوبی جیسے بہادر سپہ سالاروں کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ صلاح الدین ایوبی کے نام سے صلیبیوں کے دل کانپتے تھے۔ ان سالاروں نے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں، آج امت مسلمہ کو اس کڑے وقت پر پھر کسی صلاح الدین ایوبی کی ضرورت ہے۔ ایم اے راحت کی تحریر مداری ان کی کہنہ مشقی کی دلیل تھی، لالچ بری بلا ہے منشی جی نے بیشک اپنے گھر والوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہی غبن کیا مگر برا کام بھی برا ہی ہے۔ جلد باز میں جلد بازی کی وجہ سے ریڈ مین پھنس گیا۔ ایک اور ایک تین اثر نعمانی کی اچھی کہانی تھی، سراب پسند سائنس فکشن پر مشتمل تھی۔ محفل شعر و سخن میں شعروں کا انتخاب اچھا تھا۔ قربانی اور 364 دن بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ روح پرور تحریر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات نے روح کو تازگی دی۔ پہلی بار، اچھی کہانی تھی۔ بینک کی کیشیئر نے ایسی باتیں کیں جس کی وجہ سے جرم کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔ جنون عشق اسما قادری کی آخری صفحات کی خوب صورت ترین کہانی تھی، ایمان کے راستے پر چلنے والوں کو اپنی منزل ضرور ملتی ہے، اگر وہ یقین کامل کے ساتھ راہ میں قدم بڑھائے۔''

⊕ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ہمارا سسپنس مقررہ تاریخ سے چھ روز کی تاخیر سے بازار میں پہنچا، یہ شکایت نہیں اطلاع ہے، ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی ہوگا۔ باعث یہی ہوگا کہ دام بڑھانے کی مشاورت ہو رہی تھی۔ آخر کار فیصلہ 60 روپے پر ہوا، سر تسلیم خم! (شکریہ، آپ نے ہماری مجبوری کو سمجھا) اس بار بھی سرورق پر کہانی کے ایک کردار کی شبیہ بنی ہوئی ہے یعنی مسافر کی میڈم شکیلہ۔ جون ایلیا کی حکمت عملی پسند ہی آئی۔ اس دفعہ کشکول اور مسافر میں سسپنس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خطوط کی محفل میں اول آنے والے چودھری احمد خان کو مبارکباد۔ تفسیر عباس بابر آپ نے میرے تبصرے کو پسند فرمایا شکریہ۔ بھائی بابر عباس آپ نے میرے تبصرے پر کسی بھابی کا ذکر کیا ہے، کون سی بھابی، کہاں کی بھابی، بھائی میں تو غیر شادی ہوں (تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے) محترمہ تصویر العین صاحبہ شکریہ کہ آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا۔ علی پور والے جاوید بلوچ بھائی آپ کو کوئی کوزہ نہیں ملا جو میرے تبصرے کو لوٹے میں سمویا۔ فاتح، یہ تاریخ کی وہ مشہور و معروف کہانی ہے جو 80 فیصد لوگوں کو ازبر ہے۔ زیر نظر کہانی میں کوئی اندرونی واقعہ بھی بیان نہیں کیا جو کہ ساجد صاحب کا خاصا ہے، چنانچہ یہ کہانی مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔ مداری میں سچ جھوٹ کا پتا نہیں چلا (آپ کہانی دوبارہ پڑھیں) قربانی کافی متاثر کن تھی۔ ایک اور ایک تین، کہانی میں خوب لطف آیا۔ عنوان بھی ندرت لیے ہوئے تھا۔ حسام بٹ صاحب پچھلی بار پس منظر سے روشناس کرایا تھا اور اب پیش منظر لائے ہیں اور کیا خوب لائے ہیں۔ سراب پسند، یہ ایک طویل و عریض سائنسی گپ تھی ویسے کہانی میں مزہ آگیا۔ 364 دن اس بار بچوں کے لیے بھی ایک شاندار کہانی موجود ہے۔ پہلی بار، بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز کہانی تھی۔ جنون عشق میں روی پرشاد نے آر۔ پی کی آڑ میں زندگی گزاری، آخر کار یہ آر۔ پی رحمت پرویز میں تبدیل ہوگیا۔ ویسے آر۔ پی تو میں بھی ہوں، یعنی رمضان پاشا۔''

⊕ **عباسہ مغل**، ڈنگہ، ضلع گجرات سے پہلی بار محفل میں شرکت کر رہی ہیں ''ویسے تو میں عرصہ 5 سال سے جاسوسی اور سسپنس کی قاری ہوں مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں (خوش آمدید) اکتوبر کا شمارہ 20 ستمبر کو ملا۔ سب سے پہلے ٹائٹل حسینہ کو دیکھا جو اپنے عاشق زار کے غیر نمایاں سے خاکے سے گھبرائے لیتی تھی۔ انشائیہ پر جون ایلیا کی محفل عام و خاص میں پہنچے جہاں وہ ہمیں سیاست کے رنگ دکھا رہے تھے، سب سے پہلے مداری پڑھی جو کہ اس ماہ کی سب سے اچھی کہانیوں میں سے ایک تھی، ماں باپ چاہے تو اولاد کا بھلا ہی ہیں مگر وہ کیسا بھلا جس میں اولاد کی خوشی شامل نہ ہو۔ 364 دن اور جنون عشق اس ماہ کی سب سے اچھی اور سبق آموز کہانیاں تھیں۔ حضرت یحییٰ پڑھ کر ہمیں آخرت کے بارے میں سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ ایمان افروز کہانی تھی، اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ چودھری صاحب کو مبارکباد کہ کرسی صدارت پر فائز ہوئے۔ محفل میں ماما ایمان کا خط شامل نہیں تھا کہیں وہ صنف کرخت کو جوابات دے دے کر تنگ تو نہیں آگئیں؟ ماما جی اگر آپ کہیں پردہ پوش ہوگئی ہیں تو واپس آجائیں (لوجی واپس آگئیں) ہمیں آپ کے خط بہت پسند ہیں۔ انکل جی محفل میں لیڈیز کو بھی ہونا چاہیے۔ ویسے بھی لیڈیز فرسٹ ہوتی ہیں مگر آپ تو انہیں بیک میں ڈال دیتے ہیں (ایسی بات نہیں ہے، ہم بھی مرد اور خواتین کی برابری کے حامی ہیں، ہماری کوشش ہوتی ہے تمام ساتھیوں کے خطوط شامل کیے جائیں) اہل کراچی کے دکھ میں ہم سب شریک ہیں۔'' (خط لکھنے کا شکریہ مگر کہانیوں پر تبصرہ کہاں ہے محترمہ!)

⊕ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اکتوبر کا شمارہ غیر معمولی تاخیر کے ساتھ موصول ہوا۔ سرورق پر سوائے نکیے کے کچھ بھی ایسا نہ تھا کہ بطور خاص دیکھا جاتا۔ جون ایلیا سیاست کے فنکاروں سے مغز ماری کرتے نظر آئے۔ امریکا میں بنائی جانے والی گستاخانہ فلم نے تمام مسلمانوں کے جذبات کو بری طرح مجروح کیا، عوام نے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا، کئی جانوں کا زیاں اور کروڑوں کی املاک کی تباہی ہوئی۔ کیا اسلامی تعلیم پر عمل تھا؟ درست طریقہ تو یہ ہے کہ او آئی سی کے پلیٹ فارم سے اس گستاخانہ فلم کے خلاف ٹھوس لائحہ عمل اپنایا جائے تاکہ ایسا واقعہ پھر کبھی پیش نہ آئے۔ اداریہ میں سسپنس کی قیمت میں اضافہ کی خبر نے مہنگائی میں اضافہ کو کوسنے پر مجبور کردیا۔ کرسی صدارت پر چودھری احمد خان اپنی دوسری کوشش میں ہی قبضہ جمانے میں کامیاب ہوگئے۔ یقیناً یہ ان باداموں اور اخروٹوں کا کمال ہے جو وہ مفت میں بھی بانٹتے رہتے ہیں، آپ کے ساتھیوں کی وفات کا افسوس ہوا، اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ احمد خان توحیدی! آپ کا خط پڑھا تو چودھری احمد خان کے خط کا جڑواں بھائی لگا۔ کبھی فون پر رابطے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ خط ہی ایک دوسرے کا کاپی کرلیں۔ تفسیر عباس بھی کڑوی کسیلی زنبیل کے ساتھ حاضر تھے اور ماما کی غیر موجودگی کا غصہ ان کی صنف پہ اتار رہے تھے۔ سنسان دل، کبیر والا! اپنے اندر کی ویرانی کم کرنے کے لیے آپ نے خوب غل غپاڑا کیا، کچھ افاقہ ہوا؟ تصویر العین تبصرہ کرنے سے پہلے کچھ پڑھ بھی لیا کریں، کس دوست کی ٹانگ کھینچتے نظر آئے ہم آپ کو؟ رانا حبیب الرحمٰن! جناب ہم آپ کے لیے اور سب اسیران کے لیے دعاگو رہتے ہیں۔ ہمایوں سعید! یار ہم نے تو انٹرنیٹ کا حوالہ دیا تھا کبھی دماغ بھی استعمال کرلیا کریں اور صنف خوامخواہ کی تھوڑی خوشامد کیا کریں۔ جعفر حسین، بھوانہ! بھئی آپ کہاں غائب ہیں۔ انوار صدیقی کی کشکول سب سے پہلے پڑھی، کہانی میں تیزی سے پیش رفت جاری ہے۔ اورنگ زیب کی سراج سے بھی خفیہ کارروائی اور شبنم کی کسی کو ہوا تک سمجھ نہیں آئی۔ مسافر کا سفر بھی جاری ہے۔ میڈم شکیلہ کی حد سے زیادہ مہربانیاں اور اس پر شہریار کی پھرتیاں قابل دید ہیں۔ پروین کا غیاب ابھی تک معما بنا ہوا ہے۔ میڈم اور شہریار کا دشمن کی زد میں آجانا تجسس بھڑکا گیا ہے، اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ جنون عشق اسما قادری کی خوب صورت تحریر تھی، حمزہ کی لاحاصل محبت پر افسردہ ہوئے تو عائشہ اور آر۔ پی کے ملن کی خوشی بھی ہوئی۔ راج پرشاد اور کملا کی خود غرضی پر غصہ آیا۔ اپنے مقصد کے لیے مسلمان والدین کا بچہ پال تو لیا لیکن جب اس نے اپنی شناخت پانے کی کوشش کی تو دونوں برسوں کے تعلق کو فراموش کرکے اپنی دنیاؤں میں گم ہوگئے۔ کہانی کے جس جملے نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھا، یہ کیسے ممکن ہے کہ جس کے انتظار میں وہ دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھی تھی وہ اس دنیا میں ہی نہیں رہا۔ مختار آزاد 364 دن درآمد کرکے لائے، رینالڈ کی بے بسی نے افسردہ کردیا۔ رینالڈ نے باپ کے ساتھ وقت گزارنے کا جو طریقہ اپنایا وہ اس کی بے پناہ محبت کا اظہار بن گیا۔ کاشف زبیر کی سراب پسند سائنس فکشن اسٹوری تھی۔ جوناتھن نے ایک رمیلا کی ڈمی کے حصول کے لیے ''محبت اور جنگ میں سب جائز ہے'' کا اصول اپنایا۔ اثر نعمانی کی ایک اور ایک تین، میاں بیوی کی بے وفائی کی روایتی کہانی تھی۔ ایم اے راحت، مداری کے ساتھ تشریف لائے اور سب کو نچا کر رکھ دیا۔ عائشہ کی کیفیت بالکل فطری تھی، انسان جن لوگوں کو اپنا ماں باپ سمجھ کے رہ رہا ہو، ان سے محبت کرتا ہو اور یکدم پتا چلے کہ وہ اس کے اور وہ ان کا کچھ بھی نہیں تو یقیناً قیامت ہی ہوگی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے فاتح تحریر کرکے ماضی کی سیر کرائی۔ منظر نگاری اور الفاظ کا انتخاب بہترین تھا۔ ساجدہ راجا کی کترن بہت پسند آئی۔ جنید احمد ملک، سنسان دل اور قاری محمد رمضان حسرت کے اشعار کا انتخاب بہترین رہا۔''

⊕ **بلال اصغر**، اڈا شجن، چنیوٹ سے چلے آرہے ہیں ''پہلی دفعہ سسپنس میں شرکت کا شرف حاصل کر رہا ہوں (خوش آمدید) سرورق انتہائی دیدہ زیب تھا۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ طویل داستان مسافر پڑھی جس میں ہمارے معاشرے کے جاگیردارانہ نظام کے ساتھ ساتھ محکمہ پولیس کی کارستانیوں کی نہایت خوب صورتی سے عکاسی کی گئی ہے۔ کشکول ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جو اپنی نیک فطرت اور ایمانداری کے باعث اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی اچھی قوت حاصل کر چکا ہے جو مظالم اور برائیوں کے سامنے انتہائی مضبوط دیوار کی مانند کھڑی ہو جاتی ہے اور ان کا قلع قمع کرکے دم لیتی ہے۔ شیخ حامد کو پے در پے نقصانات پہنچا کر میڈم روبی نے اس پر اپنی دماغی برتری ثابت کردی ہے۔ تاریخی داستان میں سندھ میں اسلام کی آمد سے قبل کے واقعات اور راجاؤں کے حالات زندگی پڑھ کر علم میں گراں قدر اضافہ ہوا۔''

⊕ **تصویر العین**، اوکاڑہ سٹی سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں ''میرے تمام دوستوں کو عید الاضحی کی دل سے مبارکباد قبول ہو۔ میری دل سے دعا ہے کہ میرا رب اس ذلیل گستاخ رسول کو جس نے وہ ناپاک مووی بنانے کی جسارت کی ہے، جلد از جلد دردناک عذاب سے دوچار کرے لیکن پاکستان میں جس طرح لوگوں نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا، وہ ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکر انکل ٹائٹل اچھا تھا مگر کبھی دوشیزہ کی چار کے علاوہ چھ یا آٹھ چوڑیاں بھی بنا دیا کریں۔ اداریہ ہمیں سسپنس کی قیمت میں ہونے والے اضافے کا اعلان کرتا نظر آیا۔ سب سے پہلے چودھری اے خاں سے سامنا ہوا۔ مبارک ہو، بے شک پچھلی بار آپ کا نام بلیک لسٹ میں تھا مگر اس کا انعام آپ کو یہ ملا۔ تفسیر عباس بھائی، کیا بھابی آپ کا خط پڑھتی ہیں اگر ہاں تو جتنی آپ ٹائٹل گرل کی تعریف کرتے ہیں وہ کچھ کہتی نہیں آپ کو؟ بابر عباس خدا آپ کو جلد صحت یاب کرے۔ ڈاکٹر وسیم خالق آپ نے مس کیا اور ہم حاضر ہوگئے۔ یہ رابطہ ٹوٹنے نہ پائے۔ یہ کس کا سنسان دل ہے جو کبیر والا سے تشریف لایا ہے اور جو ایک ٹکٹ میں دو دو مزے بھی کر رہا ہے۔ ادریس احمد خان اگر ٹائٹل گرل سج دھج کر کسی کے انتظار میں موجود ہے تو آپ کو کیا تکلیف ہے؟ حافظ شاہد عمران خدا آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو جلد رہائی نصیب فرمائے، آمین۔ رانا حبیب الرحمٰن آپ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں وہ آپ کی ضرور مدد کرے گا اور آپ کو جلد ہی رہائی نصیب فرمائے گا۔ پھر آپ نہ صرف 14 اگست بلکہ ہر تہوار کو دل سے منائیں گے اور پیاری اجالا کو ہماری طرف سے بہت بہت سالگرہ مبارک ہو۔ محمد جاوید بلوچ آپ کو کس کی جدائی مار گئی ہے جو آتی ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھر کر محفل کا ماحول سرد کر رہے ہیں؟ عبدالمالک کیف، آپ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ چکنا گھڑا ہوں۔ کشکول میں شبنم کے اغوا کا ڈراما مجھے اورنگ زیب کا ہی رچایا ہوا لگتا ہے۔ مسافر میں شہریار جس مقصد کے لیے میڈم کے پاس آیا تھا وہ تو پورا ہوتا نظر نہیں آرہا۔ اس کی بہن کا تو کچھ اتا پتا ہی نہیں ہے۔ جنون عشق اسما قادری سے نہایت معذرت کے ساتھ کہ کہانی جہاں شروع ہوئی تھی وہیں ختم ہوگئی سوائے اس کے کہ آر۔ پی مسلمان ہوگیا۔ تنویر ریاض کی پہلی بار، اچھی کہانی تھی۔ کیشیئر نے واقعی ریکس کو بینک نہ لوٹنے اور محنت کرکے کمانے کا طریقہ اچھے انداز میں بتایا۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر نعیم اکبر، مانسہرہ۔ جویریہ نعیم، مانسہرہ۔ نصیر ماموں، راولپنڈی۔ ...... طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ احسان سحر، میانوالی۔ احمد خان توحیدی، کراچی۔ ساحر علی، سوہاوہ۔ ناظم بخاری، لودھراں۔ فائزہ اکبر، جھنگ۔ ارشد عباس، حافظ آباد

فاتح

ڈاکٹر ساجد امجد

بے رحم وقت نے ہمیشہ اپنی بساط پر بہت عجیب چالیں چلی ہیں... یہ اور بات کہ اس کے چال چلن کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ جیسے زیرِ نظر اس تحریر میں... جس لختِ جگر کی پیدائش کو باپ نے اپنے لیے منحوس قرار دیا، بالآخر وہی صلیبی جنگوں کا ہیرو بن کر تاریخ کے اوراق پر آج بھی زندہ ہے... بہ ظاہر صلیبی جنگوں کی بنیاد عیسائی عقیدے کو قرار دیُ جاتا ہے مگر درحقیقت اس نظریے کی آگ پر مال و دولت کے لالچ نے ایسا تیل چھڑکا کہ عیسایت کی تعلیمات مفلسی کے ہاتھوں پس پشت چلی گئیں کیونکہ مشرق کی خوش حالی مغرب کی افلاس زدہ قوم کو منظور نہ تھی۔ ان جنگوں میں تاریخ کے مطابق چالیس ہزار مسلمانوں کو بے رحمی سے قتل کرکے یروشلم پر قبضہ کرلیا گیا... اور پھر خاموشی کی چادر نے ہر زبان پر چپ کی مہر لگا دی۔ وقت کے قدموں نے پھر جنبش کی اور وہی منحوس بچہ جب سلطان صلاح الدین ایوبی کے پیراہن میں سامنے آیا تو اس کی دانش نے جنگی بساط کو ہر مقام پر پلٹ کر رکھ دیا... وقت نے اپنا چولا بدلا اور صلاح الدین ایوبی کے پیروں تلے فتح و کامیابی کی راہ بن کر بچھ گیا... سلطان نے بھی مقصد برآوری کے لیے عقل و شعور کی منازل طے کرتے ہوئے ایسا چلن اختیار کیا کہ دشمن کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں کیونکہ اس بار مقدر مسلمانوں پر مہربان تھا... اور تاریخ مسلمانوں کے کارناموں کو رقم کرنے کے لیے بے چین...

عیسائی بحری بیڑا ساحل پر آیا تو یہاں بھی کسی سپاہی کا نام و نشان نہیں تھا۔ چند پرندے پانی پینے آئے ہوئے تھے جو انہیں دیکھ کر اڑ گئے تھے۔ عیسائی خوشی سے چیخنے چلانے لگے۔

"صلاح الدین کے جاسوس شاید سو رہے تھے کہ انہیں خبر ہی نہیں ہوئی اور ہم یہاں تک آ گئے۔" عیسائی سالار نے خوش خبری دی۔

"بے چارے کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ دیر سے آنکھ کھلی ہوگی۔ بس آتا ہی ہوگا۔" کسی نے تمسخر اڑایا۔

عیسائیوں کے دس ہزار سپاہی ساحل پر اترے اور بے خوف ہوکر آگے بڑھنے لگے۔ شہر کی فصیل آ گئی اور راستے میں کوئی انہیں روکنے والا نہیں ملا تھا۔ عیسائی سالار کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔

"کوئی محاذِ جنگ ایسا تو نہیں ہوتا جیسا یہ ہے۔ کہیں ہم کسی خطرے سے دوچار ہونے تو نہیں جا رہے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو رک جانے کے لیے کہا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ کوئی خوشبو اس نے سونگھ لی تھی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ یہیں سے واپس ہوا جائے۔ بس یہی وقت تھا کہ صلاح الدین کے فوجی خندقوں سے نکل آئے اور عیسائیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ عیسائیوں پر یہ افتاد اچانک ٹوٹی تھی۔ فرار ہونے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ انہوں نے بھی مقابلہ شروع کر دیا لیکن نہ صفیں تھیں نہ کوئی طریقۂ کار۔ تاریخ کہتی ہے آٹھ ہزار عیسائی قتل ہوگئے اور باقی گرفتار ہوئے۔ ان کے بحری بیڑے بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے۔ یہ ایسی شکست تھی جسے عیسائیوں نے عرصۂ دراز تک یاد رکھا۔

اس شکست نے شاہِ یروشلم کو تقریباً نیم پاگل کر دیا۔ اسے یروشلم ہاتھ سے جاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ چند روز کے بعد اس کی حالت سنبھلی تو اس کے شیطانی دماغ نے اسے ایک اور راستہ دکھایا۔ شمس الدین ابن مقدم ابھی تک اس کی مٹھی میں تھا۔ شاہ یروشلم نے اسے مشورہ دیا کہ وہ "شام" کی خودمختاری کا اعلان کر دے۔ اپنے آپ کو سلطنتِ نوریہ کی غلامی سے نکال لے۔

"میری فوجیں وہاں تمہاری حفاظت کے لیے رہیں گی۔ اس کے بعد دوسرے مسلمان علاقے بھی تمہارے تصرف میں آجائیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی شہنشاہ نے یروشلم میں جبری بھرتی

کا قانون رائج کردیا تاکہ آئندہ کے لیے عیسائی فوج تیار کی جائے۔

صلاح الدین نے شمس الدین کی خودمختاری کی خبر سنی تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ وہ رو رو کر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اپنی فریاد پہنچانے لگا۔

”پروردگار! مسلمانوں کی حمیت کو کیا ہوگیا ہے۔ عیسائیت کا سیلاب مسلمانوں کی طرف امڈا چلا آرہا ہے اور یہ میرے ہاتھ مضبوط کرنے کے بجائے مجھے کمزور کررہے ہیں۔ مجھے ان جھمیلوں سے فرصت ملے تو میں بیت المقدس کو نجات دلاؤں۔ میرے خدا میری مدد فرما۔“

اب ٹھہرنے اور تماشا دیکھنے کا مقام نہیں تھا۔ اسلامی مقبوضات خطرے میں تھیں۔ اس کا بڑا بھائی توران شاہ یمن میں تھا۔ اس کی طرف خط بھیجا کہ سب کام چھوڑو اور شام کی طرف روانہ ہوجاؤ۔ چھوٹے بھائی سیف الدین کو مصر میں چھوڑا اور فوج کا آدھا حصہ لے کر شام کی طرف روانہ ہوگیا۔

صلاح الدین شام کے نواح میں پہنچا تو سازش کھل کر سامنے آگئی۔ اس کے مقابلے پر شامی فوج تھی اور اس کی پشت پر دس ہزار صلیبی لشکر موجود تھا۔

عجیب وقت تھا۔ مسلمان اپنی مدد کے لیے صلیبیوں کو ساتھ لائے تھے۔ وہ نور الدین زنگی جو زندگی بھر عیسائیوں کے خلاف جہاد کرتا رہا، اس کے امیر عیسائیوں کی پشت پناہی میں آئے تھے۔

دونوں لشکر آمنے سامنے آئے تو عجیب معجزہ رونما ہوا۔ شامی فوج شمس الدین کا ساتھ چھوڑ کر صلاح الدین سے آکر مل گئی۔ شمس الدین کے ساتھ دو تین سو سے زیادہ سپاہی نہیں رہ گئے تھے۔ جب عیسائیوں نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ صلح کے طالب ہوئے۔ صلاح الدین اتنے طیش میں تھا کہ اس نے عیسائی سفیر کی پوری بات بھی نہیں سنی اور اس سے کہہ دیا کہ اب ہمارے تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔

سفیر کے رخصت ہوتے ہی صلاح الدین نے اپنی فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ عیسائیوں کا حوصلہ پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ کچھ دیر دفاعی جنگ لڑتے رہے اور پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شمس الدین عیسائی سالار گرانٹ کے ساتھ بانیاس کے علاقے کی طرف بھاگ گیا۔

گرانٹ کا خیال تھا کہ صلاح الدین شام کی طرف لوٹ جائے گا لیکن وہ تعاقب کرتا ہوا بانیاس کی حدود میں داخل ہوگیا۔

گرانٹ اب کمزور نہیں تھا۔ جو فوج شکست کھا کر اس کے ساتھ چلی آئی تھی، اس کے علاوہ بانیاس میں موجود فوج بھی اس کے ساتھ تھی۔ اسے عددی برتری حاصل تھی۔ وہ مقابلے پر ڈٹ گیا۔ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا لیکن صلاح الدین کی دعائیں کام آگئیں۔ صبح جنگ شروع ہوئی تھی اور غروب آفتاب تک فیصلہ ہوگیا۔

ہزاروں عیسائی لقمۂ اجل بن گئے۔ رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر سالار گرانٹ فرار ہوگیا۔ بچا کھچا لشکر بھی فرار ہوگیا۔ شمس الدین بھی اس کے ساتھ ہی بھاگا تھا۔

بانیاس پر صلاح الدین ایوبی کا قبضہ ہوگیا۔

صلاح الدین کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ معرکہ آرائی میں مشغول رہے۔ ابھی وہ بانیاس سے واپس بھی نہیں آیا تھا کہ موصل سے خبر آگئی۔ سلطان زنگی کے حقیقی بھتیجے والی موصل سیف الدین نے ”جزیرہ“ پر قبضہ کرلیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنی خودمختاری کا اعلان بھی کردیا تھا۔

اس سے بھی زیادہ بری خبر یہ تھی کہ اس کے سالے ملک الصالح نے جو اس وقت دمشق کا والی تھا، شراب نوشی شروع کردی تھی۔ وہ جب ”تخت“ پر بیٹھا تھا تو گیارہ سال کا معصوم لڑکا تھا۔ ایک امیر گمشت گین کو اس کا نگراں بنایا تھا۔ اس نے دمشق پر قبضہ کرنے کی نیت سے ملک الصالح کو شراب پر لگادیا اور انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

دمشق کے حالات اتنے دگرگوں ہوگئے تھے کہ اس نے والی موصل سے نمٹنے کے بجائے دمشق جانے کی ضرورت محسوس کی۔

صلاح الدین نے لشکر سنبھالا اور دمشق پہنچ گیا۔ اہل دمشق نے صلاح الدین کا پرجوش خیر مقدم کیا اور اس کے لیے شہر کے دروازے کھول دیے۔

گمشت گین ہر وقت خوفزدہ رہتا تھا کہ صلاح الدین کب نازل ہوجائے لہٰذا وہ ملک الصالح کو لے کر حلب کی طرف چلا گیا۔ یہاں باطنی فرقے کے لوگوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ گمشت گین بھی خفیہ طور پر اسی عقیدے سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا خود کو وہاں محفوظ سمجھتا تھا۔

دمشق پہنچتے ہی صلاح الدین نے تمام انتظامات اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اس کے بعد اس نے ملک الصالح کو گمشت گین کی گرفت سے چھڑانے کے لیے کوششوں کا آغاز کردیا۔ اس نے ایک دردناک خط ملک الصالح کی

خدمت میں روانہ کیا جس میں اس سے درخواست کی تھی کہ وہ دمشق آجائے۔

گمشت گین اور دوسرے امراء نے اسے صلاح الدین ایوبی کی فریب کاری قرار دیا اور ملک الصالح کو یہ باور کرایا کہ وہ اسے دھوکے سے بلا کر قتل کرنا چاہتا ہے۔

ملک الصالح کی طرف سے اس خط کا جواب یہ دیا گیا کہ صلاح الدین دمشق سے چلا جائے تو وہ آسکتا ہے یا صلاح الدین تن تنہا اس سے آکر ملے۔

صلاح الدین کے نامہ نگاروں نے خبر پہنچائی کہ شاہ یروشلم اموری جہنم رسید ہوا۔ کسی کی موت خوشی کی خبر نہیں ہوتی لیکن اس خبر سے صلاح الدین کو خوشی ہوئی تھی۔ اموری نہایت متعصب بادشاہ تھا۔ اس نے مسلمانوں کا جینا حرام کردیا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے مسلمان ریاستیں ہمیشہ خطرے میں تھیں۔

اس کی یہ خوشی اس وقت عارضی ثابت ہوئی جب اگلے ہی دن وقائع نگاروں نے یہ اطلاع دی کہ ریمنڈ کو یروشلم کا بادشاہ بنادیا گیا ہے۔ ریمنڈ، اموری سے بھی زیادہ سفاک اور متعصب تھا۔ ماضی میں کبھی اس نے سلطان زنگی کی قید میں آٹھ سال گزارے تھے۔ یہ داغ بھی اس کے سینے پر تھا اور وہ مسلمانوں کا بدترین دشمن بن گیا تھا۔

اموری کا بیٹا بالڈون چہارم تھا لیکن بچپن ہی سے کوڑھ کا مریض تھا۔ وہ اموری کی موت کے وقت گیارہ سال کا تھا لیکن اپنے مرض کی وجہ سے الگ کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ ہرگز تخت نشینی کے قابل نہیں تھا۔ اسی لیے ریمنڈ کو بالڈون کا وارث بنا کر تخت پر بٹھادیا گیا تھا۔

ان خبروں نے صلاح الدین کو اتنا سراسیمہ کردیا کہ صرف ایک ہزار جانبازوں کا دستہ لے کر شام کی طرف روانہ ہوگیا اور راستے کے قلعوں کو فتح کرتا ہوا حلب کے سامنے پہنچ گیا اور ایک بلند جگہ پر پڑاؤ کرلیا۔

گمشت گین اور ملک الصالح کو صلاح الدین کی پیش قدمی کی اطلاعات برابر مل رہی تھیں۔ گمشت گین اس یورش کو روکنے کے لیے سرگرم عمل ہوگیا۔ اس نے باطنی فرقے کے سربراہ قرمطہ سے ملاقات کی۔ باطنی پہلے ہی صلاح الدین کے خلاف تھے کیونکہ اس نے مصر میں باطنیوں کا قلع قمع کردیا تھا اور اب وہ حلب اور شام تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

گمشت گین نے قرمطہ سے کہا کہ تمہیں تمہارے عقیدے پر چلنے کی مکمل آزادی ہوگی۔ اس کے صلے میں تم

یہ کرو کہ جب صلاح الدین حملہ کرے تو تم ہماری طرف سے لڑو۔

قرمطہ نے اس آزادی کے بدلے مدد کا وعدہ کرلیا۔ مصیبت یہ ہوئی کہ گمشت گین جب ملک الصالح سے ملا تو اسے خوش کرنے کے لیے یہ بھی کہہ دیا۔ ”آپ فکر نہ کریں جو پابندیاں ہٹائی گئی ہیں مطلب نکل جانے کے بعد دوبارہ لگا دی جائیں گی۔“

وہ جو کہتے ہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ قرمطہ کو ان باتوں کی خبر ہوگئی۔ اس نے سوچا اس وقت کو جو آزادی مل رہی ہے وہ لے لے۔ وقت آنے پر وہ اس کا جواب دے گا۔

گمشت گین اور ملک الصالح دونوں سمجھ رہے تھے کہ صلاح الدین حلب پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کرے گا لیکن صلاح الدین نے بے مثال جرأت کا مظاہرہ کیا اور صرف سات سو سپاہیوں کو ہمراہ لے کر حلب کا محاصرہ کرلیا۔

اب گمشت گین کو فکر لاحق ہوئی کہ مقابلے کے لیے کیسے نکلے جبکہ دوسری طرف ملک الصالح کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

قرمطہ کی طرف سے بھی صاف جواب مل گیا۔

”جب آپ مطلب نکل جانے کے بعد ہم پر دوبارہ پابندیاں عائد کرنے والے ہیں تو ہم آپ کی خاطر اپنی جانوں کو خطرے میں کیوں ڈالیں؟“

”اگر وہ حلب میں داخل ہوگیا؟“

”وہ بھی ہم پر پابندیاں ہی لگائے گا اور کیا کرے گا۔“ قرمطہ نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ ”حکومت تو آپ کی جائے گی۔“

محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ اہل شہر میں بے چینی پھیل رہی تھی اور کوئی صلاح الدین کا مقابلہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس موقعے پر ملک الصالح نے صلح کا مشورہ دیا جسے گمشت گین نے اسے ملک الصالح کی شان کے منافی کہہ کر ٹھکرا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ صلاح الدین اس صلح کے بدلے میں کیا شرائط رکھے گا۔

اب اس کے منافق ذہن نے وہ ترکیب سوچی جو واقعی سلطان زنگی کے بیٹے کے شایان شان نہیں تھی۔ سلطان زندگی بھر عیسائیوں سے جہاد کرتا رہا تھا اور اب اس کے جانشین عیسائیوں کو اپنی مدد کے لیے بلا رہے تھے۔

گمشت گین نے ریمنڈ سے سودا طے کیا۔ ”اگر ریمنڈ صلاح الدین کو محاصرہ اٹھا کر جانے پر مجبور کردے یا اسے شکست دے کر بھگا دے تو اسے بھاری رقم دی جائے گی۔“

”بھاری رقم نہیں۔ مجھے ڈیڑھ لاکھ دینار دینے کا وعدہ کرو۔“ ریمنڈ نے کہا۔

”مجھے منظور ہے۔“ گمشت گین نے سودا پکا کرلیا۔

ڈیڑھ لاکھ دینار اس نے اس لیے طلب کیے تھے کہ اس نے آٹھ سال سلطان زنگی کی قید میں گزار کر اتنی ہی رقم کے عوض رہائی حاصل کی تھی۔

اس سودے کا علم تو صلاح الدین کو اس وقت ہوا جب اس کے نام ریمنڈ کا خط آیا۔ اس میں صلاح الدین کو دھمکی دی گئی تھی کہ وہ حلب کا محاصرہ اٹھا کر چلا جائے ورنہ میں حلب والوں کے ساتھ ہوں۔ گمشت گین اور ملک الصالح کو یہ امید نہیں تھی کہ ریمنڈ کے خط کا ایسا اثر ہوگا۔ وہ تو بس یہ دیکھ رہے تھے کہ صلاح الدین محاصرہ اٹھا کر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔

صلاح الدین نے محاصرہ اٹھایا اور دمشق کی طرف چل دیا لیکن پھر اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ وہ ایک طویل چکر کاٹ کر انطاکیہ کی طرف جا رہا ہے۔ انطاکیہ اس وقت مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ سب حیران تھے کہ وہ انطاکیہ کیوں جا رہا ہے۔ سب نہ جانتے ہوں مگر وہ جانتا تھا کہ ریمنڈ شرارت سے باز نہیں آئے گا۔ وہ ”حمص“ کی طرف ضرور بڑھے گا اور اس مسلم علاقے کو اپنے قبضے میں کرے گا کیونکہ اس کے جاسوسوں نے اطلاع دے دی ہوگی کہ حمص کے دفاعی انتظامات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اس کا یہ اندازہ غلط نہیں نکلا۔ صلاح الدین ابھی انطاکیہ پہنچا ہی تھا کہ ریمنڈ ”حمص“ پہنچ گیا۔ یہاں کے نگران نے بھاگ کر قلعے میں پناہ لے لی۔

ریمنڈ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صلاح الدین انطاکیہ میں ہے جو ”حمص“ کے بہت قریب ہے۔ اس کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب صلاح الدین اس کے سر پر پہنچ گیا۔

ریمنڈ نے چند گھنٹوں تک مقابلہ کیا اور پھر سیکڑوں عیسائیوں کی لاشیں اپنے پیچھے چھوڑ کر فرار ہوگیا۔

صلاح الدین نے اب وہ سفر اختیار کیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ ریمنڈ کو بھگانے کے بعد پلٹا اور ایک مرتبہ پھر حلب کا محاصرہ کرلیا۔ گمشت گین نے دیکھا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ریمنڈ سے کیا کہہ سکتا تھا۔ کیا اتنی ہی رقم پھر ادا کرتا اور اسے پھر بلاتا؟

ملک الصالح سخت برافروختہ تھا۔ اس کا سارا غصہ

گمشت گین پر اتر رہا تھا۔ دوران گفتگو دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوگئی۔ ملک الصالح نے اس کانٹے کو نکال پھینکنا ہی مناسب سمجھا اور اسے قتل کرا دیا۔ اب ملک الصالح اپنے عزائم پورے کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اس نے صلاح الدین ایوبی کو غیر مشروط صلح کی پیش کش کردی۔ صلاح الدین کو اس کی بات کا یقین نہیں تھا لیکن یہ سوچ کر درخواست منظور بھی کرلی کہ اس صلح کے بعد اسے موقع مل جائے گا کہ وہ ملک الصالح کو خوشامدی امرا سے نجات دلا دے۔ شاید اسے یہ بھی معلوم ہوگیا ہو کہ گمشت گین کو قتل کرا دیا گیا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک اور امیر قطب الدین، ملک الصالح کے اعصاب پر سوار ہوگیا ہے اور اب وہ آئندہ اس امیر کے کہنے کے مطابق عمل کرتا رہے گا۔

صلاح الدین نے حلب سے محاصرہ اٹھایا اور دمشق واپس چلا گیا۔

ملک الصالح کی چال کامیاب ہوگئی تھی۔ وہ فوراً والی موصل سیف الدین کے پاس پہنچا اور اسے صلاح الدین سے صلح کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

”یہ صلح تو میں نے محاصرہ اٹھوانے کے لیے کی تھی۔ میں جب چاہوں اسے ٹکڑے کرکے ہوا میں بکھیر سکتا ہوں۔“

”تو پھر ہم متحد ہوکر صلاح الدین کا سر کچل دیں گے۔ تم حلب واپس چلے جاؤ اور اپنی فوج کو ”حماہ“ کے قلعے میں پہنچا دو۔ میں صلاح الدین کو یہاں بلواتا ہوں۔“

ملک الصالح رخصت ہوا تو سیف الدین نے صلاح الدین کے گرد دوستی کا جال بچھایا۔

”میں آپ کو ہمیشہ غلام زادہ کہتا رہا ہوں۔ مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ یہ میری غلطی تھی۔ آپ مسلمانوں کے اتحاد کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ موصل آئیں تاکہ آپ کی تجاویز پر عمل پیرا ہونے کی گفتگو کی جاسکے۔“

حلب اور موصل کے بیس ہزار فوجی قلعۂ حماہ میں پہنچا دیے گئے۔

صلاح الدین نے سیف الدین کے خط کے جواب میں اپنے پانچ ہزار جانبازوں کو ساتھ لیا اور دمشق سے نکل گیا۔

ملک الصالح حلب میں تھا اور اس کی فوج سیف الدین کے ساتھ قلعۂ حماہ میں تھی۔

صلاح الدین جب سفر کرتا ہوا ”حماہ“ کے نزدیک پہنچا تو سیف الدین اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ سے باہر نکل آیا۔

صلاح الدین کے ساتھ صرف پانچ ہزار کا لشکر تھا۔ حماہ کا صحرا یہ منظر بڑے دکھ سے دیکھ رہا تھا کہ صلاح الدین ایوبی کو یروشلم کے عیسائیوں سے نبرد آزما ہونے کے بجائے مسلمانوں سے لڑنا پڑ رہا ہے۔ صلاح الدین نے لشکر کشی کا حکم دیا۔ حلب اور موصل کا مشترکہ لشکر بھی جنگ کے نقارے بجاتا ہوا آگے بڑھا۔

عددی برتری اتنی تھی کہ سیف الدین فتح کے نشے میں چور تھا۔ اس کے سپاہی بھی ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے لیکن دو گھنٹے کی جنگ کے بعد ہی شکست کے آثار نظر آنے لگے۔ سیف الدین کے عیش پرست سپاہی اپنے ساتھیوں کو قتل ہوتا دیکھ کر ایسے خوف زدہ ہوئے کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بہت سے گرفتار ہوئے۔

”حماہ“ پر قبضہ کرنے کے بعد صلاح الدین ایڈیسہ کے قلعے کی جانب بڑھا۔ یہ قلعہ ملک الصالح کے زیر نگیں تھا۔ موصل پر قبضہ کرنے کے لیے ایڈیسہ پر قبضہ ضروری تھا۔ صلاح الدین نے ایڈیسہ کا محاصرہ کرلیا اور ایک ماہ کی کوششوں کے بعد ایڈیسہ پر اس کا قبضہ ہوگیا۔

صلاح الدین ایوبی تمام مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع کرنے کے لیے کوشاں تھا، دوسری جانب سیف الدین جیسا کوتاہ اندیش صلاح الدین کی کوششوں پر پانی پھیرنے کے لیے شاہ یروشلم سے اتحاد کرنے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا۔ شاہ یروشلم ریمنڈ نے اس شرط پر اتحاد کا دم بھرا کہ دمشق اس کے حوالے کر دیا جائے۔

سیف الدین کو اس شرط کے ماننے میں تامل ضرور تھا لیکن یہ سوچ کر اس بے ہودہ شرط کو ماننے کے لیے تیار بھی ہوگیا کہ دمشق پر صلیبیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد ”موصل“ محفوظ ہو جائے گا۔

سیف الدین نے ملک الصالح کو بھی آمادہ کرلیا کہ دمشق پر ریمنڈ کا قبضہ ہو جانے دے۔

ملک الصالح، سیف الدین اور ریمنڈ کے درمیان اتحاد ثلاثہ قائم ہوگیا۔ صلاح الدین اس رشتۂ اتحاد سے قطعی لاعلم تھا۔ اسے تو اس وقت معلوم ہوا جب اس اتحاد ثلاثہ نے ریمنڈ کی نگرانی میں ”رملہ“ پر قبضہ کرلیا اور دمشق کی طرف جانے والی سڑک پر اپنی چوکی بھی قائم کردی۔

جب تک صلاح الدین اپنی سپاہ کو لے کر مصر سے

نکلتا، ریمنڈ نے قلعۂ یعقوب بھی فتح کرلیا جو دریائے اردن سے قریب تھا اور جنگی نقطۂ نظر سے نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ یہ علاقہ باہمی رضامندی سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے ایک خصوصی دستے کے درمیان تقسیم تھا۔ یہ دستہ ”فرنیکس“ کہلاتا تھا۔ اس فرنیکس نے اس درخت کو کٹوا دیا جو دونوں قوموں کی سرحدوں کو تقسیم کرتا تھا۔

صلاح الدین نے ریمنڈ کو خط لکھا کہ یہ فیصلہ تو جنگ کے بعد ہی ہوتا ہے کہ کس کی سرحد کہاں تک ہے۔ آپ نے یہ جسارت جنگ سے پہلے کیسے کرلی؟

ریمنڈ نے جواب دیا۔ ”میں جنگ سے پہلے ہی بااختیار ہوچکا ہوں۔“

اس تحقیر آمیز جواب کے بعد صلاح الدین کے پاس ریمنڈ کا غرور خاک میں ملانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اسے ”قلعۂ یعقوب“ کو ریمنڈ کے ہاتھوں سے نکالنا تھا لیکن وہ سیدھا قلعۂ یعقوب نہیں گیا بلکہ دھوکا دینے کے لیے ایک اور مقام کی طرف چلا گیا لیکن ریمنڈ کے جاسوسوں نے ریمنڈ کو خبردار کردیا۔ وہ بھی ایک مقام مصیاف پر پہنچ گیا۔ یہ ایسا بلند مقام تھا کہ یہاں سے صلاح الدین ایوبی کے فوجی خیمے صاف نظر آرہے تھے۔ یہاں جنگ تو کیا ہوتی ایک بلوہ سا ہوگیا۔ ریمنڈ کے ایک فوجی دستے نے طاقت کے نشے میں چور ہوکر صلاح الدین کے خیموں پر حملہ کردیا۔ صلاح الدین کے فوجی اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی ایک بڑی تعداد بے حواس ہوکر ایک طرف کو بھاگ نکلی۔ عیسائیوں نے ان بھاگنے والوں کا تعاقب شروع کردیا۔ صلاح الدین کی جنگی مہارت نے عجیب کام کر دکھایا۔ اس نے اپنے باقی فوجیوں کو تعاقب کرنے والوں کے پیچھے بھگادیا۔ تنگ گھاٹیوں سے گزرنے کے بعد عیسائیوں نے پلٹ کر دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ صلاح الدین کی فوج ریمنڈ سے الجھ رہی ہوگی۔ وہ تعاقب چھوڑ کر واپس پلٹے۔ آگے بھاگنے والے مسلمانوں نے جب دیکھا کہ تعاقب کرنے والے واپسی کے لیے پلٹ گئے ہیں اور ان کی نظر اپنے ساتھیوں پر پڑی تو وہ بھی پلٹ آئے، اب عیسائی دونوں کے درمیان میں تھے اور ”کھاؤں کدھر کی چوٹ، بچاؤں کدھر کی چوٹ“ والا معاملہ تھا۔ بس چند ہی گھنٹوں میں فیصلہ ہوگیا۔ ہزاروں قتل ہوئے، سیکڑوں گرفتار ہوگئے۔ کچھ ایسے خوش نصیب بھی تھے کہ فرار ہونے میں کامیاب ہوکر ”صیدون“ چلے گئے۔

صلاح الدین نے ایک لمحے کے لیے بھی آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا اور قلعۂ یعقوب کی طرف بڑھا جو اس وقت فرنیکس کے قبضے میں تھا۔ وہ کسی کوفت کا خیال کیے بغیر فتح کا جشن منارہے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے پھریرے اڑتے ہوئے دیکھے تو قلعے کے دروازے بند کرلیے۔ انہیں یقین تھا کہ محاصرہ طول پکڑے گا اور اس وقت تک ریمنڈ ان کی مدد کو پہنچ ہی جائے گا۔

صلاح الدین نے محاصرہ کرلیا۔ اس کے جنگی ماہرین نے فصیل کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر فصیل کی بنیادیں کھودی جائیں تو فصیل کو گرایا جاسکتا ہے۔ فصیل کے گرد خندقیں کھودی جانے لگیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی، دو دن کی محنت شاقہ کے بعد بنیادیں نظر آنے لگیں۔

قلعۂ یعقوب کا ایک حصہ زمیں بوس ہوگیا۔

صلاح الدین کی فوج اندر داخل ہوگئی۔ فرنیکس کی کل تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تو اس امید پر قلعہ بند ہوئے تھے کہ ریمنڈ کی فوج ان کی مدد کو آجائے گی لیکن وہ نہیں پہنچ سکی۔ فرنیکس نے ہتھیار ڈال دیے لیکن یہ پہلا موقع تھا جب صلاح الدین نے انہیں قیدی بنانے کے بجائے سب کو قتل کرادیا۔

قلعۂ یعقوب کو ڈھادیا گیا اور ساز و سامان کو آگ لگادی گئی۔

صلاح الدین دمشق چلا گیا۔

ریمنڈ اپنی فوج لے کر فرنیکس کی مدد کے لیے پہنچا تو قلعۂ یعقوب کی جگہ پتھروں کا ڈھیر تھا جس سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

اس عظیم شکست کا صدمہ ریمنڈ سے زیادہ والی موصل کو ہوا۔ وہ شراب کا عادی تو تھا ہی، اس خبر کو سن کر ایسا دکھ پہنچا کہ شراب پینے بیٹھ گیا اور اس وقت تک پیتا رہا جب تک بے ہوش نہیں ہوگیا۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

اس کے انتقال کے بعد اس کا چھوٹا بھائی عزالدین مسعود تخت پر بیٹھا۔ صلاح الدین یہ توقع کررہا تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی سے مختلف ثابت ہوگا لیکن اس کی روش بھی وہی رہی جو سیف الدین کی تھی۔

☆☆☆

صلاح الدین ایوبی اپنے سادہ مگر پروقار دربار میں مسند نشیں تھا کہ یروشلم کی طرف سے ایک قاصد دربار میں حاضر ہوا اور شاہ یروشلم کی جانب سے صلح کی پیش کش کی۔ یہ درخواست اتنی غیر متوقع تھی کہ صلاح الدین حیرت زدہ رہ

گیا۔ وہ اسے سیاسی چال کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتا تھا لیکن اسے مان لینے میں کوئی حرج نہیں تھا کیونکہ صلاح الدین حلب اور موصل کے درمیان ابھی تک پھنسا ہوا تھا۔ اس صلح کے ذریعے اتحادِ ثلاثہ سے بھی نجات مل سکتی تھی۔ صلاح الدین نے شرائط نامہ تیار کیا اور قاصد کے حوالے کردیا۔

شرائط اتنی سخت تھیں کہ صلاح الدین کے خیال میں ریمنڈ کے لیے ان کا تسلیم کرنا محال تھا۔ کچھ دن بعد یروشلم کا قاصد واپس آیا تو صلاح الدین کو یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ ریمنڈ نے تمام شرائط من و عن تسلیم کرلی تھیں۔

اس معاہدے میں طے پایا تھا کہ دو سال تک عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوگی اور وہ سمندری علاقے جن پر صلاح الدین قبضہ کرچکا ہے اسی کے قبضے میں رہیں گے۔

فرانس کا بادشاہ لوئیس ہفتم انتقال کرچکا تھا اور اس کی جگہ فلپ آگسٹس تخت نشیں ہوا تھا جو خالص دنیادار اور عیش پرست تھا۔ اسے صلیبی جنگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ شاہ یروشلم کی مالی معاونت کے لیے تیار نہیں ہورہا تھا۔

شاہِ قسطنطنیہ بھی مرچکا تھا اور اس کا جانشین بھی عیسائیوں کے معاملات سے سروکار نہیں رکھتا تھا۔ ان دونوں طرف سے مایوس ہونے کے بعد شاہ یروشلم صلح پر مجبور ہوگیا تھا۔ یہ صلح ایک پردہ تھی۔ اسے دراصل عارضی مہلت درکار تھی جو اسے مل گئی۔

☆☆☆

یروشلم کا حقیقی بادشاہ بالڈون چہارم جو کوڑھ کی وجہ سے اپنے بستر پر پڑا رہتا تھا اس وقت بھی اپنے زخموں سے رستے ہوئے پانی کو چھپائے بستر پر پڑا تھا۔ اس کے پاس کوئی آتا بھی گوارا نہیں کرتا تھا لیکن سالار آٹرس سے ملنے کے لیے طرابلس سے یروشلم آگیا تھا اور اس وقت اس کے کمرے میں تھا۔

”کیا آپ کے علم میں ہے کہ ریمنڈ نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کرلی ہے۔ آپ کے علم میں ہو یا نہ ہو لیکن یہی حقیقت ہے۔ میں اس صلح کے حق میں نہیں۔ یہ اپنے دشمن کو مہلت دینے کے مترادف ہے۔ اب آپ مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں۔ میں وہ تلوار آپ کے قدموں میں رکھنے آیا ہوں جس سے میں مسلمانوں کے خلاف لڑتا رہا ہوں۔“

آٹرس کا تعلق اس عیسائی دستے سے تھا جنہیں فرنیکس کہا جاتا تھا۔ آٹرس اس دستے کا سالار تھا۔ یہ لوگ جہاں عیسائیوں کو ضرورت ہوتی تھی بلا لیے جاتے تھے۔

بالڈون فرنیکس آٹرس کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

”صلح نامے کے پرزے۔“

”یہی ہوگا۔“

بالڈون نے طلب کیا اور ریمنڈ کمرے میں داخل ہوا۔ آٹرس کو وہاں دیکھ کر تمام معاملہ اس کی سمجھ میں آگیا تھا لیکن بہ ظاہر بے خبر بنا رہا۔ بالڈون نے اسے معاہدے اور آٹرس کی مخالفت کے بارے میں بتایا۔

”میں نے عیسائیوں کے مفاد میں اس غلطی کا ارتکاب کرلیا ہے۔ اگر آٹرس کو اعتراض ہے تو میں یہ صلح نامہ منسوخ کردوں گا۔“

”آپ صرف منسوخ نہیں کریں گے بلکہ معاہدے کے ٹکڑے کرکے صلاح الدین کے دربار میں بھیجیں گے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ اس معاہدے کے ٹکڑے کرکے صلاح الدین کے پاس مصر بھیج دیے گئے۔

سالار آٹرس کو فتح کا ذائقہ نصیب ہوا تھا لیکن ریمنڈ کی شکست تھی۔

”صلاح الدین! میں اس وقت بے بس ہوں لیکن بہت جلد تیرا دمشق میرے قبضے میں ہوگا۔“

اس نے عالم دیوانگی میں یہ الفاظ ادا کردیے تھے لیکن دل ہی دل میں خائف بھی تھا کہ معاہدہ توڑنے کی پاداش میں نہ جانے صلاح الدین کا ردعمل کیا ہو۔ وہ اسی الجھن میں تھا کہ امید کی ایک کرن نظر آگئی۔ سیف الدین کے جانشین عزالدین مسعود کا خط اس کے پاس آیا جس میں اس نے سیف الدین کے نقش قدم پر چلنے اور ریمنڈ سے دوستی برقرار رکھنے کا عہد کیا تھا۔ ریمنڈ نے اس خط کا مثبت جواب دیا لیکن اب وہ ”اتحادِ ثلاثہ“ کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے لکھ بھیجا کہ اگر تم ”موصل“ کی حفاظت چاہتے ہو تو ایک لاکھ دینار مجھے ادا کرتے رہو میں تمہیں صلاح الدین سے بچالوں گا۔

یہ ایک شرمناک تحریر تھی۔ عزالدین نے اپنے امرا کا اجلاس طلب کیا اور ایک نئی بحث کا آغاز ہوگیا۔

☆☆☆

سالار آٹرس، ریمنڈ کو نیچا دکھانے کے بعد طرابلس میں آرام کے دن گزار رہا تھا کہ ایک خوفناک خبر نے اس کے ہوش اڑادیے۔ اسے خبر ملی کہ صلاح الدین ایوبی کا بحری بیڑا ”طرطوسہ“ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

طرطوسہ فرنگیس کا مرکز تھا۔ اسے نقصان پہنچنے کا مطلب فرنگیس کی بربادی تھا۔ اس نے دس ہزار کا لشکر ساتھ لیا اور طرطوسہ پہنچ گیا۔

صلاح الدین اپنے ساتھ ایک ہزار سے زیادہ تیرانداز لایا تھا جنہوں نے بڑی تعداد میں عیسائیوں کے گھوڑوں کو ہلاک یا زخمی کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔

سالار آٹرس زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔

سالار آٹرس کی گرفتاری ایک ایسا کارنامہ تھا جس نے عیسائی دنیا کو اپنے بال نوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ صلاح الدین اب ایسی پوزیشن میں تھا کہ تمام عیسائیوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے۔

آرمینیا، طرابلس اور یروشلم کے سفیر طرطوسہ پہنچے اور آٹرس کی رہائی کے لیے مذاکرات کا آغاز ہو گیا۔ صلاح الدین نے شرط رکھ دی کہ تمام عیسائی ریاستیں مل کر سالار آٹرس کے فدیے اور تاوان جنگ کے طور پر تیس لاکھ دینار ادا کریں گے۔

صلاح الدین کے مطالبات مان لیے گئے۔

آرمینیا، طرابلس، الجزیرہ، موصل، حلب اور یروشلم کے حکمراں ''سمیساط'' کے مقام پر جمع ہوئے۔ یہاں انہیں صلاح الدین کے ساتھ مذاکرات کر کے ایک نیا صلح نامہ تیار کرنا تھا۔

صلاح الدین ایوبی کی یہ بڑی کامیابی تھی۔ عیسائیوں کے تمام اہم مراکز کے حکمران صلاح الدین کے سامنے شرمندگی کا طوق گلے میں ڈالے حاضر تھے۔

طویل مذاکرات ہوتے رہے۔ تلخ و ترش باتوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ ریمنڈ نے صلاح الدین سے معافی مانگی تھی۔ اس کا معذرت نامہ پڑھ کر سنایا گیا۔

صلاح الدین طرطوسہ واپس پہنچا۔ چند روز بعد شاہ آرمینیا تیس لاکھ دینار لے کر پہنچ گیا جس کے عوض آٹرس کی رہائی عمل میں آئی۔

اس رہائی کے کچھ دن بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ ڈوڈی فرنگیس کا نیا سپہ سالار بنا۔ اب دیگر جنگوں میں یہی ڈوڈی صلاح الدین کے مقابل آنے والا تھا۔

آٹرس کی وفات صلاح الدین کے لیے خوشی کا باعث ضرور تھی لیکن ہر خوشی کے پیچھے ایک غم بھی چھپا ہوتا ہے۔ آٹرس کی وفات کے ساتھ ہی یہ خبر پہنچ گئی کہ سلطان ملک الصالح کا انتقال ہو گیا۔

صلاح الدین پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے حکم دیا کہ سات دن تک دربار آراستہ نہ کیا جائے۔ اس کی یہ حالت بعض امرا کے لیے باعث حیرت تھی۔ دشمن کا اتنا غم!

بعض امرا نے تو اس سے کہہ بھی دیا۔ ''سلطان صالح ہمیشہ مسلمانوں کا دشمن بنا رہا اور آپ ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم اس کا سوگ منائیں۔''

صلاح الدین نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''ملک الصالح میرے محسن کا بیٹا تھا۔ یہ سوگ میں اپنے آقا سلطان زنگی کے لیے منا رہا ہوں۔''

ملک الصالح کے مرتے ہی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئیں۔ والی موصل، الجزیرہ کے ساتھ ساتھ ''حلب'' کا بھی بلا شرکت غیرے مالک بن گیا۔

دوسری تبدیلی یہ آئی کہ ریجنالڈ حلب کی قید سے آزاد ہو کر ''کرک'' پہنچا اور مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔

عزالدین نے صلاح الدین کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا۔ اب صلاح الدین چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے قسم کھائی کہ وہ حلب پر قبضہ کر لے گا اور اس کے بعد موصل پر چڑھائی کرے گا تاکہ ان سے پیچھا چھڑایا جائے جو مسلمانوں کے نام پر دھبا ہیں۔ اس کے بعد وہ عیسائیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے گا۔

مصر میں ہونے والی ان سرگرمیوں کی خبر عزالدین والی موصل کو پہنچی تو اس نے ''حلب'' کا حاکم اپنے بھائی عماد الدین کو بنا دیا تاکہ صلاح الدین، عزالدین کی دشمنی میں حلب پر چڑھائی نہ کرے۔

صلاح الدین نے حسب عادت والی موصل اور والی حلب عماد الدین کے نام خطوط تحریر کیے اور انہیں ان کی ذمے داریاں یاد دلائیں۔ ''اگر تم اپنی اصلاح کر لو تو میرا تعاون تمہارے ساتھ ہے۔''

دونوں طرف سے صاف جواب آ گیا کہ فیصلہ شمشیر سے ہو گا۔

عماد الدین نے یہ دھمکی دے ضرور دی تھی لیکن وہ صلاح الدین سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ بھیک مانگنے آرمینیا پہنچ گیا اور شاہ آرمینیا سے مدد کا طالب ہوا۔

''آپ ہمارے اتحادی ہیں۔ آپ ہمیں صلاح

الدین کے خطرے سے نجات دلائیں۔''

''کھل کر کہو۔ کیا مدد چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں آپ اور شاہ یروشلم اپنی کچھ فوج میری مدد کے لیے حلب بھیج دیں۔''

''شاہ یروشلم اس وقت اپنے بکھیڑوں میں گھرے ہوئے ہیں البتہ شاہ طرابلس سے بات کی جا سکتی ہے۔'' عماد الدین اس پر بھی تیار ہو گیا۔

اس ملاقات کے بعد عیسائیوں میں ایک نئی سیاست کا آغاز ہو گیا۔ شاہ طرابلس نے آرمینیا کا خفیہ دورہ کیا۔ فرنگیس کا نیا سالار ڈوڈی بھی اس کے ساتھ تھا۔ سالار ڈوڈی نے اس مدد کے صلے میں دمشق اور شام کے کچھ علاقے طلب کیے اور حیرت انگیز طور پر عماد الدین نے یہ شرط قبول کر لی، حالانکہ ان علاقوں میں عیسائیوں کی موجودگی سے خود حلب کو خطرہ تھا۔

والی مصر صلاح الدین ایوبی حلب کی جانب بڑھ رہا تھا۔ حلب تک پہنچنے کے لیے مضبوط قلعہ عمید حائل تھا۔ صلاح الدین نے اس کا محاصرہ کر لیا۔

یہ خبر عماد الدین کے لیے پریشان کن تھی۔ اگر صلاح الدین قلعۂ عمید فتح کر لیتا ہے تو حلب کتنی دور ہے۔ اس نے اپنے ہرکارے دمشق کی طرف دوڑا دیے۔ یہاں اس وقت سالار ڈوڈی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دمشق کے نواحی علاقوں میں موجود تھا۔

عماد الدین مطمئن تھا کہ ڈوڈی کے آتے ہی صلاح الدین سے نمٹ لے گا لیکن عماد الدین کے ہرکارے خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ ڈوڈی نے معذرت کر لی تھی۔ وہ اس امید پر تھا کہ صلاح الدین اگر حلب میں الجھا رہا تو دمشق اس کی مٹھی میں ہے۔

ڈوڈی کی طرف سے یہ صاف جواب مل جانے کے بعد عماد الدین پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس کے عیاش امرا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میدان جنگ میں جا کر اپنا خون بہاتے۔

عماد الدین چیخ چیخ کر اپنے امرا کی غیرت کو للکار رہا تھا لیکن یہ شاطر کسی نہ کسی بہانے سے اسے مطمئن کر دیتے تھے۔

قلعۂ عمید کے اندر سخت مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ قلعے کی محافظ فوج میں اتنی سکت تھی نہیں کہ مقابلے کے لیے باہر نکلتی اور عماد الدین کی طرف سے کوئی جواب آ نہیں رہا تھا بالآخر حاکم قلعہ نہایت مایوسی کے عالم میں گھوڑے پر سوار قلعے سے باہر نکلا۔

''مجھے صلاح الدین ایوبی کے پاس لے چلو۔''

''اپنی تلوار ہمیں دو اور گھوڑے سے اتر جاؤ۔''

مصری سپاہیوں نے اسے غیر مسلح کیا اور صلاح الدین کے پاس پہنچا دیا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ انہوں نے تو صرف یہ دیکھا کہ حاکم قلعہ دوبارہ قلعے میں چلا گیا اور یہ دیکھا کہ صلاح الدین قلب لشکر میں آیا اور اپنی فوج سے مخاطب ہوا۔

''خدا کا شکر ہے۔ مجھے مسلمانوں کا خون بہانے سے پہلے فتح نصیب ہو گئی۔ ابھی قلعے کا دروازہ کھلے گا اور ہم اندر جائیں گے۔ اپنی تلواریں نیام سے باہر رکھنا۔ اگر حاکم قلعہ نے کوئی ہوشیاری دکھائی تو فیصلہ تلوار سے ہو گا۔''

قلعے کا دروازہ کھلا۔ حاکم قلعہ استقبال کے لیے دروازے پر موجود تھا۔ قلعے کے صحن میں حاکم قلعہ کے سپاہی موجود تھے۔ صلاح الدین کو دیکھتے ہی قلعہ اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔

قلعہ عمید صلاح الدین نے اپنے ایک جانباز بدرالدین کے سپرد کیا اور خود دریائے فرات عبور کر کے اس آخری قلعے کی طرف بڑھا جس کے بعد حلب کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ حلب کی فوجیں اب تک اس کے مقابلے پر نہیں آئی تھیں اس لیے اسے یقین تھا کہ حلب میں اسے مدافعت کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا۔

عماد الدین حلب کے قلعے میں محصور ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنے قاصدوں کو مختلف عیسائی اور مسلمان ریاستوں میں فوجی مدد کے لیے بھیج رہا تھا مگر کوئی اس کی مدد کو تیار نہیں تھا حتیٰ کہ اس کے بڑے بھائی والی موصل نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اگر میں نے حلب کی مدد کی تو صلاح الدین موصل کو ہتھیا لے گا۔

قلعہ ''خطاب'' کے حکمراں نے صلاح الدین کو دیکھتے ہی ہتھیار ڈال دیے۔

اب راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ صلاح الدین حلب کے سامنے پہنچ کر خیمہ زن ہو گیا۔ عماد الدین قلعے کی بلندی سے اپنی موت کے فرشتے کو دیکھ رہا تھا۔

عماد الدین کے بزدل امرا نے ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ جب عماد الدین نے دیکھا کہ وہ بالکل ہی اکیلا رہ جائے گا لہٰذا اس نے وہ قدم اٹھایا جو عموماً حکمرانوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اس نے کسی پیغام رساں کا

سہارا نہیں لیا بلکہ ایک دن وہ خود صلاح الدین کے خیمے میں پہنچ گیا۔

عماد الدین جنگ ہار چکا تھا۔ وہ بس ایک رعایت کا طالب تھا کہ کسی طرح وہ اپنے اہل خانہ کو لے کر حلب سے چلا جائے۔ صلاح الدین کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

”آپ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ یہ رعایت بھی میں آپ کو اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ میرے محسن سلطان نورالدین زنگی کے خاندان کے فرد ہیں۔“

”مگر میں جاؤں گا کہاں۔ مجھے سنجر کا علاقہ دے دیا جائے جسے چھوڑ کر میں حلب آیا تھا۔“

”میں سنجر کا علاقہ آپ کو دینے کو تیار ہوں لیکن آپ وہاں کے حاکم نہیں میری طرف سے نگراں ہوں گے۔ ایک مرتبہ پھر کہہ دوں کہ یہ رعایت صرف اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ میرے محسن کے بھتیجے ہیں۔“

عماد الدین کے لیے یہ ایک شرمناک شرط تھی لیکن اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے مان لے۔

دوسرے دن ایک دروازے سے صلاح الدین ایوبی شہر میں داخل ہوا، دوسرے دروازے سے عماد الدین نکلا اور سنجر کی طرف چل دیا جہاں اسے صلاح الدین کے نمائندے کی حیثیت سے نوکری کرنی تھی۔

اب صلاح الدین دنیائے اسلام کا سب سے طاقتور حکمراں تھا۔ دریائے دجلہ سے دریائے نیل تک اور افریقا کے ساحل سے طرابلس تک بڑے بڑے شہر اس کے زیرِ نگیں تھے۔

☆☆☆

ریجنالڈ حلب سے رہائی کے بعد کرک میں بیٹھا شیطانی منصوبے بنا رہا تھا۔ اس دوران اسے معلوم ہوا کہ بالڈون نے ریمنڈ کو معطل کر دیا ہے اور گائی آف لسگنٹن کو یروشلم کا نگران اعلیٰ مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ریمنڈ سے اس کی بنتی نہیں تھی۔ وہ اس کی مخالفت کر سکتا تھا اور اب وہ معطل تھا۔

یہ سوچ کر اس کی نیت میں فتور آ گیا اور جب قاہرہ سے آنے والا ایک عظیم الشان قافلہ کرک کے نزدیک ٹھہرا تو اس قافلے کے سامان تجارت کی فراوانی اور غلاموں کی کثرت دیکھ کر ریجنالڈ کی قزاقانہ فطرت بے قابو ہو گئی۔

صلاح الدین نے سخت احتجاج کیا اور لکھا کہ یہ میرا ذاتی قافلہ تھا جو عارضی صلح کی ضمانت کے ماتحت پرامن طریقے پر سفر کر رہا تھا۔ صلاح الدین نے آدمیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔

ریجنالڈ اس مطالبے کی پروا تو کیا کرتا اس نے تو نہایت سفاکانہ دلیری کے ساتھ مکہ سے واپس آنے والے حاجیوں کے ایک اور قافلے کو لوٹ لیا۔

سلطان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ریجنالڈ کی منزل اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ وہ مدینہ منورہ پہنچ کر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کو نقصان پہنچائے۔

صلاح الدین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ ”انشا اللہ اس شخص کو میں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔“

اس نے دور دراز علاقوں سے سپاہ طلب کی، ترکمان قبائل اور عراق کے کرد اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ رات کے سیاہ پردوں سے عجیب آوازیں اٹھنے لگیں۔ طبل بجنے لگے۔ یہ صلاح الدین کی فوج تھی۔ وہ ریجنالڈ سے قافلہ مکہ پر حملے کا انتقام لینے ناگہانی طور پر آن پہنچا تھا۔ صلاح الدین کے سپاہیوں نے قلعے کی بیرونی دیوار پر دھاوا بول کر عیسائی شمشیر آزماؤں کو کھلے احاطے سے مار بھگایا لیکن مجروح بھیڑیا اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ ریجنالڈ اور اس کے بیشتر سپاہی اٹھاؤ پل سے خندق کے پار جا چکے تھے۔ یہ گہری کھائی قلعے کے بیرونی حصے کو اندرونی حصار سے جدا کرتی تھی۔ صلاح الدین نے بقایا چار دیواری پر بھی دھاوا بول کر اس پر قبضہ کر لیا۔

صلاح الدین کے اسلحہ کاروں نے اندرونی قلعے کو پیہم سنگ باری کا نشانہ بنایا۔ ریجنالڈ مہینا بھر ڈٹا رہا حتیٰ کہ اس کے حریف ریمنڈ کی قیادت میں یروشلم کی فوجیں دریائے اردن پار کر کے آ گئیں۔ اس وقت اس نے محاصرے کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور شمال کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا۔

فریقین کے درمیان پانچ سال کے لیے صلح طے پا گئی۔

صلاح الدین کو ابھی موصل کی فکر تھی۔ حلب کے انتظامات میں بھی اس کی فوجیں مصروف تھیں۔ اب اسے موصل اور عراق کے شمالی کوہستانی علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کرنا ضروری تھا۔ اس کے بعد ہی وہ یروشلم کی طرف راغب ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

اس صلح کے چند ماہ بعد صلاح الدین نے دریائے

فرات عبور کیا اور موصل کے نواحی علاقے میں پہنچ گیا۔ اس کی آمد کا سنتے ہی عزالدین والی موصل بدحواس ہو گیا۔ صلاح الدین سے جنگ کرنے کی اس میں ہمت کہاں تھی۔ اس نے اپنی بوڑھی والدہ اور دو بیویوں کو صلاح الدین کے پاس بھیجا۔ اسے معلوم تھا کہ صلاح الدین زنگی خاندان کی عورتوں کا بے حد احترام کرتا ہے۔ وہ ان کی بات کو ٹال نہیں سکے گا لیکن اس کا یہ اندازہ بھی غلط نکلا۔ صلاح الدین نے صلح کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور موصل کا محاصرہ کر لیا۔

یہ محاصرہ جاری تھا کہ برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ اسے محاصرہ ختم کرنا پڑا۔ عزالدین نے سکھ کی سانس لی۔ وہ برسات بھر ساون کے جھولے جھولتا رہا۔ اس کا خواب تو اس وقت ٹوٹا جب صلاح الدین نے برسات گزر جانے کے بعد دوبارہ موصل کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس وقت موصل میں شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ گرمی کے زور نے یہ اثر دکھایا کہ وہ شدید بخار میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اسے عام سا بخار سمجھ رہا تھا۔ عام سی دوائیں استعمال کیں مگر افاقہ نہ ہوا۔ بخار بڑھتا چلا گیا۔ اتنی کمزوری ہو گئی کہ بہ مشکل گھوڑے پر سوار ہو سکتا تھا۔ وہ طبیبوں کے ہجوم میں گھرا ہوا ”حران“ چلا آیا۔ اس کی بیماری کی خبر کو خفیہ رکھا گیا تھا لیکن یہ خبر چھپی نہ رہ سکی۔

☆☆☆

ریجنالڈ حاکم کرک اپنے سوار دستوں کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوا۔ سفید محل کے کمروں سے مسلح ٹمپلر جنگجو بھاگتے ہوئے نکلے اور ریجنالڈ کے ہمراہ ہو لیے۔ یہ محل کسی زمانے میں مسجد تھا۔ عسقلان کے نیزہ بردار بھی آن پہنچے۔

ریجنالڈ سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ وہ ایسی ہی کسی شرارت کے لیے یروشلم آیا تھا۔ اسے عارضی صلح سخت ناگوار معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے فرنیکس سے ساز باز کی اور پنج سالہ معاہدے کی خلاف ورزیاں شروع کر دیں۔

صلاح الدین کو اپنی قسم یاد آ گئی۔ اس نے عہد کیا تھا کہ وہ ریجنالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا۔ اس نے عام جہاد کا حکم دے دیا۔ دیار بکر، شام اور مصر کی فوجیں دمشق میں جمع ہونے لگیں۔

اس نے دریائے اردن کا رخ کیا۔ دوسری طرف صلاح الدین کا بھتیجا تقی الدین جنگ آزما سواروں سمیت انطاکیہ کے قرب و جوار میں حرکت پذیر تھا۔ وہ انطاکیہ کے عیسائی لشکر کا راستہ روکے ہوئے تھا تاکہ وہ یروشلم کی عیسائی فوج سے نہ مل سکے اور پھر وہ اپنے چچا صلاح الدین سے جا ملا۔

سلطان نے اپنے سیاہ پرچم کھول دیے اور طبریہ کی جھیل کے قریب دریائے اردن عبور کر لیا۔ اس مرتبہ وہ جلدی میں نہیں تھا۔ عزالدین اس کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ عزالدین کی حیثیت اب صلاح الدین کے باجگزار کی سی تھی۔ مسلم ریاستوں میں اب کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے نقصان پہنچا سکتا۔

صلیبی بہادر بھی جنگ کی تیاریوں میں جانفشانی دکھا رہے تھے۔ طرابلس کے بہادر، بحری طالع آزما، صور کے نیزہ بردار، صف بستہ زرہ پوش، جنگ میں کودنے کے لیے تیار تھے۔

نوجوان امیر اپنے ایوانوں سے رخصت ہوئے، درشت مزاج قلعہ دار سنگین پناہ گاہوں سے باہر آ گئے۔ عالم یہ تھا کہ غبار کی دیوار اٹھتی اور بیٹھتی تو پیدل یا سوار نمودار ہوتے۔ یہ سپاہی گرجوں میں تھکن اتارتے اور تاروں کی چھاؤں میں سفر کرتے۔ مقدس صلیب طلائی پرچم میں لپٹی ان کے ساتھ ہوتی۔

یہ قافلے ”صفوریہ“ کے چشموں کی طرف رواں دواں تھے۔ صفوریہ میں عیسائی لشکر کا پڑاؤ تھا۔ جنگی سردار اپنے ایوانوں اور خیموں میں بڑی بے تابی سے جنگ کے منتظر تھے۔ ریمنڈ کی آنکھیں نیند سے محروم تھیں، اسے ہر دم اپنی بیوی اور قلعے کی فکر دامن گیر رہتی۔ اس کا قلعہ طبریہ کی جھیل کے کنارے واقع تھا۔ یہ علاقہ مسلمان سواروں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔

ریجنالڈ کو یارائے صبر نہ تھا۔ اب ریمنڈ اور ریجنالڈ نے مفاہمت کر لی تھی۔

اسلامی لشکر ”اخوانا“ کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ یہاں اس کے جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ صلیبیوں کی ایک بہت بڑی فوج ”صفوریہ“ میں جمع ہے اور صلیب کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں۔ صلاح الدین نے مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا۔ بحث مباحثے کے بعد یہ طے ہوا کہ دفاعی جنگ نہ لڑی جائے بلکہ آگے بڑھ کر حملہ کیا جائے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے صحرا گونج اٹھا۔ الجہاد، الجہاد کے نعرے ہر زبان پر تھے۔ صلاح الدین کے لشکر میں ایسا جوش پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

صلیبیوں کے مخبر خبریں لائے کہ صلاح الدین دریائے اردن عبور کر کے طبریہ کی بلندیوں میں خیمہ زن ہے۔ یہ فاصلہ پندرہ میل پر مشتمل تھا۔ صلاح الدین کی فوج 25 ہزار سواروں پر مشتمل تھی۔ ان کے مورچے دور سے نظر

آتے تھے۔

صلاح الدین عیسائی لشکر کو یوں عقب میں چھوڑ کر یروشلم پر حملہ آور نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ساحل کے کنارے کنارے عیسائی فوج کی زد سے بچ کر نہیں جاسکتا تھا چنانچہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کی پیش قدمی کی منتظر رہیں۔

طبریہ ریمنڈ کا علاقہ تھا جسے یروشلم کی ملکہ نے معزول کر دیا تھا اور اس کی جگہ گائی آف لسگنن نگراں شہنشاہ بن گیا تھا۔ گائی اور ریمنڈ میں پرانے اختلافات تھے لیکن اس وقت مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے دونوں متحد ہو گئے تھے۔

ریمنڈ کھوئی کھوئی آنکھوں سے طبریہ کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ اسے اپنی بیوی اور قلعہ بہت یاد آتا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ صلاح الدین اس کے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔ اس کا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ صلاح الدین نے ایک لشکر کو جھیل کے کنارے طبریہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ مسلمانوں نے طبریہ شہر کی بیرونی دیواروں پر دھاوا بول دیا اور ایک ہی دن میں قلعے پر قبضہ ہوگیا۔ ریمنڈ کی بیوی اور مختصر سی فوج قلعے میں محصور ہو کر رہ گئی۔

یہ خبر پہنچتے ہی عیسائی فوج کے سردار بادشاہ کے خیمے میں جمع ہوئے۔ سب سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے اور غور کر رہے تھے کہ اب کیا ہونا چاہیے۔

ٹمپلروں کے سردار نے جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت بے عزتی کی بات ہے کہ دشمن ہمارے قلعے کو تھیالے۔ ہمیں آگے بڑھ کر حملہ کر دینا چاہیے۔“

ریجنالڈ نے پرجوش تائید کی۔ ”ڈی رڈفورڈ بالکل صحیح کہتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔“

ریمنڈ نے ان دونوں کی مخالفت کی۔ ”میرے رفیقو! میں اپنے علاقے کے ایک ایک گوشے سے واقف ہوں، اس کی روشنی میں کہہ رہا ہوں کہ ہمیں محفوظ مقام پر رہ کر دفاعی تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ اگر مسلمانوں کے خلاف پیش قدمی کی گئی تو راستے میں پانی بالکل دستیاب نہیں ہو سکے گا۔ پیش قدمی کرنا سراسر ہلاکت ہوگی۔ اگر ہم مضبوطی سے اپنی جگہ جمے رہے تو دشمن کو لامحالہ پسپا ہونا پڑے گا۔ اگر صلاح الدین پھر بھی جنگ پر تلا ہوگا تو اسے اپنے بہتر مقام کو چھوڑ کر اپنی جگہ سے ہٹنا پڑے گا۔“

ریمنڈ کی رائے معقول تھی۔ کئی لوگوں نے اس کی تائید بھی کی لیکن بیشتر نے مخالفت کی۔ ریجنالڈ تو بالکل ہی بے قابو ہوگیا۔

”ریمنڈ کی رائے کی وقعت ہی کیا ہے۔ یہ پہلے بھی ایک مرتبہ خفیہ طور پر صلاح الدین سے صلح کر چکا ہے۔ اب چاہتا ہے طبریہ کو طشت میں رکھ کر صلاح الدین کی خدمت میں پیش کردے۔“

”شہنشاہ! آپ سن رہے ہیں۔ مجھے کیسی غلیظ گالی دی جارہی ہے۔“

”مجھے کسی کی باتوں سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ طبریہ ہمارے ہاتھ سے جانے کو ہے۔“ یروشلم کے نگران اعلیٰ گائی آف لسگنن نے کہا۔

”اسی لیے تو میں کہتا ہوں صفوریہ میں ٹھہر کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ صلاح الدین کی حکمت عملی کیا ہوتی ہے۔“

”اس کی باتوں میں نہ آیئے گا۔ یہ غدار ہمیں فریب دے رہا ہے۔“

ٹمپلروں کے سردار نے براہ راست ریمنڈ کو گالی دی تھی۔

ٹیمپلر اور فرینکس دو مذہبی تنظیمیں تھیں جن کی قوت ہی سے یروشلم کا اقتدار باقی تھا۔ گائی آف لسگنن بھی انہیں ناراض نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے ڈی رڈفورڈ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ریمنڈ کی تجویز کو مسترد کر دیا۔

”اسلامی لشکر کو مزید آگے بڑھنے دیا گیا تو دشمن کو فلسطین تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔“

”جنگ ناگزیر ہے...... جنگ ناگزیر ہے۔“ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

کمزور ارادہ گائی نے سب کی باتوں میں آکر پیش قدمی کے احکام جاری کر دیے۔

جولائی 1187ء کی صبح عیسائی فوج نے صفوریہ سے کوچ کیا۔ پرچم کھول دیے گئے۔ صف بستہ پیادے قطار اندر قطار سوار اور جوق در جوق نیزہ بردار وسیع میدان میں بڑھتے چلے گئے۔

قومی حمیت سے مجبور ہو کر کوئی یہ کہنے کو تیار نہیں تھا کہ ریمنڈ کی رائے ٹھیک تھی۔

عیسائی اس جذبے سے چلے تھے کہ وہ دوپہر تک اسلامی لشکر تک پہنچ جائیں گے اور چونکہ مسلمان ایک گہرے نشیب کے بالائی کنارے پر صف آرا تھے اس لیے منصوبہ یہی تھا کہ مسلمانوں کی صفیں توڑ کر انہیں پیچھے دھکیل دیا جائے۔ اس طرح وہ گہرے نشیب میں گر کر فنا ہو جائیں گے۔ شام ہوگئی لیکن وہ مسلمانوں کے لشکر تک نہ پہنچ سکے۔

تمام شاہراہیں پتھریلی تھیں۔ دور دور تک کسی درخت کا سایہ نہ تھا۔ یہ لوگ مشکیزے اٹھائے سست روی سے چل رہے تھے۔ سورج کا قد دراز ہوتا چلا جارہا تھا۔ محل وقوع ایسا تھا کہ سورج کی کرنیں عموری حالت میں پڑ رہی تھیں۔ زرہ بکتر میں انگارے بھرے ہوئے تھے۔ سروں پر دھری لوہے کی ٹوپیاں دماغوں کو کھولائے دے رہی تھیں۔ پاؤں تلے پتھر تپ رہے تھے۔ گلے میں پانی کی جگہ سرخ ریت بھری ہوئی تھی۔

سردار اور امیر گھوڑے دوڑاتے ہوئے آتے تھے اور سپاہیوں کو تیز چلنے کی تلقین کرتے تھے لیکن پرخار گھاٹیوں میں الجھے ہوئے سپاہی تیز قدمی دکھانے سے معذور تھے۔ کچھ دیر کے لیے تیز چلتے اور پھر سست روی پر آجاتے۔

گائی آف لسگنن فوج کے عقب میں تھا۔ اس کا حال بھی برا تھا۔ اسے خدشہ ہوا کہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے پیدل چلنے والے کہیں لڑکھڑا کر نیچے ہی نہ گر جائیں۔ اس نے پڑاؤ کا حکم دے دیا۔ فوج نے اپنے خیمے نصب کر لیے۔ تشنہ لب سپاہیوں نے جی بھر کے پانی پیا اور آرام سے سوئے۔ مسلح سوار رات بھر پہرا دیتے رہے۔

ان میں ایک تھا جو رات بھر نہ سویا، یہ تھا ریمنڈ۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ ”ہم تو ابھی سے لڑائی ہار گئے۔ اب تو ہم مردوں میں شامل ہیں۔ صفوریہ کے چشمے بھی ہمارے ہاتھ سے چلے گئے۔ اگر کل تک طبریہ نہ پہنچے تو حکومت ختم۔“

بڑی پریشانی سے رات کٹی۔ طلوع سحر سے پہلے نقاروں پر چوٹ پڑی، گھوڑوں پر زینیں کسی گئیں۔ نیزہ بردار اور تیر انداز اپنے اسلحہ کو درست کرتے ہوئے اپنے دستوں کی طرف بھاگے۔

سپاہیوں نے پانی کے آخری گھونٹ پی کر خالی مشکیزے ہوا میں اچھال دیے۔

کچھ دیر سر جھکا کے گھوڑے چلتے رہے۔ سورج کی کرنیں بتدریج تیز ہوتی چلی گئیں۔ پیادہ فوج کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ دور دور تک پانی کا ایک قطرہ نہیں تھا۔ ریمنڈ نے صحیح کہا تھا کہ وہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ملے گا۔ برا حال تھا۔ گرمی سے ہوا میں ارتعاش سا تھا۔ فضا پر غبار چھایا ہوا تھا۔ زرہ بکتر وزنی معلوم ہو رہی تھی۔

اچانک دور اڑتے ہوئے غبار کے پردے سے جنگجو عرب قبائل نمودار ہوئے، طبل کی آواز گونجی اور پرزور نعرہ بلند ہوا۔

”یا اہل السلام...... یا اہل السلام!“

سورج غروب ہو رہا تھا۔ مغربی افق سیاہی میں اترتا جارہا تھا۔

رات کے اندھیرے میں ٹیلے یا چٹانوں پر بیٹھے یا لیٹے عیسائی بھوکے بھی تھے، پیاسے بھی۔ مشکیزے خالی تھے اور کنوؤں پر مسلمان تیر انداز بیٹھے تھے۔

صلیبی سرگوشیوں میں دعائیں مانگ رہے تھے۔

کچھ اسلام کے بارے میں

☆ بے نمازی کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔

☆ نماز ہی مسلمان اور کافر کے درمیان پہچان کا سبب ہے۔

☆ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔ ”بے نمازی سے کتا اور خنزیر بھی پناہ مانگتا ہے۔“

☆ یاد رکھو نماز فرض ہے اگر یہ قرض بن گیا تو......؟

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

”دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔“

****

اقوالِ زریں

☆ بچہ اگر بوڑھا بھی ہوجائے تو ماں کے لیے بچہ ہی ہوتا ہے۔

☆ ہر جنگل کو ویران مت سمجھو ہوسکتا ہے کسی میں شیر سو رہا ہوں۔

☆ دنیا میں سب سے مشکل کام دوستی نبھانا ہے۔

☆ اگر آپ کسی کو خوشی نہیں دے سکتے تو پھر آپ کو اسے غم دینے کا بھی کوئی حق نہیں۔

☆ الو عقلمندوں کے لیے دانا اور بے وقوف کے لیے ایک بے کار پرندہ ہے۔

☆ دوستی میں جیت جائز ہے مگر جیت میں دوستی جائز نہیں۔

مرسلہ: یاسر روبی، جہلم

امرا کے خیمے خاموش بھی تھے افسردہ بھی۔

سب کے سب دن نکلنے کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ دشمن بالکل نزدیک تھا۔ صبح ہوتے ہی اس سے نبرد آزما ہونا تھا کہ اچانک مشعلیں حرکت کرتی نظر آئیں۔ یہ یقیناً صلاح الدین کے گشتی دستے تھے جو صلیبی فوج کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے، دہشت کی ایک ٹیس سی اٹھی جو صلیبیوں کے لشکر میں سرایت کرتی چلی گئی۔

صبح ہوتے ہی عیسائیوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور میدان کارزار میں کود پڑے۔ ایک مورخ کے الفاظ میں "گویا وہ یقینی ہلاکت کی طرف دھکیلے جا رہے تھے۔"

اس پیش قدمی میں پیادوں کی صفیں قدرے غیر مربوط ہو گئیں۔ وہ دشمن سے لڑنے کے بجائے اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح کنوؤں تک پہنچ جائیں اور اپنی پیاس بجھالیں لیکن کنوؤں پر متعین سلطان کے تیرانداز ہر بڑھنے والے کا خاتمہ کر دیتے تھے۔

یہ پیاسا لشکر پانی کا تعاقب کرتا ہوا "لوبیہ" گاؤں کے قریب پہنچ گیا۔ یہ گاؤں سنگلاخ پہاڑیوں کی تمام چوٹیوں کے سائے تلے واقع تھا۔ یہ چوٹیاں "قرن الحطین" کہلاتی تھیں۔

لوبیہ کے مقام پر دونوں فوجوں میں خونریز معرکہ برپا ہوا۔ مسلمانوں نے ایسا دباؤ ڈالا کہ صلیبیوں کے پیادے اپنے سواروں سے الگ ہو گئے۔ عیسائی رسالہ پیادوں اور نیزہ برداروں کی حمایت سے محروم ہو گیا۔

صلیبی سرداروں کے حملے بے سود ثابت ہو رہے تھے۔ صلیبی سواروں کے گھوڑے مسلمان تیراندازوں کا نشانہ بن جاتے یا تھکن اور پیاس کی شدت سے بے حال ہو جاتے۔

یروشلم کے بہادروں کے منہ پیاس کی شدت سے کھلے ہوئے تھے۔ پانی کے ایک قطرے کے لیے گردنیں کٹوا رہے تھے۔

گائی لسگنٹن کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ریمنڈ اپنے سواروں کو لے کر طبریہ جھیل کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ تمام سردار ریجنالڈ کے گرد "حطین" کے ٹیلے پر جمع تھے۔ پھر بادشاہ گائی بھی وہیں آ گیا البتہ ریمنڈ کا کہیں پتا نہ تھا۔

صلاح الدین کے سوار چاروں طرف سے یورش کر رہے تھے۔ ریجنالڈ پامردی سے ڈٹا ہوا تھا۔ فرنیکس تمام کے تمام جھیل کی قربان گاہ پر قتل کر دیے گئے۔

تلواروں کی تیزی کیا کم غضب تھی کہ مسلمانوں نے خاردار جھاڑیوں کو آگ لگا دی۔ حطین کا ٹیلا دھوئیں میں چھپ گیا۔ دھواں آنکھوں میں بھرنے لگا۔ حطین پر لہرانے والا صلیبی جھنڈا دھوئیں میں چھپ گیا۔

اسی اندھیرے کی دیوار پر چڑھ کر مسلمان سپاہی اوپر پہنچے۔ پادری اسقف "صلیب الصبوت" اٹھائے ہوئے تھا۔ ایک تلوار میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے مرتے ہی صلیب مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ اس صلیب کے متعلق یہ مخصوص عقیدہ تھا کہ جس میدان میں یہ صلیب موجود ہوگی وہاں عیسائیوں کا پلہ بھاری ہوگا۔

زمین پر لیٹے ہوئے بے حال عیسائیوں نے چندھیائی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

صلیبی جھنڈا اتھانہ صلیب الصبوت۔

اس جگہ صرف قیدی زندہ بچے باقی تمام قتل کر دیے گئے۔ یروشلم کے نائٹوں کی قوت کا خاتمہ ہو گیا اور جنگ حطین اپنے اختتام کو پہنچی۔ صلیبی فوج کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ بادشاہ کی دعوت پر ہر توانا مرد صفوریہ پہنچا تھا۔ اب طبریہ کے سرخ کھیت خالی پڑے تھے۔ حطین کے میدان میں گندم کے ڈھیر نہیں لاشیں پڑی تھیں۔

قید ہونے والے سپاہیوں کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ وہ بے بسی سے مسلمان سواروں کی طرف دیکھ رہے تھے کہ شاید ان کی بے بسی پر کسی کو ترس آ جائے۔

ریمنڈ بہ مشکل طرابلس کے قلعے میں پہنچا اور محض دو ہفتے بعد کمزوری اور شکستہ دلی سے مر گیا۔

عام قیدیوں کو زندہ رکھا گیا لیکن ٹمپلروں کے لیے کسی کے دل میں جگہ نہیں تھی اور نہ ان کی زبانوں پر معافی کی درخواست تھی۔

مسلمان سپاہی ہر ٹمپلر کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے تھے اور خاموشی کے جواب میں تلوار سے اس کی گردن اڑا دیتے تھے۔ یہ مذہبی جنونی ایک ایک کر کے قتل ہوتے رہے۔

جب آخری سرخ صلیب پوش یعنی ٹمپلر بھی قتل ہو گیا تو صلاح الدین گھوڑے پر سوار اپنے خیمے کی طرف آیا۔

گزشتہ نوے سال سے سرزمین فلسطین پر صلیبیوں کا قبضہ تھا۔ سلطان نورالدین زنگی زندگی بھر تمنا کرتا رہا کہ سرزمین قدس کو واگزار کرا لے۔ وہ اس خواہش کو لے کر قبر میں چلا گیا۔ صلاح الدین کی بدولت یہ خواب دو دن میں شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔

ایشیا کے کسی فاتح کو ایسی شاندار کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

ابھی تک شاہی خیمہ نصب نہیں ہوا تھا۔ سردار اور امیر خیمے کے باہر کھڑے ہو کر مبارک بادیں پیش کر رہے تھے۔ اسے خوش کرنے کے لیے اپنے اپنے جنگی کارنامے بھی بیان کرتے جا رہے تھے۔ صلاح الدین ان کے کارناموں پر خوش ضرور تھا لیکن خوشامد سے اسے چڑ تھی۔

"یہ کارنامے بیان کرنے کا وقت نہیں شکر بجا لانے کا وقت ہے۔ جاؤ اپنے اپنے اسیروں میں سے قابل ذکر قیدیوں کو شناخت کر کے میرے پاس لاؤ۔"

خیمہ آراستہ ہو چکا تو سلطان خیمے میں داخل ہوا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

"ان لوگوں کو پیش کیا جائے جنہیں قتل کرتے ہوئے میرے سپاہیوں کو ہچکچاہٹ ہو رہی ہو۔ ایسے معزز لوگوں کا فیصلہ میں خود کروں گا۔"

کھلے میدان میں قیدی قطار سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ اتنی مہربانی کر دی گئی تھی کہ انہیں پانی پلا دیا گیا تھا۔ تشنگی دور ہونے کے بعد ان کی جان میں جان آئی تھی۔

صلاح الدین کے سردار ایک ایک قیدی کا نام اور عہدہ پوچھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ ریجنالڈ، گائی آف لسگنٹن، اس کے بھائی اور شہزادہ ارناط کی تلاش تھی۔ مسلمان سردار ایک جگہ پہنچا تو ایک شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

"میں بادشاہ یروشلم گائی آف لسگنٹن ہوں۔ مجھے اپنے سلطان کے پاس لے چلو۔"

سپاہیوں نے فوراً اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور صلاح الدین کے پاس پہنچا دیا۔

تھوڑی دیر میں شہزادہ ارناط اور دو چار دوسرے اہم قیدیوں کی شناخت بھی ہو گئی لیکن ریجنالڈ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ غالباً اس نے اپنا غلط نام بتا کر سب کو بے وقوف بنا دیا تھا۔

صلاح الدین کو بتا دیا گیا کہ ریجنالڈ قیدی نہیں بن سکا ہے۔ وہ فرار ہونے والوں کے ساتھ ہے۔ صلاح الدین اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ خود خیمے سے باہر آیا اور ایک ایک قیدی کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر ایک قیدی کے پاس جا کر رک گیا۔ اس کے سفید چہرے کو بہ غور دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چل کر وہ واپس مڑا۔ قیدی کے چہرے پر اب قدرے اطمینان تھا لیکن صلاح

ناممکن

جج۔ "خاتون! تمہارے گھریلو حالات معلوم ہونے کے بعد میرا مشورہ ہے کہ تم جلد از جلد اپنے شوہر سے طلاق لے لو۔"

خاتون۔ "میں نے اس بدمعاش کے ساتھ انتیس سال گزارے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ میں اس سے طلاق لے کر اسے خوش کر دوں؟"

مرسلہ: طیب شاہین، پھالیہ

الدین کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ پھر اڑ گیا۔

"یہاں کوئی ایسا قیدی ہے جو کرک کی فوج سے تعلق رکھتا ہو؟"

بھرے میدان میں صلاح الدین کی آواز گونجی اور اس کے جواب میں دو قیدی کھڑے ہو گئے۔

"ہماری پوری فوج کٹ گئی ہے۔ ہم صرف دو بچے ہیں۔"

"میں تم دونوں کو رہا کر دوں گا۔ اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ ریجنالڈ کہاں ہے؟"

ان دونوں نے گھبرا کر ریجنالڈ کی طرف دیکھا اور پھر فوراً نظریں ہٹا لیں۔

"وہ یہاں نہیں ہیں شاید فرار ہو گئے۔ اب تک تو کرک پہنچ بھی چکے ہوں گے۔"

"پہچان تو میں گیا ہوں لیکن تم سے تصدیق چاہتا ہوں۔ اگر بتا دو گے تو رہائی مل جائے گی ورنہ اس کے ساتھ ہی قتل ہو جاؤ گے۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ان میں سے ایک بول پڑا۔

"یہ ہے ہمارا بادشاہ ریجنالڈ۔" اس نے ریجنالڈ کی طرف اشارہ کیا۔ اسے دیکھ کر دوسرے نے بھی تصدیق کر دی۔

سلطان نے دونوں سپاہیوں کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ گائی آف لسگنٹن خیمے کے دوسرے حصے میں بیٹھا ہوا تھا جہاں اس کی یخ شربت سے تواضع کی جا رہی تھی۔

ریجنالڈ کو سلطان کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ ریجنالڈ کی ساری اکڑ نکل گئی تھی۔ وہ بہ مشکل اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا۔ صلاح الدین جیسے نرم مزاج سلطان کی آنکھوں سے قہر کے شعلے برس رہے تھے۔ اسے کسی نے شاید ہی اس سے پہلے اتنے غصے میں دیکھا ہو۔

"مردود ریجنالڈ، اپنے گناہ یاد کر۔"

"کیا تم مسلمانوں میں بادشاہوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے؟"

"ہرگز نہیں لیکن تو میرا نہیں میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مجرم ہے۔ شاتم رسول ہے، بارہا حجاز مقدس کی طرف جانے والے قافلوں کو لوٹ چکا ہے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر روضۂ اقدس کی بے حرمتی کا ناپاک منصوبہ بنا چکا ہے۔ تونے ایک مرتبہ قافلے کو لوٹتے ہوئے یہ بھی کہا تھا، اب تمہیں تمہارا پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی آکر بچائے گا۔ میں نے تیری ان ناپاک جسارتوں پر قسم کھائی تھی کہ اگر مجھے موقع ملا تو تجھ ملعون کو اپنے ہاتھوں سے قتل کردوں گا۔ کیا وہ موقع آنہیں گیا؟"

ریجنالڈ اب تک اپنے قدموں پر اس لیے کھڑا رہ گیا تھا کہ صلاح الدین اسے معاف کردے گا یا قیدی بنالے گا لیکن اب اسے اپنی موت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ وہ گھسٹتا ہوا صلاح الدین کی طرف گیا اور اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

"میں نے تمہاری فیاضی کی بڑی داستانیں سنی ہیں۔ مجھے معاف کردو۔ زندگی بھر تمہاری خدمت کروں گا۔ کتے کی طرح تمہارا ہر حکم ماننا رہوں گا۔"

"اگر میں تجھے معاف کردوں تو میری قسم کا کیا ہوگا؟"

"میں آپ کی خدمت میں رہوں گا۔ یہی آپ کی قسم کا کفارہ ہوگا۔"

"میری قسم کا کفارہ ایک صورت میں ممکن ہے۔"

"میں ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔"

"تو صدق دل سے اسلام قبول کرلے۔"

ریجنالڈ کی رگ حمیت پھڑک اٹھی۔ اس کا تعصب اس کی زبان پر آگیا۔ اس نے انکار کردیا۔ سلطان آخری حجت پوری کرچکا تھا۔ اس کی شمشیر بلند ہوئی اور دوسرے ہی لمحے ریجنالڈ کی گردن اس کے جسم سے الگ ہوگئی۔

اس کا جسم گردن کے فراق میں دیر تک تڑپتا رہا۔

صلاح الدین اپنی جگہ سے اٹھا اور خیمے کے دوسرے حصے میں پہنچ گیا جہاں گائی آف لسگنن موجود تھا اسے معلوم ہوچکا تھا کہ خیمے کے دوسرے حصے میں کیا ہوا۔ وہ اپنا انجام سوچ کر تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"مسلمانوں کے بادشاہ! مجھے معلوم ہے ریجنالڈ کے بعد اب میری باری ہے۔ میں اس وقت بے بس ہوں، میری گردن حاضر ہے۔"

"بادشاہ، بادشاہوں کو قتل نہیں کرتے۔"

"اور ریجنالڈ؟"

"اس نے تو شرافت کی تمام حدود پار کرلی تھیں۔ اس لیے وہ اس انجام کو پہنچا۔"

اس کے بعد گائی نے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھا۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ سامان خورونوش سج چکا تو صلاح الدین نے شاہ یروشلم کو دسترخوان کی طرف چلنے کی دعوت دی۔ چند اور خاص خاص عیسائی امرا دسترخوان پر موجود تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان پر یہ مہربانی کیوں کی جارہی ہے۔

خیمے میں مکمل سکوت تھا۔ کسی کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس سکوت کو خود صلاح الدین نے توڑا۔

"میں خانہ بدوش قبائل کے قابل قدر فیاضانہ دستور پر کاربند ہوں۔ اس دستور کے مطابق قیدیوں کو سامان خورونوش دینا ان کی جاں بخشی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔"

یہ سنتے ہی سب کے چہروں پر بحالی کے آثار نظر آنے لگے۔

رات بھر جنگلی کتوں اور دیگر جانوروں کی غراہٹوں سے میدان میں شور مچا رہا جو میدان میں پڑی عیسائیوں کی لاشوں کو بھنبھوڑ رہے تھے۔

صبح ہوتے ہی شاہ یروشلم اور خاص خاص امرا کو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے دمشق بھجوادیا گیا۔ باقی جتنے تھے سب کو قتل کردیا گیا تھا۔

تاریخ نویسوں کے مطابق اس معرکے میں تیس ہزار عیسائی قتل ہوئے تھے۔ ایک سال بعد تک انسانی ہڈیوں کے ڈھیر دور سے نظر آتے تھے۔

دوسرے دن ریمنڈ کی بیوی نے طبریہ کا قلعہ سلطان کے حوالے کردیا۔ اب سرزمین فلسطین اس کے قدموں میں تھی۔ چند قلعوں کی تسخیر باقی تھی۔ اس کے بعد وہ یروشلم تک پہنچ سکتا تھا۔

سلطان کی فوج تقریباً صحیح سالم تھی۔ حوصلے بلند تھے۔ شوق جہاد سے سرشار تھے۔ دوسری جانب حطین کی شکست کی خبر سے عیسائی قلعوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ان قلعوں میں لشکر کی تعداد بہت مختصر تھی۔ قلعوں کے کئی سردار حطین کے معرکے میں مارے گئے تھے۔

صلاح الدین نے بلا توقف پیش قدمی شروع کردی۔ وہ ساحل کی طرف گیا اور فوج کشی کرکے صلیبی ریاستوں کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ شمالی اور جنوبی حصے

ایک دوسرے سے منقطع ہوگئے۔ اس نے سب سے پہلے "عکہ" کے مضبوط ترین ساحلی قلعے کا رخ کیا۔ عکہ کے قلیل محافظین کو مقابلے کی تاب نہیں تھی۔ انہوں نے قلعے کے دروازے کھول دیے۔ صلاح الدین نے انہیں امان دے دی۔

جمعے کا مبارک دن آیا تو صلاح الدین نے اس مسجد میں نماز ادا کی جسے نوّے سال پہلے عیسائیوں نے چرچ میں تبدیل کردیا تھا۔ اس چرچ یا مسجد میں اذان بلند ہورہی تھی اور صلاح الدین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مسلمانوں کو اب کسی عیسائی فوج سے جوابی حملے کا خطرہ نہیں تھا چنانچہ سلطان نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کردیا اور امیروں کی سرکردگی میں مختلف سمتوں میں بھیج دیا۔ سلطان نے عکہ اور طبریہ کا درمیانی علاقہ خود فتح کیا۔ اس نے جنوب کی طرف حیفہ، صفوریہ، ناصریہ اور قیصریہ جیسے اہم مقامات پر قبضہ کرلیا۔ پھر شمال کا رخ کیا۔ طنین کا قلعہ آسانی سے فتح ہوگیا۔ شہر صیدون نے شاہی فرمان کی تعمیل میں اطاعت قبول کرلی۔ صرف بیروت تھا جس نے آٹھ دن تک مقابلہ کیا اور پھر اہل بیروت نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔

اب ساحل کے صرف تین شہر سلطان کا انتظار کررہے تھے۔ صور، عسقلان اور یروشلم۔ اس نے بلا تاخیر مفتوحہ شہروں میں اپنے فوجی دستے متعین کیے۔ وہ صور فتح کرنا چاہتا تھا لیکن اس اثنا میں ملک العادل نے جافا فتح کرلیا تھا اور اب بیت المقدس کی طرف متوجہ ہورہا تھا۔ صلاح الدین بھی اس سے جاملا اور "صور" کی تسخیر موخر کردی۔

اس نے پیش قدمی کی اور عسقلان کی سنگین دیواروں کے سامنے پھیلے ہوئے ریگ زار میں خیمہ زن ہوگیا۔ اس نے حسبِ معمول عسقلان کے سالار کو مفاہمت کا پیغام بھیجا۔

"اگر تم ہتھیار ڈال دو تو ہم بھی اہل شہر کو نقصان نہ پہنچانے کا عہد کرتے ہیں۔"

عسقلان کی طرف سے صاف جواب آگیا۔

"ہم خون کے آخری قطرے تک عسقلان کی حفاظت کریں گے۔"

اسے اس جواب پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ کسی بھی باحمیت عیسائی کا یہی جواب ہونا چاہیے تھا لیکن اس کی فطرت اس بات کی بھی متقاضی تھی کہ خونریزی کے بغیر ہی کوئی حل نکل آئے۔ وہ ہر حجت پوری کرنے کے بعد ہی جنگ کرنے کا قائل تھا۔

وہ مختلف تدبیروں پر غور کرتا رہا کہ کس طرح اہل عسقلان کو ہتھیار پھینکنے پر راغب کیا جائے۔ اسے یاد آیا کہ عسقلان کا مقید حاکم گائی آف لوگنان اس کی قید میں ہے۔ اس نے حاکم کو طلب کرلیا اور اسے پیش کش کی اگر تم اپنا اثر رسوخ استعمال کرکے عسقلان پر ہمارا قبضہ کرادو تو ہم تمہیں رہا کردیں گے۔ حاکم کو شہر کی دیوار کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے اپنے سالار سے بات کی لیکن اہلِ عسقلان نے اس کی بات بھی ماننے سے انکار کردیا۔

اب صلاح الدین کے پاس جنگ کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ اس نے عسقلان کے گرد محاصرے کا دائرہ تنگ کرنا شروع کردیا اور کچھ دستے عسقلان اور یروشلم کا درمیانی علاقہ مسخر کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس علاقے میں کہیں کہیں کوہستانی شہروں اور خانقاہوں میں عیسائیوں کی جمعیت موجود تھی۔

مسلمان فوج کو دیکھ کر غازہ اور دارم کے شہروں نے اپنے دروازے کھول دیے۔ اہلِ رملہ نے بھی شہر کی کنجیاں سلطان کے گماشتوں کے سپرد کردیں۔ سینٹ جارج کے مزار کے کلیسا پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔

دامن کوہ میں واقع ابلین کے مستحکم قلعے نے اپنے محبوب حاکم بالین کی رہائی کے عوض ہتھیار ڈال دیے۔ عسقلان کا رابطہ بیرونی دنیا سے بالکل ہی کٹ کر رہ گیا لہٰذا وہ بھی امان طلب کرنے پر تیار ہوگئے۔

4 ستمبر 1187ء کو عسقلان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

دو مہینے کی قلیل مدت میں صلاح الدین ارض مقدس پر چھا گیا۔ وہ ارض مقدس جسے فتح کرنے کے لیے صلیبیوں کی کئی پشتیں معرکہ آرا رہی تھیں۔

مشرق کی جانب پہاڑوں کی بلندیوں پر چند قلعے اب بھی صلاح الدین کی یلغار کے منتظر تھے لیکن ان کی کوئی فوجی اہمیت نہیں تھی۔ صلاح الدین کے دل میں یروشلم کی فتح کی خواہش چٹکیاں لے رہی تھیں۔ اس نے ان پہاڑی قلعوں کی فتح میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔

عسقلان فتح کے ٹھیک 16 دن بعد 20 ستمبر کو اس نے یروشلم کی فصیلوں کو اپنے سامنے دیکھا۔ مغرب کی طرف باب داؤد کے مقابل ٹیلے پر خیمے گاڑ دیے۔

☆☆☆

یروشلم کی تنگ گلیوں میں خدشات اور خطرات ٹہلتے پھر رہے تھے۔ کھیتوں میں مویشیوں کا ہجوم تھا۔ ٹھیکروں کے

احاطے کے نیچے جہاں کبھی جنگی گھوڑے ہوتے تھے اب وہاں خچر اور معمولی گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ مزار مسیح البتہ پر رونق تھا۔ پورا یروشلم یہاں سمٹ آیا تھا۔ ہر شخص عبادت اور گریہ زاری میں مشغول تھا۔ قلعے کی برجیوں پر مسلح محافظ پہرا دے رہے تھے۔ قلعے کے اندر پادری اور مختلف شہروں کے پناہ گزیں جمع تھے۔ ملکہ سیبل اور شہزادی ازابیل اپنے تنازعات بھول کر جنگ کی باتیں کر رہی تھیں۔

یروشلم کے نوجوان صلاح الدین کی فوج سے مقابلے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ کوئی معجزہ ہوگا۔ ان نوجوانوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ہماری مسلح فوج کا نام ونشان مٹ چکا ہے۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ حطین کے میدان میں کیا ہوا ہے۔

یروشلم اس وقت دنیا کا واحد شہر تھا جس کی کوئی فوج نہیں تھی۔ غیر تربیت یافتہ نوجوان دیواروں کی مضبوطی پر تکیہ کیے بیٹھے تھے۔ مغربی دیوار تھی بھی بہت مضبوط، اس کی تسخیر آسان نہیں تھی۔ صلاح الدین نے اپنی فوج کو شمال مشرق کی جانب منتقل کردیا۔

یروشلم کے نوجوانوں نے مورچے توڑنے کے لیے سنگ باری شروع کردی۔ وہ ایک تو غیر تربیت یافتہ تھے دوسرے ان کے پاس آلات نہیں تھے۔ ان کے پھینکے ہوئے پتھر خندقوں میں جا کر گر رہے تھے۔ نقب زن برابر دیواروں میں شگاف ڈالنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر مسلسل کوششوں کے بعد ایک جگہ کی دیوار گر گئی نقارے پر چوٹ پڑی۔ ایک نعرہ بلند ہوا اور مسلمان سپاہی شگاف میں گھس گئے۔ ادھر نوجوانوں نے بھی تیروں کی بوچھاڑ شروع کردی۔

یروشلم کا پادری ہرقلیس یہ صورت حال دیکھ رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ایک ایک جوان کٹ جائے گا اس کے باوجود بھی ہم صلاح الدین کی یلغار نہیں روک سکیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ شہر کو صلاح الدین کے حوالے کردیں۔ وہ صلاح الدین کے پاس پہنچ گیا۔ صلاح الدین خود یہ چاہتا تھا کہ یروشلم کے بے قصور شہریوں کا قتل عام نہ ہو۔ اس نے ہرقلیس کی درخواست منظور کرلی۔ اس نے اہل یروشلم کو شہر چھوڑنے کی اجازت دے دی۔ انہیں اسلحہ اور ساز وسامان لے جانے کی بھی کھلی چھٹی تھی۔

دوسرے دن عجیب منظر تھا۔ باب داؤد کے سوا شہر کے تمام دروازے بند تھے۔ اس دروازے سے انسانوں کا ایک لامتناہی قافلہ گزر رہا تھا۔

سفری لبادے پہنے عورتیں بھاری گٹھریاں اور وزنی بقچے اٹھائے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ ان کے بچے ان کا دامن تھامے ساتھ تھے۔ جو ذرا مالدار عورتیں تھیں گدھوں پر سوار تھیں۔ ان کے نوکر مویشیوں کی رسیاں کھینچتے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

غرض امیر غریب، دہقان فقیر سب نکل گئے۔ ہرقلیس بھی اپنا خزانہ گدھوں پر لاد کر نکل گیا۔

سلطان نے خونریزی کے بغیر اس عظیم شہر پر قبضہ کرلیا تھا۔

ہزاروں مسلمان مسجد اقصیٰ کی صفائی میں مصروف ہوگئے۔ گرجے سے قربان گاہ ہٹا دی گئی۔ دیواروں پر بنی تصویروں پر چونا پھیر دیا گیا۔

سلطان نور الدین زنگی کا بنوایا ہوا منبر منگایا گیا اور مسجد اقصیٰ میں رکھ دیا گیا۔ عمدہ قالین بچھائے گئے۔ موذن مینار پر چڑھا اور اذان کی آواز سے فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔

ذرہ پوش اور جبہ پوش شانہ بشانہ سیدھی صفوں میں کھڑے ہوگئے۔

☆☆☆

یروشلم پہنچنے کی جلدی میں سلطان صلاح الدین "صور" کا قلعہ فتح کیے بغیر چھوڑ آیا تھا۔ اب یروشلم فتح ہوگیا تو اسے "صور" کا خیال آیا۔

صور میں عیسائیوں کا اجتماع ہونے لگا تھا۔ ان عیسائیوں کو ایک نیا قائد بھی مل گیا تھا۔ یہ شخص کونارڈ تھا۔ نواب مانسریٹ کا بیٹا جو قسطنطنیہ سے روانہ ہوکر "صور" پہنچ گیا تھا اور عیسائیوں کی کمان سنبھال لی تھی۔ ہر طرف سے بھاگے ہوئے عیسائی اور بچی کھچی افواج صور میں جمع ہوگئی تھیں۔ ان کی کمان یہی کونارڈ کر رہا تھا۔ خدشہ تھا کہ یہ افواج صور سے نکل کر پھر کوئی ہنگامہ برپا کردیں گی۔

سلطان نے اس بڑھتی ہوئی طاقت کو کمزور کرنے کے لیے "صور" کا محاصرہ کرلیا۔ مسلمان کوشش کے باوجود شہر کی مضبوط فصیلوں میں شگاف نہ کرسکے۔ سردیوں کا موسم آگیا تھا۔ پھر سردیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ صلاح الدین کے امیر جنگ سے جی چرانے لگے۔ مسلسل ایک سال سے مصروف پیکار تھے۔ اب سردیوں میں اپنے گھروں کو جانا چاہتے تھے۔ صلاح الدین کو رخصت دینی پڑی۔

محاصرہ ختم کردیا گیا اور صلاح الدین چودہ ماہ بعد ایک بڑی کامیابی (یروشلم کی فتح) کا فخر ساتھ لیے اپنے

دارالحکومت دمشق کی جانب لوٹ گیا۔

وہ دمشق اس لیے آیا تھا کہ کچھ دن یہاں رہ کر آرام کرے گا لیکن آرام اس کی قسمت میں تھا ہی نہیں۔ اس کے دمشق لوٹتے ہی عیسائیوں نے "جبیل" کا محاصرہ کرلیا۔ اس کی آدھی فوج رخصت پر جاچکی تھی لیکن اس کے باوجود وہ جبیل کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ عیسائی محاصرہ اٹھا کر فرار ہوگئے۔ سلطان نے اسی قلیل فوج کے ساتھ طرابلس پر حملہ کردیا اور اسے تاراج کرتا ہوا ساحلی شہر طرطوس پہنچ گیا اور ایک مختصر مگر خونریز معرکے کے بعد قلعے پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھتا گیا اور قلعوں پر قلعے فتح کرتا چلا گیا۔ جب صیہون بھی فتح کرلیا تو "انطاکیہ" اکیلا رہ گیا۔ انطاکیہ کو اس نے ایسی آسانی سے فتح کرلیا جیسے پکی ہوئی فصل کاٹ لی جائے۔

اب عیسائیوں کے صرف دو قلعے باقی بچے تھے۔ "صنعد" اور "کوکب"۔ یہ دونوں قلعے دو عظیم معرکوں کے بعد سلطان کے قدموں میں جھک گئے۔

"صور" عیسائیوں کے پاس رہ گیا تھا۔ عکہ پر مسلمانوں کا قبضہ تھا لیکن اب عیسائی اس پر قبضہ کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔

☆☆☆

بے شمار پھڑپھڑاتے ہوئے بادبان سطح سمندر پر نمودار ہوئے۔

راستوں اور گزرگاہوں پر گھوڑوں کی بھاری ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ سیاہ پوش پادری مسیح مصلوب کے مجسمے اٹھائے گھوڑوں پر سوار تھے۔ زرنگار علم لہرا رہے تھے۔ شمال کے برفانی علاقوں سے مسلح سوار یروشلم کا رخ کر رہے تھے۔ ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔

"خدارا یروشلم کی مدد کرو۔ آؤ ابدی نجات کے طلبگارو آؤ۔ صلیب کی حفاظت کے لیے جانیں لڑا دو۔ عیسائیت کے دشمنوں کو فنا کردو۔"

عیسائی فوج یروشلم کو آزاد کرانے کے لیے نکل پڑی تھی۔ ڈینیوب کے کناروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جانباز اور صقلیہ کی بندرگاہوں سے جہازوں پر سفر کرنے والے بہادر فلسطین کی سرحدوں کی طرف ہجوم کر رہے تھے۔

جرمن ریاستوں کے حکمران اعلیٰ کی جانب سے خط آیا رکھا تھا۔ اس خط میں تنبیہہ کی گئی تھی کہ "اگر یروشلم عیسائیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو میں اپنی ساری فوجیں لے کر تمہیں سبق دینے پہنچ جاؤں گا۔"

کسی نے سچ کہا ہے کہ......

- محبت اور نفرت دونوں حد سے بڑھ جائیں تو جنون میں داخل ہوجاتے ہیں اور جنون کسی بھی چیز کا اچھا نہیں ہوتا۔
- کچھ کانٹے اپنے پاس رکھو کہ یہ پھولوں کی یادگار ہیں اور باقی اپنے دل میں پیوست کرلو تاکہ دوسروں کا درد محسوس ہو۔
- بے وقوف آدمی کی دوستی اور دشمنی دونوں سے بچو کیونکہ کوئلہ اگر گرم ہو تو ہاتھ جلا دیتا ہے اور اگر ٹھنڈا ہو تو ہاتھ کالے کر دیتا ہے۔
- کام سے غلطی، غلطی سے تجربہ، تجربہ سے عقل، عقل سے خیال اور اس خیال سے نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔
- قسمت ایک پہیے کی مانند گھومتی ہے، کوئی نیچے آتا ہے اور کوئی اوپر، تم جب اوپر ہو تو نیچے والوں کے ہاتھ تھام لو کیونکہ اگلے چکر میں اللہ نہ کرے تم نیچے ہو اور تمہارا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ ہو۔
- دوستی ایک مالا کی طرح ہے جس میں اگر خلوص ووفا، محبت، ہمدردی اور اعتماد کے موتی پروئے جائیں تو یہ کبھی نہیں ٹوٹتی لیکن اگر حسد، بغض، کینہ، عداوت، منافقت اور نفرت کے موتی پروئے جائیں تو یہ یوں بکھر جاتی ہے جیسے سوکھے پتے بکھر جاتے ہیں۔
- منافق دوست کبھی تیرا نہیں بن سکتا جو منہ سے کچھ کہے لیکن اس کے دل میں کچھ اور ہو۔
- دوست سے بے رخی اور بے پروائی برتنے سے انسان مصیبت میں اکیلا رہ جاتا ہے۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل بہاولپور

1189ء کے موسم بہار میں مسلمانوں نے سنا کہ وہ صلیبی جنگ کے لیے روانہ ہو چکا ہے اور ڈیوک آف آسٹریا بھی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ فرانس کے بادشاہ فلپ آگسٹس ثانی اور انگلستان کے بادشاہ رچرڈ نے بھی علم صلیب بلند کیا ہے۔

سقوط یروشلم کے بعد عیسائیوں کا بہت بڑا پادری ولیم آرچ بشپ مشرق سے یورپ پہنچا تا کہ عیسائی شہنشاہوں سے صلیبیوں کے لیے امداد طلب کرے۔ پادری ولیم نے فتح بیت المقدس اور مسلمان کے فرضی مظالم کا ایسا درد انگیز نقشہ کھینچا کہ حاضرین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور ہر گوشے سے ماتمی آوازیں ابھرنے لگیں۔ ہر عیسائی کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت و انتقام کے جذبات ابھر آئے۔ پھر جب سارے انتظامات مکمل ہو گئے تو شاہ فرانس فلپ اور شاہ انگلستان رچرڈ نے ایک طویل ملاقات کی اور سمندر کے راستے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہی پادری فرانس اور جرمنی بھی گیا تھا اور وہاں جنگی جنون پیدا کر دیا تھا۔

اس خوفناک طوفان کو دیکھتے ہوئے صلاح الدین نے اندازہ کر لیا کہ اصلی معرکہ اب ہوگا۔ صلاح الدین نے جن عیسائی فوجوں کو شکست دی تھی وہ موجودہ عیسائی فوجوں کا عشر عشیر بھی نہ تھیں۔ اب فرنگستان کے سارے بادشاہ اور امیر مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار تھے اور ان کی فوجیں اسلامی افواج سے تعداد میں بہت زیادہ تھیں۔ صلاح الدین کے پرچم تلے کبھی پچاس ہزار سے زیادہ سپاہی جمع نہیں ہو سکے تھے۔

صلاح الدین کے پاس اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ ضروری تھا کہ عیسائی فوجوں کے لنگر انداز ہونے سے پیشتر ہی عیسائیوں کے آخری قلعوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ بلفورٹ سے صور کو پناہ ملتی تھی لہٰذا اس نے بلفورٹ کے محاصرے کی ٹھان لی۔

وہ بلفورٹ کے سامنے نمودار ہوا تو قلعہ دار نے صلح کی درخواست کی۔ اس کا نام ریجنالڈ آف سڈون تھا۔ وہ پرانے صلیبی خاندان کا چشم و چراغ تھا اور مسلمانوں کے ذہن اور زبان سے واقف تھا۔ وہ سلطان کے خیمے میں کافی دیر تک تبادلۂ خیال کرتا رہا۔ اس نے سلطان سے تین مہینے کی مہلت طلب کی تا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو ساحلی علاقے میں بہ حفاظت پہنچا سکے۔ صلاح الدین نے یہ تجویز مان لی۔ جب تین مہینے کی مدت ختم ہو گئی تو وہ سلطان کے پاس پھر آیا اور مزید مہلت طلب کی۔ اس کی اس حرکت سے سلطان کو شبہ ہوا کہ وہ محض وقت ٹالنے کے لیے مہلت طلب کر رہا ہے۔ سلطان نے اسے گرفتار کر لیا اور بلفورٹ کی دیواروں کے سامنے لے جایا گیا۔ صلاح الدین نے اس سے کہا کہ اہلِ قلعہ کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دو ورنہ تمہیں اذیت ناک عتاب سے دوچار کیا جائے گا۔ ریجنالڈ نے چیخ چیخ کر اپنے سپاہیوں کو پکارا اور کہا ”خبردار! قلعہ کبھی دشمن کے حوالے نہ کرنا۔“

سلطان نے اسے گرفتار کر کے دمشق بھیج دیا۔ بلفورٹ کی مزاحمت جاری رہی۔ شہر سے سات میل دور پہاڑوں میں صلاح الدین اپنی لشکر گاہ میں حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ ہر گھنٹے بعد اس کے قاصد اسے عکہ کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ عیسائیوں نے عکہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔

شمال میں بلفورٹ کے قلعے نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے اور سارے کوہستانی علاقے سلطان کے تصرف میں آ گئے۔

تقی الدین، بربروصہ کی پیش قدمی روکنے شمال کی طرف گیا ہوا تھا۔

اس روز تیز رفتار قاصد لشکر گاہ میں آیا۔ وہ خبر لایا تھا کہ بربروصہ وفات پا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی تھی کہ بیالیس ہزار سپاہی متوفی کے بیٹے کے زیر کمان ہیں لیکن یہ سپاہی خستہ حال ہیں۔ ان کے بدن پر سوائے زرہ بکتر کے اور کچھ نہیں۔ ان کے پاس گھوڑے بھی نہیں۔ وہ اپنا سامان گدھوں پر لاد کر سفر کر رہے ہیں۔

ان سپاہیوں کا یہ حال اس لیے ہوا تھا کہ ان کا سامان رسد اور ایندھن راستے ہی میں ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے انہیں اپنے آلات اور فرنیچر جلانا پڑا۔ بھوک سے نڈھال ہو کر کئی آدمی مر گئے۔ مجبور ہو کر انہوں نے گھوڑے ذبح کر لیے اور اب گدھوں پر سفر کر رہے ہیں۔

اس خبر سے سلطان کو خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اس پیغام سے خوشی ضرور ہوئی جو تقی الدین کی جانب سے موصول ہوا تھا۔

”ہمارے رسالے کی جرمن فوج سے مڈبھیڑ ہوئی اور ہم نے انہیں انطاکیہ کے میدان میں درہم برہم کر دیا۔ صرف پانچ ہزار سپاہی اپنے علیل شہزادے کو لے کر شہر میں داخل ہو سکے ہیں اور حاکم انطاکیہ کے خزانے پر قبضہ کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔“

اب صلاح الدین کو شمالی سرحدوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے تقی الدین کو واپس بلا لیا۔

موسم گرما کے آخر میں صلیبی نہایت زور و شور سے عکہ کے گرد اپنے محاصرے کا دائرہ تنگ کرنے لگے۔ جرمن سپاہی بھی ان سے آ کر مل گئے تھے۔

سمندر میں بھی جنگ جاری رہی۔

مسلمانوں کا سامان رسد عکہ تک برابر پہنچ رہا تھا۔ یہ صلاح الدین کی عجیب حکمتِ عملی تھی کہ عکہ کے محصورین تک سامان رسد برابر پہنچ رہا تھا۔

اس کے برعکس محاصرہ کرنے والے عیسائیوں میں قحط پھیل گیا جو روز بہ روز بڑھتا ہی گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عمدہ گھوڑے کاٹے جانے لگے۔

قحط سے نمٹے نہیں تھے کہ وبا پھیل گئی۔ سب کے گلے بیٹھ گئے۔ سر اور ہاتھ پاؤں سوجھ گئے، لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگے۔ جو قحط سے بچے تھے، وبا سے مر گئے۔

محاصرہ اب بھی جاری تھا۔ پھر ان کی مشکل پر خدا کو رحم آ گیا۔ چھ عظیم الشان جہازوں کا بیڑا بندرگاہ میں داخل ہوا۔ ان جہازوں پر فرانس کے پرچم پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایک جہاز پر فلپ آگسٹس ثانی شاہِ فرانس کا ذاتی نشان لہرا رہا تھا۔ بادشاہ کے ساتھ کئی دلیر اور تجربہ کار نائب بھی آئے تھے۔

تازہ دم فرانسیسی فوجوں نے بڑے جوش و خروش سے محاصرہ شروع کیا اور عکہ کی شکستہ دیواروں پر بار بار یورش کرنے لگے۔

صلاح الدین کے گھڑ سوار عیسائیوں کے بیرونی گھیرے کو بار بار توڑتے جس سے عیسائی حملوں کا زور ماند پڑ جاتا۔

عکہ کے محاصرے کو دو سال گزر چکے تھے۔

پچیس جہاز اور بجرے ساحل پر نمودار ہوئے۔ عیسائی چھاؤنی میں کھلبلی مچ گئی۔ تمام لوگ ساحل کی طرف دوڑے۔ ڈھول تاشے بجنے لگے۔ میدان خیر مقدمی نغمات سے گونجنے لگا۔

سب سے اگلے جہاز پر انگلستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

مسلمان جاسوسوں نے تیزی سے صلاح الدین کو اطلاع دی کہ رچرڈ، شاہِ انگلستان پہنچ گیا ہے۔

عیسائیوں کی خوشی اس وقت ماند پڑ گئی جب انہوں نے چیتے کی کھال پر پڑے ہوئے رچرڈ کو بخار کی شدت سے تڑپتے دیکھا۔ اس کے لمبے بازو نقاہت سے کانپ رہے تھے۔ شیر دل رچرڈ اس وقت بالکل بے دست و پا تھا۔

گفتگو کے دوران

ہر دو اشخاص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی بات پر ایک دوسرے سے متفق ہو جائیں، اس سلسلے میں دو کسانوں کی گفتگو سنیے۔

☆ سناؤ اتنا عرصہ کہاں رہے؟

O میں اسپتال میں تھا۔

☆ اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔

O نہیں بہت اچھا ہوا۔ میں نے وہاں ایک نرس سے شادی کر لی۔

☆ اوہ، یہ تو بہت اچھا ہوا۔

O نہیں بہت برا ہوا، اس کے پہلے ہی 9 بچے ہیں۔

☆ اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔

O نہیں، بہت اچھا ہوا، ایک بہت بڑا مکان اس کی ملکیت ہے۔

☆ یہ تو بہت اچھا ہوا۔

O نہیں بہت برا ہوا، چند روز قبل وہ مکان جل گیا۔

☆ اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔

O نہیں بہت اچھا ہوا، وہ بھی بچوں سمیت مکان میں جل گئی۔

☆ اوہ، یہ تو بہت اچھا ہوا۔

O ہاں یقیناً اچھا ہوا۔

مرسلہ: امتیاز خٹک، اٹک سٹی

ایک لوہار کی

اولاد والدین کی بہت مرتبہ زندگی میں نافرمانی کرتی ہے۔ خاص کر جوان بیٹے، لیکن والدین اتنے مہربان ہوتے ہیں کہ وہ ان کو ہر وقت سزا نہیں دیتے ہیں، وہ (والدین) صرف یہ کرتے ہیں کہ ان کو ہمیشہ کے لیے سزا کے طور ایک بیوی دے دیتے ہیں۔ اس سزا کو بیٹے ساری زندگی بھگتے ہیں۔ ہے نا ایک لوہار کی؟

مرسلہ: حکیم سید محمد رضا شاہ، تورنگ، میانوالی

کیا رچرڈ جنگ میں حصہ لے سکے گا؟ کیا یہ جانبر ہو سکے گا؟

رچرڈ کی عمر اس وقت بہ مشکل 34 سال تھی۔ اس کے شانوں پر سنہری بال جھول رہے تھے۔ پیشانی ہموار اور کشادہ تھی۔ چہرے پر مختصر سی فرانسیسی تراش کی ڈاڑھی تھی۔

وہ اس عزم کے ساتھ یہاں آیا تھا کہ اگر مجھے انگلستان پہنچ کر بھی صلیبیوں کی مدد کرنی پڑی تو کروں گا۔

رچرڈ بخار کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ کتان کے خیمے میں چیتے کی کھال پر پڑا تھا۔ فلپ آگسٹس شاہ فرانس سے صبر نہ ہوا اور اس نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ ایک مورخ لکھتا ہے۔

''صبح ہی سے ہر شخص مسلح اور مستعد تھا۔ ہر ایک کے دل میں حملے کا ولولہ تھا۔ مسلح سپاہیوں کے نیزے، بکتر بند پیادوں کے چمکیلے خود، تازی گھوڑوں کی سفید زینیں اور بہادر نائٹوں کے علم شمار نہیں کیے جاسکتے تھے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا مورچہ سنبھال لیا۔ فصیل پر سخت سنگ باری شروع کردی گئی۔''

عکہ میں محصور سلطانی فوج نے یہ حال دیکھا تو دھویں کے اشاروں سے صلاح الدین کو حملے کی اطلاع کردی۔ صلاح الدین سات میل دور پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ وہ دھاوا بولتے ہوئے آیا اور پرجوش جوابی حملہ کر کے عیسائی حملہ آوروں کو واپس ہونے اور اپنی چھاؤنی کی مدافعت کرنے پر مجبور کردیا۔ یہ حملہ اس روز بے سود رہا تھا کہ چھاؤنی میں موت کا سناٹا تھا۔ فلپ کا چچازاد اس حملے میں مارا گیا تھا۔ اس کی لاش کے گرد شمعیں روشن تھیں۔ بالآخر فلپ کی مردہ آواز گونجی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو مسلمانوں سے انتقام لینے کی ہدایات دے رہا تھا۔

اس سے اگلے دن عیسائیوں نے دوبارہ شہر پر یورش کی۔ محصورین نے طبل بجائے۔ صلاح الدین پہاڑوں سے اترا اور بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوگیا۔ اس کے محافظ دستے اس کے ساتھ تھے۔ ایک لاکھ کے مقابلے میں چھ ہزار۔ تقی الدین بھی اپنے رسالے کے ساتھ آگیا۔

مسلمانوں نے خندق کے پاس دشمن کی صفوں میں کئی شگاف ڈال دیے۔ خوں ریز لڑائی جاری رہی اور بالآخر عیسائی خندق بچانے میں کامیاب ہوگئے۔

صلاح الدین کو بستر پر جاتے جاتے عشا کا وقت ہوگیا تھا لیکن فجر سے پہلے ہی اٹھ بیٹھا جیسے رات بھر دن نکلنے کا انتظار کرتا رہا ہو۔ اس نے حکم دیا اور طبل جنگ بجنے لگے۔ سپاہی لیس ہو کر اپنے اپنے دستوں کی طرف بھاگے۔ دوبارہ جنگ کے لیے مستعد ہوگئے۔

رچرڈ خیمے میں پڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا بدن ابھی تک بخار میں تپ رہا تھا۔ وہ کئی مرتبہ اٹھ کر بیٹھا اور بستر پر لیٹ گیا۔ پھر اس نے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ میرا بستر اٹھا کر میدان جنگ میں لے چلو۔ خدمت گاروں نے اس کا بستر ایک ٹیلے پر لگا دیا۔ یہاں ایک کمیں گاہ بنی ہوئی تھی جس پر بید کی چھت تھی۔ ایک روزن تھا جس سے عکہ کی دیواریں صاف نظر آتی تھیں۔ یہاں سے وہ اپنی فوجوں کو یورش کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

رچرڈ اپنے بستر پر اوندھا لیٹ گیا اور کہنی کے بل گردن اٹھا کر میدان جنگ کا نظارہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد جیسے وہ دیوانہ سا ہوگیا۔ اس نے اپنی کمان منگوائی اور روزن سے تیر چلانے لگا۔ یہ اس کا شوق جنگجوئی تھا ورنہ اس کے تیر بے اثر ہی جا رہے تھے۔

محصور مسلمان بہت کم تعداد میں تھے۔ سلطان کے ساتھ بھی سپاہ کی تعداد کم تھی۔ تین لاکھ عیسائیوں کا مقابلہ کس طرح ممکن تھا۔ انگریزوں کو یہ موقع مل گیا تھا کہ وہ فصیل کے نیچے سرنگ کھودتے رہیں۔ خندق بھرنے کی تیاریاں بھی ہوتی رہیں۔ رات کے اندھیرے میں بھی جنگ ختم نہیں ہوئی۔ نامعلوم سائے تھے جو آپس میں الجھتے رہے، خندق لاشوں سے پٹتی رہی۔ بالآخر ایک برج سے دھویں کے بادل اٹھے اور برج زمیں بوس ہوگیا، شہر پناہ میں ایک بڑا شگاف پڑ گیا۔ خستہ حال محصورین فصیل کے شگاف کو پر کرنے کے لیے جمع ہوگئے۔ اب چھپن چھپائی کا کھیل شروع ہوگیا تھا۔ محصورین لکڑیوں کا انبار جمع کر کے مورچے بناتے دوسرے ہی لمحے عیسائی حملہ آور ٹوٹ پڑتے اور ان مورچوں کو تہس نہس کردیتے۔ ایک وقت وہ آیا کہ مسلمان کے بنائے ہوئے مورچوں پر عیسائی قابض ہوگئے۔

اب محصورین کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ شہر کو دشمن کے حوالے کر کے اپنی جانیں بچالیں۔ انہوں نے نہایت کڑی شرائط پر ہتھیار ڈال دیے۔

صلاح الدین کے امیروں نے مسلمانوں کی جاں بخشی کے لیے یہ شرائط قبول کی تھیں کہ شہر صحیح حالت میں واپس کیا جائے گا۔ دو لاکھ طلائی دینار بہ طور زر فدیہ ادا کیا جائے گا اور سولہ سو اسیر عیسائی رہا کیے جائیں گے اور مقدس صلیب واپس کردی جائے گی جو جنگ حطین میں صلاح الدین کے ہاتھ لگی تھی۔ آخری شرط کچھ زیادہ ہی کڑی تھی اور وہ یہ تھی کہ ''عکہ'' کے تمام لوگ شرائط کی تکمیل تک عیسائی فوج کے پاس یرغمال رہیں گے۔

صلاح الدین ان شرائط کو رد کرسکتا تھا لیکن اسے اپنے تین ہزار سپاہیوں اور دو امیروں کی سخت فکر لاحق تھی۔ وہ ان شرائط کو رد کر بھی دیتا لیکن اس نے مشعلوں کی روشنی میں دشمن کے پرچم فصیل پر لہراتے دیکھ لیے۔ وہ مجلس مشاورت سے چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے امیران نے شہر دشمن کے حوالے کردیا۔

اس فتح کی خوشی ابھی منائی جارہی تھی کہ شاہ فرانس نے اپنی واپسی کا اعلان کردیا۔ کئی فرانسیسی امرا نے اس سے درخواست بھی کی کہ وہ جنگ کے اختتام تک رک جائے لیکن وہ نہ مانا۔ اتنا کیا کہ اپنی کچھ فوج یہاں چھوڑ دی اور خود فرانس واپس چلا گیا۔

اب صلیبی جنگ کی قیادت رچرڈ کے ہاتھوں میں تھی۔

سلطان نے تمام عیسائی اسیروں کو دمشق سے بلوا کر رہا کردیا۔ سلطان بار بار مطالبہ کرتا رہا کہ مسلمان یرغمالیوں کو اس کے پاس بھیجا جائے لیکن رچرڈ اس بات پر اڑا رہا کہ تمام شرائط پوری ہونے کے بعد چھوڑا جائے گا۔

یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا اور پھر رچرڈ نے ان یرغمالیوں کی رہائی کا فیصلہ دوسرے طریقے سے کیا۔ چھبیس سو مسلمان اسیران جنگ کو کھلے میدان میں لے جایا گیا۔ ان قیدیوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے سر قلم کردیے گئے۔ صرف چند اعلیٰ امرا تھے جن کی جاں بخشی کی گئی۔

بعض مورخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ سلطان نے یہ شرط لگادی تھی کہ پہلے وہ یرغمالیوں کو رہا کرئے اس کے بعد عیسائی اسیر چھوڑے جائیں گے۔ رچرڈ نے یہ سوچے بغیر کہ عیسائی اسیروں پر کیا گزرے گی مسلمان اسیروں کو قتل کردیا۔ نیک دل صلاح الدین نے اس کے باوجود عیسائی اسیروں کو قتل نہیں کیا صرف یہ حکم جاری کیا کہ ان سے نرم برتاؤ نہ کیا جائے۔

ہیرلڈ لیم، امریکی مصنف بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوگیا۔

''اس غیر ضروری کشت و خون سے رچرڈ کی ناموس و عزت ہمیشہ کے لیے داغدار ہوگئی۔ سلطان صلاح الدین پر صد آفرین کہ اس عالی حوصلہ انسان نے صرف اعلانیہ جنگ میں دشمن سے بدلہ لیا۔''

اس اثنا میں رچرڈ، یروشلم پر چڑھائی کی تیاریاں کرتا رہا تھا۔

اس نے پیش قدمی کی لیکن صلاح الدین کے لشکر سے لڑائی مول لینے یا فلسطین کا اندرونی علاقہ فتح کرنے کے بجائے اس نے ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف پیش قدمی کی۔ بحری بیڑے نے بادبان کھول دیے اور وہ فوج کے متوازی ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اسے یروشلم کی بندرگاہ ''جافا'' جانا تھا۔

صلاح الدین کو اس کے مخبر اور سوار گشتی دستے رچرڈ کی پیش قدمی کی اطلاعات دیتے رہے۔ اس نے پہاڑیوں کی اوٹ میں صلیبیوں کی متوازی سمت میں حرکت شروع کردی۔

رچرڈ کی فوج بہ مشکل بارہ میل کے فاصلے پر قیصریہ پہنچی تھی کہ اس کے عقب میں مسلمان رسالہ نمودار ہوا۔ عیسائی فوج کا نگراں مسلمانوں کے حملوں اور تیروں کی بوچھاڑ سے عاجز آگیا۔ اب عیسائیوں کے لیے راستہ چلنا دشوار تھا۔ مسلمان جگہ جگہ گھات لگا کر بیٹھ جاتے اور موقع ملتے ہی حملہ کردیتے اور پھر غائب ہوجاتے۔

رچرڈ کے پاس باقاعدہ شکایتیں پہنچنے لگیں۔ اس کے بے شمار گھوڑے تیروں کا نشانہ بن گئے۔ کئی جگہ ایسا بھی ہوا کہ باقاعدہ لڑائی چھڑ گئی۔ مسلمانوں نے یہی طریقہ اپنایا ہوا تھا کہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے اور پھر جھاڑیوں میں چھپ جاتے۔

رچرڈ کے لیے سفر جاری رکھنا دشوار ہوگیا تھا۔ گھنٹوں کا سفر دنوں میں طے ہو رہا تھا۔ جب اس کی فوج ایک جنگل سے گزرنے لگی تو یہ مشہور ہوگیا کہ صلاح الدین کے سپاہی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی جھاڑیوں میں آگ لگادیں گے۔ ہر سپاہی ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ رچرڈ بھی اس راستے سے گزرا۔ وہ خوفزدہ تو نہیں تھا لیکن احتیاط اس پر بھی لازم تھی۔

اس جنگل سے گزرنے کے بعد اس نے میدان میں خیمے ڈال دیے اور آئندہ کی حکمت عملی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ زیادہ دن انگلستان سے دور نہیں رہ سکتا تھا اور یہاں کے ماحول سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہاں کی جنگ برسوں پر محیط ہوسکتی ہے۔ اس کا سابقہ ایک ذہین اور بہادر دشمن سے پڑا ہے۔ دشمن کے لفظ سے اس کا ذہن صلاح الدین کی طرف گیا۔ اگر صلاح الدین سے ملاقات کی جائے تو ممکن ہے اپنی شرائط پر فیصلہ ہوجائے پھر اسے یاد آیا، ایک مرتبہ پہلے بھی اس نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن اس نے انکار کردیا تھا۔ کوئی اور..... کوئی اور۔ اس

کا دھیان ملک العادل کی طرف گیا جو سلطان کا بھائی اور مشیر تھا۔ اس نے ملک العادل کے پاس قاصد بھیجا۔

ملک العادل ایک شاندار رسالے کے ہمراہ رچرڈ سے ملاقات کے لیے آیا۔ رچرڈ، نارمن نائٹوں کے ساتھ اس کے استقبال کو آیا۔ جب وہ مذاکرات کے لیے بیٹھے تو مترجم بھی ان کے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔

رچرڈ نے کہا۔ ''اس جنگ کو کافی مدت ہو چکی ہے۔ دونوں طرف کے بہت سے لوگ مارے جا چکے ہیں۔ اگر مصالحت ہو جائے تو میں اپنے ملک واپس چلا جاؤں۔''

''اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ انسانی جانوں کا زیاں اچھی بات تو نہیں۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں، کچھ شرائط پر ہمارے تمہارے درمیان صلح ہو جائے۔''

''عیسائی کن شرائط پر صلح چاہتے ہیں؟''

''شرائط سادہ بھی ہیں اور آسان بھی۔ یروشلم ہمارے حوالے کر دیا جائے اور مسلمان فوجیں اردن کے پار چلی جائیں۔''

''معاف کیجیے گا۔ اس قسم کی شرائط فاتحین کی زبان سے اچھی لگتی ہیں۔''

''ہم فاتح ہی تو ہیں۔'' رچرڈ کے چہرے پر اس وقت غرور کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے عکہ فتح کیا؟''

''تو پھر اسی طرح دوسرے قلعے بھی فتح کر لیجیے۔ ہم یروشلم واپس کرنے والے نہیں۔'' ملک العادل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''یروشلم عیسائیوں کا مقدس شہر ہے اور اخلاقی اعتبار سے کسی کے مقدس شہر پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔''

''عیسائیوں سے زیادہ یروشلم مسلمانوں کے لیے مقدس ہے۔ یہ کبھی مسلمانوں ہی کے پاس تھا۔ اب پھر مسلمانوں کے پاس آ گیا۔ ہمارے پیغمبر اسی شہر سے معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اس شہر کی خاک ہماری آنکھوں کے لیے سرمہ ہے۔'' ملک العادل نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔

''ملک العادل، آپ مجھے اچھے لگے ہیں۔ شاید دوبارہ ملاقات ہو۔''

''اب تو میدان جنگ ہی میں ملاقات ہو گی۔'' ملک العادل نے کہا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔

شیر دل رچرڈ نے مارے غصے کے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''اف یہ مسلمان۔ یہ اس طرح ماننے والے نہیں ہیں، انہیں کھلے میدان میں شکست دوں گا۔''

مذاکرات کی ناکامی کے بعد اس نے عیسائی فوج کو ''ارسوف'' کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ مسلمان سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر صلیبی لشکر پر چھاپے مارتے اور غائب ہو جاتے۔ گویا مسلمان ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ رچرڈ اپنے لشکر کو بار بار تسلیاں دے رہا تھا کہ یہ ساری مشکلیں عارضی ہیں۔ ارسوف پہنچتے ہی گزرگاہیں صاف ملیں گی۔ کھلے میدان میں آ کر لڑنا مسلمانوں کے بس کا کام نہیں۔

اس کے یہ دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے جب ارسوف پہنچتے ہی اس نے دیکھا کہ اسلامی لشکر ان کا راستہ روکے کھڑا ہے۔

صلیبی لشکر بہ عجلت تمام ارسوف کے باغات اور مورچوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ دونوں طرف سے تیر اندازی شروع ہو گئی۔ جب دونوں لشکروں میں فاصلہ کم ہو گیا تو دوبدو لڑائی شروع ہو گئی۔ ایک ایسا خونریز معرکہ ہوا کہ میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ ہزاروں صلیبی قتل ہو گئے۔ کہا جاتا ہے اس جنگ میں عیسائیوں کے ایک ہزار گھوڑے کام آئے۔

رات ہوئی تو دونوں لشکر پیچھے ہٹ گئے۔ صرف وہ لوگ نظر آ رہے تھے جو اپنے اہم لوگوں کی لاشیں ڈھونڈنے نکلے تھے۔

دوسرے دن صلاح الدین ایوبی بہ نفس نفیس میدان جنگ میں آیا لیکن صلیبیوں کو مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ارسوف کی جنگ تاریخ میں بڑی متنازع رہی ہے۔ عیسائی مورخین اسے عیسائیوں کی فتح کہتے ہیں جبکہ عرب مورخین نے اسے مسلمانوں کی فتح کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک جھڑپ تھی جس میں عیسائیوں کا بھاری تعداد میں نقصان ہوا اور یہ بھی ہوا کہ دونوں کو اپنی اپنی طاقت کا اندازہ ہو گیا اور اب اس روشنی میں آئندہ کے اقدامات طے کرنے تھے۔

رچرڈ کے خیالات معلوم ہو جانے کے بعد ضروری تھا کہ یروشلم کے دفاع کو مضبوط بنایا جائے۔ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جلدی میں ہے اور یروشلم پہنچنے میں دیر نہیں لگائے گا۔

عسقلان وہ شہر تھا جس پر قابض ہونے کے بعد رچرڈ

کو استحکام مل سکتا تھا۔ صلاح الدین اس شہر کو دوسرا ''عکہ'' نہیں بنا سکتا تھا جہاں عیسائی فوجیں آ کر بیٹھ جائیں اور مسلمانوں کے لیے یروشلم کا دفاع مشکل ہو جائے اس نے اس خوبصورت شہر کو مسمار کرنے کا حکم دے دیا۔

عسقلان یروشلم کی کلید تھا۔ یہ مصر کے قافلوں کی شاہراہ پر واقع تھا اور بڑی خوش حال بندرگاہ تھا لیکن صلاح الدین اس کی حفاظت کے لیے خود کو محصور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شہر کو مسمار کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''خدا کی قسم! اس کا ایک پتھر اکھاڑنے کے بجائے میری ساری اولاد مر جاتی لیکن میں کیا کروں۔ امر مجبوری ہے۔''

صلاح الدین نے شہر کی مسماری کا ناگوار فریضہ اپنے لشکر کے سپرد کیا اور امداد کے لیے مزدوروں کی جمعیت بھی مہیا کی۔

صلاح الدین کا سیرت نگار بہاء الدین رقم طراز ہے۔

''جب مزدور شہر میں داخل ہوئے تو گویا ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ یہ شہر نہایت خوش منظر تھا۔ اس کی فصیل مضبوط تھی اور مکان نہایت خوبصورت تھے۔ لوگوں نے اپنا مال اونے پونے بیچ دیا جو وہ اپنے ساتھ مصر نہیں لے جا سکتے تھے۔ ان دنوں ایک درہم کی دس دس مرغیاں بکیں۔ وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر کیمپ میں آ گئے اور گھریلو سامان کی باقی ماندہ چیزیں وہاں فروخت کیں۔ جو بے چارے سواری کا کرایہ ادا کرنے کے قابل نہیں تھے انہیں پیدل سفر کرنا پڑا۔ فوج تکان سے خستہ حال تھی۔ سپاہیوں نے وہ رات خیموں میں بسر کی۔ اف خدایا! یہ کتنی مصیبت کا وقت تھا۔''

صبح ہوتے ہی فصیلوں کے انہدام کا کام شروع ہو گیا۔ سلطان نے شہر میں موجود غلے کے ذخیروں کو مزدوروں میں تقسیم کر دیا۔ مزدوروں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مکانوں کو آگ لگا دی۔

سلطان نے اپنا خیمہ فصیل کے قریب منتقل کرا لیا۔ اس نے شتربانوں اور گدھے ہانکنے والوں تک کو کام پر لگا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کام ختم ہونے سے پہلے عیسائیوں کو اس منصوبے کی خبر ملے اور وہ جوابی کارروائی کریں۔

رچرڈ اس وقت ''جافا'' میں تھا جب اسے عسقلان کی بربادی کی خبر پہنچی۔ اس نے فوراً سرداروں کا اجلاس طلب کیا۔

''معززین! مسلمان عسقلان برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ہمارے خلاف نبرد آزما ہونے کی ہمت نہیں۔ فوراً اٹھو اور اس شہر کو بچا لو۔ اگر نہ بچا سکے تو دمشق، موصل اور پورے مصر کو آگ کے حوالے کر دو۔''

اس کی فوج ایسی عیش پسند اور بددل ہو گئی تھی کہ پیش قدمی میں دیر لگاتی رہی۔ زیتون کے جھنڈوں پر بہ دستور پرچم لہراتے رہے۔ خشک شمالی ہوائیں چلتی رہیں۔ نہروں کے شاداب کناروں پر گھوڑے مزے سے چرتے رہے اور آدمی بڑے شوق سے پکے ہوئے انگور اور تازہ انجیر کھاتے رہے یا پھر یہ بحث کرتے رہے کہ اب کیا کریں۔ آخر یہ طے پایا کہ سب سے پہلے جافا کی دیواروں کی مرمت کرنی چاہیے۔

رچرڈ نے ارکان کونسل کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو ایک مرتبہ پھر اس کا دھیان ملک العادل کی طرف گیا۔ رچرڈ نے اسے دوبارہ بلوایا۔ ملک العادل اس سے ملنے کے لیے آیا تو رچرڈ نے اظہار دوستی کے لیے عمدہ اونٹ اور... ساز و سامان سے آراستہ گھوڑے ملک العادل کی خدمت میں پیش کیے۔ پر تکلف کھانوں کی طشت منگوائے اور دیر تک ملک العادل کی دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

اس مجلس میں خلاف توقع صلح کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کی تعریفیں کرتے رہے اور مجلس برخاست ہو گئی۔

اس دوستی کے باوجود جنگی معاملات اپنی جگہ تھے۔ رچرڈ نچلا بیٹھنے والا نہیں تھا۔ مسلمان سواروں سے اس کی روزانہ جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں جن میں رچرڈ کو اپنی بہادری اور جواں مردی کے جوہر دکھانے کے مواقع ملتے رہتے وہ اکثر چند سوار لے کر دشمن کے گشتی دستوں کا سراغ لگانے نکل جاتا اور انہیں مار بھگاتا۔ ایک مرتبہ تو اس کی جان کو سخت خطرہ درپیش آ گیا تھا۔ وہ مٹھی بھر سپاہیوں کو لے کر دشمن کی تلاش میں نکلا اور تھک کر ایک جگہ سو گیا۔ تقی الدین کے ترک گشتی سوار گھات میں لگے ہوئے تھے۔ وہ دبے پاؤں اس کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ بہ مشکل اسے بیدار کیا گیا۔ اچانک بیدار ہونے پر بھی اس کے اوسان خطا نہیں ہوئے۔ وہ کود کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا لیکن بھاگنے کا موقع نہ مل سکا۔ ترکوں نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔ دونوں طرف سے شمشیریں چلنے لگیں۔ ترکوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ یا ان میں سے کوئی رچرڈ بھی ہے۔ اسی وقت رچرڈ کے

ایک وفادار نے اپنی شناخت کرائی۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ میں شاہ انگلستان رچرڈ ہوں۔ دنیا مجھے شیر دل کے نام سے جانتی ہے۔''

رچرڈ کا نام سنتے ہی مسلمان اس پر جھپٹ پڑے اور یورش کر کے اس وفادار ساتھی کو پکڑ لیا اور اپنے لشکر میں لے گئے۔

جب میدان صاف ہوگیا تو اس کے خیر خواہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''خدارا ایسا نہ کیا کیجیے۔ یہ آپ کے شایان شان نہیں۔ آپ اکیلے نہ جایا کریں۔ آپ کی زندگی سے ہماری زندگیاں وابستہ ہیں۔''

وہ جنگ کو کھیل سمجھ کر گزار رہا تھا۔ اسی لیے تاخیر ہوتی جارہی تھی۔ صلاح الدین کو موقع مل رہا تھا کہ وہ یروشلم کے دفاع کی تیاریاں کر سکے۔

وہ اپنی عزت بچانے کے لیے کسی اور ہی راہ چلنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ شاید وہ جان چکا تھا کہ جس طرح شاہ فرانس اسے چھوڑ کر چلا گیا اسی طرح اطالوی اور آسٹریائی فوجیں بھی اسے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ اس سے پہلے ہی کوئی باعزت راستہ نکال لیا جائے۔

اسے جنگ وجدل ختم کرانے کی انوکھی تدبیر سوجھی۔ اس نے اپنی بہن کی شادی ملک العادل سے کرنے کی تجویز پیش کردی اور یہ تجویز رکھی کہ شادی کے بعد مسلمانوں کی طرف سے صلاح الدین اور صلیبیوں کی طرف سے شاہ انگلستان اپنے اپنے مفتوحہ علاقے نئے شادی شدہ جوڑے کو پیش کردیں۔ اس طرح یروشلم دونوں (عیسائی، مسلمان) کا ہوجائے گا۔ زائرین آزادانہ مقامات مقدسہ کی زیارت کرسکیں گے اور مقدس صلیب عیسائیوں کو واپس مل جائے گی۔

''میں اپنے بھائی سلطان صلاح الدین کے مشورے کے بغیر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

''مجھے یقین ہے وہ تجویز سے اتفاق کریں گے کیونکہ بے نتیجہ جنگ سے وہ بھی تنگ آچکے ہوں گے۔''

''پھر بھی ان سے بات کرنا ضروری ہے۔''

سلطان کے سامنے جب ذکر آیا تو وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ کسی نے پوچھا۔ ''کیا آپ قبول کرلیں گے؟''

سلطان نے کہا۔ ''ہاں کیوں نہیں۔'' لیکن چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ تجویز ناقابل عمل ہے۔

یہی ہوا بھی۔ رچرڈ کو کہنا پڑا۔ ''میری بہن کسی مسلمان سے شادی پر تیار نہیں۔''

یہ معلوم نہیں کہ یہ پیش کش محض اپنا خلوص ظاہر کرنے کے لیے ایک چال تھی یا وہ واقعی ایسا چاہتا تھا۔

جب جافا کی تعمیر مکمل ہوگئی تو عکہ سے فوج بلائی گئی۔ صلیبی آگے بڑھے۔ کمین گاہیں بنا کر آگے بڑھتے گئے۔ اب یروشلم کی سڑک ان کے سامنے تھی۔ یہ سڑک عمیق گھاٹیوں اور دشوار چٹانوں پر سے بل کھاتی اور اوپر چڑھتی ہوئی پہاڑیوں میں گم ہوجاتی تھی۔ صرف بارہ میل کے فاصلے پر یروشلم کا مقدس شہر تھا۔

یروشلم سامنے تھا لیکن بہت تاخیر ہوگئی تھی۔ بارش شروع ہوگئی تھی۔ صلیبی سپاہی یروشلم کی زیارت کے لیے بے تاب تھے لیکن رچرڈ اس پُرخطر اقدام کے نتائج سے واقف تھا۔ صلیبی سرداروں اور رچرڈ کے درمیان اتنی تکرار ہوئی کہ رچرڈ قیادت سے استعفیٰ دینے کو تیار ہوگیا۔

اطالوی اور آسٹریائی سرداروں نے صاف کہہ دیا۔

''اگر یروشلم کی طرف پیش قدمی نہیں کی گئی تو ہم اپنے وطن واپس چلے جائیں گے۔''

اس دھمکی کے باوجود رچرڈ نے استعفیٰ تو نہیں دیا لیکن یہ حکم جاری کردیا کہ ساری فوج عسقلان کو واپس ہوجائے اور اس کی شہر پناہ بنائے۔

رچرڈ اکثر یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اس جنگ سے ہمیں کیا ملا۔ ہزاروں عیسائی کٹ گئے۔ ہمارے دو شہر تباہ ہوگئے۔

عسقلان واپسی کی خبر پھیلی تو فوج میں ہر طرف مایوسی اور حسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بہت سے لوگ بے قابو ہوگئے اور اپنے طویل قیام کو کوسنے لگے۔

رملہ میں بھی فوج تھی لیکن عام بددلی اور مایوسی پھیل جانے کی وجہ سے اس کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا۔ بے شمار فرانسیسی ڈیوک آف برگنڈی کے ہمراہ چلے گئے۔ شاہ یروشلم بھی چلا گیا۔

رچرڈ اپنی فوج کو لے کر عسقلان میں داخل ہوا تو شہر ویران تھا۔ ملبے کے ڈھیر تھے اور جلے ہوئے مکانات۔

عسقلان کی شہر پناہ تعمیر ہو رہی تھی کہ ایک مرتبہ پھر رچرڈ کو صلاح الدین سے مصالحت کی گفتگو کا خیال آیا۔

اس نے اپنے سفیروں کو ہدایت کی۔ ''سلطان کو میرا سلام پیش کرنے کے بعد کہنا کہ جنگ سے مسلمان اور عیسائی بے حال ہوگئے ہیں لیکن جب تک ہماری جان میں جان ہے ہم یروشلم سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ آپ

دریائے اردن تک سارا علاقہ ہمارے حوالے کردیں۔ صلیب الصبوت آپ کے لیے بے وقعت لکڑی ہے لیکن ہمارے لیے نہایت مقدس مذہبی تبرک ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اسے ازراہِ کرم ہمیں واپس کردیں گے۔''

صلاح الدین نے اپنے امیروں سے مشورے کے بعد جواب روانہ کردیا۔

''ہم یروشلم کو آپ سے بھی زیادہ مقدس سمجھتے ہیں۔ یہ خیال بھی نہ کریں کہ ہم کبھی یہ مقدس مقام آپ کے حوالے کردیں گے۔ یاد رکھیں کہ یہ سرزمین ہماری ہے اور آپ لوگ حملہ آوروں کی حیثیت سے یہاں وارد ہوئے ہیں۔ اس لیے آپ کو اس سے دست کش ہونا پڑے گا۔ اگر آپ نے ایک مرتبہ اسے فتح کرلیا تو اس سے آپ کو مستقل قبضے کا حق نہیں پہنچتا۔ آپ نے پہلی مرتبہ بھی اچانک دھاوا بول کر اس پر قبضہ جمالیا تھا۔ اب جب تک جنگ جاری رہے گی ہم آپ کو اس شہر سے ایک پتھر بھی ہلانے نہیں دیں گے۔''

صلاح الدین کے پاس بجا طور پر یہ جواز موجود تھا کہ اگر صلح کر بھی لی جائے تو عیسائیوں کی بدعہدی اور وعدہ شکنی کی کیا ضمانت ہے۔

☆☆☆

سرزمینِ قدس میں گرمیوں کا موسم آنے کو تھا۔ صلاح الدین ایوبی کو اردن پار کیے پورے پانچ سال گزر چکے تھے۔

صلیبی پڑاؤ میدان میں تھا۔ صلیبیوں کے دستے میدانی علاقوں میں تاخت وتاراج میں مصروف رہتے تھے لیکن ان کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ یروشلم کی طرف بڑھتے۔

صلاح الدین سے مذاکرات ناکام ہونے کے بعد محض اپنی موجودگی جتانے اور صلیبیوں کو جنگ میں الجھائے رکھنے کے لیے داروم کے قلعے پر دھاوا بول دیا۔ یہ قلعہ مصر کے راستے میں واقع تھا۔ یہاں سے سمندر صاف نظر آتا تھا۔ جب صلاح الدین نے اسے فتح کیا تھا تو اس کے مورچے بھی مسمار کرادیے تھے۔ صلیبیوں نے دھاوا بول کر تمام مسلمانوں کو تہ تیغ کردیا۔ پھر وہ یورش کر کے ریت کے ٹیلوں پر واقع غزہ کے باغات تک جا پہنچے۔

انہی دنوں لشکر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ رچرڈ انگلستان واپس جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ انگلستان میں اس کے تاج وتخت کے خلاف سازش ہو رہی ہے لہٰذا اسے جانا ہی پڑے گا۔

رچرڈ ان افواہوں سے بے خبر کسی گہری سوچ میں گم رہنے لگا تھا۔ غالباً آنے والے حالات اسے فکر میں مبتلا کر رہے تھے۔ اس کا ذاتی پادری ولیم آف پوشواس کی طرف سے فکرمند رہنے لگا تھا۔ وہ افواہیں بھی سن رہا تھا اور بادشاہ کی حالت بھی دیکھ رہا تھا۔ آخر ایک روز اس نے رچرڈ سے پوچھ ہی لیا۔

''خداوند! لوگ آپ کو الزام دے رہے ہیں کہ آپ واپس جانا چاہتے ہیں۔ یہ بات سارے لشکر میں پھیل چکی ہے۔ خدا کرے وہ دن کبھی نہ آئے جب آپ ہمیں چھوڑ کر جائیں۔ اگر آپ نے اس سرزمین کو یوں بے یارومددگار چھوڑ دیا تو دشمن اسے روند ڈالے گا اور یہ بڑی غداری ہوگی۔''

خیمے پر سکوت طاری تھا۔ پادری کو جو کہنا تھا کہہ چکا تھا۔ رچرڈ بہ دستور خاموش تھا لیکن اس کے سنہری بال پریشان تھے۔ وہ گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ پادری خاموشی سے اٹھ کر خیمے سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن رچرڈ کے حکم پر اس کے نقیب عسقلان کے دروازے پر کھڑے ہوکر اعلان کر رہے تھے۔

''رچرڈ شیر دل کا حکم ہے کہ ہم کسی دنیاوی تنازعے یا ترغیب سے متاثر نہیں ہوں گے اور آئندہ ایسٹر تک سرزمین مقدس میں مقیم رہیں گے۔ اس لیے سب لوگوں کو یروشلم کی طرف اقدام کے لیے کمربستہ ہوجانا چاہیے۔''

فوج میں شادمانی ومسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف فتح یروشلم کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ آپس میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں ''اب ہمیں مزار مسیحؑ کی زیارت ضرور نصیب ہوگی۔''

یروشلم جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

یہ فوج تل صافیہ اور نائٹوں کے ٹورون کے خرابات سے تیزی سے گزرتی ہوئی دامن کوہ کی طرف بڑھی اور بیت النبیل کے جھونپڑوں تک پہنچی۔ اس مقام پر فرانسیسی بھی ان سے آملے۔ یہاں سے سڑک ایک گہری کھائی سے بل کھاتی ہوئی یروشلم کی طرف جاتی تھی۔ عیسائی فوج کو مجبوراً یہاں رکنا پڑا تھا کیونکہ مسلمان سواروں کے گشتی دستے ایک مرتبہ پھر ان پر اور ان کے سامانِ رسد کے قافلوں پر چھاپے مارنے لگے تھے۔

سلطان کو صلیبیوں کی نقل وحرکت کی خبریں روزانہ پہنچ رہی تھیں۔ اس نے یروشلم کی فصیل کی تعمیر کا کام شروع کرادیا۔ اب اس کی ساری توجہ یروشلم کے دفاع کی جانب تھی۔

سلطان نے بڑی ہوشیاری سے بیت المقدس کے قرب و جوار میں آب رسانی کے تمام وسائل مسدود کردیے، چشمے بند کرادیے، حوض پاٹ دیے اور کنویں تڑوا دیے۔ شہر سے باہر پانی کا ایک قطرہ بھی ملنا محال ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام ولایتوں کو قاصد دوڑا دیے کہ جلد کمک بھیجیں۔

رچرڈ تک یہ خبریں پہنچ چکی تھیں کہ سلطان نے پانی کے ذخائر ختم کرادیے ہیں۔ اب وہ آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا جبکہ اس کی فوج اور سردار پیش قدمی کے لیے بے چین تھے۔ بالآخر رچرڈ کو اپنے اندیشے ظاہر کرنے پڑے۔

''اس مقام سے آگے پانی کے تمام ذرائع برباد کردیے گئے ہیں۔ شہر کے قریب پانی مفقود ہے۔ ہم گھوڑوں کو پانی کہاں سے پلائیں گے؟''

اس کے جواب میں کسی نے کہا۔ ''شہر سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر تکواندی بہتی ہے۔ پانی وہاں مل سکتا ہے۔''

رچرڈ نے پوچھا۔ ''ہم وہاں گھوڑوں کو کیسے پانی پلا سکتے ہیں؟''

سرداروں نے جواب دیا۔ ''ہم فوج کے دو حصے کردیں گے۔ ایک حصہ سوار ہوکر جائے گا اور گھاٹ سے گھوڑوں کو پانی پلا لائے گا اور دوسرا حصہ شہر کا محاصرہ جاری رکھے گا۔''

رچرڈ کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ ''جب فوج کا ایک حصہ گھوڑوں کو پانی پلانے گیا ہوا ہوگا، دشمن شہر سے نکل کر باقی ماندہ فوج پر حملہ کرکے اسے فنا کردے گا۔''

یہ بحث کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوگئی۔ انتظار کیا جانے لگا کہ کوئی اور تجویز سامنے آئے لیکن یہ ایک قسم کی پسپائی ہی تو تھی۔ فوجیں اس لیے تو نہیں آئی تھیں کہ دور کھڑی یروشلم کو دیکھتی رہیں۔

پسپا ہوتے ہی صلیبی فوج منتشر ہوگئی۔ فرانسیسی ایسے خفا ہوئے کہ ان سے مصالحت ناممکن ہوگئی۔ غصے میں اٹھے اور شمال کی طرف چل دیے۔ اطالوی سپاہی ساحل کے تجارتی قلعوں کی طرف بھاگے۔ عسقلان کی نئی دیواروں کی حفاظت کے لیے ٹمپلر اور ہاسٹپلر باقی رہ گئے۔

رچرڈ عکہ کی طرف چلا گیا۔ اب اسے انگلستان جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس نے اتنی دیر بھی اس لیے لگا دی تھی کہ صلیبی سپاہی یروشلم کی تسخیر کے لیے بضد تھے۔ اب وہ خود ہی بکھر گئے تھے تو اس کے لیے راستہ صاف تھا۔ وہ عکہ میں اپنی بیگمات سے ملا۔ اس نے اپنی سپاہ کو جہازوں پر سوار ہونے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا۔ وہ یہاں سے بیروت اور وہاں سے انگلستان جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

صلاح الدین نے اس موقعے کا فائدہ اٹھایا۔ اب مدافعت کا وقت نہیں تھا۔ پیچھے ہٹتی ہوئی صلیبی افواج پر یورش کرنے کا وقت تھا۔ اب یروشلم کو کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے دفاع کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے سوار دستوں کو ''جافا'' پر یورش کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ وہی شہر تھا رچرڈ نے جس کی تعمیر و مرمت میں بہت جانفشانی دکھائی تھی۔

صلاح الدین کے بیس ہزار سوار آگے بڑھے اور جافا کی شہر پناہ کے گرد پھیل گئے۔ شہر میں اس وقت تقریباً پانچ ہزار عیسائی تھے جو فصیل کے اندر پھنس کر رہ گئے۔ وہ مدافعت پر کمر بستہ ہوئے اور رچرڈ کو بلانے کے لیے ایک جہاز عکہ کی طرف روانہ کردیا۔

رچرڈ اپنے خیمے میں تھا اور بیروت جانے کی تیاریاں کررہا تھا کہ جافا سے قاصد پہنچ گیا۔

''جافا دشمن نے لے لیا ہے۔ بچے کھچے عیسائی قلعے میں محصور ہیں۔ اگر امداد نہ پہنچی تو سب کے سب مارے جائیں گے۔''

رچرڈ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مسلمانوں کی قسمت اچھی نہیں ہے کہ میں بیروت روانہ نہیں ہوا۔ اب میں اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے جافا ضرور جاؤں گا۔ کاش وہ اس وقت تک مدافعت کرسکیں۔''

اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ بیروت جاچکا تھا۔ انہیں بلانا اب ممکن نہیں تھا۔ فرانسیسیوں نے اس کے پرچم تلے لڑنے سے انکار کردیا۔ اس کے پاس اس کے چند سو مسلح سپاہی اور جینوا کے رضا کار تیر انداز شامل تھے۔ وہ انہیں لے کر جہازوں میں سوار ہوگیا۔ جہاز تیزی سے چل رہے تھے لیکن اچانک ہوا مخالف ہوگئی کھلے سمندر میں دو دن رکنا پڑ گیا۔

وہ رات کا وقت تھا جب رچرڈ کے جہاز جافا پہنچے۔ رات کے اندھیرے میں ساحل پر اترنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سب کے سب صبح ہونے کے انتظار میں جاگتے رہے۔

صبح ہوئی تو یہ دیکھ کر سب کے حوصلے پست ہوگئے۔ ساحل کی ریت پر عربوں اور ترکوں کا ہجوم تھا۔ شہر کی عقبی فصیل سے بل کھاتا ہوا دھواں اٹھ رہا تھا۔ دور کہیں فصیل سے متصل کھجوروں کے جھنڈ میں مسلمانوں کے خیمے

نصب تھے۔ پرچم ہوا میں لہرا رہے تھے۔ قلعے میں زندگی کے مطلق آثار نہیں تھے۔ ''شاید قلعے کے سارے لوگ مارے جاچکے۔'' رچرڈ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''ساحل پر اترنا مشکل ہے۔ اتریں بھی تو کس کے لیے اتریں۔ ہمیں دیر ہوگئی۔ قلعے کے سارے لوگ مارے جاچکے ہیں۔ دھواں بتا رہا ہے کہ شہر کو آگ لگا دی گئی ہے۔'' وہ اپنے نائٹوں سے مخاطب ہوا اور کسی امیدِ موہوم میں کشتیاں ساحل کے قریب لے آیا۔

قلعے کی دیوار سے ایک آدمی ریت پر گرا۔ چند لمحے بے حس و حرکت پڑا رہا اور پھر بھاگتا ہوا مسلمانوں کی صفوں سے نکل گیا اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

یہ قلعے کا پادری تھا جو رچرڈ کو صورت حال سے باخبر کرنے کے لیے آیا تھا۔ وہ اس کشتی کے قریب پہنچ گیا جس پر سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ملاحوں نے اسے اوپر گھسیٹ لیا۔ اب وہ رچرڈ کے سامنے تھا۔

''بادشاہ سلامت! قلعے میں لوگ آپ کے منتظر ہیں۔''

''کیا کوئی زندہ بھی ہے؟''

''ڈھائی ہزار سے زیادہ اس معرکے میں کام آگئے لیکن اتنے ہی اب بھی برجوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔''

''اب ہمارا سمندر میں رہنا حرام ہے۔'' رچرڈ نے چیخ کر کہا اور ملاحوں کو حکم دیا کہ کشتی کو ساحل کی ریت سے ٹکرا دیں۔

دوسری کشتیوں نے بھی اس سرخ کشتی کی تقلید کی۔ سپاہیوں نے اپنے سینوں پر صلیب کے نشان بنائے۔ تلواریں برہنہ کرلیں لیکن سب حیران تھے، دیوانہ رچرڈ کیا کرنے والا ہے۔ ساحل پر مسلمان ہیں اور یہ کشتی کو اسی طرف لے جارہا ہے۔

رچرڈ نے نہ کوئی حکم جاری کیا اور نہ کسی ترتیب کی پروا کی، کمر کمر پانی میں اتر کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے کندھے پر کمان تھی، تلوار پہلو سے لٹک رہی تھی۔ اس نے کمان سنبھالی اور تیر برساتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے نائٹ بھی آپہنچے۔ کنارے پر پہنچ کر انہوں نے تلواریں سونت لیں۔ تیر انداز تیر برسانے لگے۔

دراصل مسلمانوں کو یہ توقع ہی نہیں تھی کہ وہ کنارے پر اترنے کی ہمت کرے گا۔ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہورہے تھے۔

رچرڈ نے صفوں میں جگہ بنائی اور فصیل کے بغلی دروازے تک جا پہنچا۔ اس کے نائٹ بھی پیچھے پیچھے چلے آئے۔

شہر میں لوٹ مار جاری تھی۔ دکانیں اور بازار سامان سے خالی کیے جارہے تھے۔ وہ قلعے کی طرف بھاگے جارہے تھے۔ اہل قلعہ چھتوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ رچرڈ کو دیکھ کر ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ قلعے سے باہر نکل آئے اور بازار میں موجود غیر منظم مسلمانوں کو مارنا شروع کردیا۔ لوگ شہر سے نکلنے کے لیے باہر کی طرف بھاگے۔ بہت سے لوگ اس بھیڑ میں کچلے بھی گئے۔

بہاء الدین مصاحبِ خاص کا بیان ہے کہ میں سوار تھا۔ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا صلاح الدین کے پاس پہنچا جو شہر سے کچھ فاصلے پر مقیم تھا۔ اس وقت دو سفیر، جن میں سے ایک جافا کا سالار تھا، سلطان کے پاس صلح کی درخواست لے کر آئے ہوئے تھے۔ سلطان دستخط کرنے ہی والا تھا کہ میں پہنچ گیا اور ساری صورتِ حال سے اسے آگاہ کردیا۔ دشمن کے حملے سے بھاگتے ہوئے کچھ مسلمان بھی آن پہنچے۔ سلطان نے حکم دیا کہ ان سفیروں کو گرفتار کرلو اور گھوڑوں پر سوار ہوکر تیار ہوجاؤ۔''

دوسری طرف یہ حال ہوا کہ عیسائی سپاہی کشتیوں سے کودے اور مسلمانوں کے منظم دستوں کی آمد سے پہلے ہی کنارِ ساحل پر قبضہ کرلیا۔ شہر سے بھاگ کر آنے والوں کی وجہ سے یہ حال ہوا کہ بیرون شہر کی فوج بھی ایک بھیڑ سی بن کر رہ گئی۔

صلاح الدین کو مجبوراً قریبی پہاڑی کی طرف پسپا ہونا پڑا کیونکہ شہریوں کے اس ہجوم میں جنگ لڑنا آسان نہیں تھا جبکہ اس کے ساتھ فوج بھی زیادہ نہیں تھی۔

صلاح الدین کئی میل پیچھے چلا گیا تھا اور رچرڈ نے وہاں خیمہ لگایا تھا جہاں کچھ دیر پہلے صلاح الدین کا خیمہ لگا ہوا تھا۔

رچرڈ نے جافا بچالیا تھا۔ اسے تسلیم کرنا پڑا ''میرا خیال تھا سلطان کو جافا فتح کرنے میں دو مہینے سے بھی زیادہ وقت لگے گا لیکن اس نے دنوں ہی میں اس کا صفایا کردیا۔''

اس نے پے در پے شراب کے کئی جام خالی کیے۔ پھر اس نے صلاح الدین کے نام پیغام بھیجا۔

''میں وہ تمام مطالبات واپس لیتا ہوں جو میں نے ملک العادل سے کیے تھے۔ سلطان صرف ایک گرجا مجھے بخش دے اور میں اسے اس کا نعم البدل پیش کروں گا۔''

سلطان کی طرف سے اس کا جواب آگیا۔

"اگرچہ آپ نے ان تمام شہروں پر تصرف کرلیا ہے لیکن آپ کو خوب معلوم ہے کہ آپ کی روانگی کے بعد یہ شہر دوبارہ ہمارے تسلط میں آجائیں گے۔"

وہ سلطان کے اس جواب سے مایوس ضرور ہوا لیکن خیمہ زن رہا اور اسلامی فوجوں کی واپسی کا منتظر کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب تک صلاح الدین یہاں ہے اس کی یہ فتح ادھوری رہے گی۔

☆☆☆

اندھیرے کی چادر اتنی دبیز تھی کہ ہاتھ بھر سامنے کی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ انجیر اور کھجور کے درخت سیاہی کے بڑے بڑے دھبوں میں تحلیل ہوگئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی کتا بھونکنے لگتا تھا۔ اچانک کتوں کے بھونکنے کی آوازوں میں شدت آگئی۔

پڑاؤ میں نیند پہرا دے رہی تھی۔ کتوں کے بھونکنے سے ایک سپاہی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ یونہی ٹہلتا ہوا خیمے سے باہر نکل آیا۔ کوئی غیر مرئی طاقت اسے پڑاؤ سے باہر لے گئی۔ پھر خوف سے اس کی رگوں میں اس کا لہو جمنے لگا۔

کچھ آدمیوں کو اس نے گھوڑوں پر سوار پڑاؤ کی طرف آتے دیکھا۔ یہ گھوڑے شاید اسے نظر بھی نہ آئے۔ ان سواروں کے سروں پر رکھے صیقل شدہ خود چمک رہے تھے۔ اس سے اس نے پہچان لیا کہ کوئی ہے۔ وہ الٹے قدموں پڑاؤ کی طرف بھاگا۔

"تیار ہوجاؤ حملہ ہونے کو ہے۔ مسلمان...... مسلمان۔" وہ گھبراہٹ میں بے ربط جملے بول رہا تھا۔

کئی دراز قامت نائٹ اپنے خیموں سے نکل آئے۔ سپاہیوں نے زرہ بکتر پہنی، تلواریں لگائیں۔ شاہ رچرڈ بھی نکل آیا۔ جلدی سے گھوڑے پر سوار ہوا۔

یہ عجیب بات تھی کہ حملہ آور اب تک نہیں پہنچے تھے حالانکہ انہیں بہت قریب دیکھا گیا تھا۔ شاید مسلمان دیکھ چکے تھے کہ پڑاؤ میں ان کی آمد کی خبر ہوگئی ہے۔

رچرڈ کے فوجی پوری طرح تیار تھے۔

یہ شبہ بھی کیا جا رہا تھا کہ شاید اس شخص کو دھوکا ہوا ہے۔ مسلمان ہوتے تو اب تک حملہ آور ہو چکے ہوتے۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ رچرڈ گھوڑے پر سوار ہدایات دیتا پھر رہا تھا کہ اچانک مسلمانوں نے حملہ کردیا، ہر طرف شور مچ گیا۔ مسلمان حملہ آور تعداد میں زیادہ نہیں تھے۔ غالباً وہ شب خون مارنے آئے تھے اور اب مشرقی افق پر صبح کی نارنجی روشنی پھیلنے لگی تھی۔

مسلمانوں نے براہ راست رچرڈ کے سرخ علم پر دھاوا کیا۔ تلواروں سے تلواریں ٹکرائیں۔ کمانوں سے تیر سائیں سائیں کرکے گزرنے لگے۔ نیزوں سے گھوڑے چھد گئے۔ دوپہر ہوگئی تھی اور مقابلہ جاری تھا۔ رچرڈ کا گھوڑا بے کار ہوگیا تھا۔ وہ ایک نکمے گھوڑے پر سوار اپنا دفاع کرتا پھر رہا تھا۔ وہ ایک اچھا شمشیر زن تھا ورنہ اس نکمے گھوڑے پر سوار ہوکر لڑنا آسان نہیں تھا۔

اتنی دیر میں مسلمانوں کی طرف سے ایک غیر مسلح ترک سوار آیا۔ اس نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھا رکھا تھا اور بائیں ہاتھ میں دو عمدہ گھوڑوں کی لگامیں تھیں۔ نائٹوں نے حفاظت کی غرض سے رچرڈ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس ترک سوار کو آنے دیا۔ وہ سوار رچرڈ کے قریب آگیا۔

"اے نوجوان، کس غرض سے آیا ہے اور کیا مقصد ہے؟"

"ہمارے آقا ملک العادل نے یہ گھوڑے شاہ انگلستان کے لیے بھیجے ہیں۔ ہم مسلمان یہ کبھی گوارا نہیں کرتے کہ دشمن کو بے دست و پا کرکے لڑیں۔ شاہ انگلستان ایک نکمے گھوڑے پر سوار ہوکر لڑیں، ملک العادل سے یہ دیکھا نہیں گیا۔"

قریب کھڑے نائٹوں نے رچرڈ کو مشورہ دیا۔ "جناب، یہ کوئی چال ہے۔ آپ ان گھوڑوں پر ہرگز سوار نہ ہوں۔ یہ آپ کو لے کر مسلمانوں کی طرف بھاگ جائیں گے۔"

رچرڈ نے اس مشورے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور پھلانگ کر گھوڑے پر بیٹھ گیا۔

ترک سوار واپس چلا گیا۔ جنگ پھر شروع ہوگئی۔

چاشت کے وقت تک جنگ کا پانسا پلٹ گیا۔ عیسائیوں کو مات ہونے لگی تھی۔ سلطان کے سوار تیر اندازوں نے تابڑ توڑ حملے کرکے عیسائی صفوں کو درہم برہم کردیا۔ کشتی ران کشتیوں میں جا کر چھپ گئے۔ کچھ شہر کی طرف بھاگے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور فصیل کے شگافوں کے ذریعے شہر میں گھس گئے۔ رچرڈ کو یہ صورت حال معلوم ہوئی تو وہ بھی اپنے سواروں کے ساتھ شہر میں چلا گیا۔ دوبدو لڑائی شروع ہوگئی لیکن غضب یہ ہوا کہ رچرڈ کے سپاہیوں نے فصیل کا شگاف بند کردیا۔ جو مسلمان اندر تھے وہ بے ترتیب تھے۔ قتل کردیے گئے یا کسی نہ کسی طرح باہر کی جانب بھاگے۔

سلطان اب صرف محاصرہ کرسکتا تھا۔ عیسائی شہر پر قابض ہوچکے تھے۔ سلطان نے اس وقت محاصرہ کرنے کو خلاف مصلحت سمجھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ رچرڈ انگلستان واپسی کے لیے پر تول رہا ہے اور یروشلم فی الحال بالکل محفوظ ہے۔ عیسائیوں میں پھوٹ پڑ چکی ہے۔ اگر وہ جافا پر قابض بھی ہوگئے تو یروشلم کی طرف پیش قدمی نہیں کرسکتے۔ رچرڈ کی واپسی کے بعد ان کی طاقت بالکل ہی ٹوٹ جائے گی۔ جافا اس وقت فتح کیا جاسکتا ہے۔

سلطان نے مراجعت کا حکم دے دیا اور اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔

رچرڈ نے عارضی طور پر سہی، جافا کو بچا لیا لیکن خود بیمار پڑ گیا۔ گرمی اور غلاظت سے فوج میں بھی بیماری پھیل گئی۔ کثیر تعداد میں لوگ مرنے لگے۔ رچرڈ کی جان کو خطرہ تھا۔ نائٹوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے "عکہ" لے جائیں وہاں اس کا علاج بھی ہوسکتا تھا اور صلاح الدین کی دست برد سے محفوظ بھی ہوجاتا کیونکہ خبریں یہ آرہی تھیں کہ صلاح الدین کو مصر سے فوجی کمک پہنچ گئی ہے۔ اس وقت جنوب میں فرانسیسی فوج قیصریہ کے پاس خیمہ زن تھی لیکن وہ رچرڈ کے پرچم تلے لڑنے کو تیار نہیں تھی۔ انہوں نے جافا کو بے یارومددگار چھوڑا اور رچرڈ کو لے کر عکہ آگئے۔

رچرڈ بیمار بھی تھا اور افسردہ بھی۔ وہ یہ جنگ جیت کر بھی ہار گیا تھا۔ اسے اب کسی پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ اگر اس وقت صلاح الدین حملہ کردیتا تو وہ بستر علالت پر تھا۔ اس نے بے بسی کے عالم میں ملک العادل کے نام پیغام لکھوایا۔

"میں صلح چاہتا ہوں۔ صلح کی جو شرائط آپ طے کریں مجھے منظور ہیں البتہ عسقلان کو میں کسی قیمت پر آپ کے حوالے نہیں کروں گا۔"

رچرڈ کا پیغام ابھی پہنچا بھی نہیں تھا کہ چند نائٹ ملک العادل کے پاس گئے اور اس سے صلح کی شرائط طے کرلیں۔

شرائط صلح نہایت سادہ تھیں۔ فریقین اپنے اپنے مفتوحہ علاقوں پر قابض رہیں گے۔ اس طرح عیسائی صور سے لے کر جافا تک کے ساحلی علاقے کے مسلمہ حاکم بن گئے۔ ساحلی علاقے میں عکہ کی بندرگاہ کے علاوہ ساحل کے نواحی گاؤں بھی شامل تھے جو ساحل سے دامن کوہ تک واقع تھے۔ "رملہ" جو جافا اور یروشلم کے درمیان زائرین کی شاہراہ پر واقع تھا یکساں طور پر فریقین کے قبضے میں رہے گا۔ عیسائی زائرین خراج ادا کیے بغیر یروشلم کی زیارت کرسکیں گے۔

عسقلان عیسائیوں کے ہاتھ سے چلا گیا۔ صلح کی میعاد تین سال قرار پائی۔

صلح کے معاہدے پر دستخط ہونے سے قبل اس کی خبر سلطان کو کی گئی۔ سلطان بضد تھا کہ فیصلہ کن فتح تک جنگ جاری رکھی جائے۔ وہ خونریزی اور جنگ کا قائل نہیں تھا۔ ہمیشہ اس بات کا قائل رہا تھا کہ جنگ سے صلح بہتر ہے لیکن عیسائی ہمیشہ معاہدے توڑتے رہے تھے لہٰذا اب وہ ان کی طرف سے مایوس ہوچکا تھا۔ وہ بوڑھا بھی ہوچکا تھا۔ مرنے سے پہلے فیصلہ کن فتح دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا۔

"میں صلح کرنے سے ڈرتا ہوں۔ نہ جانے میری موت کے بعد حالات کیا ہوں؟"

اس کی فوج مسلسل جنگ سے بیزار ہوچکی تھی۔ اس کے امیر بھی یہی چاہتے تھے کہ اس موقعے پر صلح ہوجائے جبکہ شرائط بھی نرم تھیں۔

صلاح الدین مجبور ہوگیا۔ اس نے ملک العادل کو اختیارات دے کر عکہ بھیج دیا جہاں صلح نامے پر دستخط ہونے تھے۔ یہ 2 ستمبر 1192ء کا واقعہ ہے۔

تمام لوگ رچرڈ کے کمرائے علالت سے متصل کمرے میں اکٹھے ہوئے۔ کمرے میں میز کے وسط پر صلح کی دستاویز رکھ دی گئی۔

عیسائی سردار اپنے رسمی سفید چغوں میں ملبوس منتظر کھڑے تھے۔ وہ اس سرزمین کے آئندہ مالک تھے۔ باری باری آگے بڑھے اور دستاویز پر دستخط ثبت کردیے۔

جب سب لوگ دستخط کرچکے تو رچرڈ کا خاص پادری اس دستاویز کو رچرڈ کے پاس لے گیا اور بلند آواز سے تحریر کے الفاظ پڑھنے لگا۔

رچرڈ کو اس تحریر سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے پادری کو درمیان ہی میں روک دیا۔

"بس بس۔ میرے صبر کا مزید امتحان مت لو۔ میں ایمان کی قسم کھاتا ہوں کہ میعاد صلح ختم ہونے کے بعد میں فوجیں لے کر دوبارہ آؤں گا اور جنگ شروع کروں گا۔"

اس کا یہ قول فقط قول ہی دیا۔ وہ پھر کبھی پلٹ کر نہیں آیا۔

صلح کے معاہدے پر دستخط ہوتے ہی مسلمان امیر گھوڑوں پر سوار یروشلم کے بازاروں میں صلح کا اعلان کرتے پھر رہے تھے۔

”یروشلم بہ دستور اسلامی تسلط میں رہے گا۔ مسلمانوں کو عیسائیوں کے علاقے میں جانے کی اجازت ہوگی۔“

پورا یروشلم اس اعلان اور نقاروں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ اسلامی تسلط کے باوجود عیسائیوں میں خوشی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ جنگ کے بادل جو ہمیشہ ان کے سروں پر منڈلاتے رہتے تھے، انہیں ان بادلوں سے نجات مل گئی تھی۔ اب وہ آزادانہ مزار مسیحؑ کی زیارت کے لیے جاسکتے تھے۔ ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

سب سے زیادہ خوشی مسیحی سپاہیوں کو تھی۔ مزے سے اپنے خیموں میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔

پادری اور نائٹ مزار مسیحؑ کی زیارت کے لیے یروشلم جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ رچرڈ کا خاص پادری رچرڈ کے پاس گیا اور اسے یروشلم چلنے کی دعوت دی۔

”میں نے یروشلم کو آزاد کرانے کی قسم کھائی تھی لیکن افسوس! میں اپنی قسم کو پورا نہ کرسکا۔ جہاں میں فاتح کی حیثیت سے نہ جاسکا زائر کی حیثیت سے کیوں جاؤں۔“

”آپ نے کوشش تو بہت کی لیکن خداوند کو منظور نہیں تھا ورنہ فتح تو ہماری تھی۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر میں پچھلی گرمیوں میں لشکر کے اصرار کے باوجود پیش قدمی نہ روکتا تو فتح یقینی تھی۔ میں نے دنیاوی اسباب پر بھروسا کیا۔ پانی کی کمیابی کو بہانہ بنا کر آگے نہیں بڑھا۔ صلیبی مجھ سے ناراض ہوگئے، انہوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔“

رچرڈ کی قیادت میں صلیبی جنگ ناکام ہوگئی تھی۔ وہ دلیر تھا لیکن اس میں انتظامی صلاحیت نہیں تھی، جب اس نے فوج کی کمان سنبھالی تو وہ بالکل بے بس ہوگیا۔ جب اسے پیش قدمی کرنی چاہیے تھی وہ صلاح الدین سے مصالحت میں الجھ گیا۔ بیت النبل تک پہنچنے کے بعد یعنی یروشلم سے ایک منزل دور، اس نے پسپائی اختیار کرلی۔ اس نے اپنے غلط فیصلوں سے ہمیشہ اپنے اتحادیوں کو ناراض کیا۔ جہاں اسے تیزی دکھانی ہوتی تھی وہ سست رو ہوجاتا تھا۔ جہاں احتیاط کی ضرورت ہوتی تھی، بے پروا ہوجاتا تھا۔ اس کی ایسی ہی بے شمار غلطیاں تھیں جنہوں نے اسے ناکام کیا اور بازی مسلمانوں کے ہاتھ رہی۔

وہ اس وقت اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے کانوں میں امیروں کے سفر یروشلم کی تیاری کی آوازیں آرہی تھیں مگر اب اس کے سامنے مستقبل نہیں ماضی تھا جسے وہ افسوس کے ساتھ انگلستان لے جانے والا تھا۔

☆☆☆

لمبے ہاتھوں، سنہری بالوں والا رچرڈ ابھی بیمار تھا اور ”حیفہ“ میں آرام کررہا تھا۔ اس کی ملکہ برنگیریا بھی وہاں آگئی اور اس کی تیمارداری میں مصروف ہوگئی۔

صلیبی فوج کے پس ماندگان جہازوں میں بیٹھ کر اپنے اپنے وطن کو واپس جاچکے تھے۔ رچرڈ نے برنگیریا سے شادی قبرص میں کی تھی۔ جب وہ انگلستان سے روانہ ہوا تھا تو سال سسلی میں گزارنے کے بعد قبرص پہنچا تھا۔ یہیں اس نے برنگیریا آف نوارے سے شادی کی تھی۔

برنگیریا نے اس کے ساتھ رہنے کے لیے گھر بار چھوڑ دیا تھا اور صلیبی فوج کے ساتھ چلی آئی تھی۔ پھر اسے سکون کا ایک دن بھی نصیب نہیں ہوا۔ یہی ایک مہینا سکون سے گزرا جب وہ رچرڈ کی تیمارداری میں مصروف رہی لیکن اس وقت اس پر قیامت ٹوٹ پڑی جب رچرڈ نے اسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کردیا۔ برنگیریا کے سوا اس کی وجہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ رچرڈ سسلی سے چل کر قبرص پہنچا تھا تو بازنطینی حکام اس کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئے تھے۔ وہ پایاب پانی سے گزر کر خود ساحل پر پہنچا اور جزیرے کو تاراج کردیا اس نے بازنطینی شہزادے کو زنجیروں میں جکڑ دیا اور اس کی نوجوان بیٹی کو بہ طور یرغمال رکھ لیا۔ اس شہزادی کو اس نے بعد میں اپنی داشتہ بنالیا۔ یہی شہزادی تھی جس کے عشق میں گرفتار ہوکر وہ برنگیریا کو انگلستان لے جانے پر تیار نہیں تھا۔

برینگیریا جب مایوس ہوگئی تو عکہ لوٹ آئی اور پاپائے روم کے دربار میں پناہ لینے کے لیے بذریعۂ جہاز روم چلی گئی۔ اس کے بعد برنگیریا کا نام کبھی سننے میں نہیں آیا۔ وہ اپنے والدین کے پاس بھی نہیں گئی۔

شکست خوردہ رچرڈ نے سرزمینِ قدس کو خیرباد کہا۔ وہ مختصر سے محافظ دستے کے ساتھ جہاز میں سوار ہوا۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔ جہاز نے بادبان کھولے۔

رچرڈ اس وقت تک عرشے پر نمودار نہیں ہوا جب تک ساحلِ شام نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔ وہ شکست خوردہ نظروں سے ساحلِ شام کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

صلاح الدین کو جب خبر ملی کہ شاہ رچرڈ انگلستان روانہ ہوچکا تو اس کے سامنے وہی مسائل تھے جو اتنی طویل جنگ کے بعد درپیش آتے ہیں۔ سرحدی قلعے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئے تھے، ان کا معائنہ کرتا رہا اور تعمیر کے احکام جاری کرتا رہا۔

بحالی امن کے لیے اس نے اپنے سرداروں کو احکام

جاری کیے کہ عیسائی زائرین سے کسی قسم کی بازپرس نہ کی جائے۔ جب صلح ہوگئی ہے تو ان کی جان ومال کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

حالت جنگ میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں پر اتنے مظالم ہوئے تھے کہ مسلمانوں کے دل غصے اور انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔ چند مسلمان سردار صلاح الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس سے درخواست کی کہ ہمیں ان زائرین سے اپنے مقتولین کا انتقام لینے کی اجازت دی جائے لیکن صلاح الدین نے ان کی عرض داشت کو سختی سے ٹھکرادیا۔ اسے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ حالات کہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس نے سڑکوں پر محافظ دستے تعینات کردیے اور امیروں کو بھی صاف لفظوں میں سمجھادیا کہ عیسائیوں کو مزار مسیحؑ کے لیے راہداری بخش دی گئی ہے لہٰذا ان سے اب کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

صلاح الدین منصف مزاج بھی تھا، فراخ دل اور بردبار بھی۔ اسے فتح ہوئی تھی۔ اس کا دشمن معاہدے پر مجبور ہوا تھا لیکن اس کے مزاج میں تبدیلی پھر بھی نہیں آئی تھی۔ رچرڈ اور فرانسیسیوں کے درمیان دورانِ جنگ میں اختلافات ہوگئے تھے۔ رچرڈ نہیں چاہتا تھا کہ فرانسیسی یروشلم کی زیارت کے لیے آئیں۔ اس نے صلاح الدین کو لکھا۔

”فرانسیسی چونکہ فریقِ معاہدہ نہیں ہیں لہٰذا انہیں یروشلم کی زیارت کی اجازت نہ دی جائے۔“

سلطان نے جواب دیا۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے سب عیسائیوں کو اجازت دی ہے۔ انہیں کیسے روک دوں؟“

کئی ہفتے یروشلم میں گزارنے کے بعد اسے قاہرہ کی یاد آئی۔ مصر چھوڑے ہوئے اسے دس سال ہوگئے تھے۔ اس شہر سے اس کی کیسی کیسی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ ان یادوں کو تازہ کرنا چاہتا تھا۔

اس کش مکش میں برسات کا موسم آگیا اور وہ قاہرہ کے بجائے دمشق چلا گیا۔ کوئی مہم سامنے نہیں تھی۔ کبھی کبھی شکار کو نکل جاتا۔ اکثر وقت علما کی صحبت میں بسر کرتا۔ رفتہ رفتہ وہ بالکل ہی گوشہ نشیں ہوگیا۔ محل کے ایوانوں میں اس کے امیر ملاقات کے منتظر رہتے لیکن وہ کسی کو شرفِ باریابی نہ بخشتا۔

جہاد کی مصروفیت کی وجہ سے کئی سال کے روزے قضا ہوگئے تھے۔ طبیبوں کے منع کرنے کے باوجود وہ مسلسل روزے رکھ رہا تھا جس سے کمزوری بڑھتی جارہی تھی اور وہ بیمار بھی رہنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھی محل سے فصیل باغ میں بیٹھ جاتا تھا۔ یہاں بھی علما فضلا ہی اس کے گرد جمع رہتے۔ سارا وقت علمی بحثوں میں کٹ جاتا۔

ایک زمانہ تھا جب کتابیں ہی اس کی دوست تھیں۔ وہ سپاہی سے زیادہ عالم وزاہد نظر آتا تھا۔ اسے جنگ سے نفرت تھی۔ وہ خون بہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن پھر حالات نے ایسا مشغول کیا کہ پوری عمر جنگوں میں گزر گئی۔ اب وہ تھک گیا تھا۔ علما کی صحبتیں اس کے اس مزاج کی آئینہ دار تھیں۔

بارش ہوچکی تھی کہ اس نے قافلۂ حجاج کی آمد کی خبر سنی تو قاضی کو طلب کیا۔

تاریخ کے صفحات میں سربلند

1944ء کا ذکر ہے قائداعظم اور گاندھی جی کے درمیان بمبئی میں مذاکرات ہونا طے پایا تھا، قائداعظم کشمیر میں تھے وہاں گاندھی جی کا پیغام پہنچا کہ کشمیر سے واپسی میں قائداعظم واردھا آجائیں۔ مذاکرات وہیں ہوجائیں گے، گاندھی واردھا میں مقیم تھے۔

واردھا راستے میں پڑتا تھا مگر قائداعظم نے جواب دیا کہ وہ اپنا پروگرام بدلنے سے قاصر ہیں، واردھا نہیں آسکتے۔ آخر گاندھی جی کو مذاکرات کے لیے بمبئی آنا ہی پڑا۔ بعد میں کسی نے قائداعظم سے کہا۔

”اگر آپ واپسی میں واردھا رک جاتے تو کیا حرج تھا؟“

قائداعظم نے جواب دیا۔

”یہ کوئی ذاتی مسئلہ نہ تھا قومی وقار کا معاملہ تھا۔ اگر میں گاندھی کی اونچی مسند پر جھک کر پہنچتا تو کانگریس تصویروں کے ذریعے دنیا بھر میں اس کی تشہیر کرتی، اس صورت میں میری قوم کو کیا محسوس ہوتا۔ میں اپنی قوم کو کسی کے سامنے سرنگوں نہیں دیکھ سکتا۔“

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

مرسلہ: محمد مقبول عاشق، خوشاب

"کیا آپ نے قافلۂ حجاج کی آمد کی خبر سنی ہے؟"

"جی ہاں، اگر بارش کی وجہ سے کیچڑ نہ ہوگئی ہوتی تو آج قافلہ شہر پہنچ جاتا، اب ان شاء اللہ کل پہنچ جائے گا۔"

"کل میں قافلے کے استقبال کے لیے نکلوں گا۔ آپ بھی میرے ساتھ ہوں گے۔"

سلطان نے حکم دیا کہ سڑک کی مرمت کی جائے اور بارش کا پانی نکال دیا جائے۔

یہ نہایت روح پرور منظر تھا۔ لوگ گروہ در گروہ میدان میں جمع تھے۔ سلطان کی آمد کا اعلان ہوا تو اہلِ دمشق نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے۔

اہلِ دمشق کو دُہری خوشی ملی تھی۔ ایک طرف انہیں سلطان کی زیارت کا موقع مل رہا تھا دوسری جانب وہ حجاج کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

سلطان کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر جب حجاج کو خوش آمدید کہہ چکا تو واپس ہوا۔ ہجوم سے بچنے کے لیے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ ایک چھوٹی سڑک پر ہولیا جو باغات سے گزرتی تھی۔ سب لوگ سلطان کی صحت کی طرف سے فکر مند تھے۔ اس کے چہرے پر وہ بشاشت نہیں تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار ضرور تھا لیکن تھکا تھکا سا نظر آرہا تھا۔

اسی روز وہ محل میں پہنچتے ہی سخت بخار میں مبتلا ہوگیا۔ ایسی بیماری میں وہ پچھلے کئی سال سے وقفے وقفے سے مبتلا ہوتا رہا تھا لیکن اب اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ دمشق میں طرح طرح کی خبریں گشت کررہی تھیں۔ لوگ آتے جاتے اس کے محل کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے جہاں اب اداسی پہرا دے رہی تھی۔ گھڑسوار دن میں کئی مرتبہ مصر کی طرف دوڑتے دکھائی دیتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ محل میں سب خیریت نہیں ہے۔

خیریت کہاں سے ہوتی صلیبی جنگوں کا ہیرو نیم بے ہوشی کی حالت میں بسترِ علالت پر پڑا ہوا تھا۔ طبیبوں کی آنکھوں میں اندیشوں کے ڈورے تھے۔ بار بار دوائیں تجویز کررہے تھے لیکن کوئی دوا کارگر نہیں ہورہی تھی۔

بارہ دن بعد تین مارچ 1193ء کو ملک الناصر سلطان صلاح الدین نے وفات پائی۔ دمشق میں صف ماتم بچھ گئی۔ دکانیں بند ہوگئیں اور بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔ آج وہ عظیم انسان موت کی آغوش میں سو گیا تھا جس نے بیس سال تک دنیائے .... اسلام کی نہایت ثابت قدمی اور عالی حوصلگی سے قیادت کی تھی۔ سفید کفن میں لپٹے ہوئے جسدِ خاکی کے گرد قاری اور حفاظ قرآن خوانی میں مصروف تھے۔ ان کے پرسوز اور مترنم لحن میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔

سلطان کے بڑے صاحبزادے نے دوپہر کے کھانے پر صدارت کے فرائض سرانجام دیے۔ سلطان مرحوم کی جگہ کسی اور کو دیکھ کر مصاحبوں کے دلوں پر قیامت گزر گئی۔ مرحوم کی تجہیز و تکفین کے اخراجات کی ادائی کے لیے صاحبِ خزانہ سے رقم طلب کی گئی تو معلوم ہوا شاہی خزانہ بالکل خالی ہے۔

سلطان کے تصرف میں بے شمار دولت اور زر و جواہر ہوتے تھے لیکن جب وہ فوت ہوا تو اس کا اثاثہ صرف 47 درہم اور ایک شاہی اشرفی تھا۔ اس نے کوئی مکان، مال و اسباب، جاگیر یا کسی قسم کی جائداد ترکہ میں نہیں چھوڑی۔

سلطان کو جامع دمشق کی شمالی دیوار سے ملحق باغ میں دفن کیا گیا۔

اس عظیم المرتبت باپ کے بیٹے اس کی قابلیت اور جذبہ جہاد سے عاری تھے۔ سلطان کی حکومت جلد ہی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اس کے بیٹوں نے قاہرہ، دمشق اور حلب میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں اور پھر باہمی اختلافات میں الجھ کر رہ گئے۔

سلطان کا بھائی ملک العادل البتہ اولوالعزم اور بلند ہمت تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی اور ان قوتوں کی شیرازہ بندی کی جو سلطان مرحوم کے بعد منتشر ہوگئی تھیں۔ اس نے اپنی قابلیت سے قاہرہ اور دمشق کی ولایت حاصل کرلی۔ اس نے تیزی سے اپنی حدودِ سلطنت میں توسیع کی۔ وہ جزیرۃ العرب کے بیشتر حصے کے علاوہ یروشلم اور جنوبی شام پر قابض ہوگیا۔ عرب، ترک اور کرد اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ دنیا دیکھ رہی تھی کہ اس نے صلاح الدین کی سلطنت کی تجدید کردی ہے اور جذبۂ جہاد کو دوبارہ زندہ کردیا ہے۔

صلاح الدین کی سلطنت کے تمام علاقے سوائے شمالی حصے کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے، اس کے جھنڈے تلے جمع تھے چنانچہ جب صلیبیوں نے دوبارہ اقدام شروع کیا تو انہیں ایک قابل، اولوالعزم اور ہوشیار حکمران سے سابقہ پڑا۔

ماخذات

سیرت صلاح الدین (ترجمہ)، بہاء الدین ابن شداد۔ صلاح الدین ایوبی ہیرلڈ لیم/محمد یوسف عباسی۔
صلاح الدین ایوبی (انگریزی)، لین پول۔ نور الدین زنگی، کامران اعظم سوہدروی۔
دمشق، خواجہ عباد اللہ اختر امرتسری۔ تاریخ ابن کثیر، علامہ ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ ابن کثیر/ابوطلحہ

طاہر جاوید مغل

انوکھا ملاپ

قدرت نے احساسات میں ایسا کرشمہ رکھا ہے کہ اگر انسان کچھ کرنے کی ٹھان لے تو احساسات کی طاقت اس کی ہمت ٹوٹنے نہیں دیتی۔ زندگی کے اس موڑ پر اسے بھی موت کا سامنا کرنا پڑا اور... دیکھتے ہی دیکھتے جذبات کی ہلچل نے بازی پلٹ کر رکھ دی۔ وہ کہ جسے... آنے والی سانس کا یقین نہ تھا، اچانک پوری زندگی جی اٹھا، محض ایک کمزور سی امید کے سہارے۔

آگ کے دریا میں ڈوبنے...... ابھرنے والوں کا منفرد قصہ

حامد کا تعلق کافرستان سے تھا۔ کوہ ہندوکش کے دامن میں بمبورت وادی کے نواحی پہاڑوں میں یہ ایک خوب صورت بستی تھی، چاروں جانب سرسبز بلندیوں سے گھری ہوئی۔ بہ ظاہر یہ کیلاشا دیش سے الگ تھلگ تھی لیکن یہاں کے مکینوں کی رگوں میں خون تو کیلاش نسل ہی کا تھا۔ اس قبیلے کو کیلاش ہی کی ایک گمنام شاخ کہا جاسکتا تھا۔ حامد کا پرانا نام بدلک تھا لیکن اس نے چودہ پندرہ سال پہلے اسلام قبول کرلیا تھا، اس کی بیوی بھی اسی زمانے میں مسلمان ہوگئی تھی اور اس کا نام آسیہ تھا۔ اب کئی سال سے وہ یہاں ایبٹ آباد میں مقیم تھا۔ وہ جانوروں کی کھالوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ اسے خود بھی شکار کا شوق تھا۔ کبھی کبھار وہ پہاڑیوں کی طرف نکل جاتا۔ مارخور، جنگلی خرگوش اور پرندے وغیرہ شکار کرلاتا۔ حامد ایبٹ آباد کی ایک مضافاتی بستی کا رہائشی تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ لڑکے کی عمر گیارہ بارہ سال اور لڑکی کی

چھ سات برس تھی۔ اس کا حلقۂ احباب محدود تھا۔ الگ تھلگ رہنے والا اور اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا۔ وہ ویرانوں سے مہذب دنیا کی طرف آیا تھا اور کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ ابھی تہذیب کے ساتھ پوری طرح گھل مل نہیں سکا۔ شاید اس کے بچے جوان ہوکر یہ ہم آہنگی پیدا کرلیتے۔ بہر حال وہ خوش اور مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔

وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ شام تھی۔ سہ پہر سے ہی برف باری شروع ہوگئی تھی۔ حامد کی بیوی آسیہ نے آتشدان دہکا رکھا تھا۔ وہ اپنے چوبی گھر کو اور گھر کے مکینوں کو گرم رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی، حامد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ عمر کسی طرح بھی ستر سال سے کم نہیں رہی ہوگی۔ وہ سرتاپا گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے سر اور کندھوں پر برف کے ذرات تھے۔ حامد نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا...... یہ اس کے قبیلے کا سردار تھا، سردار آروش خاں جس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ یہ کامیابی کی چمک تھی جیسے وہ اس بات پر بہت مطمئن اور خوش ہو کہ آخر اس نے بدولک یعنی حامد کو ڈھونڈ لیا ہے۔

کوئی چار گھنٹے بعد سردار آروش اور حامد علیحدہ کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ کھانا کھا چکے تھے۔ قہوے کے دو تین دور بھی چل چکے تھے۔ پردے کی اوٹ سے آسیہ نے بھی چند باراں کی گفتگو میں شرکت کی تھی۔ اب آسیہ اور دونوں بچے ساتھ والے کمرے میں تھے۔ بچے تو یقیناً سو چکے تھے۔ آسیہ کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔

گڑگڑی کا کش لیتے ہوئے حامد نے سردار کو دیکھا۔ پچھلے چودہ پندرہ سال میں وہ بوڑھا تو ضرور ہوا تھا لیکن اس کے دم خم اور لب ولہجے میں کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ سردار صرف اپنے قبیلے کی سرداری ہی نہیں کرتا تھا، وہ دیگر قبیلوں اور برادریوں میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنے علاقے کا مکھیا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جڑی بوٹیوں کا بھی زبردست ماہر تھا اور اسے علاج معالجے میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔

حامد نے کیلاشا زبان میں کہا۔ ''سردار! میرے دماغ میں مسلسل ہلچل مچی ہوئی ہے۔ وہ کیا بات ہے جس نے آپ کو میری خاطر اتنا لمبا سفر کرایا۔ آپ نے کئی ماہ میری تلاش میں بھی لگائے۔ کاش مجھے پتا ہوتا تو آپ کو میرے لیے اتنی تکلیف نہ اٹھانا پڑتی۔''

سردار نے اپنا گلا صاف کیا اور اسے اس کے پرانے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بدولک یہ کوئی تکلیف نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تو اس جدوجہد کا مول پڑ جائے گا...... اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ جو سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں، تمہیں بھی کسی حد تک اس کا علم ہے۔''

حامد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں آتش دان کے شعلوں پر مرکوز ہوگئیں، کھڑکیوں پر تواتر سے برف گررہی تھی اور بستی میں سناٹے کا راج تھا۔

حامد کی نگاہوں میں کچھ بھولے بسرے مناظر گھومنے لگے۔ آج سے چودہ پندرہ سال پہلے کے واقعات ذہن کے پردے پر کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔ وہ کیلاش کے بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی جس دوردراز بستی کے رہائشی تھے اس کی آبادی کوئی ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہوگی۔ ان پہاڑوں کے باہر کی دنیا سے انہیں کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ وہ وادی ہی ان کا وطن تھی اور یہ کوئی چالیس پچاس یا دو چار سو سال کی بات نہیں تھی۔ وہ ہزاروں سال سے یہیں آباد تھے۔

سردار آروش کی دانش، حکمت اور علمیت میں کسی کو کوئی کلام نہیں تھا۔ علاقے میں موسم گرما کے جوشی میلے کی طرز کا میلہ تھا۔ اردگرد کی بستیوں کے کئی مکھیا اور سردار ایک جگہ جمع تھے...... کھانے پینے کے دوران میں بحث مباحثہ ہورہا تھا۔ عورت کے حسن وجمال اور اس کی فطری کشش کی بات ہو رہی تھی۔ ایک جواں سال سردار کرشنا کا خیال تھا کہ مرد کی زندگی میں عورت کی طلب اور بھوک سب سے اہم ہوتی ہے۔ یہ کشش دیگر ساری کششوں پر حاوی ہے۔ سردار آروش نے یہ بات مانی لیکن شرطوں کے ساتھ۔ اس نے کہا کہ اس کے خیال میں عورت کی طلب سے پہلے دو تین اور چیزیں ہیں جو بندے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ انسانی جسم کے لیے سب سے ضروری چیز ہوا ہے، اس کے بعد پانی...... اس کے بعد خوراک...... پھر عورت کا نمبر آتا ہے۔ کافی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر سردار آروش نے اپنے خیالات کا عملی مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مظاہرے کے لیے چار دن بعد کا وقت رکھا گیا۔ یہ میلے کا بھی آخری دن تھا۔

اس مظاہرے میں شرکت کے لیے سردار آروش نے بستی کے پانچ صحت مند ترین نوجوانوں کا انتخاب کیا۔ ان میں سے ایک حامد یعنی بدولک بھی تھا۔ پانچ نوجوانوں کے علاوہ ایک خوب صورت لڑکی ایرا بھی چنی گئی۔ یہ ان کنواری لڑکیوں میں سے تھی جنہیں دیوتا کے لیے وقف کیا جاتا تھا۔ وہ ساری زندگی معبد میں رہتی تھیں اور ان کی شادی نہیں ہوتی

تھی۔ یہ لڑکیاں معبد میں کئی طرح کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ صفائی ستھرائی کرتی تھیں۔ پجاریوں کے لیے کھانا پکاتی تھیں۔ دیوتا کے سامنے جانوروں کے تازہ خون سے بھرے ہوئے پیالے رکھتی تھیں۔ اسے بھینٹ چڑھانا کہتے تھے اور اسی طرح کے کئی کام تھے جو ان دوشیزاؤں کو انجام دینے ہوتے تھے۔ ایسی لڑکیوں کے لیے کنوارہ ہونا ضروری ہوتا تھا۔ معبد میں بھیجنے سے پہلے علاقے کی دو نہایت جہاندیدہ خواتین ان کی دوشیزگی کی جانچ کرتی تھیں۔ یہ دونوں جڑواں بہنیں تھیں اور ان کی عمریں ساٹھ سال سے اوپر تھیں۔ ان کا خاندان نسل درنسل یہ کام کررہا تھا۔ ان دونوں بہنوں کا تجربہ اتنا زیادہ ہوچکا تھا کہ وہ کسی بھی جانچ کے بغیر کسی لڑکی کو صرف دیکھ کر اور اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ کر یہ بتادیتی تھیں کہ یہ کنواری ہے یا بیاہتا۔ ان کا یہ اندازہ حیرت انگیز طور پر ایک سو ایک فیصد درست ثابت ہوتا تھا اور علاقے کے لوگ بارہا اس کا تجربہ کرچکے تھے۔

سردار آروش نے جو پانچ نوجوان چنے تھے انہیں نیچی چھت والے ایک علیحدہ کمرے میں بند کردیا گیا۔ حامد بھی ان میں شامل تھا۔ یہ ایک بے روزن کمرا تھا۔ اس سال موسم بھی معمول سے زیادہ گرم تھا۔ پورے چار دن تک حامد اور اس کے چاروں ساتھیوں کو بالکل بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی جان لبوں پر آگئی۔ حامد سمیت ان سارے نوجوانوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے دانش مند سردار کے تجربے کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور اس کمرے سے ان کی لاشیں برآمد ہوں گی۔ بہرحال ایسا ہوا نہیں، پانچویں دن ان کے بند کمرے کے سامنے آہٹیں ہوئیں اور انہیں معلوم ہوا کہ انہیں اس امتحان سے گزارا جانے والا ہے جس کے لیے انہیں یہاں بند کیا گیا تھا۔

بستی کے بہت سے مرد اور نوجوان یہ انوکھا اور دلچسپ تجربہ دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ سردار آروش اور اس کے دوستوں کے لیے ایک علیحدہ خیمہ لگایا گیا تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ اس انوکھے تجربے کے علاوہ میلے کے دیگر کھیل تماشے بھی دیکھ سکتے تھے۔ کمرے کی سلاخ دار کھڑکیاں کھول دی گئیں۔ حامد اور اس کے ساتھیوں نے ان کھڑکیوں کے اندر سے دیکھا۔ سامنے ایک دسترخوان بچھا تھا۔ اس دسترخوان پر ٹھنڈے پانی سے لبالب بھرا ہوا ایک پتھریلا پیالہ رکھا تھا۔ اس پیالے سے آٹھ دس فٹ کی دوری پر ایک تھال تھا۔ اس تھال میں نوخیز بھیڑ کا روسٹ گوشت تھا، ہنٹر بیف ٹائپ کا۔ اس سے دس پندرہ فٹ کی دوری پر ایک خیمہ تھا۔ چاروں طرف سے بند...... دوپہر کا چمکیلا سورج خیمے کے سنہری نقش ونگار کو اجاگر کررہا تھا۔

سردار آروش نے بلند آواز میں حامد سمیت پانچوں نوجوانوں کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''سب سے ضروری چیز ہوا ہے، اس کے بعد پانی، اس کے بعد خوراک اور اگر عورت میسر ہو تو اس کا نمبر چوتھا ہوگا، میں اس تجربے سے یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے اشارہ کیا۔ ایک طرف سے ایرا نمودار ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے شیشوں والا مقامی لباس اس کے متناسب جسم پر جھلملا رہا تھا۔ اس کے صحت مند رخسار دہکے انار جیسے تھے...... چوٹیوں کی صورت میں گندھے ہوئے بال دونوں طرف سینے پر جھول رہے تھے۔ اس کے سر پر مقامی طرز کی گول ٹوپی تھی۔ اسے واقعی بستی کی خوش شکل ترین لڑکیوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک اجلی مسکراہٹ کے ساتھ سردار کی طرف دیکھا اور تعظیم سے سر جھکایا۔ سردار نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ ایک دروازے کے عقب سے وہی دونوں عمر رسیدہ بہنیں برآمد ہوئیں جنہیں مقامی زبان میں آروزا کہا جاتا تھا اور جو معبد کو وقف کی جانے والی لڑکیوں کی تندرستی اور دوشیزگی کی تصدیق کرتی تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر باری باری ایرا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھیان سے دیکھا۔ اس سے ایک دو باتیں کیں اور اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اپنی خداداد صلاحیت کے طفیل اس امر کی تصدیق کر رہی تھیں کہ ایرا ایک کنواری لڑکی ہے۔

سردار نے اشارہ کیا۔ ایرا منقش خیمے میں داخل ہوگئی۔ سردار نے بہ آواز بلند پانچوں نوجوانوں کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''چار خواہشیں اور چار اشیا، ہوا، پانی، غذا اور عورت۔ ان چار میں سے تین تمہارے سامنے ہیں یعنی پانی، غذا اور عورت۔ ہوا کے معاملے میں تو کسی تجربے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر تین منٹ کے لیے تمہاری سانس بند کردی جائے تو سانس لینے کی خواہش کے سوا تمہاری ہر خواہش مٹ جائے گی۔ کیا میں تمہارا سردار ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

حامد سمیت پانچوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بھوک، پیاس کی وجہ سے ان پانچوں کے سر چکرا رہے تھے اور کھڑا ہونا دشوار تھا۔ حامد کے گلے میں تو کانٹے سے پڑ چکے تھے۔

سردار نے کہا۔ ''لہٰذا ہوا کو ہم اس تجربے سے نکال رہے ہیں۔ اب پانی، غذا اور عورت تمہارے سامنے ہیں، ہیں یا نہیں؟''

پانچوں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

سردار نے کہا۔ ”تم باری باری باہر آؤ گے اور اپنی طلب کو ان چیزوں سے مٹانے کی کوشش کرو گے لیکن اس کے لیے ایک شرط بھی ہے...... اور وہ شرط یہ ہے کہ تم ان تین چیزوں میں سے صرف دو کو استعمال کر سکتے ہو۔ اگر کوئی پانی کی طرف جائے گا تو پھر وہ بھنے ہوئے گوشت اور ایرا میں سے صرف ایک کی طرف جاسکے گا اور اگر وہ بھنے گوشت کی طرف جائے گا تو پھر ایرا اور پانی میں سے ایک کی طرف جاسکے گا۔ فرض کیا کہ کوئی پہلے ایرا کی طرف جاتا ہے تو پھر وہ گوشت اور پانی میں سے صرف ایک چیز استعمال کر سکے گا۔ تم پانچوں میں سے ہر ایک کے پاس پورے چار گھنٹے کا وقت ہوگا۔ نگران تم پانچوں کی نگرانی کریں گے اور تمہیں باری باری اس تجربے سے گزرنے کا موقع دیں گے۔“

”اس وقت تک سب لوگ یہیں رہیں گے؟“ سردار کرشا نے پوچھا۔

”نہیں، میں نے کہا ہے نا کہ یہاں نگران موجود ہوں گے، یہ جو، ان پانچوں کی کارگزاری پر پوری نظر رکھیں گے۔ دونوں آروزا (عمر رسیدہ بہنیں) بھی یہیں ہوں گی اور وہ بھی دیکھیں گی کہ ان پانچوں میں سے کون اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے، یعنی ایرا کو حاصل کرنے میں۔ یقیناً ان پانچوں میں سے ہر ایک کی خواہش ہوگی کہ وہ ایرا سے جسمانی تعلق قائم کرلے۔ جو بھی ایسا کرے گا وہ انعام میں ایرا سے شادی کا حقدار ہوگا۔“ تماشائیوں نے آوازے بلند کیے اور اپنے جوش و خروش کا اظہار کیا۔

سردار کرشا نے کہا۔ ”سردار! یہ پانچ بندے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ اس مقابلے کا آخری نتیجہ ہمیں کل ہی معلوم ہو سکے گا۔ ایک بندے کے لیے چار گھنٹے یعنی پانچ کے لیے بیس گھنٹے۔“

سردار مسکرایا۔ ”میرے خیال میں اتنے دلچسپ کھیل کے نتیجے کے لیے ایک دن کا انتظار کچھ زیادہ نہیں ہے، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اس میں اتنا وقت نہیں لگے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم دو چار گھنٹوں میں ہی اس کا حتمی نتیجہ جان سکیں۔“

”سب سے پہلے کھیل میں کون حصہ لے گا سردار؟“ ایک اور معزز سردار یونر نے دریافت کیا۔

”اس کا فیصلہ قرعہ اندازی سے ہوگا۔“ سردار آروش نے جواب دیا۔

وہ سب بڑی روانی اور متانت سے باتیں کر رہے تھے، عجیب و غریب رسموں والے اس قبیلے میں خوبرو ایرا کے حصول کا مقابلہ کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ پرانے وقتوں سے ان علاقوں میں محبت کی شادی جائز اور مقبول تھی۔ پسندیدہ لڑکی کے حصول کے لیے نوجوانوں میں سوئمبر طرز کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ گئے وقتوں میں تو مرد و زن کے جسمانی ملاپ کے حوالے سے کچھ ناگفتہ بہ رواج بھی موجود تھے۔ اب بھی جنس کے حوالے سے آزادانہ بات کی جاتی تھی۔

سردار کے حکم کے مطابق اس کھیل کا آغاز ہونے والا تھا، تماشائیوں میں صرف بالغ مرد تھے اور جو دو عورتیں یعنی آروزا یہاں موجود تھیں ان کا تو کام ہی ایسا تھا جو انہیں شرم اور جھجک کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ دو ریفریز کی طرح اطمینان سے ایک طرف کھڑی تھیں۔ سردار کے حکم پر پانچ نیلی کنکریوں کے ذریعے قرعہ اندازی کی گئی۔ ان کنکریوں پر کیلاشا زبان کے حرف کندہ تھے۔ بھوکے پیاسے خستہ حال نوجوانوں نے ایک تھیلی میں ایک ساتھ ہاتھ ڈال کر ایک ایک کنکری اٹھائی۔ اس کھیل میں حامد کا نمبر چوتھا آیا۔ اب اسے کچھ دیر مزید سخت بھوک پیاس برداشت کرنا تھی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کا نمبر پہلا آنا چاہیے تھا۔ وہ ایرا کو چاہتا تھا۔ قریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل اس وسیع بستی میں ایرا وہ واحد لڑکی تھی جو حامد کے دل کو بھاتی تھی۔ کبھی کبھی حامد کو بھی لگتا تھا کہ وہ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے، مگر ابھی تک ان دونوں میں اظہار کا موقع نہیں آیا تھا۔ بس ایک خاموش محبت کی سی کیفیت تھی۔ حامد سوچا کرتا تھا کہ کیا ہی اچھا ہو جو وہ ایرا کو دیوتا کے لیے وقف ہونے سے بچالے۔ اسے بھگا کر کہیں لے جائے۔ ہمیشہ کے لیے بستی سے اوجھل ہو جائے لیکن اسے پتا تھا کہ یہ سب خیالی پلاؤ ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا اور نہ ایرا اسے کرنے دے گی۔

اب وہ یہ سوچ سوچ کر بے حال ہو رہا تھا کہ کیا اس عجیب طرز کے سوئمبر میں کوئی اور لڑکا ایرا سے جسمانی تعلق بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس سے پہلے تین لڑکوں نے اس انوکھے کھیل میں حصہ لینا تھا۔ ان میں سے کوئی کامیاب ہو جاتا تو حامد کے دل کی کلی ہمیشہ کے لیے مرجھا جاتی...... لیکن اگر کوئی ان میں سے کامیاب نہ بھی ہوتا تو پھر کیا ہوتا؟ پھر بھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آرہی تھی۔ سردار آروش نے جو شرط رکھی تھی وہ بہت کڑی تھی۔ بھوک پیاس کی انتہا کو چھوتے ہوئے نوجوانوں کے لیے پانی، گوشت اور ایرا میں سے دو کا انتخاب...... صرف دو کا انتخاب۔

سردار کے حکم پر سب سے پہلے کترسنگھ نامی نوجوان کو بند کوٹھری میں سے نکالا گیا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے اوپر سورج...... اور اس سورج سے اوپر نیلا آسمان بھی جیسے محو تماشا تھا۔ کترسنگھ کے سرخ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ بھوک پیاس کے سبب چار دنوں میں ہی اس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ حامد کے اندازے کے مطابق وہ بستی کا سب سے سخت جان اور کرخت لڑکا تھا۔ اس نے پتا نہیں کیا سوچا ہوا تھا۔ وہ پانی کے لیے اپنی شدید ترین طلب کو یکسر نظر انداز کرتا ہوا، گوشت کی طرف بڑھا۔ گوشت کو خاص مسالے ڈال کر کافی نرم کیا گیا تھا تاہم وہ بالکل خشک تھا...... کترسنگھ نے گوشت کھانے کی کوشش کی۔ یہ فطرت کے خلاف تھا، یہ جسمانی تقاضے سے جنگ کے مترادف تھا۔ وہ دو تین بوٹیاں ہی بہ مشکل نگل سکا۔ اس کے خشک گلے میں پھندا لگ گیا۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی ابکائیاں نہ روک سکا۔ شدید ترین کھانسی نے اسے گھٹنوں کے بل بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ایک شخص جو کترسنگھ کا رشتہ دار تھا، بھاگ کر گیا۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے لبالب بھرا ہوا پیالہ کترسنگھ کی طرف بڑھایا۔ اس نے بے بسی کے عالم میں پیالہ منہ سے لگایا اور پیتا چلا گیا۔ قریباً نصف پیالہ چڑھا کر اس کی جان میں جان آگئی۔ وہ ہارے ہوئے انداز میں پتھریلی زمین پر بیٹھ گیا اور پھر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔ اب اس کی آنکھوں میں لذیذ گوشت کے لیے زبردست اشتہا پیدا ہو رہی تھی۔

سردار آروش نے بہ آواز بلند کہا۔ ”کتر کو کھانا کھلاؤ۔“

کترسنگھ کا رشتے دار اس کے لیے لکڑی کی رکابی میں گوشت نکالنے لگا۔ سردار نے فاتح انداز میں کہا۔ ”پہلا نتیجہ نکل آیا۔ پہلے پانی...... پھر خوراک...... پھر عورت۔“

کترسنگھ میدان سے رخصت ہو گیا تو دوسرے نوجوان کی باری آئی۔ یہ بستی کا چرواہا جستو تھا۔ پانچ دن پہلے وہ ایرا کے حصول کے لیے بڑا پرجوش تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ ایسی گداز لڑکی کے لیے ہر امتحان سے گزر جائے گا۔ اس نے ایرا کے دہکتے رخساروں اور ہونٹوں کے حوالے سے کئی شعر سنائے تھے، یوں اپنے لہو کو گرمایا اور حامد کے لہو کو کھولایا تھا لیکن آج یہ شخص بھوک پیاس کی خوفناک چکی میں پسنے کے بعد کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ حامد پچھلے آدھ گھنٹے سے دیکھ رہا تھا کہ جستو کی نگاہیں مسلسل ٹھنڈے چشمے کے پانی سے بھرے ہوئے پیالے پر جمی ہیں۔ غالباً اس کے لیے یہ پیالہ فی الوقت دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھا۔ شاید دنیا کی خوب صورت ترین عورت بھی سراپا دعوت بن کر اس کے سامنے آجاتی تو وہ کہتا...... نہیں جانی...... پہلے پانی۔

جب اسے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے آزاد کیا گیا تو وہ ٹھیک سے چلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اسے سردار کے ایک ملازم نے سہارا دے کر دسترخوان تک پہنچایا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے پیالہ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ اس کے گلے اور جسم کو سیراب کرتا ہوا یہ ٹھنڈا پانی یقیناً اس کے لیے ہفتِ اقلیم کی دولت اور نعمتوں سے بڑھ کر تھا۔ پانی پی کر وہ بیٹھ گیا اور بڑی سعادت مندی سے گوشت کی طرف اشارہ کیا۔ ملازم نے اس کے لیے لکڑی کی رکابی میں گوشت نکالا۔ وہ بے حد رغبت سے گوشت کھانے میں مصروف ہو گیا۔ خاص مسالوں میں پکایا ہوا یہ زود ہضم گوشت اس کے لیے اس تیل کے مانند تھا جو بجھتے ہوئے چراغ میں ڈالا جاتا ہے۔ گوشت اور پانی...... پانی اور گوشت...... جستو باقی سب کچھ بھول گیا۔

تیسری باری راہا خاں کی تھی۔ راہا خاں بستی کے لوہار کا بیٹا تھا۔ غالباً یہ بستی کے سب سے صحت مند نوجوانوں میں سے تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، ہٹا کٹا بدن، چہرے سے لالی ٹپکتی ہوئی۔ جوانی جیسے اس سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ ایک دو معاشقے بھی چل چکے تھے۔ پھر اس پر ترکھان موک کی پندرہ سالہ بیٹی کے ساتھ زیادتی کا الزام بھی لگا تھا۔ بعدازاں برادری کے لوگوں نے مل جل کر یہ معاملہ دبا دیا تھا۔ ایرا کے حوالے سے حامد کو سب سے زیادہ فکر اسی راہا خاں کی طرف سے تھی۔ راہا نکلا بھی عجیب جوش و جذبے سے تھا۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ آج یہ بے مہار سانڈ (راہا خاں) ایرا جیسی خوب صورت لڑکی کے حوالے سے کیا کرتا ہے؟

کہتے ہیں کہ بندہ جتنا صحت مند ہو، بھوک پیاس اسے اتنا ہی زیادہ پریشان کرتی ہے۔ راہا بھی شکستگی کی تصویر نظر آتا تھا۔ رخساروں پر گہری زردی تھی۔ پانی یا گوشت، اسے ایرا کی طرف جانے سے پہلے پانی یا گوشت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا اور پانی کی طلب زیادہ شدید تھی۔ وہ لڑکھڑا کر پانی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے پتھر کے پیالے سے جی بھر کر پانی پیا اور پھر بے جان سا ہو کر زمین پر ہی لیٹ گیا۔ پانی نے اس کی پیاس تو بجھائی تھی لیکن اس کی جسمانی نقاہت دور نہیں کی تھی بلکہ شاید وہ کچھ اور پژمردہ نظر آیا تھا۔ سب نے دیکھا وہ قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح زمین پر چت لیٹا رہا۔ اس نے اپنا بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ کچھ کھائے بغیر اس کی جسمانی توانائیاں عود کر آئیں اور وہ خیمے کا رخ کر سکے...... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کے بعد نہایت پژمردگی کے عالم میں راہا خاں اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا سا میدان سے باہر چلا گیا۔ اس نے اور اس کے جسم نے ایک بے ساختہ ادا کے

ساتھ اپنی شکست تسلیم کرلی تھی۔

حامد نے دیکھا کہ کچھ ہی دیر بعد راہا خاں ایک طرف بیٹھا تھا اور بے بسی سے کھانے پر ٹوٹا پڑ رہا تھا اور اب حامد کا امتحان تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ سردار آروش نے ایک انوکھا کھیل کھیلا ہے۔ یہ کھیل تماشائیوں کے لیے تو دلچسپ تھا مگر کھیلنے والوں کے لیے سخت اذیت ناک ثابت ہو رہا تھا۔ حامد کی کیفیت پہلے تین نوجوانوں سے مختلف نہیں تھی۔ وہ تو ویسے بھی بھوک پیاس کا عادی نہیں تھا۔ اس کے گلے میں کانٹے سے اُگے ہوئے تھے۔ منہ کے اندر زبان جیسے بوسیدہ چمڑے کا بالکل خشک ٹکڑا تھی۔ اس ٹکڑے کے ساتھ کچھ بھی کھانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چمکیلی دھوپ میں بس ایک ہی طلب تھی۔ پانی...... اور پانی۔

حامد نے وہی کیا جو اس کا شدید ترین جسمانی تقاضا تھا۔ راہا خاں کی طرح اس نے بھی چشمے کا سرد پانی پیا اور پھر بے سدھ سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے چیڑ کے ایک بلند درخت سے ٹیک لگالی تھی...... ہاں پانی پیاس تو بجھاتا ہے لیکن جسم کو حرارت اور توانائی فراہم نہیں کرتا۔ شدید ترین بھوک نے کسی موذی جانور کی طرح اس کے معدے میں پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو یکسر بے جان محسوس کر رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ انسانی جسم کی کیمیا کیا ہے اور یہ کیمیا دل و دماغ پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ چار پانچ دن سے بھوکا تھا۔ اس کے لیے توانائی بخش غذا کے سوا کچھ اہم نہیں تھا۔ اسے لگا کہ ایرا کو بہت چاہنے کے باوجود ان لمحوں میں وہ اسے حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ ایرا کا شباب، اس کی دلکشی اور ساری جسمانی کشش حامد کے لیے بے معنی سی ہوگئی تھی۔ اس سے جسمانی تعلق کا تو وہ تصور بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کیا ماجرا تھا۔ حسن و عشق جن کے حوالے سے کتابیں بھری پڑی ہیں، جن کے لیے جنگیں ہوئی ہیں، ملکوں کے نقشے بدلے ہیں، نسلیں آباد اور برباد ہوئی ہیں...... وہ حسن و عشق گوشت کی ایک پلیٹ یا دودھ کے ایک پیالے کا محتاج ہے؟ یہ حیران کن انکشاف تھا اور ان پُرآزمائش لمحوں میں وہ اس انکشاف کو بے حد شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ تنے سے ٹیک لگائے بے سدھ بیٹھا رہا۔ اب اسے یہ سمجھ بھی آرہی تھی کہ اس سے پہلے راہا جیسا تنومند اور شعلہ صفت نوجوان کیوں آنکھیں بند کیے پڑا رہا تھا اور بے بسی کی تصویر نظر آیا تھا۔

ایرا کچھ نہیں تھی۔ وہ اس سے صرف چند قدم کی دوری پر تھی۔ وہ اسے ابھی حاصل کرسکتا تھا۔ لیکن کیسے؟ کیسے؟ اسے اس حوالے سے کوئی رغبت ہی نہیں تھی، جسمانی حقیقتیں روشن کی طرح عیاں تھیں اور جذبے کونوں کھدروں میں منہ چھپا چکے تھے۔

تو کیا وہ بھی راہا خاں کی طرح اٹھ کر اور گلے میں شکست کا ہار ڈال کر باہر چلا جائے۔ ایرا سے دستبردار ہوجائے؟ اسے معبد کے لیے وقف ہوجانے دے؟

سوال بے شمار تھے اور جواب ایک تھا، بھوک۔ اس کے نیم جاں جسم میں غذا کی طلب نے ایک موذی جانور کی طرح پنجے گاڑے ہوئے تھے اور اسے مزید بے جان کر رہی تھی۔ کھیل کے اصول کے مطابق وہ ایرا اور گوشت میں سے صرف ایک چیز استعمال کرسکتا تھا اور اس کے پاس اب بھی تقریباً تین گھنٹے کا وقت باقی تھا لیکن وقت اب بے معنی ہوچکا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایرا کو کھو چکا ہے۔ ان لمحوں میں اسے لگا جیسے پانی، گوشت اور ایرا تین بند دروازوں کی طرح ہیں۔ پہلے دروازے کو کھولے بغیر دوسرے دروازے تک اور دوسرے کو کھولے بغیر تیسرے تک نہیں پہنچ جاسکتا۔ وہ ہار چکا تھا...... بے شک وہ ہار چکا تھا۔

اس کے اردگرد بیسیوں تماشائی موجود تھے۔ وہ سب خاموش تھے۔ وہ بھی حامد کی شکست کی بو سونگھ چکے تھے۔ وہ کچھ کہہ نہیں رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر چمکنے والا دھیما سا تمسخر حامد کو محسوس ہو رہا تھا۔ حامد کی طرح شاید ان سب کے لیے بھی آج ایک سادہ لیکن حیرت انگیز انکشاف کا دن تھا۔ حسن و عشق کی ساری جولانیاں اور حشر خیزیاں، خوراک کے چند توانائی بخش لقموں کی مرہونِ منت قرار پائی تھیں۔ سردار آروش کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔

اچانک نیم جان حامد کی نگاہ خیمے کی طرف اٹھ گئی۔ دروازے کے سنہری پردے کی جھری میں سے اسے ایرا کی مختصر جھلک نظر آئی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی پیغام تھا۔ کوئی حوصلہ افزا اشارہ تھا۔ کوئی انوکھی دعوت تھی۔ اس نے اپنے سر کو ہلکی سی اثباتی حرکت دی۔ وہ جیسے حامد کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ کیوں بلا رہی تھی؟ وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ حامد کا ذہن اس کے ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکا...... لیکن پھر بھی...... وہ ایرا تھی...... اور وہ اسے چاہتا تھا...... اور وہ اسے بلا رہی تھی۔ وہ اپنے بے جان، ٹوٹے پھوٹے جسم کو سنبھالتا ہوا اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا سا خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

✂✂✂

حامد کے پردۂ تصور پر چلنے والی طویل فلم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی لیکن سردار آروش کی آواز نے اسے خیالات سے چونکا دیا۔ ”کہاں کھو گئے تھے بدولک؟“ اس نے کہا۔

”کہیں نہیں۔ بس یونہی۔“ حامد نے کہا۔

کھڑکیوں سے باہر برف تواتر سے گر رہی تھی۔ سردی بڑھ گئی تھی اور آتشدان بھی کمرے کو پوری طرح گرم نہیں رکھ پا رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں شاید بچوں کے ساتھ ساتھ آسیہ بھی سو چکی تھی۔ سردار نے گڑگڑی کا کش لیتے ہوئے اپنی بوڑھی آواز میں کہا۔ ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر آج مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تو اس ساری تکلیف کا کوئی غم نہیں ہوگا جو میں نے تمہاری تلاش میں اٹھائی ہے۔“

”آ...... آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ حامد نے کہا۔

سردار بولا۔ ”تمہیں بھی کچھ بھولا نہیں ہوگا بدولک! سب کچھ یاد ہوگا۔ پانچ لڑکوں میں سے تم چوتھے تھے...... تم سے پہلے کوئی ایرا کے خیمے میں داخل نہیں ہوسکا تھا، لیکن تم ہوئے۔ تم نہ صرف داخل ہوئے بلکہ تم نے کافی وقت وہاں گزارا اور...... جب تم باہر نکلے تو کسی کو اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا اور مجھے تو بالکل نہیں۔ کیونکہ میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔ جسمانی علم کو جتنا میں سمجھتا ہوں اس علاقے میں شاید اب بھی کوئی نہیں سمجھتا۔“

حامد خاموشی سے سردار کو دیکھتا رہا جس کے چہرے پر الجھنوں کی لکیریں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ سردار بولا۔ ”تم خیمے سے نکلے تو تمہارے چہرے پر فتح کی خوشی تھی۔ ایرا تمہارے پہلو سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی وہی کہانی تھی جو تمہارے چہرے پر تھی۔ وہ شرمیلے انداز میں مسکرا رہی تھی، تم نے اعلان کیا تھا کہ کھیل کے اصول کی رو سے ایرا اب تمہاری ملکیت ہے اور پھر دونوں آروزا (جڑواں بہنوں) نے بھی تمہارے بیان کی تصدیق کردی تھی، میں باقی سب کچھ جھٹلا سکتا تھا مگر ان کی تصدیق کو نہیں۔“

”آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں سردار؟“ حامد نے مودب انداز میں کہا۔

”میرا علم کچھ اور کہتا ہے بدولک! اور اس دن کے واقعات کچھ اور...... انسان کے جسم کی ہر ادا میری دیکھی بھالی ہے اور میں آروا بہنوں ہی کی طرح اسے بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ مجھے بھی یقین ہے کہ اس روز تمہارا ملاپ ہوا۔ یہ سب کیسے ہوگیا؟ تم اپنے نیم جان لاغر جسم کو گھسیٹ کر خیمے میں گئے اور فاتح بن کر باہر نکلے، یہ کیسے ہوا؟“

حامد نے کہا۔ ”آپ اپنے تجربے کی روشنی میں کیا اندازہ لگاتے ہیں؟“

”میرا ہر تجربہ یہاں ناکام ہو رہا ہے۔ میں پچھلے چودہ سال سے یہی سوچ رہا ہوں...... اس خیمے میں کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا۔ ایک دانہ نہیں تھا، نہ کوئی شے باہر سے اندر جاسکتی تھی۔ وہاں صرف ایرا تھی۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ تم ایرا کو چاہتے تھے۔ شاید اس چاہت نے ہی تمہارے ”کمزور“ جسم میں وہ توانائیاں بھر دیں کہ تم ایرا سے جسمانی تعلق بنانے میں کامیاب ہوگئے یا پھر دیوتاؤں نے تمہاری کوئی خاص مدد کی...... لیکن...... میں...... میں جذبات کا بندہ نہیں ہوں۔ میں ٹھوس حقیقتوں کو مانتا ہوں۔ جو نہیں ہوسکتا، وہ نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ کیسے ہوا؟“

حامد بہت دیر تک آتش دان کے سرخ شعلوں کو دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”اس روز اس خیمے میں مجھے خوراک ملی تھی سردار۔“

”کیسے...... کیسے ملی تھی؟“ سردار تقریباً چلّا کر بولا۔ اس کا گلا رندھ گیا۔

”اس کا جواب آپ کو ایرا دے گی لیکن اس کو اپنے تک ہی رکھیے گا...... آئیے میرے ساتھ۔“ حامد نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”ہم نے جو کچھ کیا اس پر ہم شرمندہ ہیں...... لیکن یہ ہماری مجبوری تھی۔“

وہ اٹھا۔ سردار بھی دیوار کا سہارا لے کر بہ مشکل اٹھ گیا۔ وہ دونوں دبے پاؤں ساتھ والے کمرے میں پہنچے، یہاں نیم تاریکی تھی۔ حامد کی بیوی آسیہ یعنی ایرا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اونی نمدے پر سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بالوں کی لٹیں بکھری تھیں۔ حامد نے ٹارچ روشن کی۔ ٹارچ کا روشن دائرہ ایرا کی بائیں کلائی پر مرکوز کیا۔ گوری چٹی سڈول کلائی پر زخم کا ایک پرانا نشان نظر آرہا تھا جیسے کسی نوکیلی چیز سے بے دردی کے ساتھ گہرے کٹ لگائے گئے ہوں۔ سردار کو زخم کا نشان دکھانے کے بعد حامد اسے لے کر واپس آتش دان والے کمرے میں آگیا۔ کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ”سردار! محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ یہ دیواروں میں در پیدا کرتی ہے...... یہ خود ہی دیوتا ہے، خود ہی پجاری اور خود ہی بھینٹ۔ اس روز ایرا نے اپنی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں سے اپنی کلائی کی رگیں کاٹی تھیں اور...... اور تمہیں پتا ہی ہے سردار! تازے خون میں بڑی توانائی اور حرارت ہوتی ہے۔“

سردار سکتہ زدہ سا حامد کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ باہر برفانی ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

کشکول

انوار صدیقی

سولہویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہوکے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ بھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پر تاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک لیموں ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیموں سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازم... رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوجن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد

کوسیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیرِ عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابلِ اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کرلیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج ہے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کردیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہوجاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کرلیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرالیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچالیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کردیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہوجاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنالیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرالیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبووالے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہوجاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پاکر لودھی کو معطل کرادیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کرلیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کردیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کرلی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور نگزیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کرلیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہوگئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرادیے۔ اور نگزیب نے لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابلِ اعتماد افسر کو ہدایت دی۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر تو کے کوڈ سے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کردیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور

ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیرِ داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب معذرت کر کے اسے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کردیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچالیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کی آمادگی پر منتج ہوئی۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواستگار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کردیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کردیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہوسکتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ سفید رنگ کی ایک پک اپ تھی جس کی پشت پر بھی دو آدمیوں کے بیٹھنے کی محفوظ اور آرام دہ جگہ موجود تھی۔ پک اپ میں موجود چاروں افراد پوری طرح مسلح تھے، ان چاروں کی نظریں تقریباً تیس فٹ آگے جانے والی سیاہ وین پر مرکوز تھیں جس سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ جس گاڑی میں شبنم موجود تھی وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو سفید پک اپ میں پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنے ساتھی سے دریافت کیا۔

"اب کیا حکم ہے؟ لڑکی والی گاڑی نظروں سے نکل چکی ہے۔ کیا اب بھی ہم ہینڈ گرینیڈ استعمال کر کے سیاہ وین کو راستے سے ہٹا کر آگے جانے کی کوشش نہیں کرسکتے؟"

"نہیں......" دوسرے شخص نے جو گٹھے ہوئے جسم اور درمیانے قد کا مالک تھا، بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ "ہمیں ان میں سے کسی ایک آدھ کو زندہ پکڑنا ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ لڑکی لے جانے والے سورما کون لوگ ہیں۔"

"کیا یہ حکم بھی باس کی طرف سے ملا ہے؟"

"ہاں......" مختصر جواب دیا گیا۔

فائرنگ کی وجہ سے سڑک پر رواں دواں ٹریفک تھم گیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دونوں گاڑیوں سے فائرنگ ہو رہی تھی جب اچانک کہیں قریب سے پولیس پیٹرولنگ کار کے سائرن کی مخصوص آواز سنائی دینے لگی۔ سفید پک اپ اور پیٹرولنگ کار کا درمیانی فاصلہ بھی تقریباً چالیس فٹ رہا ہوگا۔

"اب کیا حکم ہے؟" پک اپ کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے سچویشن کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے دوسرے سے کہا۔ "ہم درمیان میں سینڈوچ ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی ایک کو درمیان سے ہٹائے بغیر ہمارے پاس فرار کا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔"

"ہم اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتے۔" اس نے کسمسا کر جواب دیا۔ "فی الحال ان دونوں کو دور رکھنا ہوگا۔"

سفید پک اپ کی رفتار فوری طور پر تیز کردی گئی جس کو محسوس کر کے وین سے ہونے والی فائرنگ بھی شدت اختیار کرگئی، اس کی رفتار بھی بڑھتی جارہی تھی پھر اگلے موڑ سے وین کو ساحلی علاقے کی جانب موڑ دیا گیا۔ پولیس پیٹرولنگ کار سے نشر ہونے والے سائرن کی آواز نے دونوں گاڑیوں میں موجود افراد کو نئی سچویشن سے دوچار کردیا تھا۔ گٹھے ہوئے جسم والا کسی گہری سوچ میں غرق تھا پھر اس نے دونوں نشستوں کے درمیان کی پارٹیشن کے درمیان مختصر کھڑکی کا سلائڈنگ ٹکڑا ایک طرف کر کے ڈرائیور سے کہا۔

"تم اگلے موڑ سے پک اپ داہنی جانب موڑ لینا۔"

"ہماری مطلوبہ گاڑی بائیں جانب موڑی گئی ہے۔" ڈرائیور نے تیزی سے جواب دیا۔

"اس کی فکر مت کرو۔ ساحلی راستے پر بھی ہمارے ساتھی موجود ہوں گے۔ میں ان سے رابطہ کرتا ہوں۔" اس نے جملہ ختم کر کے درمیانی کھڑکی کو دوبارہ بند کردیا۔

"اگر اس راستے پر کوئی نہ ہوا تو لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی؟" دوسرے آدمی نے اپنی تشویش کا اظہار ضروری سمجھا۔ "باس ناراض ہوگیا تو ہماری عافیت بھی خطرے میں پڑ جائے گی؟"

صورتِ حال نے جو اچانک رخ اختیار کیا تھا اس کے اثرات گٹھے ہوئے جسم والے کے چہرے پر بھی مرتب ہو رہے تھے، وہ اپنے ساتھی کی بات سن کر مزید مضطرب ہوگیا۔ اسی لمحے ڈرائیونگ کمپارٹمنٹ کی طرف سے درمیانی کھڑکی میں خلا پیدا کر کے کہا گیا۔ "آپ کے لیے کال ہے۔" جملے کی ادائیگی کے ساتھ ہی ایک موبائل بھی اس کی طرف بڑھا دیا گیا۔

"یس باس......" گٹھے ہوئے جسم والے نے موبائل کان سے لگا کر عقبی شیشے پر نظر ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "پولیس کی موبائل کے آجانے سے ہماری پوزیشن خراب ہوگئی ہے۔"

"پھر...... تم نے کیا فیصلہ کیا......؟" خشک لہجے میں سوال کیا گیا۔

"ہمیں ہر قیمت پر اپنا تحفظ کرنا ضروری ہے۔"

"میں نے تمہارا فیصلہ دریافت کیا تھا؟" اس بار بھی دوسری جانب سے بات کرنے والے کے لہجے میں کرختگی ہی شامل تھی۔

"دو صورتیں ممکن ہیں...... پیٹرولنگ کار سے پیچھا چھڑانا یا ہینڈ گرنیڈ کا استعمال جس سے پوزیشن زیادہ خطرناک ہوجائے گی۔"

"ایک جواب دو......"

"وقتی طور پر ہمارے لیے پولیس سے ٹکراؤ مناسب نہیں ہوگا اس لیے میں نے لڑکی کا تعاقب کرنے سے گریز کا فیصلہ کیا ہے۔" گٹھے ہوئے جسم والے نے اپنا فیصلہ دل پر جبر کر کے سنا دیا۔

"ٹھیک ہے...... اسی پر عمل کرو۔"

"لیکن...... لڑکی ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں ہم عتاب کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اس کا فیصلہ باس کو کرنا ہے...... مجھے نہیں۔" دوسری جانب سے لائن منقطع کر دی گئی تو وہ تلملا کر رہ گیا۔

"اب کیا آرڈر ملا ہے؟" برابر بیٹھنے والے ساتھی نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے ڈرائیور کو دوبارہ داہنی ہی جانب موڑنے کو کہا پھر موبائل ایک طرف ڈال کر آنکھیں بند کر کے کسی ذہنی گتھی کو سلجھانے لگا۔ دوسرے آدمی کے چہرے سے بھی بے چینی مترشح تھی۔

☆☆☆

حالات کی گردش اور الٹ پھیر نے افضل خان کے ذہن کو الجھا دیا تھا۔

اسے اسپتال سے بگ باس کے حکم پر فارغ کیا گیا تھا جبکہ ڈاکٹروں کی نظروں میں اس کی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ اپنے مالی حالات اور سابقہ حیثیت کے بھنور میں الجھ کر اس نے خودکشی کا راستہ پسند کیا تھا لیکن شبنم اسے بروقت سامنے آکر اپنے فلیٹ پر لے گئی تھی۔ شبنم کا وہ اقدام بھی تعجب خیز تھا۔ بعد میں شاید شبنم ہی کی کوششوں سے بگ باس نے اسے خدمت کا ایک موقع اور دیا تھا۔ میڈم روبی کی طرح اس نے رستم علی آغاخانی کے مقابلے میں بھی جرأت مندی کا ثبوت دے کر بگ باس کو ایسی فلم فراہم کر دی تھی جس کے خوف سے رستم علی کبھی شیخ حامد کے سامنے نظریں نہیں اٹھا سکتا تھا۔ بعد میں شبنم اور وہ دونوں اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئے جو کبھی خود افضل خان کی ملکیت تھا۔ اس وقت اس کو موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ اپنا کھویا ہوا مقام یا پھر بگ باس کی نظروں میں دوبارہ اہمیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا لیکن شبنم کے اغوا کی پراسرار واردات نے اسے پھر الجھا دیا۔ شبنم کو لے جانے والوں نے اسے دور رہ کر تماشا دیکھنے کو کہا تھا۔ کیوں؟ وہ کون لوگ تھے؟ شبنم کے اغوا سے ان کا مقصد کیا تھا؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، بعد میں اسے بھی اپارٹمنٹ چھوڑ کر ہوٹل میں شفٹ ہونے پر آمادہ کیا گیا...... ہوٹل میں بھی اس نے اپنے سابقہ تجربوں کی بنیاد پر اندازہ لگایا تھا کہ دو مختلف پارٹیاں اس کی نگرانی کر رہی تھیں۔ ایک پارٹی کی نمائندگی بگ باس کے خاص آدمی کے سامنے آجانے کے بعد بے نقاب ہوگئی تھی لیکن دوسری پارٹی کے بارے میں وہ کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکا تھا۔

افضل خان اپنے حالات سے خوفزدہ بھی نہیں تھا، وہ کسی ایسے موقعے کا منتظر تھا جب اسے اس بات کا اندازہ ہوجاتا کہ بگ باس اسے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے، اس کے بعد ہی وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی قدم اٹھا سکتا تھا مگر اسے اس کا موقع بھی نہیں ملا۔ نگرانی کرنے والے دونوں گروپ کے درمیان اچانک ٹھن گئی تھی۔ افضل خان کے ہوٹل پر ہونے والا حملہ ایسا نہیں تھا جسے وہ کم از کم بگ باس کی طرف سے کوئی ڈراما سمجھتا، جیت بہرحال بگ باس کے لوگوں کی ہوئی تھی اس کا اندازہ افضل خان کو بعد میں موبائل پر ملنے والی ہدایت سے ہوگیا۔ حملے کے بعد جب وہ ہوٹل کے منیجر سے الجھ رہا تھا تو بلیک ٹائیگر کے حوالے سے بات کرنے والے نے اس سے کہا تھا کہ وہ ایک سفری تھیلا لے کر ہوٹل چھوڑ دے اور جنرل پوسٹ آفس کے سامنے پہنچ کر دوسری ہدایت کا انتظار کرے۔ افضل خان کے پاس اس ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔ جنرل پوسٹ آفس پر پہنچ کر ٹیکسی چھوڑ دینے کے بعد ہی تقریباً بیس منٹ بعد اسے دوبارہ پک کیا گیا، پک کرنے والے نے بھی بلیک ٹائیگر ہی کا کوڈ استعمال کیا تھا اس لیے وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں اس نے اپنے ساتھ سفر کرنے والے سے دریافت کیا۔

"مجھے اب کہاں جانا ہے؟"

"بے صبری کا مظاہرہ مت کرو...... ہمیں صرف تمہیں احتیاط سے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دینے کی ہدایت ملی ہے۔"

"لیکن جن حالات میں......"

"نہیں......" ڈرائیو کرنے والے نے اسے دوبارہ ٹوکا۔ "سوال جواب سے پرہیز کرو، مجھے بھی اس کی اجازت

نہیں ہے۔"

افضل خان نے پھر اس سے کوئی سوال نہیں کیا، آدھے گھنٹے تک مختلف سنسان سڑکوں سے گزرنے کے بعد اسے آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر کسی محفوظ مقام پر چھوڑ دیا گیا، اپنے قدموں کی حرکت کی بنیاد اور پرانے تجربات کی روشنی میں افضل خان کو اس بات کا اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ اسے کسی ایسے زیرزمین کمرے میں لایا گیا ہے جس کا اوپری حصے سے کم و بیش بارہ سیڑھیوں کا درمیانی فاصلہ ضرور تھا، اس کی آنکھوں سے پٹی اتارنے کے بعد اس کے ساتھ آنے والا واپس چلا گیا۔ افضل خان کا اندازہ غلط نہیں تھا، وہ جس کمرے میں لایا گیا تھا اس میں کھڑکی یا روشن دان قسم کی کوئی چیز موجود نہیں تھی، کمرے کا کل رقبہ بھی دس بائی دس سے زیادہ نہیں تھا۔ ساتھ میں اٹیچ باتھ روم بھی موجود تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ، میز اور دو کرسیوں کے علاوہ فرنیچر نام کی کوئی اور شے موجود نہیں تھی۔ باہر جانے کا بظاہر ایک ہی دروازہ نظر آرہا تھا جسے ساتھ آنے والے نے باہر جانے کے بعد بند کر دیا تھا۔

افضل خان کو اپنی بے بسی اور دگرگوں حالت پر ہنسی آرہی تھی، کبھی اسی شہر میں اس کے نام کا طوطی بولتا تھا، آج وہ بے بسی کی حالت سے دوچار تھا۔ اس نے سفری بیگ کاندھے سے اتار کر ایک طرف رکھا پھر آرام سے بستر پر دراز ہوگیا، ذہن تھکا ہوا تھا اس لیے اسے جلد ہی نیند آگئی۔ صبح دس بجے اسے بیدار کیا گیا۔ یہ فریضہ ناشتے کی ٹرے لانے والے نے انجام دیا تھا، وہ اٹھ کر خاموشی سے واش روم میں چلا گیا۔ واپس کمرے میں آیا تو جگانے والا جا چکا تھا، اس نے بے پروائی سے ناشتے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جو ذہن کی صلاحیتوں اور جسمانی توانائی کو برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری تھا، ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذہن کو دوبارہ کریدا تو اسے شبنم کی پوزیشن کچھ مشکوک سی نظر آئی۔ اس کی دلیلیں بھی معقول تھیں، شبنم نے بگ باس کی مرضی کے بغیر اسے اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد اپنے ساتھ فلیٹ لے جانے کی ہمت نہیں کی ہوگی، رستم علی کے خلاف استعمال کرنے کا مشورہ بھی اس نے بگ باس کی ہدایت کے بعد ہی دیا ہوگا۔ افضل خان کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کا مسئلہ کسی مصلحت کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد جن حالات میں اسے نہایت اطمینان اور دلیری سے اغوا کیا گیا تھا وہ بھی افضل خان کے لیے حیران کن ہی تھا۔ افضل خان کے ہوٹل شفٹ ہو جانے کے بعد اس نے موبائل پر رابطہ قائم کرنے کے بعد بھی اپنے اغواکاروں کے بارے میں کسی خیال کا اظہار نہیں کیا تھا، اگر وہ واقعی دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی تو موبائل کس طرح دستیاب ہوا؟...... گفتگو کے دوران اس نے ایک بار خود ہی موبائل بھی آف کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ افضل خان کو ایک ڈرامے کا منصوبہ ہی نظر آرہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بگ باس کے خاص کارندے اس کی مرضی کے بغیر "چوں" کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

افضل خان، شبنم کے بارے میں غور کر رہا تھا جب دروازہ کھلنے کی آہٹ پا کر چونکا پھر آنے والوں کو دیکھ کر اسے اس بات کا بخوبی اندازہ بھی ہوگیا وہ شیخ حامد کے سوا کسی اور کا قیدی نہیں تھا۔ آنے والا اس کا پرانا شناسا تھا، دوسروں کی طرح وہ بھی پولیس کے ریکارڈ پر مفرور مجرموں کی فہرست میں شامل تھا۔ بگ باس کا دست راست ہونے کے زمانے میں وہ بھی افضل خان کے حکم پر عمل کرنے کا پابند تھا، اس کا اصل نام کچھ اور تھا لیکن وہ اسلم ڈنکا کے نام سے مشہور تھا۔ انتہائی دلیر، بے خوف اور خطرناک قسم کا آدمی تھا، دو تین بار جیل کی سلاخوں سے بھی فرار اختیار کر چکا تھا، بالآخر بگ باس نے اسے کارآمد سمجھ کر اپنی ٹیم میں شامل کر لیا تھا۔

"کیسے ہو افضل خان؟......" اسلم ڈنکا نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں میز پر ٹکا دیں، یہ اس بات کا اظہار تھا کہ اب وہ افضل خان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور بااختیار حیثیت کا مالک تھا۔

"مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" افضل خان نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔

"مجھے بھی تمہاری موجودہ پوزیشن کا دکھ ہے...... بہرحال، مجھ سے کسی خوش اخلاقی کے مظاہرے کی امید بھی نہ رکھنا۔" اس نے کھرے اور کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہے۔" افضل خان سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا پہلے بھی عادی نہیں تھا، میرا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے جس میں اتار چڑھاؤ کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔"

"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم نے حالات کے سامنے سر جھکانے کا ارادہ کر لیا ہے، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" اسلم ڈنکا نے بڑے زہریلے لہجے میں کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بگ باس نے تم پر ترس کھا کر وقتی طور پر پناہ دی ہے، کل کیا ہوگا؟ اس کا انحصار بھی گردن جھکا کر تمہاری تابعداری کے انداز پر ہوگا۔"

"یہ بھی جانتا ہوں......"

”کیا تمہیں اندازہ ہے کہ شبنم کے اغوا میں کون لوگ ملوث تھے......؟“ اسلم نے یکلخت گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

”یہی سوال میں تم سے کرنے والا تھا۔“

”کبھی تم بڑے طرم خان شمار کیے جاتے تھے۔“ اسلم نے طنز کیا۔ ”کچھ اندازے تو ضرور قائم کیے ہوں گے؟“

”ہوسکتا ہے کسی مخالف پارٹی...... کسی پرانے سر پھرے عاشق یا پھر ایجنسی والوں نے اسے اغوا کیا ہو...... میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“

اسلم نے چونک کر سوال کیا۔ ”یہ ایجنسی والوں کا خیال تمہارے ذہن میں کیوں آیا......؟“

”میں نے ایک امکانی بات کہی تھی ورنہ میں خود بھی حیران ہوں کہ اغوا کرنے والوں سے اگر میں نے خود الجھنے کی کوشش نہ کی ہوتی تو شاید وہ میرے ساتھ کوئی جارحانہ سلوک بھی نہ کرتے۔“

جواب میں اسلم نے افضل خان کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے افضل خان کو دوبارہ ایکسرے کرتی نظروں سے گھورا۔

”ہوٹل میں جو دو افراد تم سے ملتے رہتے تھے وہ کس قماش کے تھے؟“

”میری نگرانی پر مامور...... اس کے علاوہ مجھے کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔“

”کیا چاہتے تھے وہ؟“

”شبنم کے اغوا کے سلسلے میں وہ میری زبان کھلوانے کے خواہش مند تھے۔“ افضل خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری لاعلمی پر وہ ایک آدھ بار تشدد پر بھی آمادہ ہوئے لیکن انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ یہ بھی ان میں سے ایک کی مہربانی یا میری خوش قسمتی تھی کہ اس نے عملی جارحیت کا مظاہرہ کرنے سے پیشتر موبائل پر کسی سے رابطہ قائم کیا تھا ورنہ اس کا دوسرا ساتھی کوئی رعایت نہ کرتا۔“

”تمہارا کیا جواب تھا......؟“

”میں اب بھی لاعلم ہوں کہ شبنم کو اغوا کرنے والوں کی اصلیت کیا تھی اور اسے کس مقصد سے اغوا کیا گیا۔“

”ایجنسی والوں کا خیال تمہارے ذہن میں کیوں اور کس زاویے سے کلبلایا تھا۔“

”غیر قانونی حرکت کرنے والے اکثر ڈبل کراس کرنے کی پالیسی بھی اختیار کرنے سے نہیں چوکتے۔“ افضل خان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”ہم بھی ضرورت کے تحت ایسا ہی فارمولا اختیار کرکے دوسری پارٹی کو ذہنی جمناسٹک کرنے پر مجبور کردیتے ہیں۔“

اسلم ڈنکا کے چہرے پر بہ دستور تناؤ کی کیفیت نظر آرہی تھی، کچھ توقف سے بولا۔ ”مخالف پارٹی کے سلسلے میں تمہارے ذہن میں کس کا نام سرفہرست ہے؟“

”میں کتنے عرصے سے عتاب سے دوچار ہوں اس کا اندازہ تمہیں بھی ہوگا۔ ان ایکشن ہوتا تو شاید کسی ایک کی نشاندہی کرسکتا تھا۔“

”ٹھیک ہے...... ہم تینوں امکانات پر غور کرکے دیکھ لیں گے...... فی الحال تم کو کچھ دنوں کے لیے ہماری میزبانی کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔“

”جانتا ہوں لیکن ایک سوال میں بھی کرنا چاہوں گا۔“ افضل خان نے اسلم ڈنکا کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”مجھے یہاں کس مقصد کے لیے لایا گیا ہے؟“

”تم کبھی بگ باس کے رائٹ ہینڈ بھی رہ چکے ہو، ہزاروں اہم راز اب بھی تمہارے دل و دماغ میں دفن ہوں گے۔ بگ باس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید تمہیں پہلی فرصت میں ختم کرنے سے گریز بھی نہ کرتا۔ تمہیں یہ بھی علم ہوگا کہ شبنم کی وجہ سے تمہاری رسی ابھی تک دراز ہورہی ہے۔“

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گیا۔

”یہ بھی ہوسکتا ہے بگ باس کسی خاص محاذ پر تم کو بہ طور ڈائنامائٹ استعمال کرے۔ یہ بھی میرا ذاتی خیال ہے ورنہ باس کے دل میں کیا ہوتا ہے اس کی خبر اس کے فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی۔“

”میں نے رستم علی آغا خانی کے لیے بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر بگ باس کے اشارے کی تعمیل کی تھی۔ اب بھی انکار نہیں کروں گا۔“ افضل خان نے مصلحتاً دور اندیشی سے کام لیا۔ ”باس کی سرپرستی میں آنے سے پیشتر قانون کی نظروں میں کیا پوزیشن تھی تمہیں تو نہیں معلوم ہوگا۔ باس نے بروقت میری مدد نہ کی ہوتی تو شاید پھانسی کے پھندے تک پہنچ چکا ہوتا، آج بھی میں اس کے احسان کو نہیں بھولا۔“

جواب میں اسلم ڈنکا کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے جیب سے ایک موبائل نکال کر افضل خان کے حوالے کرتے ہوئے بڑے سرد لہجے میں ہدایت کی۔ ”اس پر تم صرف دوسری جانب سے کی جانے والی کال ریسیو کرو گے۔ خود کسی سے رابطہ قائم کرنے کی

حماقت نہ کرنا۔ ہوسکتا ہے کہ میں ایک دو دن بعد دوبارہ تمہاری مزاج پرسی کے لیے چکر لگاؤں۔“

اسلم ڈنکا کے جانے کے بعد افضل خان نے موبائل جیب میں ڈالا پھر دوبارہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ شاید وقتی طور پر سکون سے نیند پوری کرنا اس کی اولین ترجیح تھی۔

☆☆☆

اس روز بھی اس کی آنکھ دیر سے کھلی لیکن اس صبح کا آغاز اس کے لیے خاصا خوشگوار تھا۔ دولت اور طاقت کے ساتھ ساتھ اگر کامیابی کا نشہ بھی شامل ہوجائے تو پھر سہ آتشہ بن جاتا ہے۔ شیخ حامد کی بھی اس وقت ایسی ہی کیفیت تھی، دو روز کے اندر اندر اس کو دو کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں، اس کے زرخرید غلاموں نے بالآخر افضل خان کو پھر اپنی قید میں کرلیا تھا، مخالف پارٹی نے معمولی مقابلے کے بعد راہ فرار اختیار کرلی تھی اس لیے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کس گروپ کے لوگ تھے۔ افضل خان کے بعد اسے دوسری کامیابی کی اطلاع نمبر ٹو نے شبنم کی اچانک بازیابی کی دی تھی۔ شبنم کے سلسلے میں بھی دوسری پارٹی نے زیادہ مزاحمت نہیں کی تھی۔ افضل خان کے مقابلے میں شبنم کے ملنے کی اسے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ذہانت اور کارکردگی کے سبب بگ باس کے زیادہ قریب ہوگئی تھی۔ وہ سونے کی چڑیا تھی جس کے پر کترنے کے بعد شیخ حامد نے اسے پوری طرح اپنے اشاروں پر چلنے کی خاطر مجبور کردیا تھا، اسی کے مشورے پر اس نے افضل خان کو نظروں سے گرانے کے بعد رستم علی آغا خانی کے محاذ پر لڑنے کا ایک آخری موقع دیا تھا جو افضل خان نے جان ہتھیلی پر رکھ کر بڑی دلیری سے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ رستم علی کے خواب گاہ میں جو مائیکرو فلم تیار کی گئی تھی وہ اب بگ باس کے قبضے میں تھی جس کے بعد سیٹھ عثمان کے بعد کے علاوہ اب رستم علی آغا خانی بھی اس کے مقابلے سے ہٹ گیا تھا البتہ اس کا جوان بیٹا دارا جسے باپ کی مجبوری کا علم نہیں تھا، پر نکالنے کی کوشش کررہا تھا، شیخ حامد اسے بھی شبنم کو استعمال کرنے کے بعد پسپائی پر مجبور کرنے کے بارے میں اسکیم تیار کررہا تھا جب شبنم کو اچانک افضل خان کے اپارٹمنٹ سے اس کی موجودگی کے باوجود اغوا کرلیا گیا۔ اس اغوا کی دلیرانہ واردات کے سلسلے میں شیخ حامد کے ذہن میں کئی نام ابھرے تھے لیکن وہ کسی ایک کے بارے میں حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ ان معاملات میں کسی نہ کسی زاویے سے جگا اور اس کے گروہ کے افراد ضرور ملوث ہوں گے جو بلیک ٹائیگر کی پراسرار موت کے بعد ہی اچانک منظر عام سے غائب ہوگیا تھا اور تلاشِ بسیار کے باوجود ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

بہرحال بگ باس کے جیالوں نے افضل خان اور شبنم کو دوبارہ نہ صرف حاصل کرلیا تھا بلکہ ایسی محفوظ جگہ پہنچا دیا تھا جہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا، اس کے علاوہ شیخ حامد کو اس بات کی بھی بہت خوشی تھی کہ اورنگ زیب جیسا اثر و رسوخ رکھنے والا سرپھرا پولیس آفیسر بھی از خود جذبات کا شکار ہوکر اس سے ایک ایسا وعدہ کرچکا تھا جو بہ ظاہر پورا ہونا مشکل تھا۔ ناکامی کی صورت میں اس نے شیخ حامد کے ہر حکم پر سر جھکانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وعدے کی معیاد بھی ختم ہونے میں اب چھ سات گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ اورنگ زیب کے قابو میں آجانے کے بعد جگا اور اس کے چھپے ہوئے سرپھروں کو بھی ان کے ٹھکانوں سے نکال کر قدموں تلے روندنا زیادہ آسان ہوجاتا۔

اس وقت شیخ حامد اپنے بستر پر نیم دراز انہی خوش فہمیوں سے دل بہلا رہا تھا جب موبائل پر کنول کے نمبر جگمگانے لگے۔ اس کال کو نیک شگون جان کر اس نے فون آن کرکے ریسیور کان سے لگالیا، سرد آہ بھر کر بولا۔

”کیسی ہی کنول؟ اس وقت میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔“

”مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی لیکن میری حالت اس سے مختلف ہے۔“ دوسری جانب سے کنول نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا۔

”کیا ہوا تمہیں......؟“ شیخ حامد نے بے چینی سے دریافت کیا۔

”پندرہ روز سے آپ کی صورت نہیں دیکھی۔“ دوسری طرف سے پیار بھرے انداز میں شکوہ کیا گیا۔ ”اس سے بہتر تو میں آپ کی ذاتی سیکریٹری کی حیثیت میں تھی، روز آپ کا دیدار تو ہوجاتا تھا۔“

”ڈونٹ وری مائی سویٹ ہارٹ...... میں نے طے کرلیا ہے کہ اب بہت جلد تم بھی میرے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہو گی۔ بس جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں دو ایک دن اور صبر کرلو۔“

”یہ انتظار بھی میرے لیے قیامت ہی ہوگا...... کیا آپ ہفتے میں ایک رات بھی میرے ساتھ نہیں گزار سکتے؟“

”صرف دو روز اور میرے کہنے سے رک جاؤ پھر...... میں تمہیں اپنے پاس ہی بلا لوں گا البتہ...... تمہاری والدہ وہیں رہیں گی۔ ان کی خدمت کے لیے ملازم اور چوکیدار سب میری ذمے داری ہوگی۔“

''آپ دلاسا تو نہیں دے رہے؟''
''کم آن ڈارلنگ۔ اب جو فیصلہ میں نے کرلیا ہے وہ اٹل ہے۔''
کنول سے رابطہ ختم کرنے کے بعد بھی شیخ حامد نے طے کرلیا تھا کہ وہ اب کسی نہ کسی طرح کنول کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھے گا۔ باسی اور بازاری ہانڈیاں چکھتے چکھتے اس کی نیت بھی بھر چکی تھی۔ وہ کنول کے خوب صورت وجود کے تصور سے سرشار ہو رہا تھا جب نمبر دو کی کال موصول ہوئی۔
''کیا خبر ہے؟'' شیخ حامد نے سپاٹ لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔
''دونوں خیریت سے ہیں۔ میں نے اور میرے آدمیوں نے پوری طرح اطمینان کرلیا تھا کہ ان کی نگرانی نہیں کی جارہی۔''
''شبنم نے کیا کہا ہے؟ اس کے اغوا میں کون ملوث تھا؟''
''وہ بہ ظاہر لاعلم نظر آتی ہے اس کے علاوہ اس نے ہمارے زیادہ تر سوالات کے جواب میں ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ وہ آپ کے سوا کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔''
''افضل خان نے کچھ اگلا۔''
''نہیں...... وہ اب بھی اسی پرانے بیان کو دہرا رہا ہے......'' نمبر ٹو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ حالات سے بری طرح ٹوٹ چکا ہے، ہم نے بھی نگرانی کے دوران یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ دو پارٹیوں کے بیچ سینڈوچ بن کر رہ گیا تھا۔''
''ایک تم اور تمہارے ساتھی تھے...... دوسری پارٹی کس کی ہوسکتی ہے؟''
''یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن مقابلے کے دوران دوسری پارٹی کے راہ فرار اختیار کرنے سے بہ ظاہر یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ جگا ہی کے لوگ رہے ہوں گے۔''
شیخ حامد نے ایک منٹ کے لیے کچھ سوچا پھر تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''شبنم کو اس ٹھکانے پر منتقل کردو جہاں پہلے افضل خان کو رکھا گیا تھا، میں کسی وقت خود اس سے مل لوں گا۔ نگرانی پر تمہارے اعتماد کے آدمی ہونے چاہئیں۔ افضل خان کے بارے میں بعد میں بات کروں گا۔''
موبائل کا رابطہ ختم کرکے وہ اٹھ بیٹھا، واش روم جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا پھر دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتے کی میز پر آگیا۔
اس وقت دوپہر کے سوا گیارہ کا عمل تھا، جتنی دیر میں اس نے تازہ اخباروں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اتنی دیر میں اس کے پرانے ادھیڑ عمر کے قابل اعتماد ملازم نے ناشتا لگا دیا اور خود خاموشی سے حسبِ معمول ایک طرف ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔
شیخ حامد ناشتے سے فارغ ہوکر لاؤنج میں آکر اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھ گیا۔ سامنے شیشے کی گول میز پر ڈاک سے موصول والے ہونے والے لفافے اور دیگر پیکٹ پڑے تھے، اس نے ڈاک الٹ پلٹ کر کچھ مخصوص لفافوں کا انتخاب کیا جس میں ایک غیر ملکی ہوائی کمپنی کا خوب صورت سکس بائی ایٹ کا سفید لفافہ بھی تھا جس پر کسی بیرونی ملک سے تعلق رکھنے والی ایئر ہوسٹس کی یونیفارم والی تصویر بھی تھی، شیخ حامد کے نام کی پرنٹ سلپ بھی موجود تھی جس پر ''پرسنل اور پرائیویٹ'' بھی سرخ رنگ سے لکھا تھا۔
چند لمحے تک وہ اس لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، اسے پوری طرح یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے بیرونی ملک سفر کے لیے اس کمپنی کا انتخاب بھی کیا تھا یا نہیں، ہوائی کمپنیوں کے علاوہ بھی اس قسم کے بے شمار پیکٹ اسے موصول ہوتے رہتے تھے جس میں کمپنی کے بروشر اور پبلسٹی مواد ہوتا تھا۔ ایک بار اس نے سرسری طور پر میزبان خاتون کی تصویر کو الٹ پلٹ کر مختلف زاویوں سے دیکھا پھر بڑی بے پروائی سے لفافہ کھولا تھا لیکن...... دوسرے ہی لمحے اس کی رگوں میں دوڑتے خون کی گردش کے ساتھ ہی دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہونے لگیں، اندر سے برآمد ہونے والی تصویریں تعداد میں صرف چار تھیں لیکن وہ کسی ٹائم بم سے زیادہ خوفناک تھیں جو شیخ حامد کے پورے وجود میں ہولناک دھماکے کرنے کو کافی تھیں۔
پھٹی پھٹی نظروں سے وہ ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا جن میں اس کی اور کنول کی شکلیں بہت واضح طور پر نظر آرہی تھیں۔ کسی نے بڑی مہارت سے اس کی سہاگ رات کی رنگینیوں کو مختلف انداز میں ایکسپوز کیا تھا، تصویروں میں شیخ حامد اور کنول دونوں ہی مادرزاد برہنہ نظر آرہے تھے، وہ میز بھی نظر آرہی تھی جس پر شراب کی بوتل اور گلاس موجود تھا۔
کچھ دنوں پیشتر کنول نے بھی ایسے ہی کسی نووارد کے بارے میں بتایا تھا جس نے فون کرکے اسے دھمکی دی تھی، شیخ حامد نے اس بات کو محض کسی دیوانے کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کردیا تھا مگر...... اب وہ اپنی نظروں سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جس کے ایک معمولی سے امکان پر بھی اس کے فرشتوں نے کبھی غور نہیں کیا تھا، تصویروں کے ساتھ ایک ٹائپ شدہ خط بھی تھا۔ وہ اس تہہ شدہ کاغذ کو کھول کر اس کا مضمون پڑھنے لگا، لکھا تھا۔

''بگ باسٹرڈ...... تمہاری خدمت میں تمہاری ہی سہاگ رات کا تحفہ بہ طور مبارک باد بھیج رہا ہوں۔ یہ انوکھا گفٹ تمہیں براہ راست نہ دے سکا اس لیے کہ تم مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو۔ مجھے دیکھتے ہی تمہارے پالتو شکاری کتے مجھے اپنی صفائی میں دو حرف بھی زبان پر لانے کا موقع نہ دیتے۔ تمہارے ہی خوف سے انڈر گراؤنڈ ہوکر گھٹن کی سانس لے رہا ہوں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ ان تصویروں کو دل بھر کر دیکھ اور پرکھ لینے کے بعد اپنے نطفۂ ناتحقیق قسم کے گرگوں کو ہدایت کردینا کہ وہ میری یا میرے کسی آدمی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کریں ورنہ...... تم بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔ فی الحال یہ یقین دلا دوں کہ تمہارے بلیک ٹائیگر کی موت کا مجھ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ میری اطلاع کے مطابق اس کی موت میں اس سیاہ فام حبشی کا ہاتھ تھا جو اب خود بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ میرے ہی ٹھکانے پر دونوں کا آمنا سامنا ہوا تھا پھر ان کے درمیان موت اور زندگی کا کھیل کیوں ہوا؟ اس کی وجہ مجھ سے زیادہ تم بہتر طور پر جانتے ہوگے...... ہوسکتا ہے کہ آج یا کل میں کسی وقت تم سے فون یا موبائل سے رابطہ قائم کروں...... ایک بار پھر ان ہولناک نتائج پر غور کرنے کی زحمت گوارا کرلینا جو ان تصاویر کے منظر عام پر آنے کی صورت میں پیش آسکتے ہیں، تمہاری عزت، تمہاری شہرت اور برسوں کی بنی بنائی جھوٹی ساکھ ریت کے محل کی طرح ڈھے جائے گی...... دور اندیشی پر عمل کرنے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ میں بھی کبھی تمہارے آڑے وقت میں کام آجاؤں...... تمہاری گھٹیا سوچ کی وجہ سے عارضی طور پر عتاب یافتہ...... جگا!''
جگا کا نام پڑھ کر شیخ حامد کا خون کھولنے لگا لیکن وہ موصول ہونے والی تصویروں کے پیش نظر اس وقت اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ جلد بازی میں کوئی قدم اٹھاتا۔ جو تصویریں اسے موصول ہوئی تھیں ان کے نگیٹوز اور دوسری کاپیز کسی اور کے پاس بھی ضرور محفوظ ہوں گی، ان تصویروں کے منظر عام پر آجانے کے بعد وہ عرش سے گر کر فرش پر آجاتا اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ اس نے تصویروں پر دوبارہ غور کیا، کئی زاویوں سے غور کرنے کے بعد اس کا یہی خیال تھا کہ وہ تصویریں برابر والے مکان سے گزر کر اس کے مکان کے روشن دان تک رسائی حاصل کرنے کے بعد بنائی گئی ہوں گی جو کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی، اسے یہ بھی حیرت تھی کہ اس کی اور کنول کی شادی کا علم جگا یا کسی اور کو کس طرح ہوا جبکہ اس نے ہر ممکن احتیاط سے کام لیا تھا......؟
بہرحال، وہ جو کوئی بھی ہو لیکن اس نے ان تصویروں کے ذریعے شیخ حامد کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھا ہونٹ چباتا رہا۔ زندگی میں اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا تھا لیکن اس وقت چار بے جان تصویروں ہی نے اسے چاروں خانے چت کردیا تھا۔ جس صبح کا آغاز خوشگوار توقعات کے ساتھ ہوا تھا، وہ دن ڈھلنے سے پیشتر ہی اس کے لیے انتہائی اذیت ناک ہوگئی تھی۔
تصویروں کو پیکٹ میں ڈال کر وہ تلملایا ہوا اپنی خواب گاہ میں آگیا، بے بسی کا احساس اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا جب اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔
''کون بول رہا ہے......؟''
''میں جگا کا ایک پرانا ساتھی بول رہا ہوں جناب۔'' دوسری جانب سے سپاٹ آواز میں کہا گیا۔ ''آپ سے ایک دو ضروری باتیں کرنی ہیں۔''
''کہو......'' شیخ حامد نے دل پر جبر کرکے جواب دیا۔
''استاد کے لیے اب کیا حکم ہے؟'' عاجزانہ انداز میں طنز کیا گیا۔ ''وہ بیت الخلا میں چھپا رہے یا تازی ہوا میں سانس لینے کو باہر آجائے۔''
''جگا سے کہنا کہ براہ راست مجھ سے بات کرے، میں درمیانی لوگوں سے بات نہیں کرتا۔''
شیخ حامد نے جھلا کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا، اس کے ذہن میں آتش فشاں کا لاوا ابل رہا تھا۔ کنول کے ساتھ اپنی اخلاق سوز تصویروں کو دیکھ لینے کے بعد اس کا سکون غارت ہوگیا تھا، کل تک وہ آسمان کی بلندیوں پر پرواز کررہا تھا، مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا، آج زمین پر کھڑا بے بسی سے ہاتھ مل رہا تھا۔ اس کا ذہن بڑی سنجیدگی سے اس دلدل سے نکاسی کا راستہ تلاش کررہا تھا جس میں حالات کی ستم ظریفی سے پھنس گیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ ٹہلتا رہا، تمام آپشن پر غور کرتا رہا پھر اس نے طے کرلیا کہ وہ فی الحال اس وقت تک خاموشی سے دن گزارے گا جب تک جگا اور تصویروں کے نگیٹوز اس کے ہاتھ نہیں آجاتے۔ کوئی دوسرا مسئلہ ہوتا تو وہ بد سے بدتر حالات سے بھی ٹکرا جانے سے گریز نہ کرتا۔ جن بدنام زمانہ مجرموں کی پرورش کررہا ہے وہ پل بھر میں سارے کونے کھدروں کو کھنگال کر رکھ دیتے لیکن وہ تصویریں کسی کو نہیں دکھا سکتا تھا، یہ ایسا معاملہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے وسیع تعلقات سے بھی کام لے سکتا۔
شام تک وہ اپنی خواب گاہ میں رہا پھر جب ملازم نے

اورنگ زیب اور سراج کے آنے کی اطلاع دی تو وہ ایک لمحے کو چونکا، ایس پی کی آمد تو کسی وقت بھی متوقع تھی اس لیے کہ وہ دیے گئے وقت میں کسی مجرم کا سراغ نہیں لگا سکا تھا لیکن اس کی اور سراج کی ایک ساتھ آمد اس کے سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ اس نے ملازم سے ان دونوں کو انتظار کرنے کا کہہ کر کچھ دیر غور کیا پھر لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ اورنگ زیب اور سراج دونوں اسے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہوگئے۔ خاص طور پر اورنگ زیب کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی، اس نے صوفے پر بیٹھنے کے بعد ان دونوں کو اشارے سے بیٹھنے کو کہا پھر کچھ توقف سے دریافت کیا۔

''اس وقت کیسے آنا ہوا......؟'' اورنگ زیب سے سوال کرتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سراج پر بھی ڈالی تھی۔

''مسٹر حامد......'' اورنگ زیب نے سنبھل کر نپے تلے لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ''میں کیا ہوں اور کیا نہیں، یہ آپ بھی بخوبی جانتے ہیں، قانونی معاملات میں کسی لچک کا مظاہرہ کرنا میرے اصول اور فطرت دونوں کے خلاف ہے، میں نے خدا کے علاوہ کسی کے سامنے جھکنا نہیں سیکھا لیکن ...... میں اپنے عہد سے کبھی ایک قدم پیچھے بھی نہیں ہٹا...... کچھ لوگ اعتراف شکست سے نظریں چرا کر موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں، میں اس کو بھی بزدلی قرار دیتا ہوں، مرد میدان وہ ہے جو مردانگی ہی سے اپنی شکست بھی تسلیم کرلے۔''

''میں تمہارے ٹائپ اور تمہارے تعلقات سے بھی واقف ہوں لیکن اس وقت کیسے آنا ہوا؟'' شیخ حامد نے بہ ظاہر انجان بنتے ہوئے بڑے شاطرانہ انداز میں پوچھا۔ سراج کی موجودگی میں وہ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

سراج نے بھی یہ بات محسوس کرلی تاہم خاموش رہا۔

''آئی سی'' اورنگ زیب نے مسکرا کر سراج کو ساتھ لانے کی وضاحت بھی مناسب سمجھی۔ ''مسٹر سراج میرے ساتھی ہیں اور اب تک کے تجربے سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں یہ بھی کم و بیش انہی اصولوں کو پسند کرتے ہیں جن پر میں ثابت قدم رہنے کا عادی ہوں۔ میں نے آپ سے مجرموں کے سلسلے میں جو مہلت حاصل کی تھی وہ پوری ہوگئی، مسٹر سراج کو بھی میں نے تمام صورت حال سے آگاہ کر کے ہاتھ بٹانے کی خاطر اپنے ساتھ شامل رکھا تھا لیکن اتفاق ہے جو ابھی تک ہم مجرموں کا سراغ نہیں پا سکے...... اب آپ جو بھی فیصلہ میرے حق میں کریں...... وہ مجھے منظور ہوگا۔'' اورنگ زیب نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔ ''مسٹر سراج کو میں اسی غرض سے ساتھ لایا ہوں کہ یہ بھی میرے اور آپ کے معاملے میں گواہ رہیں۔ جس طرح میں مجرموں کو فرار کا راستہ نہیں دیتا۔ اسی طرح خود بھی چانس لینے کو پسند نہیں کرتا۔''

''گڈ......'' شیخ حامد نے اپنے اصلی رنگ میں جواب دیا۔ ''مجھے خوشی ہوئی کہ تم خود آگئے ورنہ مجھے تمہیں یاد دلانے کی زحمت بھی کرنی پڑتی۔ کسی ڈیل کے معاملے میں، میں بھی وعدہ خلافی کو اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔''

اورنگ زیب نے بگ باس کے جملے کی گہرائی کو بھانپ لیا لیکن صرف کسمسا کر رہ گیا، شیخ حامد نے رخ بدل کر سراج کو دیکھا۔

''تمہاری طبیعت اب کیسی ہے مسٹر سراج؟''

''لوٹ پوٹ کر پھر ڈیوٹی پر حاضر ہوگیا ہوں۔''

''جن مجرموں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا ان کا کوئی پتا چلا؟'' اس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے کہ ابھی تک ایس پی صاحب اس کے بارے میں بھی چھان بین کر رہے ہیں۔'' سراج نے اورنگ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ایسی بات نہیں ہے مسٹر حامد۔'' اورنگ زیب نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''ایک دو کلیو ہاتھ آئے ہیں، ہم بہت جلد ڈور کے دوسرے سرے تک بھی پہنچ جائیں گے۔''

''جگا کے بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں؟'' اچانک شیخ حامد نے سوال کیا تو اورنگ زیب کے علاوہ سراج بھی چونکا۔

''میں یہاں آنے کے بعد اس کی فائل بھی پڑھ چکا ہوں۔'' اورنگ زیب نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''فائل کے اندراجات کے مطابق وہ اپنی سزا کاٹنے کے بعد سے کوئی ذاتی کاروبار کر رہا ہے۔ رہائی کے بعد سے اس کے خلاف کوئی کرمنل کیس سامنے نہیں آیا لیکن...... آپ کو اس وقت جگا کا خیال کیسے آگیا؟''

''میں آف دی ریکارڈ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جگا نے اپنا ایک گینگ بنا رکھا ہے، اس کے آدمی ضرورت مندوں کو منہ مانگی اجرت پر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔''

''آپ کو اس کا علم کس طرح ہوا......؟'' سراج نے روانی میں پوچھ لیا۔

''میں اس وقت آف دی ریکارڈ بات کر رہا ہوں۔'' اس نے سراج کو تیز نظروں سے گھورا۔ ''حقیقت کیا ہے یہ

پولیس کا محکمہ بھی ضرور جانتا ہوگا۔''

''آپ درست فرما رہے ہیں مسٹر حامد۔'' اورنگ زیب نے نارمل انداز میں جواب دیا۔ ''کچھ ایسی ہی رپورٹس ہمارے پاس بھی ہیں لیکن کسی ثبوت کے بغیر ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے...... اس کے علاوہ اور بھی کئی سفید پوش لوگ بھی ایسے کاروبار میں ملوث ہیں مگر پولیس کسی نہ کسی وجہ سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔''

''شبنم کے بارے میں ابھی تک آپ کے ڈی آئی جی نے بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔'' شیخ حامد نے موضوع بدل دیا۔ ''وہ میری خاص اور قابل اعتماد دور کر تھی۔''

''میں اس وقت آپ کے پاس صرف اعتراف شکست کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔'' اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''اس عہد کے ساتھ کہ جب تک مجرموں کے ہاتھ میں قانونی زیور نہیں پہنا دیتا، آپ کے ہر حکم پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھوں گا...... بشرطیکہ وہ حکم قانون سے متصادم نہ ہو۔''

''فائن......'' شیخ حامد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ قدرے رعونت سے بولا۔ ''مجھے توقع تھی کہ آپ جلد یا بدیر ہتھیار ڈال دیں گے۔''

اورنگ زیب کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ سراج بھی اپنی نشست پر کسمسانے لگا پھر وہ وہاں زیادہ دیر نہیں رکے تھے، ان کے جانے کے بعد شیخ حامد نے دوبارہ اپنی خواب گاہ میں آکر نمبر دو کو کال کیا۔ رابطہ قائم ہو جانے پر بڑے سرد لہجے میں بولا۔

''میں تم لوگوں کی کارکردگی سے زیادہ خوش نہیں ہوں...... بلیک ٹائیگر کے بعد سے مجھے اس کی کمی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ وہ انمول ہیرا تھا۔ کھرا اور بے داغ۔''

''مجھ سے کیا بھول ہوگئی باس......؟''

''جگا......'' شیخ حامد کے لہجے میں طوفان مچلنے لگا۔ ''اسے فوری طور پر تلاش کرو، وہ ہمارے لیے سب سے اہم ہے لیکن...... اسے اس طرح پنجرے میں بند کر کے میرے سامنے لاؤ کہ خود اس باسٹرڈ کو بھی اس کا علم قبل از وقت نہ ہو۔''

''آل رائٹ باس......''

''فی الحال کسی اور سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ روک دو، اپنے تمام آدمیوں کو جگا کی تلاش پر لگا دو...... مجھے دو تین روز میں رزلٹ چاہیے، پازیٹو رزلٹ، ناکامی کی صورت میں تم بھی زیر عتاب آسکتے ہو...... ویٹس آل۔'' جملے کے اختتام کے ساتھ ہی شیخ حامد کے چہرے پر الجھن اور غصے کے ملے جلے تاثرات اور گہرے ہوتے چلے گئے...... مخرب اخلاق تصویریں پھر اس کے ذہن میں کسی بڑے خطرے کی علامت کے طور پر جلنے بجھنے لگیں۔

تقریباً ایک گھنٹے تک شیخ حامد کسی نہ کسی طرح وقت گزارتا رہا، تصویروں کے معاملے نے اس کے ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا، وہ ابھی تک اس بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تھا کہ جگا کو اس کی اور کنول کی شادی کا علم کس طرح ہوا؟ اور جو تصویریں اس نے بھیجی تھیں، ان کو حاصل کرنے کا خیال اس کے دماغ میں کس طرح آیا......؟ وہ کئی زاویوں سے غور کرتا رہا پھر ایک خیال اس کے ذہن میں بڑی سرعت سے ابھرا، کیا تصویروں کا تحفہ بھیجنے والا جگا ہی تھا یا کسی نے خاص مصلحت کی بنا پر صرف اس کا نام استعمال کیا تھا؟ اگر وہ جگا کے سوا کوئی اور تھا تو...... کون تھا؟ اسے خاص طور پر جگا کا نام استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

خاصی دیر تک شیخ حامد کا ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں الجھا رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر ایس پی اورنگ زیب کے نمبر ملائے۔ دوسری طرف سے کال چوتھی گھنٹی پر ریسیو کی گئی۔

''ایس پی۔ اورنگ زیب......''

''میں شیخ حامد بول رہا ہوں۔''

''خیریت...... ابھی مجھے آپ کے پاس سے واپس آئے ایک گھنٹا ہی ہوا ہے؟''

''میں ہمیشہ ون ٹو ون بات کرنے کا عادی ہوں۔'' شیخ حامد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ......''

''سمجھ گیا۔'' دوسری جانب سے اورنگ زیب نے جملہ کاٹ کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کو شاید میرے ساتھ مسٹر سراج کا آنا اچھا نہیں لگا۔''

''یو آر رائٹ......''

''آئی سی...... میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''گڈ......'' شیخ حامد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے یہ عہد کیا ہے کہ جب تک مجرموں کے ہاتھ میں ہتھکڑی نہیں پہناتے...... میرے ہر حکم پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھیں گے۔''

''یس! بشرطیکہ وہ حکم ہمارے قوانین سے متصادم نہ ہو۔''

''میں نے اس وقت خاص طور سے جگا کے سلسلے میں

آپ کو کال کیا ہے۔'' شیخ حامد نے گفتگو جاری رکھی۔ ''یہ اور بات ہے کہ رہائی کے بعد اس کے خلاف آن ریکارڈ کوئی قابل گرفت ثبوت نہیں ہے لیکن آپ نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اس کے خلاف کچھ رپورٹس آپ کو بھی ملی ہیں۔''

''یس...... میں نے غلط نہیں کہا تھا۔''

''آپ کی اطلاع کے مطابق سزا کاٹنے کے بعد سے وہ کوئی ذاتی کاروبار کررہا ہے؟''

''جی ہاں...... فائل رپورٹ یہی ظاہر کرتی ہے۔''

''آپ اور...... آپ کی فائل رپورٹ!'' شیخ حامد نے قدرے تلخ لہجے میں تلملا کر کہا۔ ''جو لوگ شریفانہ کاروبار کرتے ہیں وہ کبھی پراسرار طور پر منظر عام سے غائب ہوکر انڈر گراؤنڈ نہیں ہوتے۔''

''میں آپ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں اور یہ بھی صاف گوئی سے عرض کردوں کہ میں ذاتی طور پر بھی اس بات کا سراغ لگانے کی کوشش کررہا ہوں کہ ایک دو مخصوص قتل کی وارداتوں کے بعد سے جگا نے روپوشی کیوں اختیار کررکھی ہے؟ کیا آپ اس کی وجہ جانتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پلیز مجھ سے تعاون کریں۔''

''مسٹر اورنگ زیب......'' اچانک شیخ حامد کا لہجہ بے حد تلخ ہوگیا۔ ''آپ شاید بھول رہے ہیں کہ اس وقت آپ کس سے مخاطب ہیں۔''

''سوری!...... میں سمجھا نہیں......؟''

''میں فون پر طویل باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔'' شیخ حامد نے بہ دستور تنگ مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

''اوہ...... یقیناً کوئی خاص بات ہے۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''کیا میں اس وقت آپ سے دوبارہ مل سکتا ہوں؟''

''نہیں...... کل رات دس بجے میں آپ کے لیے وقت نکال سکتا ہوں، آنے سے پہلے مجھے کال ضرور کرلیں۔'' جواب میں پھر سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا پھر دوسری جانب سے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

☆☆☆

زخمی کو بستر سے اتار کر وہیل چیئر پر منتقل کیا گیا تو اس نے بڑی بڑی مونچھوں والے ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھا۔

''تم...... اس وقت مجھے کہاں لے جارہے ہو؟''

جواب میں ہیڈ کانسٹیبل کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ اس نے زخمی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا لیکن خاموش ہی رہا۔ دوسرے ماتحتوں کی موجودگی میں اس نے زبان ہی رکھی، لوچن اور زخمی دونوں ہی خاص قیدی تھے جن کو پی اورنگ زیب کے حکم سے رعایت دی جارہی تھی و ہیڈ کانسٹیبل دو گھنٹے کے اندر اندر ان کو بتا دیتا کہ وہ قیدیوں کے حلقے میں بھی جلاد کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' زخمی نے دوسری بار بھی بے پروائی سے سوال کیا تو ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

''زبان بند رکھو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔''

''لیکن......''

''مروت...... ابھی تمہیں پھانسی کے پھندے پر نہیں لٹکایا جارہا، جب اس کا حکم آگیا تو پھر تمہارے ساتھ ہونے والا وی آئی پی ٹریٹمنٹ بھی نکاسی کے راستے باہر نکال دیا جائے گا۔ میں اگلا پچھلا حساب برابر کرنے میں کوئی رعایت بھی نہیں کرتا۔''

زخمی نے خلاف توقع خاموشی اختیار کرلی لیکن دس منٹ بعد جب اسے لوچن والے حوالاتی کٹھرے میں لایا گیا تو اس کی نظریں لوچن پر جم کر رہ گئی تھیں۔ لوچن بھی اسے دیکھ کر ایک لمحے کو چونکا پھر اس نے کڑوا سا منہ بنا کر ہیڈ کانسٹیبل کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔

''یہ کیا ٹوٹا پھوٹا کباڑ خانہ اٹھا لائے ہو؟ میں اپنے ساتھ سوائے کسی خوبصورت عورت کے کسی اور کا وجود برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

''یہ تمہاری سسرال نہیں ہے پتر......'' ہیڈ کانسٹیبل نے اس وقت بھی اوپر کے سخت احکام کی بنا پر رعایت سے کام لیا۔ ''رہا یہ لنڈا مارکیٹ کا دوسرا پیس تو اسے گرینڈ فادر کے حکم پر تمہاری سرپرستی میں دیا گیا ہے۔''

جواب میں لوچن نے بھی اسے دو چار تند و تیز جملے کس دیے تھے لیکن وہ خون کے گھونٹ پیتا اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ کٹھرے کو باہر سے قفل لگا کر وہ سب اورنگ زیب کے حکم کے مطابق اس سے بیس فٹ دور چلے گئے تھے۔ لوچن نے ان کے جانے کے بعد دوبارہ زخمی کو دیکھا جو اس وقت بھی کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کی تیز عقابی نظریں بہ دستور لوچن کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو؟'' لوچن نے حقارت کا اظہار کیا۔ ''میں چھوٹے موٹے مجرموں کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا جبکہ تم...... تم شاید کسی پولیس مقابلے میں فرار ہوتے ہوئے پکڑے گئے ہو؟ صورت سے بھی

اٹھائی گیر ہی لگتے ہو۔"

"اور تم کون سا گولڈ میڈل لے کر یہاں آرام کرنے آئے ہو؟" زخمی کا لب ولہجہ بھی بدل گیا، اس کی نگاہیں اب بھی لوچن کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

"تمہاری زبان سے گولڈ میڈل ہی کیوں نکلا؟" لوچن نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ "ایک عرصے سے مافیا کے لوگوں نے بھی گولڈ کی تجارت کرنے والوں کی سرپرستی چھوڑ دی ہے۔ فی الحال ہیرو اور ہیروئن کا راج ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تم میرے بارے میں غلط سوچ رہے ہو۔" زخمی نے جھلا کر پینترا بدلا۔ "مجھے محض ایک شبہے کی بنیاد پر پولیس نے گرفتار کیا ہے۔ میں اگلی دو تین پیشیوں پر پھر کھلی فضا میں سانس لے سکوں گا۔"

"ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" لوچن نے دبی زبان میں سوال کیا۔

"کمائی کا سب سے سستا، آسان اور گھٹیا طریقہ۔"

"لیکن میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر تم...... یا کوئی مجھے اپنا نام بتا دے تو میں اس کے ماضی، حال اور مستقبل کو کسی عصمت فروش عورت کی طرح ننگا کرنے میں بھی مہارت رکھتا ہوں۔"

"تم بھول رہے کہ ہم اس وقت سرکاری مہمان خانے میں ہیں جہاں تن کا کپڑا بھی اپنا نہیں ہوتا۔" زخمی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ "میں تمہیں بہ طور فیس ایک دمڑی بھی نہیں دے سکوں گا۔"

"آج کل دنیا میں نقدی کے بجائے کریڈٹ کارڈز کا راج ہے۔ میں تمہارے ساتھ کریڈٹ کے وعدے پر بھی اعتبار کر سکتا ہوں۔"

"میں...... میرا نام ارباز خان ہے......" زخمی نے ہچکچا کر کہا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ میری رہائی کب تک ممکن ہو سکے گی؟"

لوچن نے ارباز خان کے نام کو دو چار بار دُہرایا پھر انگلیوں پر کچھ حساب کتاب لگانے لگا، زخمی اسے بہ دستور سنجیدگی سے گھور رہا تھا۔ دس منٹ تک خاموشی رہی پھر لوچن اپنی جگہ سے اٹھ کر زخمی کے قریب آ گیا، سرسراتے لہجے میں بولا۔

"تم نے اپنا نام درست نہیں بتایا پھر بھی میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ رہائی کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد تم بھی یہاں سے جان ہتھیلی پر رکھ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤ گے...... اس کے بعد...... اس کے بعد...... اس کے بعد مجھے صاف نہیں نظر آ رہا...... ہاں، اگر تم سچائی سے اپنا اصلی نام بتا دو تو میں ہر بات پورے اعتماد سے سو فیصد درست بتا سکتا ہوں۔"

"میرا نام ارباز خان ہی ہے......" زخمی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں سمجھ رہا ہوں کہ تم سوائے تکے بازی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

"یہ تمہاری رائے ہے۔" لوچن نے معنی خیز انداز میں ایک آنکھ جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔ "ارباز خان کے بجائے اگر تم نے کسی غیر اسلامی نام کا انتخاب کیا ہوتا تو بات نبھ سکتی تھی۔ نہیں، درمیان میں نہ بولنا، صرف میرے علم کی گہرائی پر غور کرتے رہو۔ ارباز خان خوب صورت نام ہے لیکن...... تم نے جلد بازی میں ایک اہم پوائنٹ کو نظر انداز کر دیا...... فرض کرو میں یا پولیس والے تمہارا یہ سرکاری پاجامہ اتار دیں تو نام کی ساری خوب صورتی کا بھرم کتنی دیر قائم رہ سکے گا؟"

"کون ہو تم؟" زخمی نے اس بار حیرت کا اظہار کیا۔

"ارباز خان کے حوالے سے اگر میں اپنا نام رابرٹ نام ظاہر کروں تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟" لوچن کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ ابھری، اس میں بھی ہزاروں زہریلے معنی پنہاں تھے۔

"نہیں...... تم وہ نہیں ہو سکتے۔" زخمی چونکا۔ "اسے...... اسے میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا...... مم...... میری آنکھیں اتنے بڑے دھوکے پر یقین نہیں کر سکتیں۔"

"پھر اس بات پر یقین کر لو کہ تمہاری طرح میں بھی بلیک ٹائیگر کے پاس ورڈ پر آنکھ بند کر کے کام کرتا رہا ہوں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اپنی ناگہانی موت سے دو روز قبل اس نے مجھے یہ بات بتا دی تھی کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا تھا۔ اب کیا مجھے یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ تم بھی شیخ حامد المعروف بگ باس کے زرخرید غلام ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

زخمی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ لوچن کو پوری توجہ سے گھور رہا تھا، اس کی آنکھوں میں تجسس اور حیرت کے ملے جلے تاثرات پھیل کر گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"میرے گاڑھی اردو بولنے پر شاید تم کو حیرت ہو رہی

ہے؟" لوچن نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "اس الجھن کو ذہن سے نکال دو، میں دنیا کی آٹھ زبانیں اسی قدر روانی سے بول سکتا ہوں کہ خود اس زبان کے بڑے بڑے اسکالر بھی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ تم درست کہہ رہے ہو لیکن میں......"

"اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ اگر میں بگ باس کا کارندہ تھا تو میں نے اور میرے ساتھی نے اس کے کاروباری آفس کو آگ کیوں لگا دی۔" لوچن نے زخمی کا ادھورا جملہ پورا کیا تو وہ اور ششدر رہ گیا۔ لوچن نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "وہ بگ باس کی پولیس کو دھوکا دینے کی ایک زبردست پلاننگ تھی۔" لوچن نے بات جاری رکھی۔ "تم کیا!...... ایس پی اورنگ زیب جیسا گھاگ آفیسر بھی یہی سمجھ رہا ہے کہ میں بگ باس کے بجائے کسی اور گروپ کا نمائندہ ہوں۔"

"تم نے یہاں سے فرار ہونے والی بات کیوں کہی تھی......؟" زخمی نے کچھ توقف کے بعد دبی زبان میں سوال کیا۔

"پہلے میری ایک بات دھیان سے سن لو۔" لوچن نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "یہ گُر کی بات ہے۔ ایک بار جو فرضی نام ضرورت کے تحت اختیار کرو اسے دوبارہ کبھی زبان سے نہ نکالنا۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"اب کھل جاؤ مائی ڈیئر رام دیال!" لوچن یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ "ویسے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم جرائم کی دنیا میں وشنو کے نام سے مشہور ہو۔ اچھا نک نیم ہے، کم از کم ہندوستان کے جرائم میں تمہاری حیثیت کسی اوتار (وشنو) سے کم بھی نہیں ہے۔" لوچن نے بات جاری رکھی۔ "میں نے فی الحال فرار کے معاملے والی بات تم سے اس لیے کہی ہے کہ مجھے اس کے لیے تمہاری ضرورت پیش آئے گی۔ جانتے ہو کیوں؟"

"نہیں......"

لوچن مسکرایا پھر جنگلے کے قریب جا کر اس نے اطمینان کر لیا کہ کہیں قریب کوئی موجود نہیں تھا۔ بے پروائی سے قدم اٹھاتا وہ دوبارہ وشنو کے قریب آ گیا پھر مدھم آواز میں بولا۔ "ایس پی اورنگ زیب اتفاق سے میری مٹھی میں آ گیا ہے۔ وہ مجھے کسی اور گروپ اور تمہیں بگ باس کا آدمی سمجھ رہا ہے۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ میں مر جاؤں گا لیکن زبان نہیں کھولوں گا۔ بہرحال، کسی خاص وجہ سے اس نے مجھے اپنے حق میں رام کر لیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں تمہاری زبان پر پڑے تالے کھلوا سکتا ہوں۔ اسی مقصد سے تمہیں میرے پاس لایا گیا ہے۔ وشنو کی حیثیت سے تمہیں شناخت کر لینے کے بعد ہی میرے ذہن میں ایک خاص منصوبے نے جنم لیا ہے۔ اگر تم بگ باس اور اس کے گروپ کے بارے میں کچھ فرضی اور کچھ اصلی باتیں ایس پی کو بتا دو تو ہم دونوں مل کر اسے نہایت آسانی سے ڈبل کراس کر سکتے ہیں۔"

"فرار ہونے کے بعد کی تم نے کیا پلاننگ کی ہے......؟" وشنو نے کچھ توقف سے سوال کیا۔

"سوری وشنو...... میں قبل از وقت اپنے ٹرمپ کارڈز اوپن کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" لوچن کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ "اگر تم میرے اوپر اعتماد نہیں کرتے تو پھر تم جانو اور تمہارا کام۔"

"جگا کے نام سے واقف ہو......؟" وشنو نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"ہاں......" لوچن نے اعتماد سے جواب دیا۔ "بگ باس کے کہنے پر میں اور بلیک ٹائیگر دونوں اس سے ملتے رہتے تھے۔ میرا تیسرا ساتھی جو خودکشی کر چکا ہے اس کا اور بلیک ٹائیگر کا آمنا سامنا جگا کے ٹھکانے پر ہی ہوا تھا اس کے بعد ہی......"

"ون منٹ......" وشنو نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "اگر تم اور تمہارا تیسرا ساتھی بگ باس کے لیے کام کر رہے تھے تو پھر بلیک ٹائیگر کی موت میں کس کا ہاتھ تھا......؟"

"ابھی نہیں......" لوچن نے کچھ سوچ کر غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ "جب تک ہم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو جاتے، میں تمہارے سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔ اپنے اپنے اصول کی بات ہے۔"

"صرف ایک الجھن اور دور کر دو۔" اس بار وشنو نے کسی قدر اپنی آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہاں سے فرار ہونے کے منصوبے میں پولیس کے کچھ افسران کا ہاتھ بھی شامل ہوگا؟"

"ہو بھی سکتا ہے......" لوچن نے محتاط لہجے میں کہا تو وشنو پھر کسی سوچ میں گم ہو گیا لیکن بالآخر اس نے لوچن کی باتوں سے متاثر ہونے کے بعد اس بات کا اقرار کر لیا کہ وہ اورنگ زیب کے سامنے کسی حد تک زبان کھولنے پر تیار ہے۔

وشنو کا اقرار سن کر لوچن نے اچانک جو ہنگامہ شروع

کیا وہ خود دشنو کے لیے بھی تعجب خیز تھا، وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا اور پولیس والوں کی شان میں دل کھول کر گالیاں بک رہا تھا۔ پہرے پر مامور عملے کو گالیاں دے دے کر پکار رہا تھا۔ اس کا نتیجہ دس منٹ بعد ہی سامنے آ گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور نگہبانی پر مامور عملہ اس سب انسپکٹر کے ساتھ ہی سامنے آ گیا جو انچارج تھا۔

''وہاٹ نان سنس۔'' سب انسپکٹر نے کٹہرے کے باہر ہی سے کرخت لہجے میں لوچن کو مخاطب کیا۔ ''کیوں شور مچا رکھا ہے؟''

''میں اس باسٹرڈ کو برداشت نہیں کرسکتا۔'' لوچن نے دشنو کی جانب اشارہ کر کے مرعوب ہوئے بغیر بڑی حقارت سے چیخ کر کہا۔ ''وہ ان فائیو منٹس اس کو ادھر سے لے جاؤ ورنہ میں اسے جان سے ماردوں گا۔''

سب انسپکٹر کے علاوہ ہیڈ کانسٹیبل کی آنکھوں میں بھی خون لہرا کر رہ گیا۔ پھر سب انسپکٹر نے وہیں کھڑے کھڑے کسی سے موبائل پر رابطہ کیا اس کے بعد وہ تلملاتا ہوا مسلح عملے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے لوچن کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا پھر سپاہیوں کو اشارہ کیا تو وہ دشنو کی وہیل چیئر کو خاموشی سے باہر لے گئے۔

''تھینکس سب انسپکٹر......'' وشنو کے جانے کے بعد لوچن نے نارمل انداز میں سب انسپکٹر کا شکریہ ادا کیا پھر سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آفیسر، کیا تمھیں اس کہانی سے کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے کہ راون نے لنکا ڈھانے کی کوشش کیوں کی تھی؟''

سب انسپکٹر نے اس بار بھی بارود بھری نظروں سے لوچن کو دیکھا پھر پلٹ کر خاموشی سے لمبے لمبے قدم اٹھاتا واپس لوٹ گیا۔

☙☙☙

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ کا عمل تھا۔

ایس پی اورنگ زیب اپنی خواب گاہ سے ملحقہ اسٹڈی میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا جب موبائل پر مخصوص سگنل ملا اور اس نے اتنی جلدی میں اسے آن کیا جیسے وہ اسی کال کا منتظر ہو۔

''کیا اطلاع ہے؟'' اس نے مختصر سوال کیا۔

''ہمارا مطلوبہ شکار ابھی پانچ منٹ قبل ایک سیاہ وین میں نکلا ہے۔''

''تمہیں کیسے یقین ہے کہ وین کے اندر وہی ہوگا؟''

''اندر کے آدمی نے اطلاع دی ہے۔''

''گڈ......'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ''اس وقت اس کا رخ کدھر ہے؟''

''میرا دوسرا ساتھی اس کے تعاقب میں ہے۔ پہلے وین کا رخ ڈیفنس ایریا کی طرف تھا لیکن اب وہ ہائی وے کی طرف جارہا ہے۔''

''اگر تمہیں یقین ہے کہ وین میں وہی ہے تو اسے کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہیے۔'' اورنگ زیب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں ہدایت کی۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہ اب بھی کسی تعاقب کے پیش نظر دوبارہ راستہ تبدیل کرے۔ ممکن ہے کوئی دوسری کار تمہارے ساتھی کے تعاقب میں بھی ہو۔ اس سے کہو کہ محتاط رہے۔ دس منٹ بعد مجھے دوبارہ کال کرنا۔''

اس ہدایت کے ساتھ ہی اورنگ زیب نے موبائل آف کر دیا پھر اس نے دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر میز سے ایک موبائل نما شے اٹھا کر اس کے چرمی کیس کو کھولا، اندر تین بائی دو کی اسکرین ہی نظر آرہی تھی جس کے نیچے حروف کے بجائے کچھ ہندسے اور اشاروں کے نشان موجود تھے۔ ایک مخصوص سمت سے ہلکا دباؤ ڈالنے کے بعد اسکرین پوری طرح روشن ہوگئی۔ اسکرین پر صرف ایک سرخ رنگ کا نقطہ اسپارک کرتا نظر آرہا تھا۔ اورنگ زیب نے اس ڈیوائس کے اوپری سرے سے ایک ایریل نما باریک راڈ پورا کھینچا تو اسپارک کرتا ہوا نقطہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ تبدیل کرنے لگا۔ اورنگ زیب کی نگاہیں چمکنے لگیں، وہ اس نقطے پر نظر جمائے بیٹھا رہا، نقطہ حرکت کرتا ہوا... بائیں جانب ایک جگہ رک گیا تو اورنگ زیب نے ایک ہندسہ دبا کر اسکرین کا منظر تبدیل کیا، اب اسکرین پر سڑکوں کا ایک جال سا نظر آرہا تھا جس پر گول دائروں میں مختلف نمبر موجود تھے۔ اگلا بٹن دباتے ہی ایک ہندسے کا رنگ تبدیل ہوکر سرخ ہوگیا، اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب کے ماتھے پر آڑی ترچھی سلوٹیں ابھرنے لگیں لیکن اس کی آنکھیں بہ دستور چمک رہی تھیں، تیسرا بٹن آزمانے میں اس نے بڑی سرعت کا مظاہرہ کیا، سڑکوں کے جال کی جگہ اب تلے اوپر ترتیب سے نمبر درج تھے، ان کے آگے باریک حروف میں اس نمبر کا مقام بھی درج تھا، وہ اسکرین کو رول کرتا رہا پھر...... ایک جگہ اس نے ہاتھ روک لیا۔ اس کا مطلوبہ نمبر اور اس کے آگے درج مقام کا نام دونوں سرخ تھے۔ ایک لمحے تک وہ پوری توجہ سے انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے ڈیوائس بند کر کے واپس رکھ دی اور موبائل پر کسی کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہونے میں بہ مشکل پندرہ

سیکنڈ لگے ہوں گے۔

''میں غافل نہیں ہوں سر......'' خاص پاس ورڈ کے بعد دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''اس وقت بھی میں نئے اسپاٹ کے قریب ہی ہوں۔''

''گڈ...... مجھے تم سے اسی انداز میں عمل کرنے کی امید تھی۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ''محتاط رہنا، ہوسکتا ہے کہ آدم خور کا رخ بھی اسی طرف ہو۔''

''میں بھی ان ہی خطوط پر غور کر رہا تھا......''

''میری ہدایت کو نظر انداز نہ کرنا۔'' اس بار اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''اس بات کی فکر مت کرنا کہ تمہارے ہاتھ سے کتنے خون ہوئے۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا لیکن شیشے میں کسی صورت بال نہ آئے۔ یہ میری ذمے داری ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا جناب......''

''گڈ لک......'' اورنگ زیب نے کال منقطع کی پھر اٹھ کر دبیز قالین پر ٹہلنے لگا۔ سات آٹھ منٹ بعد موبائل پر دوبارہ سگنل ملا تو اس نے جھپٹ کر اسے آن کرتے ہوئے پوچھا۔

''اب کیا خبر ہے......؟''

''میرے آدمی کا تعاقب نہیں کیا گیا اور...... آپ کا اندازہ بھی درست تھا، وہ مختلف راستے بدلنے کے بعد اب اپنے ایک پرانے اور مخصوص ٹھکانے پر گیا ہے۔''

''کتنی دیر پہلے کی بات ہے......؟''

''بہ مشکل دو منٹ ہوئے ہوں گے، میں آپ کو کال کرنے ہی والا تھا کہ آپ کی کال......''

''میری بات پوری توجہ سے سنو......'' اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر بے حد سنجیدگی سے ہدایت کی۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہاں ہنگامے کی کوئی صورت اچانک پیدا ہوجائے، ایسی صورت میں تم باہر سے حملہ کرنے والی پارٹی کو سپورٹ کرو گے، آپس میں الجھنے کی نوبت آجائے تو تم میرے نام کا مخفف، اے۔ زیڈ استعمال کر کے بات بگڑنے سے سنبھال سکتے ہو، میں نے دوسری پارٹی کو بھی یہی ہدایت کردی ہے۔''

''باہر سے کون حملہ کرے گا......؟''

''وقت کم ہے...... تم صرف ہدایت پر عمل کرو۔'' اورنگ زیب نے جلدی میں تاکید کی پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ لباس تبدیل کر کے بڑی جلدی میں باہر نکل رہا تھا جب موبائل پر پھر سگنل موصول ہوئے، روشن اسکرین پر ڈی آئی جی کے نمبر دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

ایک لمحے تک مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے بہرحال موبائل آن کر کے بڑی سادگی سے کہا۔

''خیریت تو ہے سر...... اس وقت کیسے یاد کرلیا......؟''

''آج شیخ حامد کا فون آیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اب آپ نے مفاہمتی طریقہ اختیار کرلیا ہے۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔ ''اس طرح درمیانی راستہ اختیار کر کے ہم زیادہ آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں لیکن بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ آسانی سے تر نوالہ بھی نہیں بنے گا، ہمیں مشترکہ طور پر کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا ہوگا جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''ایسا کوئی طریقہ ہے آپ کے ذہن میں؟''

''اس موضوع پر کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر بات ہوگی۔ فی الحال میں نے آپ کو شبنم کے بارے میں فون کیا ہے۔ شیخ حامد ہر قیمت پر اس کی بازیابی کی خاطر زور ڈال رہا ہے۔''

''میں اور سراج دونوں کوشش کر رہے ہیں سر......'' اورنگ زیب نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ قسمت سے جلد ہی اس کا کوئی سراغ مل جائے، یہ بھی ممکن ہے ہم کبھی کامیاب نہ ہوسکیں۔''

''میں سمجھا نہیں......؟''

''ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن...... اگر شبنم کے اغوا میں آکٹوپس کے دشمنوں کا کوئی انتقامی جذبہ یا مقصد ہوگا تو پھر اسے یقیناً ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔''

''آئی۔ سی۔'' ڈی آئی جی نے چونک کر جواب دیا۔ ''آپ کی بات سمجھ میں آرہی ہے، بہرحال ہم ابھی کوئی آخری فیصلہ بھی اخذ نہیں کرسکتے۔''

''اس سلسلے میں افضل خان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں......؟''

''افضل خان کی موجودگی میں شبنم کا اغوا ہونا ابھی تک میرے حلق کے نیچے نہیں اتر سکا۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اغوا کے فوراً بعد وہ اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ کر ہوٹل میں منتقل ہوگیا؟ پھر اسے بھی بھرپور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری نگرانی کے باوجود دوبارہ منظر عام سے ہٹا دیا گیا۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں آپ نے بھی ضرور کوئی رائے قائم کی ہوگی۔''

''میں آپ کا اشارہ سمجھ رہا ہوں لیکن...... آکٹوپس کو اس قسم کی حرکتوں سے کیا حاصل ہوسکتا ہے؟''

''اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے۔'' اس بار اورنگ زیب نے خشک انداز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... میں ایک دو دن میں جنرل میٹنگ کال کر کے سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ مشترکہ کوشش کر کے ان تمام معموں کو حل کرنے کی کوشش کریں۔''

''نہایت مناسب خیال ہے سر......''

دوسری جانب سے کال منقطع کی گئی تو اورنگ زیب معنی خیز انداز میں شانے اچکاتا تیز تیز قدم اٹھاتا باہر آیا اور اپنی واکس ویگن میں بیٹھ کر بنگلے سے باہر آ گیا۔ اس گاڑی کو وہ خاص خاص موقعوں پر استعمال کرنے کا عادی تھا۔

***

لیاقت حسین اور فرحین واپسی کے لیے تیار تھے۔ باہر سردار سرفراز خان کی لینڈ کروزر تیار کھڑی تھی۔ سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا جب لیاقت حسین کی ماں نے اسے علیحدہ کمرے میں بلا کر کہا۔

''تو جدھر کام کر رہا ہے ادھر تیری کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں ہے؟''

لیاقت حسین کے چہرے پر تجسس کا ایک رنگ آ کر تیزی سے گزر گیا، ماں کی دلجوئی کی خاطر حیرت سے بولا۔ ''دشمنی کیسی ماں؟''

''ماں سے جھوٹ بول رہا ہے۔'' ماں نے شکوہ کیا۔ ''ہم تیرا ماں ہے لیاقت حسین اور ماں کا دل اپنا جگر کے ٹکڑے کے لیے، کبھی بلاوجہ نہیں دھڑکتا۔''

''تو پریشان نہ ہوا کر ماں، میں وہاں بالکل خیریت سے ہوں اور......''

ماں نے اس کا جملہ کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''اور تو یہ بھول گیا تیرا پرنانا اپنا وقت کا بہت بڑا بزرگ تھا۔ وہ اب دنیا میں نہیں رہا لیکن اب بھی اس کا سایہ ہمارا سروں پر رہتا ہے۔ کل رات میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ جانتا ہے وہ تیرے لیے کیا بولا تھا؟''

''خواب تو نے دیکھا ہے ماں، میں بھلا اس کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں۔'' لیاقت حسین نے بہ دستور بڑے لاڈ سے جواب دیا۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ ادھر شہر میں کوئی پلید کا تخم تیرا دشمن بن گیا ہے اس لیے کہ تو نے اس کے کسی گندے عمل کو اپنا جان پر کھیل کر غارت کر دیا تھا لیکن اوپر والے کی مرضی سے اس کے کسی نیک بندے نے تیری حفاظت کر دی تھی۔''

لیاقت حسین سنجیدہ ہو گیا۔ ماں جو کہہ رہی تھی وہ غلط نہیں تھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار رکھی تو ماں نے اس کے بازوؤں کو تھام کر پورے اعتماد سے کہا۔

''ایک بات کا ہمیشہ یقین رکھنا ماں کا جگر...... جس پر اوپر والا مہربان ہو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہی ایک مسلمان کا پکا ایمان ہے۔''

''پھر...... تو کس لیے پریشان ہے؟'' لیاقت حسین نے ماں کو تسلی دی۔ ''جو بھی اچھا برا ہوگا اسی اوپر والے کی مرضی سے ہوگا۔''

''ہاں...... لیکن تیرا... پرنانا کہہ رہا تھا کہ تیرے پلید دشمن نے تجھے زیر کرنے کے لیے زیادہ طاقت حاصل کر لیا ہے مگر وہ کامیاب نہیں ہوگا، خدا نے چاہا تو وہ حرام کا تخم خود اپنا جال میں الجھ کر مرے گا۔ اس کے لیے تیرا پرنانا نے مجھے قرآنی عمل کا تعویذ تیار کرنے کو بولا تھا جو میں نے تیار کر لیا ہے۔'' ماں نے ایک موم جامہ کیا ہوا تعویذ نکال کر لیاقت حسین کو دیتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ ''اس تعویذ کے بارے میں کسی کو کچھ نہ خبر ہونے دینا، فرحین کو بھی نہیں۔ ہر وقت اسے اپنے پاس چھپا کر رکھنا۔ خدا نے چاہا تو تیرا دشمن خود اپنے پھندے میں پھنس کر جہنم رسید ہو جائے گا۔''

لیاقت حسین نے تعویذ احتیاط سے جیب میں محفوظ کیا، ماں سے لپٹ کر بڑے پیار اور اعتماد سے بولا۔ ''ماں، تیری دعائیں جب تک میرے ساتھ ہیں پورا دنیا مل کر بھی تیرے لیاقت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

ماں کے ساتھ وہ کمرے سے نکل کر باہر آیا تو فرحین اور سردار سرفراز خاں سامنے کھڑے تھے۔ لیاقت اور فرحین جانے کے لیے دروازے تک پہنچے تو سرفراز خاں نے فرحین کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''ہمارا لیاقت کا بہت خیال رکھنا فرحین اور...... ہو سکے تو ہم کو معاف کر دینا۔''

''فرحین کو گناہ گار نہ کرو بابا...... ہمارا دل میں آپ کا جو عزت پہلے تھا وہ اب بھی ہے۔'' فرحین نے سرفراز خاں کے سینے پر بڑی عقیدت سے سر ٹکا کر کہا۔ ''آپ ہم دونوں کا بڑا ہے بابا...... غلطی تو ہم بچوں سے ہو جاتا ہے اس لیے اگر ہم سے......''

''نہیں جان جگر، آگے کچھ مت بولنا، ہم پہلے ہی بہت شرمندہ ہے۔'' سرفراز خاں نے فرحین کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے پھلنے پھولنے کی دعا دی تو لیاقت حسین کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ باہر آ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئے تو سرفراز خان

نے لیاقت حسین کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے کہا۔ ''تمہارا آنے کے بعد سے دو تین بار ہمارا اور سیٹھ عثمان کا تفصیلی بات ہو چکا ہے، اس نے تمہارے لیے جو بولا ہمیں اس پر فخر ہے۔ ایمانداری سے کام میں اوپر والا بھی برکت دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ابھی اور ترقی کرے گا۔''

''بابا...... آپ اور ماں ہمارے پاس کب آئیں گے؟'' لیاقت حسین نے باپ سے پوچھا تو اس کی ماں نے کہا۔

''ادھر تمہارا باپ کا کچھ ضروری کام نہ ہوتا تو ہم تمہارا ساتھ ہی چلتا لیکن خدا نے چاہا تو ہم بہت جلدی تمہارے پاس ہوگا۔''

لیاقت حسین اور فرحین ماں باپ کی دعائیں لے کر واپس شہر آ گئے۔ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم نے ایک بار پھر دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد لیاقت حسین تیار ہو کر ڈیوٹی پر گیا تو سیٹھ عثمان نے اسے اندر بلا کر کہا۔

''لیاقت حسین، تم نے شاید اسٹور میں جا کر نئی الماری نہیں دیکھی جسے بیگم صاحبہ نے بڑے اہتمام میں تمہارے لیے خریدا ہے، اس میں تمہارے لیے وہ نئے لباس ہیں جن کو پہن کر تم کل سے دفتر میں بیٹھا کرو گے۔''

''فرحین کو میں آج کسی وقت اپنے ساتھ لے جا کر شاپنگ کراؤں گی۔'' راحیلہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''اور ایک بات کا خیال رکھنا۔ تم دونوں پہلے بھی ہمارے لیے غیر نہیں تھے لیکن اب دوسری بات ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اب تم کسی تکلف سے کام نہیں لو گے۔ مجھے اور عثمان کو اپنے گھر کے فرد جیسا خیال کرو گے۔''

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کی چھلکتی ہوئی آنکھیں اس کے دل کی ترجمانی کر رہی تھیں جب سیٹھ عثمان نے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اپنے برابر صوفے پر بٹھا لیا۔ دوستوں کی طرح کہا۔

''کل رات تمہارے آنے کے بعد بھی میں نے سرفراز خاں سے طویل گفتگو کی تھی، اپنی خفگی کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ تمہاری ماں کو لے کر تم لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آیا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ پندرہ روز کے اندر اندر ضرور آئے گا۔''

''ماں نے بھی جلدی آنے کا وعدہ کیا ہے۔'' لیاقت حسین نے کسمسا کر جواب دیا۔

''اگر وہ سیدھی طرح نہ آئے تو مجھے پھر سراج بھائی کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔'' راحیلہ بیگم نے بے تکلفی سے کہا۔ اسی وقت فرحین نے داخل ہو کر سیٹھ عثمان کو سلام کیا، راحیلہ بیگم نے بڑے خلوص سے اٹھ کر گلے لگایا پھر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

گفتگو کے درمیان ہلکے پھلکے ناشتے کا اہتمام ہوا، اس دوران لیاقت حسین بھی سیٹھ عثمان کے ساتھ تھوڑا بہت گھل مل گیا۔ تکلفات کے بادل آہستہ آہستہ چھٹتے رہے۔

اگلی صبح فرحین ناشتا بنا رہی تھی جب لیاقت حسین گہرے کلر کا سفاری سوٹ پہن کر اس کے سامنے آ گیا، یہ لباس اس نے زندگی میں پہلی بار پہنا تھا، فرحین نے لیاقت حسین کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی، لیاقت حسین اس خوب صورت لباس میں دنیا کا حسین ترین فرد نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ بت بنی کھڑی لیاقت حسین کو بڑی اپنائیت سے دیکھتی رہی پھر دوڑ کر بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

''یہ...... یہ کیا کر رہی ہو؟'' لیاقت حسین نے بناوٹی خفگی کا اظہار کیا۔ ''ہمارے لباس کا استری خراب ہو جائے گا۔''

''کیا کہا تو نے......؟'' فرحین نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر شوہر کو جھلا کر گھورا۔ ''اب یہ فرنگیوں کا لباس پہن کر تیری نظریں بھی بدل گئیں؟ کیا یہ لباس تجھے اپنی فرحین سے زیادہ پیارا ہے؟''

''ہے تو سہی......''

لیاقت حسین نے منہ بنا کر جواب دیا تو فرحین غصے سے تلملا کر بولی۔ ''سچ کہہ رہا ہے؟...... ایک بار پھر میری قسم کھا کر بول۔''

''لباس میرے تن سے لگا ہوا ہے اس لیے زیادہ اچھا لگ رہا ہے اور تو مجھ سے دور کھڑی بالکل اچھی نہیں لگ رہی۔'' لیاقت حسین نے شوخی سے کہا۔ ''یہی میرا دل بولتا ہے...... تیری مرضی، مان یا نہ مان۔''

''یہ بات ہے تو پھر جہنم میں گئی تیرے لباس کی استری۔'' فرحین نے لیاقت حسین کے دل کی بات سمجھی تو اس وقت خود بھی دیوانی ہو گئی، لیاقت حسین اس کی چاہت تھی، اس کی پسند تھی، نئے لباس کی کشش نے اسے ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت بنا دیا تھا پھر وہ ان لمحوں کو یادگار بنانے سے دریغ کس طرح کرتی۔

فرحین کی خودسپردگی کے جذباتی انداز نے لیاقت حسین کو بھی دیوانہ کر دیا، طوفان کا زور کچھ دیر بعد تھما تو دونوں ہی ہلکان ہو چکے تھے۔

فرحین خود کو سمیٹتی تیزی سے اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی، لیاقت حسین آنکھیں بند کر کے خوابوں کی دنیا میں گم ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ لباس تبدیل کر کے ناشتے سے فارغ ہو کر جانے لگا تو فرحین نے اسے دروازے پر روک کر اس کی بلائیں لیں، خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے بولی۔

''لیاقت ...... مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنے لیے تیرا انتخاب کیا تھا۔ قدرت کو بھی ہمارا ملاپ منظور تھا، ہم دونوں آج جس جگہ کھڑے ہیں یہ بھی اسی اوپر والے کی مہربانی ہے...... آج تو پہلی بار صاحب بہادر بن کر کرسی میز پر بیٹھنے جا رہا ہے تو ہاتھ باندھ کر تجھ سے ایک چیز مانگوں گی۔ تجھے قسم ہے...... انکار نہ کرنا۔'' فرحین کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''کیا پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے تیری کسی بات سے انکار کیا ہو؟'' لیاقت نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

''پہلے کی بات اور تھی فرحین کی جان لیکن ...... اب وقت کے ساتھ ہمارے حالات بھی بدل رہے ہیں اس لیے میرا دل ڈرتا ہے کہ کہیں کرسی میز پر بیٹھنے کے بعد تیری آنکھیں بھی......''

''چپ ہو جا...... جان لیاقت۔'' لیاقت حسین نے اس کے گداز ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے اعتماد سے کہا۔ ''دنیا بدل سکتی ہے فرحین لیکن ...... لیکن تیرا لیاقت تیرے لیے وہی رہے گا جس کا ہاتھ تھام کر تو نے ایک نئے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہم دونوں کا یہ مشترکہ سفر زندگی کی آخری سانسوں تک اسی طرح جاری رہے گا...... انشاءاللہ۔''

جواب میں فرحین کی آنکھوں میں پھر زندگی کے دھنک رنگ آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔

☆☆☆

شبنم کو اس زیرِ زمین کمرے میں دو روز گزر گئے تھے۔ اس عرصے میں اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ نگرانی کرنے والے بہ دستور گونگے بہرے بنے ہوئے تھے، صرف ایک بار شیخ حامد کے ایک خاص آدمی نے اس سے کچھ دیر کے لیے ملاقات کی تھی۔ اس نے شبنم سے بہت کچھ اگلوانے کی کوشش کی تھی لیکن شبنم نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے ہر بار ایک ہی جواب دیا تھا۔ ''وہ بگ باس کے علاوہ پہلے بھی کسی کو جواب دہ نہیں تھی۔ اب بھی صرف اسی کے سامنے زبان کھولے گی۔''

ان دو دنوں میں وہ متعدد بار اورنگ زیب کے بارے میں غور کرتی رہی تھی جس کی پناہ میں وہ خود کو سب سے زیادہ محفوظ سمجھ رہی تھی، اس کا برتاؤ اچانک اس قدر تلخ و جارحانہ ہو جائے گا، اس نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس بات کا علم اس کے فرشتوں کو بھی نہیں تھا کہ افضل خان پر اس کے اپنے اغوا ہونے کے بعد کیا گزری تھی؟ اسے کہاں رکھا گیا تھا؟ اس اغوا سے اس کا کوئی تعلق تھا بھی یا نہیں اور اگر وہ ایجنسی والوں کی نگرانی میں تھا تو پھر فرار کس طرح ہو گیا؟ اس کے فرار میں کس کا ہاتھ تھا؟ کیا بگ باس نے اسے اپنے آدمیوں کے ذریعے اٹھوا لیا تھا یا پھر خود افضل خان نے قید و بند سے آزاد ہو کر کہیں دور چلے جانے کی ٹھان لی تھی؟ حقیقت کیا تھی اسے قطعی علم نہیں تھا مگر ایس پی اورنگ زیب افضل خان کے فرار میں اسی کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا...... آخر کیوں؟ اس کا جواز کیا تھا؟ اسے اچانک کس جرم کی پاداش میں دوبارہ موت کے حوالے کر دیا گیا تھا؟

خاصی ذہنی جمناسٹک کرنے کے بعد اس کے ذہن میں اس موبائل کا خیال ابھرا جو اسے خود اورنگ زیب نے دیا تھا، وہ اس سے اعتراف بھی کر چکی تھی کہ ایک بار اس نے موبائل پر افضل خان سے رابطہ کیا تھا۔ اس اعتراف کے بعد اسے دوبارہ افضل خان سے رابطہ نہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ وہ خود بھی محتاط ہو گئی تھی لیکن اب ...... اب شاید وہی موبائل اس کے لیے ایک عذاب بن گیا تھا۔ افضل خان کے غائب ہو جانے کے بعد اسی موبائل کی وجہ سے وہ شکوک اور شبہات کے بھنور میں پھنس کر رہ گئی تھی، ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے سوچا ہو کہ وہ اس کی پناہ میں ہونے کے باوجود اسے ڈبل کراس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ افضل خان بہر حال ایک اہم شخصیت کا مالک تھا، اس کا فرار ہو جانا یا کسی مقابلے کے بعد غائب ہو جانا بعید از قیاس بھی نہیں تھا۔ بگ باس کے کہنے پر اس نے رستم علی آغا خانی پر جس مہارت اور دلیری کے ساتھ ہاتھ ڈالا تھا اور جو ثبوت حاصل کر لیے تھے وہ کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں تھی، خود بگ باس نے بھی اس سے نظریں پھیر لینے کے باوجود اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا۔

شبنم نے ہر زاویے سے مختلف امکانات پر غور کیا لیکن اس کی سمجھ میں اورنگ زیب کا اچانک اس سے نظریں پھیر لینے کا سبب ایک معما ہی بنا رہا۔

افضل خان کے زوال کے بعد شبنم کو اس کا مقام مل گیا تھا، یہ بات سراج اور اورنگ زیب کے علم میں بھی تھی۔ نہ ہوتی تو اورنگ زیب، شبنم اور افضل خان کے اندر اتنی دلچسپی بھی نہ لیتا، اس نے افضل خان کے ذریعے بگ باس کو زیر کرنے کا کوئی نہ کوئی منصوبہ ضرور بنایا ہو گا جو افضل خان کے

ہاتھ سے نکل جانے کے بعد تباہ ہو گیا۔ ایسی صورت میں خود شبنم بھی اگر اورنگ زیب کی جگہ ہوتی تو وہ بھی انہی خطوط پر ضرور غور کرتی جس پر اورنگ زیب نے غور کرنے کے بعد اسے دوبارہ اسی جہنم میں جھونکنے کا پروگرام بنا لیا تھا جس سے وہ بڑی مشکل سے نجات پا سکی تھی۔

اس وقت بھی وہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بستر پر لیٹی حالات کی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی جب کمرے کے واحد دروازے کے کھلنے کی آواز اس کے کانوں میں آئی، اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر آنے والے کو دیکھا تو سہم کر رہ گئی۔ شیخ حامد کو اس وقت سامنے دیکھ کر اسے اپنی سانسیں سینے میں گھٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ دروازے کے قریب ہی کسی آتش فشاں کی طرح سر اٹھائے کھڑا اسے خوفناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

شبنم ایک لمحے کو گنگ رہ گئی پھر تیزی سے خود کو سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ شیخ حامد کی تیز نظریں اسے اپنے جسم کا ایکسرے کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ خود شبنم کا دل بھی دھڑک رہا تھا جب شیخ حامد نے اسے قریب آ کر مخاطب کیا۔

''اب کیسی ہو......؟'' اس کے لہجے میں بڑی گہرائی تھی۔

''آپ کی پناہ میں آنے کے بعد دوبارہ زندگی کا احساس ہو رہا ہے۔'' شبنم نے حالات کے پیشِ نظر سنبھل کر جواب دیا۔

''جو تمہیں لے گئے تھے، وہ کون لوگ تھے؟'' سپاٹ اور خشک لہجے میں سوال کیا گیا۔

''ان کی تعداد دو تھی ...... دونوں ہی پروفیشنل ٹائپ کے بدمعاش لگ رہے تھے۔ میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو وہ غالباً جگا کے آدمی تھے۔''

''اس اندازے کا کوئی سبب بھی ہو گا؟''

''ان کا مقصد خاص طور پر مجھے اغوا کرنا تھا۔ انہوں نے افضل خان سے دور رہنے کو کہا تھا، شاید افضل خان کے مقابلے میں، میں ان کے لیے زیادہ اہم تھی۔''

''افضل خان کا کیا ردِعمل تھا؟''

''اس نے اچانک ہی بازی پلٹنے کی خاطر ان دونوں پر حملہ کر دیا تھا لیکن صرف ایک نے مارشل آرٹ کا مظاہرہ کر کے افضل خان کے سارے کس بل نکال دیے۔ دوسرے نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔''

''پھر......''

''وہ افضل کو دوبارہ وارننگ دے کر مجھے ساتھ لے گئے تھے۔ افضل خان نے دوبارہ درمیان میں آنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید وہ وقتی طور پر ان دونوں سے خائف ہو گیا تھا۔'' شبنم نے بیان جاری رکھا۔ ''وہ دونوں مجھے لے کر بڑے اطمینان سے لفٹ کے ذریعے نیچے آئے پھر مجھے ایک وین میں ڈال کر اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ میری آنکھ پر پٹی باندھ دی گئی تھی مگر میرے خیال میں وہ مجھے جہاں لے گئے وہ جگہ اپارٹمنٹ سے آدھے گھنٹے کے فاصلے پر کہیں تھی۔ وین کی رفتار اور وقت کے لحاظ سے وہ جگہ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے اپارٹمنٹ سے تقریباً بارہ پندرہ میل کے فاصلے پر کہیں رہی ہو گی۔ انہوں نے میری آنکھوں کی پٹی کسی انڈر گراؤنڈ کمرے میں لے جانے کے بعد ہی کھولی تھی۔''

''تمہارے اغوا کا کوئی مقصد بھی ضرور رہا ہو گا؟'' شیخ حامد نے بہ دستور خشک لہجے میں سوال کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھا شبنم کو ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا، اس کی خوفناک آنکھوں میں تجسس تھا۔

''دو روز تک انہوں نے مجھ سے کوئی اہم بات نہیں کی لیکن تیسرے دن ایک نقاب پوش نے سامنے آ کر مجھ سے صرف آپ کے بارے میں سوالات کیے تھے، وہ غالباً میری حیثیت سے خاصی حد تک واقف تھا لیکن میں صرف ایک بیان پر قائم رہی کہ میں آپ کو صرف آفس کے بگ باس کی حیثیت سے جانتی ہوں اور اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔''

''کیا اس نے تمہارے بیان پر یقین کر لیا تھا؟''

''نہیں......'' شبنم نے کہا۔ ''وہ میرا جواب سن کر مسکرایا تھا پھر اس نے صرف ایک ہی بات کہی تھی کہ اگر میں نے ایک ہفتے کے اندر اندر زبان نہ کھولی تو میرا انجام خطرناک ہی ہو گا۔''

''تمہارے ذہن میں اغوا کرنے والوں کے سلسلے میں خاص طور پر جگا ہی کا نام کیوں آیا؟''

''میں نے ایک امکانی بات کہی تھی ورنہ اغوا کرنے والوں کے سلسلے میں ایجنسی کے لوگوں پر بھی شبہ کیا جا سکتا ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' ایجنسی کے نام پر شیخ حامد چونکا۔

''ان کا طرزِ عمل جارحانہ ہونے کے باوجود مہذب تھا جبکہ پروفیشنل قسم کے افراد مہلت دینے کے بجائے ٹیڑھی انگلی سے بھی اپنا مطلب حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔''

شیخ حامد نے اس بار فوراً ہی کوئی سوال نہیں کیا۔ ایجنسی کے حوالے پر اس کی پیشانی بھی کسی خاص وجہ سے شکن آلود ہوگئی تھی، کچھ دیر وہ شبنم کو گھورتا رہا پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''تم نے میرے آدمیوں سے یہ ضد کیوں کی تھی کہ میرے سوا کسی اور کے سامنے زبان نہیں کھولو گی؟''

''یہ پابندی آپ ہی نے لگائی تھی باس اس لیے میں اس کی خلاف ورزی کس طرح کرسکتی تھی۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ میں تمہاری باتوں کو آرام سے ہضم کرلوں گا؟''

''نہیں......'' شبنم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں اس وقت اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ اپنی صفائی پیش کر سکوں لیکن آپ کے ایک اشارے پر اب بھی زندگی داؤ پر لگا سکتی ہوں۔ فی الحال میرا کھل کر سامنے آنا مناسب بھی نہیں ہوگا۔''

''جو تمہیں لے گئے تھے انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی......؟'' شیخ حامد نے شبنم کے نشیب وفراز پر ایک گہری نظر ڈال کر سوال کیا تو شبنم اس کا مفہوم سمجھ گئی۔ ہونٹ چباتے ہوئے کچھ تامل سے بولی۔

''نگرانی کرنے والے عملے کے ایک فرد نے میرے ساتھ کچھ دست درازی ضرور کی تھی لیکن وہ ایک حد سے آگے نہیں بڑھا۔ اسی بنیاد پر میں نے ایجنسی والوں پر شبہ کیا تھا، پروفیشنل بدمعاش ہوتے تو......''

''یہ تمہارا بیان ہے سویٹ ہنی...... میں کیسے اعتبار کرلوں؟'' شیخ حامد کی نگاہوں میں شوخیاں مچلنے لگیں۔

''باس......'' شبنم نے بڑی بے بسی سے جواب دیا۔ ''اگر انہوں نے حد سے تجاوز کیا ہوتا تو شاید میں اس وقت زندہ نہ نظر آتی۔''

''ایک اہم بات تم نے ابھی تک نہیں بتائی جان من!'' شیخ حامد کے تیور پھر بدل گئے۔ ''جن لوگوں نے تمہیں جان پر کھیل کر اغوا کیا تھا۔ انہوں نے اتنی آسانی سے تمہیں کیوں چھوڑ دیا؟''

''اس میں بھی ایک گہری چال ہے۔'' شبنم نے اورنگ زیب کے آخری جملوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے زبان نہ کھولنے پر نقاب پوش نے تیسری ملاقات پر میرے لیے موت کی یہی سزا تجویز کی تھی کہ وہ مجھے آپ کے حوالے کردے۔''

''میں سمجھا نہیں......''

''افضل خان کی مثال سامنے ہے باس۔'' شبنم نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''اغوا کرنے والوں کو یقین ہوگا کہ آپ میری باتوں پر یقین نہیں کریں گے پھر...... شاید افضل خان کی طرح مجھے بھی کوئی سخت سزا دینے کے بعد حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے اور...... اس وقت میں حالات سے مجبور ہو کر ان کے سامنے ہتھیار ڈال دوں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے......؟ کیا میں نے اگر تمہیں سزا دی تو وہ موت سے کم ہوگی......؟''

''موجودہ حالات میں، میں بھی موت ہی کو ترجیح دوں گی۔'' شبنم نے بڑے اعتماد سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''وہ مجھے جو زندگی دیں گے وہ شاید کسی بازاری عورت سے بھی زیادہ گھناؤنی ہوگی۔''

شیخ حامد نے اس کے جواب کو غور سے سنا، اس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ ابھری، کچھ دیر وہ سپاٹ نظروں سے شبنم کو گھورتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔

''میرے قریب آؤ......''

شبنم قدم بڑھاتی اس کے قریب چلی گئی، اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں۔

''اپنی بے گناہی کا یقین دلانا ہے تو میرے سامنے پوری طرح کھل جاؤ...... میں زبانی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔''

''باس......''

''تم بھول رہی ہو خوب صورت تتلی کہ تمہاری جو تصاویر میرے پاس محفوظ ہیں ان میں بھی تم بے لباس ہی تھیں۔''

''وہ...... وہ تصاویر اس وقت کی ہیں جب میں ہوش میں نہیں تھی......'' شبنم نے ہچکچا کر جواز پیش کیا۔

''اب ہوش وحواس میں میرے حکم پر عمل کرو۔'' شیخ حامد کا لہجہ بازاری ہوگیا۔ ''میرے پاس وہ پیمانہ ہے جو اس بات کو جانچ لے گا کہ جو پروفیشنل بدمعاش تمہیں اٹھالے گئے تھے انہوں نے تمہیں کورا چھوڑا ہے کہ نہیں......''

''بب...... باس، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ......''

''ایک حد سے آگے نہ بڑھوں گا۔'' شیخ حامد نے یکلخت اسے بانہوں میں سمیٹ کر کہا۔ ''میں اب بھی اپنے وعدے کا بھرم رکھوں گا بشرطیکہ تمہیں کسی اور نے استعمال نہ کیا ہو۔''

''بب...... باس میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھ پر رحم کریں۔'' شبنم نے اس کے بازوؤں کے حصار میں مچلتے ہوئے درخواست کی۔ ''اس سے بہتر ہے کہ آپ مجھے گولی مار

دیں۔“

”ابھی میں نے تمہارے بارے میں کوئی آخری فیصلہ نہیں کیا مائی ہنی۔“ شیخ حامد نے اسے پوری طرح دبوچ کر کسی آدم خور کی طرح مخاطب کیا۔ ”ہوسکتا ہے کہ تمہاری بے گناہی ثابت ہونے کے بعد میں پھر تمہیں اپنے قدموں میں بیٹھنے کی جگہ دے دوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بے گناہی نہ ثابت ہونے پر تمہیں اپنے ان جاں نثاروں کے سپرد کردوں جو برسوں سے کسی عورت کے قرب کو ترس رہے ہیں۔ تم یقیناً ان کے لیے ایسا زوداثر ٹانک ثابت ہوگی جو ان کی کارکردگی کو میرے لیے بڑھانے میں بڑا معاون ثابت ہوگا۔“

”باس......“ اچانک شبنم نے بڑی بے بسی سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”میں آپ کے حکم پر سر جھکانے پر آمادہ ہوں لیکن ایک شرط پر...... آپ مجھے پوری طرح پرکھنے کے بعد...... گولی مار کر ہمیشہ کے لیے ختم کردیں گے...... میں بے غیرتی کی زندگی پر موت کو زیادہ ترجیح دوں گی۔“

”اس کا فیصلہ بھی ہوجائے گا...... پہلے تم خود کو ہنستے مسکراتے بے لباس کر کے میرے حوالے کردو۔“

شبنم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی کہ آکٹوپس کی بات پر عمل نہ کرنے کی صورت میں وہ اس کے پالتو بدمعاشوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن کر رہ جائے گی۔ اس نے ایک آخری بار بگ باس کو رحم طلب نظروں سے دیکھا پھر ہاتھ پشت پر کر کے ایک جھٹکے سے اپنی قمیص کی زپ کھول دی، نظریں فرش پر جمائے وہ آہستہ آہستہ خود کو بے لباس کر رہی تھی جب اچانک کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ شیخ حامد نے قہر آلود نظروں سے اس ملازم کو دیکھا جو پہرے پر تھا، اب بوکھلایا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”تم......“ اس نے جیب سے اپنا آٹومیٹک ریوالور نکال کر پہرے دار پر تان لیا۔

”باس...... باہر گولیاں تڑتڑا رہی ہیں۔“ پہرے دار نے کانپتے ہوئے کہا۔ ”سردار اور دوسرے لوگ ان کا جواب دے رہے ہیں، آپ دوسرے راستے سے نکل جائیں...... ہم حملہ آوروں کو اینٹ کا جواب پتھر ہی سے دیں گے۔“

پہرے دار تیزی سے باہر نکل گیا، گولیوں کی آواز شیخ حامد نے بھی سن لی تھی، اس نے شبنم کو لباس سمیٹ کر پیچھے آنے کا حکم دیا پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا باہر کی جانب لپکا۔

☆☆☆

افضل خان سوتے سوتے ایکدم ہی ہڑبڑا کر جاگا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس کی گردن پر کسی نے سوئی چبھو دی ہو لیکن کمرے میں اس وقت کوئی دوسرا نہیں تھا، اس نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دو بج رہے تھے، کمرے میں مدھم پاور کا نائٹ بلب روشن تھا، بستر پر لیٹے لیٹے اس نے پھر دائیں بائیں دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا، اس کا سیدھا ہاتھ ایک بار پھر گردن پر ہونے والی چبھن پر گیا پھر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا، خون کا وہ قطرہ جو اسے انگلی پر نظر آیا وہ اس کا وہم نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ تیزی سے بستر سے اترا تو اس کی نظریں اسلم ڈنکا پر جم کر رہ گئیں جو پلنگ کے نیچے سے مسکراتا ہوا باہر آرہا تھا۔

”اوہ......“ افضل خان نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ رات کو دو بجے اس کی آمد افضل خان کے لیے خلاف توقع ہی تھی، پھر جس انداز میں اسے سوئی چبھو کر بیدار کیا گیا تھا اس نے بھی افضل خان کی کھوپڑی گرم کر دی۔ اس وقت یہ احساس بھی بچھو کے ڈنک کے مانند اس کے وجود کو ڈس رہا تھا کہ جو اسلم ڈنکا کبھی اس کے حکم پر پالتو کتوں کی طرح دم ہلانے کا عادی تھا۔ اس وقت اس کے سامنے سینہ تانے کھڑا بڑے بھونڈے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”اس طرح دیدے پھاڑے کیا دیکھ رہے ہو افضل خان؟“ اس نے کینچلی بدل کر کہا۔ ”میں کئی بار تمہیں آوازیں دے چکا تھا، تم مُردوں کی طرح دنیا سے بے خبر سو رہے تھے، میں نے سوئی چبھوئی تو احساس ہوا کہ تم ابھی تک بقید حیات ہو۔“

”تمہارا یہ انداز میرے لیے نیا اور حیرت انگیز بھی ہے۔“ افضل خان نے بہ دستور بگڑے ہوئے تیور سے دریافت کیا۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں مجھے اذیت دینے کا حکم ملا ہے؟“

”حکم......“ اسلم ڈنکا نے حقارت سے فرش پر تھوکتے ہوئے بڑے گھٹیا لہجے میں اپنی بڑائی کی نمائش کی۔ ”تم جس زمانے کی بات کر رہے ہو وہ گزر چکا۔ اب ہر طرف میرا ڈنکا بجتا ہے اور میرے ماتحت حکم پر بلاچوں وچرا عمل کرتے ہیں، تم بھی اب انہی ماتحتوں میں خود کو شمار کرو۔“

”مجھے معلوم ہے...... تم پہلے بھی سستی قسم کی تاڑی اور بھنگ پینے کے عادی تھے شاید اب بھی تمہارے دماغ پر اسی کا اثر......“

”بکواس نہیں افضل خان......“ اسلم ڈنکا کی آنکھیں خون اگلنے لگیں۔ ”تمہاری اوقات اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی...... دوبارہ کبھی مجھ سے اونچے سروں میں بات کرنے کی حماقت نہ کرنا ورنہ......“

”اس وقت تم میرے پاس کس لیے آئے ہو......؟“

”شٹ اپ......“ اسلم ڈنکا نے بپھر کر کہا۔ ”تم کوئی سوال نہ کرو، صرف میرا حکم سنو۔“

افضل خان کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا، اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد ہی اس نے خودکشی کی ٹھان لی تھی، اگر شبنم درمیان میں نہ آجاتی تو شاید اس وقت اسے اسلم ڈنکا جیسے بدمعاشوں کے سامنے خون کا گھونٹ پی کر صبر نہ کرنا پڑتا۔ اس نے مصلحتاً کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی نظریں اب بھی بڑی حقارت سے اسلم ڈنکا کے ناپسندیدہ وجود میں چبھ رہی تھیں۔

”نظریں نیچی رکھو افضل خان۔“ اسلم ڈنکا بپھر کر بولا۔ ”بارود کو چنگاری لگ گئی تو یہاں پہرا دینے والوں کو تمہارے جسم کے چیتھڑے بھی نہیں ملیں گے۔“

”یہی جملہ میں بھی کہہ سکتا تھا لیکن تم......“ افضل خان کی رگوں میں گرم خون بھی مچلنے لگا۔ ”تم شاید آتشیں اسلحہ کے بل پر اکڑ رہے ہو۔ ایک بات اور سن لو اسلم۔ کسی خطرناک انجام کی فکر مجھے پہلے بھی نہیں تھی، میں سر سے کفن باندھ کر زندگی گزارنے کا عادی تھا، بگ باس کے احسانوں نے مجھے خرید لیا تو میں نے اپنی جون بھی بدل لی۔ اب بھی میں اسے اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ اس کے اشارے پر جان بھی دینے سے دریغ نہیں کروں گا لیکن تم...... تم آئندہ اپنی حد سے تجاوز کرنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔“

اسلم ڈنکا نے ایکدم بپھر کر حملہ کرنے کے انداز میں پینترا بدلا لیکن دوسرے ہی لمحے موبائل کی آواز سن کر اس کے اعصاب کا کھنچاؤ کم ہونے لگا، افضل خان پر نظر جمائے جمائے اس نے موبائل جیب سے نکال کر آن کرلیا۔

”یس باس...... میں اس وقت افضل خان کے قریب ہی ہوں۔“

”اس نے کیا جواب دیا......؟“ دوسری جانب سے شیخ حامد کی کرخت آواز ابھری۔

”کچی نیند سے بیدار ہونے پر اس کے ایک دو اسکریو لوز ہوگئے تھے، انہیں ٹائٹ کر رہا ہوں، آپ کا حکم اس کے فرشتے بھی نہیں ٹال......“

”افضل خان سے بات کراؤ......“ دوسری جانب سے بہ دستور سخت لہجے میں حکم ملا تو اسلم ڈنکا نے ہونٹ چباتے ہوئے موبائل افضل خان کی طرف بڑھا دیا۔

”میں افضل خان بول......“

”اسلم بتا رہا تھا کہ تم خود کو کسی گیسٹ ہاؤس میں وی آئی پی مہمان سمجھ رہے ہو؟“ شیخ حامد نے انتہائی سفاک انداز میں سوال کیا۔

”یہ جھوٹ بول رہا تھا باس......“ افضل خان نے زندگی کی پروا کیے بغیر مدھم لہجے میں سچ بیانی کا مظاہرہ کیا پھر ایک ہی سانس میں پوری تفصیل دُہراتا چلا گیا۔

”سچ کیا ہے میں یہ بھی معلوم کرلوں گا......“ خلاف توقع کسی غصے کے اظہار کے بجائے سرد لہجے میں جواب ملا۔ ”تم نے شبنم سے کہا تھا کہ میرے احسانوں کے عوض تم اپنی حقیر زندگی کا نذرانہ بھی دے سکتے ہو۔“

”یس باس...... میں اب بھی یہی کہوں گا۔“ افضل خان نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں اسلم ڈنکا پر مرکوز تھیں جو کسی زخمی درندے کے مانند قریب ہی کھڑا اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

”امداد علی کا نام کبھی سنا ہے......؟“

”یس باس...... کسی زمانے میں پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل تھا پھر اس نے اچھا خاصا مال پانی کمانے کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اپنا کاروبار پھیلا رہا تھا۔“

”اور کچھ......؟“

”اوہ......“ افضل خان نے چونک کر جواب دیا۔ ”امداد علی نے جیل سے رہائی پانے کے بعد جہانگیر بٹ نامی ایک قیدی کی مدد کی تھی جو بعد میں جگا بن گیا تھا...... بہ ظاہر وہ دونوں الگ الگ ہیں لیکن اندر سے ان کی جڑیں ملی ہوئی ہیں۔“

”گڈ...... مجھے خوشی ہے کہ تمہاری یادداشت ابھی زنگ آلود نہیں ہوئی۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے......؟“

”مجھے جگا کی تلاش ہے لیکن وہ مادر بہ خطا کسی چوہے کے بل میں چھپا ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ......“

”میں آپ کا اشارہ سمجھ گیا باس......“ افضل خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کا احسان مند اور پروردہ ہوں۔ آپ کا خیال سو فیصد درست ہے، امداد علی کو چوہے دان میں بند کرنے کے بعد جگا کے سلسلے میں اس کی زبان کھلوائی جاسکتی ہے۔“

”ہاں، میں بھی چاہتا ہوں لیکن یہ کام انجام دینے کے باوجود تمہاری موجودہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ جواب میں دوٹوک فیصلہ بھی سنا دیا گیا۔

”میں جانتا ہوں باس......“

”اسلم ڈنکا کو میں نے تمہارے پاس اسی غرض سے بھیجا تھا۔“

”باس......“ افضل خان نے دل کڑا کر کے موقعے سے

فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’ایک گزارش میں بھی کروں گا۔‘‘

’’کہو لیکن...... ضروری نہیں کہ تمہاری درخواست منظور بھی ہوجائے۔‘‘

’’میں عزت کی زندگی اور عزت کی موت کی درخواست کروں گا......‘‘

’’سمجھ گیا...... غالباً اسلم بھی اب آہستہ آہستہ پل پرزے نکالنے کی حماقت کرنے لگا ہے۔‘‘

’’میرا امتحان درکار ہو تو میں خود ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ کر لبلبی دبانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں۔‘‘

’’امداد علی کی زبان اگر کھل گئی تو تم کو کوئی موقع اور بھی دیا جاسکتا ہے۔‘‘ سرد لہجے میں جواب ملا، اس کے ساتھ ہی سلسلہ بھی منقطع کر دیا گیا۔ افضل خان نے موبائل آف کر کے دوبارہ اسلم ڈنکا کی طرف اچھال دیا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت کسی آدم خور چیتے جیسی چمک نظر آرہی تھی۔

’’کیا حکم دیا باس نے......؟‘‘ اسلم نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے بہ دستور برتری کا انداز اختیار کیا۔

’’سوری، میں باس کی کہی ہوئی بات تمہیں بتانے کا پابند نہیں ہوں۔‘‘

’’ہواؤں میں اڑنے کی حماقت مت کرنا...... امداد علی والا کام تمہیں زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹوں میں انجام دینا ہوگا۔‘‘

جواب میں افضل خان نے مسکرا کر شانے اچکائے تو اسلم ڈنکا کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

’’تم نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا؟‘‘

’’مجھے فوری طور پر میک اپ کا ضروری سامان اور اعشاریہ دو پانچ کا ایک آٹو میٹک درکار ہوگا۔‘‘

’’کیا کسی چوہے یا چھپکلی کو شکار کرنے کا ارادہ ہے؟‘‘

’’صبح ناشتے کے بعد میری مطلوبہ چیزیں فراہم کر دینا ورنہ پھر تم باس کو جواب دہ ہوگے۔‘‘

’’تم کو یہاں سے تنہا نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔‘‘ اسلم ڈنکا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ’’میں یا میرے بھروسے کا کوئی آدمی تمہارے ساتھ ہوگا۔‘‘

’’نہیں......‘‘ افضل خان نے دوٹوک جواب دیا۔ ’’میں ایسی کوئی بندش یا شرط قبول نہیں کروں گا۔ تم چاہو تو کم از کم سو گز دور رہ کر میری نگرانی کر سکتے ہو۔‘‘

’’بکواس نہیں......‘‘ اسلم ڈنکا ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ’’اپنی اوقات سے اونچا اڑنے کا خیال اب دل سے نکال دو۔‘‘

’’باس سے دوبارہ کال ملا کر میری شرط بتادو...... یہی تمہارے حق میں مناسب رہے گا۔‘‘

افضل خان کا جواب سن کر اسلم ڈنکا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا پھر اس نے جیب سے موبائل نکال کر بگ باس کے نمبر ملائے۔ افضل خان کی شرائط کو اس نے توڑ مروڑ کر اپنی زبان میں بیان کیا، کچھ خدشات کا اظہار بھی کیا لیکن اس کے جواب میں دوسری جانب سے جو کہا گیا اسے سن کر اس نے موبائل بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اس کی پیشانی پر ابھرنے والی شکنوں کا جال بتدریج گہرا ہوتا رہا، اس کی شعلہ بار نظریں کچھ دیر افضل خان پر جمی رہیں پھر وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے پلٹا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

افضل خان نے سکون کا گہرا سانس لیا پھر دوبارہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

مدھم چراغ کی کپکپاتی لو آپس میں گڈمڈ ہوتے سایوں کو اور زیادہ پراسرار بنا رہی تھی۔ تیز تیز سانسوں کی ملی جلی آوازیں پرتاب بھوشن اور نئی پجارن سلونی کے بھڑکتے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ جب دروازے پر کسی نے دو بار آہستہ آہستہ ہاتھ مار کر ان کے رنگ میں بھنگ گھوٹ دیا۔ سلونی نے اوڑھنی گھسیٹ کر اپنا شریر ڈھانپ لیا، پرتاب نے بل کھا کر اونچی آواز میں پوچھا۔

’’کون ہے......؟‘‘

’’میں مدھو ہوں مہاراج۔‘‘ باہر سے مدھو کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ ’’جلدی دروازہ کھولو ورنہ غضب ہوجائے گا۔‘‘

’’اس سمے تیرے اوپر کیا بپتا آن پڑی ہے......؟‘‘

’’بڑے پجاری کو سن گن مل گئی ہے، وہ کسی سمے میں بھی ادھر آسکتا ہے۔‘‘

بڑے پجاری کا نام سن کر پرتاب کے کس بل بھی ڈھیلے پڑ گئے، سلونی گرتی پڑتی اوڑھنی سے باہر نکلی اور اپنا لباس سمیٹتی پلک جھپکتے میں باہر نکل گئی، نیا شکار ہاتھ سے پوری طرح ذبح ہونے سے پہلے ہی بچ کر نکل گیا تو پرتاب بھی بل کھانے لگا۔ وہ غصیلی نظروں سے مدھو کو گھور رہا تھا جو سلونی کے نکل جانے کے بعد اندر آگئی تھی۔

’’میرا کوئی دوش نہیں ہے مہاراج۔‘‘ مدھو نے سہمے سہمے انداز میں کہا۔ ’’بڑے پجاری نے ایک دوسری پجارن کو سلونی کو بلانے بھیجا تھا، سلونی اپنی کٹی میں نہیں ملی تو وہ اتفاق سے میرے پاس کھوج لگانے آگئی۔ میں نے خطرہ محسوس کیا

تو تمہیں ہوشیار کرنے چلی آئی۔‘‘

پرتاب اب بھی اسے تیز نظروں سے گھور رہا تھا جب باہر سے ملے جلے قدموں کی آواز ابھری۔ مدھو نے لپک کر دروازہ بھیڑا پھر دوڑ کر پرتاب سے لپٹ گئی، دونوں ہی الجھ کر بستر پر گرے تھے جب جھونپڑی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور مدھو بڑی خوب صورتی سے اپنا جسم چراتے ہوئے ایک طرف سمٹ گئی۔ پرتاب بھی ہڑبڑا کر رہ گیا۔

دروازے پر مندر کا بڑا پجاری کھڑا تھا۔

’’تم......‘‘ پرتاب نے کینچلی بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔ ’’تم کو اس طرح آدھی رات گئے کسی کی جھونپڑی میں بغیر آواز دیے اندر گھس آنا شوبھا نہیں دیتا۔ بڑے پجاری ہو تو اپنی بڑائی کا بھی دھیان رکھا کرو۔‘‘

’’وہ...... میں...... تم نے دروازہ بھی نہیں بند کیا تھا۔‘‘ بڑا پجاری مدھو کو پرتاب کے بستر پر دیکھ کر سٹپٹا گیا۔

’’یہ دیوی کا مندر ہے مہاراج...... کیا یہاں بھی چوری چکاری کا کھٹکا رہتا ہے اور پھر...... تمہیں میری ہی کٹی کا دھیان کیسے آگیا؟ کیا مدھو کی تلاش تھی......؟‘‘

’’نہیں...... میں کسی اور کو دیکھ رہا تھا۔‘‘

’’ایسی کیا انمول چیز گم ہوگئی، جس نے اس سمے تمہیں بھی ویاکل کر دیا ہے؟‘‘

’’میں شما چاہتا ہوں۔‘‘ بڑا پجاری اپنا جملہ پورا کر کے تیزی سے الٹے پاؤں لوٹ گیا تو مدھو نے اوڑھنی سے باہر آتے ہوئے کہا۔

’’میں نے تم سے جھوٹ نہیں کہا تھا مہاراج...... اگر میں نے ادھر آنے میں دیر کی ہوتی تو بھانڈا پھوٹ گیا ہوتا۔‘‘ وہ لہنگا ٹھیک کرتے ہوئے اٹھنے لگی۔ ’’میں اب چلتی ہوں، تم آرام کرلو......‘‘

’’بھوک بھڑکی ہو تو مردار جانور بھی پیٹ بھرنے کو بہت ہوتا ہے۔ تو تو ابھی جیوت ہے میری بلبل۔‘‘ پرتاب نے مدھو کا ہاتھ تھام کر اسے بستر پر گرا دیا اور اس کے ساتھ آدھی رہ جانے والی بازی پوری کرنے لگا۔ اس نے دروازے پر بھی دھیان نہیں دیا جو آدھا کھلا ہوا تھا۔

مدھو ایک داسی کی حیثیت سے پرتاب کے بازوؤں میں مچلتی رہی۔ طوفان کا زور ٹوٹا تو اس نے سانس درست کرنے کے بعد کہا۔

’’تمہاری دان کی ہوئی شکتی نے اب مدھو کو بھی اندھیرے میں دور تک دیکھنے کا گر سکھا دیا ہے۔‘‘

’’کیا دیکھ لیا تو نے؟‘‘

’’اسی دشٹ کو دیکھا ہے جو تمہارے چنگل سے بچ بچ کر نکل جاتا ہے۔‘‘

’’کس کی بات کر رہی ہے......؟‘‘ پرتاب نے چونک کر دھکتے لہجے میں سوال کیا۔

’’اسی مسلے کی بات کر رہی ہوں مہاراج جو ڈر کر بھاگ گیا تھا لیکن اب اس کی موت اسے دوبارہ تمہارے قریب لے آئی ہے۔‘‘

’’سچ کہہ رہی ہے؟‘‘

’’تم بھی اپنی آنکھیں بند کر کے کھوج لگا لو...... وہ اپنی دھرم پتنی کے ساتھ واپس آگیا ہے۔‘‘

پرتاب کی پیشانی شکن آلود ہوگئی، ایک لمحے تک وہ مدھو کو گھورتا رہا پھر اس کی بات کی تصدیق کرنے کی خاطر وہ آسن جما کر بیٹھا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

ڈی آئی جی کی کانفرنس ختم ہونے کے بعد اورنگ زیب اور سراج ایک ہی گاڑی میں دفتر واپسی کے لیے روانہ ہوئے تھے، اورنگ زیب کسی سوچ میں غرق تھا، سراج نے کچھ انتظار کے بعد مہر سکوت توڑی۔

’’آپ کا کیا خیال ہے؟ شبنم کو ہماری تحویل سے نکال لے جانے والے کون لوگ ہوں گے؟‘‘

’’میرے آدمی کھوج لگا رہے ہیں، ایک دو ٹپس ملی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم جلد ہی اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجائیں۔‘‘ اورنگ زیب نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ کانفرنس کے دوران بھی وہ خلافِ توقع زیادہ تر خاموش ہی رہا تھا۔

’’آج کی کانفرنس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ آکٹوپس نے ہمارے ڈی آئی جی کو اوپر سے پریشرائز کرایا ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا تو اتنے سارے ذمے داروں کی بھیڑ بھی نہ ہوتی، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا۔ اس کے برعکس اس بات کے زیادہ امکان ہیں کہ شبنم کو اغوا کرنے والے اور زیادہ محتاط ہوجائیں۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں......؟‘‘

’’حیرت ہے۔‘‘ اورنگ زیب نے کہا۔ ’’کیا تمہیں ہمارے محکمے میں کالی بھیڑوں کا اندازہ نہیں ہے؟‘‘

سراج نے خاموشی اختیار کرلی پھر وہ کچھ اور کہنے کی خاطر کسمسایا تھا کہ اورنگ زیب کے موبائل پر سگنل موصول

ہوا۔

"ہیلو......" اورنگ زیب نے موبائل آن کر کے صرف ہیلو کہنے پر اکتفا کیا۔

"کیا میں آپ سے اس وقت کچھ ضروری بات کر سکتا ہوں؟" دوسری جانب سے آواز بنا کر کہا گیا۔ کم از کم سراج نے یہی اندازہ لگایا تھا۔

"کر سکتے ہو...... اس وقت میرے ساتھ سراج صاحب کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔" اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آپ کا آکٹوپس جگا تک پہنچنے کی خاطر قربانی کے بکرے کو استعمال کر رہا ہے۔"

"جگا کیا انڈر گراؤنڈ نہیں ہے؟"

"جگا تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر امداد علی کی سیڑھی استعمال کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔"

"اطلاع کس نے دی ہے؟"

"اندر کے بھیدی نمبر دو نے...... وہ اپنے مقابلے میں قربانی کے بکرے کی کامیابی کسی طور پسند کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں بے نقاب کرنے کی خاطر ڈبل کراس کر رہا ہو؟"

"اس کی امید صرف بیس فیصد ہو سکتی ہے۔" دوسری جانب سے بڑے اعتماد سے کہا گیا۔ "بہرحال آپ کو اطلاع دینی ضروری تھی۔"

"جگا سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"کل رات بھی وائرلیس پر رابطہ ہوا تھا۔"

"اسپاٹ نمبر کیا تھا......؟"

"زیرو سکس، لیکن استاد نے کہا تھا کہ وہ شفٹ کرنے والا ہے۔ اس وقت کہاں ہوگا یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"تمہارا کیا خیال ہے...... کیا امداد علی زبان کھول دے گا......؟"

"یقین تو نہیں ہے لیکن موت کی اذیت ناک گھٹن کبھی کبھی اعتماد کو ٹھیس بھی پہنچا سکتی ہے۔"

"اندر کے بھیدی اور قربانی کے بکرے...... دونوں پر نظر رکھو۔" اورنگ زیب نے کچھ توقف سے ہدایت کی۔ "دو گھنٹے بعد دوبارہ کال کرنا...... دو گھنٹے کے بعد بھی اگر میں کال ریسیو نہ کروں تو انتظار بھی نہ کرنا...... میں خود تم سے رابطہ قائم کر لوں گا۔"

"ایک اطلاع اور بھی ہے...... آئٹم نمبر دو کا ٹھکانا بھی کل رات تبدیل کر دیا گیا ہے۔ میرے مخبر کی اطلاع کے مطابق......"

"دو گھنٹے بعد کال کرنا...... اوور اینڈ آل۔" اورنگ زیب نے دوسری جانب سے بولنے والے کی پوری بات سنے بغیر سلسلہ ختم کر دیا۔

"کس کی کال تھی......؟" سراج نے تجسس سے دریافت کیا۔

"جگا کا خاص آدمی ہے۔ میں نے اسے آکٹوپس کے دباؤ ڈالنے کے بعد ڈی آئی جی کی درخواست پر ان لوگوں کے ساتھ رہا کر دیا تھا جو آکٹوپس کے آدمی تھے۔"

"میں آپ سے یہ دریافت نہیں کروں گا کہ قربانی کا بکرا یا آئٹم نمبر دو کے کوڈ کس کے لیے استعمال کیے گئے تھے لیکن یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ نے موجودہ اطلاع کے بعد جگا کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"تم میری جگہ ہوتے تو کیا فیصلہ کرتے......؟" اورنگ زیب نے مسکرا کر سوال کیا۔

"اس وقت ہماری بساط پر جگا سب سے اہم مہرہ ہے۔ میں اسے ہر قیمت پر تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرتا۔"

"میں بھی ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں سمجھا نہیں......! آپ نے کیا پلان بنایا ہے؟"

"اس کا فیصلہ میں دو گھنٹے بعد ہی کر سکوں گا۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر کسی خیال کے تحت اس نے سراج کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ کر بڑی اپنایت سے کہا۔ "ایک بات کا یقین کر لو سراج...... آکٹوپس کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے میں تم میرے شانہ بشانہ رہو گے۔ میری وقتی خاموشی کو کوئی اور رنگ نہ دینا...... ایک بات اور بھی ذہن نشین کر لو...... تم اور الماس مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہو۔ اگر کبھی موت کے کنویں میں آنکھ بند کر کے چھلانگ لگاتے وقت میں تم کو نظر انداز کر دوں تو اس کا برا بھی نہ منانا۔"

"ایک فیصلہ میرا بھی سن لیجیے۔" سراج نے پورے وثوق سے کہا۔ "میری زندگی میں آپ کسی بھی موقعے پر خود کو تنہا نہیں پائیں گے۔"

اورنگ زیب نے سراج کے جملے کو خاموشی سے سنا۔ اس کی طرف بہت غور سے دیکھا پھر کسی سوچ میں غرق ہو گیا۔ دفتر واپس ہونے تک دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔

☆☆☆

رات کے اس پچھلے پہر میں بھی میڈم روبی نہ صرف پوری طرح بیدار تھی بلکہ ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہی تھی، اس کے چہرے پر اس وقت تفکرات کے گہرے تاثرات مسلط تھے۔ بیڈروم میں وہ تنہا نہیں تھی، تھریسا بھی ڈریسنگ ٹیبل کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی میڈم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بہ غور جائزہ لے رہی تھی۔ گزشتہ چالیس منٹ سے ان کے درمیان کسی جملے یا مکالموں کا تبادلہ نہیں ہوا تھا، میڈم کے مقابلے میں تھریسا زیادہ مطمئن نظر آ رہی تھی پھر گفتگو کی ابتدا بھی اسی نے کی۔

"میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ آپ کی بے چینی کا اصل سبب کیا ہے...... کیا دوسری پارٹی نے جو پروگرام بنایا ہے، آپ کو اس پر اطمینان نہیں ہے؟"

میڈم نے کسی خیال سے چونک کر تھریسا کو بہ غور دیکھا، اس کے جملے پر ایک لمحے غور کیا پھر نچلا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ "اطمینان نہ ہوتا تو میں اپنے کسی آدمی کو استعمال کرنے کی اجازت بھی نہ دیتی۔"

"پھر...... کس بات کی فکر آپ کو الجھا رہی ہے......؟"

"آم کی تمام قسمیں بازار میں کھلے عام ملتی ہیں لیکن کسی باغ سے ایک کچی کیری چرا کر کھانے کا جو لطف ہے وہ سب سے الگ ہوتا ہے۔"

"مطلب......؟" تھریسا نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"میں تم کو بے حد عزیز رکھتی ہوں تھریسا لیکن افسوس ہے کہ تم ایک عورت ہو کر بھی میرے درد کو نہیں سمجھ رہی ہو۔" میڈم نے اس بار جذباتی انداز اختیار کیا۔ "میں نے تم سے بار بار کہا ہے کہ وہ دونوں میرے اعتماد کے لوگ ہیں، ان کی دوستی میں کھوٹ ہوتا تو آج میں اپنے دشمنوں سے نظریں ملا کر دبنگ آواز میں گفتگو کرنے کے قابل بھی نہ ہوتی۔ پہلے شخص نے میرے ساتھ جو نیکی کی اس میں اس کا جو خلوص شامل تھا، اس کا اندازہ تمہیں بھی ہوگا۔ میری ہی خاطر میرے دشمن کی نفرتیں بھی اس سے زیادہ ہو گئیں۔" میڈم نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "اعتماد نہ ہوتا تو میں اب تک ان سے کنارہ کش ہو چکی ہوتی۔"

"پھر آپ اس وقت اس قدر......"

"سمجھنے کی کوشش کرو تھریسا۔" میڈم نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "ایک شکار پارٹی میں چار شکاری شامل ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد محض شکار سے ہوتا ہے لیکن جو خود شکار کرتا ہے اسے زیادہ مزہ آتا ہے، دوسرے کی کامیابی اس کی خوشی نہیں ہوتی۔ خود اس کی چلائی ہوئی گولی سے شکار زخمی ہو کر موت اور زندگی کے درمیان تڑپے تو اس کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

"اوہ......" تھریسا نے بات سمجھتے ہوئے پہلو بدل کر کہا۔ "میں آپ کے خیال سے متفق ہوں لیکن ایک تنہا عورت پچیس پچاس مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

"لیکن کوشش......"

"کوشش آپ کر چکی ہیں لیکن اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔" تھریسا نے بھی میڈم کی بات کاٹ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ اتفاق ہی تھا کہ ہر موقعے پر قدرت نے آپ کی کسی نہ کسی طور مدد کی، جس کا اعتراف ابھی آپ بھی کر چکی ہیں۔"

"تم......" میڈم ایک لمحے کو تلملا کر رہ گئی پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "تم شاید ٹھیک کہہ رہی ہو مگر تم نے ان زخموں کو نہیں دیکھا جو میرے مظلوم شوہر کے جسم پر موجود تھے۔ وہ زخم مجھے پکار پکار کر صرف ایک ہی مطالبہ کر رہے تھے...... روبی، مجھ سے وعدہ کرو...... تم...... تم ان زخموں کا گن گن کر حساب چکتا کرو گی...... مجھے دفن کرنے کے بعد فراموش نہ کرنا اور...... اور میں نے اسی خاموش خواہش کے احترام میں پوسٹ مارٹم کرائے بغیر خالد ریاض کے جسم کو سپردِ خاک کر دیا تھا لیکن ان زخموں کی چیخ، ان کے آخری مطالبے کی آواز آج بھی میرے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہی ہے، میں انہیں آسانی سے کیسے فراموش کر دوں؟ اور تنہا عورت کو تو اپنی بے بسی کا احساس بھی دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ تم...... اگر میری جگہ تم ہوتیں تو تم کیا کرتیں؟"

"اس شخص کے مرنے کے بعد اس کی موت کی خوشی میں جشن مناتی...... قہقہے بکھیرتی...... خود کو تسلی دینے کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے۔"

میڈم نے تھریسا کو غور سے دیکھا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ موبائل کی سرخ بتی جلنے بجھنے لگی، میڈم نے اسے گول میز سے اٹھا کر آن کرنے میں دیر نہیں لگائی، روشن اسکرین پر نظر آنے والے نمبروں کو دیکھ کر اس نے تیزی سے سوال کیا۔

"کوئی خاص خبر......؟"

"میں یہی دیکھنا چاہ رہا تھا کہ آپ اس وقت سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں۔" سنجیدگی سے دریافت کیا گیا۔

"جن کی روح زخمی ہو وہ منزل قریب دیکھ کر سوتے

نہیں، بے چینی سے جاگتے رہتے ہیں...... آپ بتایئے کیا رہا؟''

''ہر کام انتہائی تسلی بخش انداز میں طے پا گیا۔'' اطمینان سے جواب ملا۔ ''آپ کی منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ اسے حالات کی کوئی بھنک نہیں ملی ہوگی؟''

''کسی امکانی پہلو کو نظر انداز کر دینا بھی ہمارے اصول کے خلاف ہے لیکن میرا خیال ہے کہ جس انداز میں ساری پلاننگ کی گئی تھی اسے فول پروف ہی کہا جاسکتا ہے۔ جس شخصیت نے بیانات قلمبند کیے ہیں اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اتنی رات گئے اسے کس مقصد سے طلب کیا گیا تھا۔''

''ان میں سے کوئی مخبری کر کے کالی بھیڑ ہونے کا کردار بھی ادا کرسکتا ہے۔'' میڈم نے پھر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

''عین ممکن ہے کہ آپ کا شبہ درست ہو لیکن میں نے تمام امکانات کے متبادل راستوں پر بھی قبل از وقت غور کرلیا تھا۔ جس طرح پلاننگ کی گئی ہے وہ نوے فیصد ہماری کامیابی ہی ثابت ہوگی۔''

''ایک بات اور بھی ممکن ہے......'' میڈم نے بے چینی سے الٹے ہاتھ کی انگلیاں مسلتے ہوئے کہا۔ ''کچھ مجرم ڈرائنگ روم ٹریٹمنٹ سے بچنے کی خاطر بھی حلفیہ بیان دے دیتے ہیں لیکن...... عدالت کے روبرو ان کے منحرف ہوجانے کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''

''کل تک اور انتظار کرلیں، ہوسکتا ہے کہ کچھ نئے واقعات ایسے رونما ہوں جن کے بعد آپ کو اس بات کی تسلی ہوجائے کہ ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔''

''مجھے آپ دونوں کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد ہے، نہ ہوتا تو دوستی کا ہاتھ کبھی دراز نہ کرتی۔''

''اگر اجازت ہو تو ایک بات کی مبارکباد قبل از وقت دے دوں؟''

''کس طرف اشارہ ہے؟''

''میرا...... اشارہ اس تیسری شخصیت کی طرف ہے جس کا ہاتھ آپ نے مستقل تھامنے کا ارادہ کرلیا ہے۔''

''شکریہ......'' میڈم نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ''اسے میری مجبوری اور وقت کی ضرورت بھی سمجھ لیں۔''

''بہرحال...... آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ہر اعتبار سے درست ہے۔''

میڈم نے فوری طور پر موضوع بدل کر پوچھا۔ ''آپ نے کل تک انتظار والی بات کہہ کر ایک تجسس پیدا کردیا ہے۔ کیا آپ قبل از وقت......''

''آئی ایم سوری......'' دوسری جانب سے سنجیدگی سے جواب ملا۔ ''کامیابی سے قبل بلند بانگ دعوے کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوگیا، میڈم نے موبائل بستر پر اچھال دیا تو تھریسا نے پوچھا۔

''کوئی نئی اطلاع......؟''

''ہاں...... چوہے دان پوری طرح تیار کرلیا گیا ہے۔''

''اب تو آپ کو اطمینان ہوجانا چاہیے۔''

''کسی حد تک...... ویسے یہ افسوس پھر بھی رہے گا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے مرحوم کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا۔''

''لیکن حالات اب آپ کے حق میں سازگار ہیں۔'' تھریسا نے میڈم کے قریب آکر دلجوئی کرنے کے انداز میں کہا۔ ''کل کسی نے آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اب آپ اس کے بے دست و پا ہونے کے بعد اپنے دل کا غبار بہرحال نکال سکتی ہیں۔''

میڈم نے چونک کر تھریسا کی سمت دیکھا پھر کچھ سوچنے کے بعد اس نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا یہ مشورہ مجھے پسند آیا، امید کی ایک کرن نظر آجائے تو انسان کو بہت سارے فیصلے کا اختیار بھی حاصل ہوجاتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے...... جو کچھ ہوگا، وہ بہتر ہی ہوگا۔''

میڈم نے اثبات میں سر کو جنبش دی تو تھریسا کچھ دیر بعد خواب گاہ سے باہر چلی گئی، میڈم نے کمرا اندر سے بند کر کے خود کو بستر پر تھکے تھکے انداز میں گرا دیا لیکن اس کی آنکھیں پوری طرح بیدار تھیں، ان آنکھوں میں بے شمار خواب آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت تھریسا بھی اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ میڈم نے اس کے آخری مشورے پر جو جواب دیا تھا وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر بڑی سنجیدگی اور تشویش سے غور کر رہی تھی۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

سیاسی محبت

کاشف زبیر

یہ دنیا بھی عجیب انسانوں کا مجموعہ ہے۔
کبھی صیاد شکار کی تلاش میں اور کبھی
شکار خود شکاری کے تعاقب میں زندگی
داؤ پر لگادیتا ہے... یہ اور بات کہ محض
ایک فیصد چانس پر بازی کھیلنے والے بڑے
جی دار ہوتے ہیں... وہ بھی اس کی قید
سے رہائی پانے کی خواہش میں بہت سی
بیڑیوں کو نظر انداز کرکے صحرا صحرا
بھٹکتی پھر رہی تھی۔

دلوں کے تار چھیڑنے والی دلفریب کہانی

دو گھوڑوں والی بگھی آکر صمد پاشا کے دفتر کے سامنے رکی اور اس سے لیڈی میریا گورڈن اتری۔ اس نے پر تجسس نظروں سے چاروں طرف دیکھا، وہاں سوائے چند محافظوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ یہ اسکندریہ کے پولیس چیف صمد پاشا کا دفتر تھا۔ 1850ء کا اسکندریہ، مصر کے قدیم دھندلکوں میں لپٹا ایک ایسا شہر تھا جو آنے والے دنوں میں مصر اور اس علاقے کی سیاست میں اہم ترین کردار ادا کرنے والا تھا۔ نپولین کو یہاں آئے نصف صدی سے

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اگرچہ وہ واپس چلا گیا تھا اور عثمانی سلطنت نے دوبارہ مصر پر گرفت مضبوط کر لی تھی لیکن اب برطانیہ کی نظریں مشرق و مغرب کے سنگم پر واقع اس اہم ترین خطّے پر مرکوز تھیں۔ ایک مستعد سپاہی نے آکر میریا سے کہا۔ ”جناب صمد پاشا آپ کے منتظر ہیں۔“

میریا نے روایتی لباس کے ساتھ سر پر نقاب والا ہیٹ بھی لے رکھا تھا اور وہ اپنے طور طریقوں سے رائل لیڈی لگ رہی تھی۔ سپاہی کی بات پر اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور نپے تلے قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ عمارت پتھروں کی لیکن سادہ تھی۔ اس کے ایک کمرے میں جوان العمر صمد پاشا اس کا منتظر تھا۔ میریا گورڈن کو حیرت ہوئی تھی، اس کے خیال میں اس اہم ترین شہر کے پولیس چیف کو اتنا جوان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ صمد پاشا تیس سال سے بھی کم عمر تھا۔ وہ طویل قامت اور کھڑے نقوش کا پرکشش نوجوان تھا۔ اس نے میریا کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے ستائش کی جھلک نظر آئی لیکن اس نے لیڈی گورڈن کے استقبال کے لیے کھڑے ہونے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کے بجائے اس نے میریا کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میریا کسی قدر برہمی کے ساتھ نشست پر بیٹھ گئی۔ یہ کمرا سادہ اور دفتری نوعیت کا تھا۔ گرمی خاصی تھی لیکن صمد پاشا نے موٹے خاکی کپڑے کا لباس پہن رکھا تھا اور اس پر ترکش کوٹ بھی تھا۔ ایک طرف کھڑکی سے سمندر کی ہوا اندر داخل ہو رہی تھی لیکن وہ بھی گرمی کو کم کرنے میں ناکام تھی۔

”لیڈی گورڈن!“ صمد پاشا نے رواں انگریزی میں کہا۔ ”مجھے گورنر کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے مکمل تعاون کروں، اب بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”لارڈ اسمتھ گورڈن کی گم شدگی کی تحقیقات آپ نے کی ہیں صمد پاشا؟“ میریا کے لہجے میں کسی قدر طنز آگیا۔ ”پھر بھی آپ پوچھ رہے ہیں کہ آپ میری کیا خدمت کر سکتے ہیں۔“

”یہ درست ہے اور میں اپنی تفتیش سے مطمئن ہوں۔“

”آپ ضرور مطمئن ہوں گے۔“ میریا کا لہجہ بہ دستور طنزیہ تھا۔ ”کیونکہ لارڈ گورڈن کی گم شدگی آپ کا مسئلہ نہیں ہے لیکن آپ نے سوچا کہ وہ شخص ایک عورت کا شوہر بھی ہے اور وہ عورت اپنے شوہر کی تلاش میں کئی ہزار میل کا سفر کر کے یہاں آئی ہے۔“ میریا کی آواز جذباتی اور بلند ہو گئی تھی لیکن بہ ظاہر صمد پاشا نے اس کا کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

”مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مگر یہ مسئلہ جذبات سے حل نہیں ہو سکتا۔“

”تب مجھے بتائیں میں کیا کروں، اپنے شوہر کو کہاں تلاش کروں؟“ میریا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس بار صمد پاشا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔ وہ پولیس چیف سہی لیکن اس کے سینے میں بھی دل تھا۔ اس نے رومال نکال کر میریا کی طرف بڑھایا۔

”پلیز، مجھے آپ کی تکلیف کا احساس ہے اور میں پہلے ہی آپ کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا چکا ہوں۔“

صمد پاشا کے ردِعمل نے میریا کو بتایا کہ اس نے پہلا مرحلے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ تین مہینے پہلے اسے لندن میں خارجہ امور کے دفتر طلب کیا گیا اور یہ افسوسناک اطلاع دی گئی کہ اس کا شوہر سر گورڈن مصر میں اچانک لاپتا ہو گیا ہے اور بہت زیادہ امکان ہے کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے۔ دفترِ خارجہ نے میریا کو یہ نہیں بتایا کہ اسے کن ذرائع سے یہ اطلاع ملی ہے لیکن اسے یہ ضرور معلوم ہوا کہ سر گورڈن کسی اہم سرکاری مشن پر مصر میں تھا۔ میریا حیران ہوئی تھی کیونکہ اس کے خیال میں سر گورڈن کو آثارِ قدیمہ کا خبط تھا اور اپنے اسی خبط کی تسکین کے لیے وہ مصر گیا تھا۔ برطانوی ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے لیے مصر ایک پرکشش ملک تھا اور اسمتھ گورڈن یہاں جانے والا پہلا برطانوی نہیں تھا۔ اب میریا کو احساس ہو رہا تھا کہ اس کا شوہر شوق کی خاطر نہیں بلکہ ملک کی خاطر مصر گیا تھا۔

میریا کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا لیکن سر گورڈن کا خاندان کہیں زیادہ معزز تھا اور اس کی رسائی براہِ راست بکنگھم پیلس تک تھی۔ اس لیے میریا نے ہنسی خوشی لیڈی گورڈن بننا قبول کر لیا۔ پانچ سال پہلے جب اس کی شادی اسمتھ گورڈن سے ہوئی تو وہ بائیس برس کی تھی اور سر گورڈن اس وقت بھی پینتالیس برس کا تھا۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا کیونکہ دونوں کو ہی اولاد کی خواہش نہیں تھی۔ کیونکہ یہ شادی ایک سمجھوتا تھی اور وہ دونوں اس سمجھوتے کو نبھا رہے تھے۔ میریا کا ارادہ ہرگز مصر جا کر اپنے شوہر کو تلاش کرنے کا نہیں تھا لیکن اسے بتایا گیا کہ یہ برطانوی حکومت کی خواہش ہے کہ وہ مصر جائے اور جاننے کی کوشش کرے کہ سر اسمتھ گورڈن پر کیا گزری تھی۔ اس مقصد کے لیے سرکاری سطح پر اس سے تعاون کی درخواست بھی کی گئی تھی، یہ درخواست اس کی آمد سے پہلے مصر کے ترک گورنر کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اسی کے نتیجے میں وہ صمد پاشا کے سامنے تھی۔

صمد پاشا صرف اسکندریہ کا پولیس چیف نہیں تھا بلکہ سارا شمال مغربی مصر اس کے تحت آتا تھا، اس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ اگرچہ اس کی رگوں میں عثمانی خاندان کا خون نہیں تھا لیکن اس کی نانی کی شادی ایک عثمانی شہزادے سے ہوئی تھی۔ اس کا باپ ترک بحریہ میں ایڈمرل تھا اور خود صمد پاشا نے بیرونِ ملک سروس کا شعبہ پسند کیا تھا۔ وہ صرف بیس سال کی عمر میں مصر آگیا تھا۔ میریا کو یہ ساری تفصیلات اس سرکاری مہمان خانے کے اس بیس سالہ ملازم نے بتائیں جو اس کی خدمت پر مامور تھا۔ عبدل صمد پاشا کو پسند کرتا تھا اس لیے وہ صرف اس کی اچھائیاں بیان کر رہا تھا، یہ میریا کا خیال تھا لیکن اس نے عبدل کو ٹوکا نہیں۔ ویسے اسے یہ سانولے رنگ کا ہنس مکھ نوجوان اچھا لگا تھا۔

سرکاری مہمان خانہ اسکندریہ کی بندرگاہ سے کچھ فاصلے پر ایک ساحلی ٹیلے پر تھا۔ یہاں سے بحیرۂ روم کا نیلگوں پانی صاف دکھائی دیتا تھا اور تیز سمندری ہوا کی وجہ سے گرمی کا احساس بھی کم تھا۔ جب وہ برطانیہ سے چلی تو لندن میں بادل چھائے تھے اور جون میں بھی نہایت تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ مصر میں اس کا استقبال شدید گرمی نے کیا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد شام کو موسم کسی قدر بہتر ہوا تو میریا تیار ہو کر مہمان خانے کے باغ میں نکل آئی۔ درختوں اور پھولدار تختوں کے درمیان ٹہلتے ہوئے وہ سوچ میں گم تھی۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ وہ بے سود یہاں آئی۔ وہ انکار بھی کر سکتی تھی۔ اگر سر گورڈن کسی سرکاری کام کے دوران لاپتا ہوا تھا تو اسے تلاش کرنا حکومت کی ذمے داری تھی۔

”میرا خیال ہے آپ یہاں آکر پچھتا رہی ہیں لیڈی گورڈن۔“ اچانک ہی اسے قریب سے صمد پاشا کی آواز سنائی دی، وہ گلابوں کے ایک تختے کے پاس کھڑا تھا اور اس وقت اس نے وردی کے بجائے سادہ کرتہ پاجامہ نما لباس پہن رکھا تھا۔ میریا کو اس کی آمد کا پتا نہیں چلا تھا۔

”جناب پولیس چیف صاحب، یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں؟“

”یہاں کی شدید گرمی۔“ صمد پاشا اس کی طرف بڑھا۔ ”کوئی بھی شخص جو ذرا بھی سرد ملک سے آیا ہو یہاں آنے کے بعد کچھ دیر کے لیے ضرور پچھتاتا ہے۔“

”گرمی واقعی شدید ہے۔“ میریا نے تائید کی۔ شاید گرمی کی وجہ سے ہی اس نے روایتی لباس کے بجائے سوتی اسکرٹ اور ململ کی شرٹ پہنی تھی۔ اس سادہ لباس میں بھی اس کا حسن نکھر رہا تھا۔ ”ویسے میں سمجھی کہ شاید یہاں حکومت کو ایک عورت کا آنا ناگوار گزر رہا ہو؟“

”ایسا نہیں ہے، ترک حکومت اور اس کا ہر کارندہ لوگوں کی دادرسی کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔“ صمد پاشا نے سنجیدگی سے کہا اور اسے ایک بارہ دری کی طرف لے آیا۔ یہاں سنگِ مرمر کی گول میز کے گرد کرسیاں لگی تھیں۔ چائے اور اس کے لوازم لگ گئے تھے۔ ”بلکہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے گم شدہ شوہر کو تلاش نہیں کر سکا اور آپ کو سفر کی زحمت کرنا پڑی۔“

”یعنی آپ مجھے صرف ایک فریادی کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں؟“

”بالکل۔“ صمد پاشا نے سر ہلایا۔ ”سرکاری حیثیت میں میں آپ کو اس کے سوا کسی اور نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔“

”اور غیر سرکاری حیثیت میں؟“

صمد پاشا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ ایک غیر معمولی حسین خاتون ہیں۔“

میریا کی آنکھوں میں ستارے سے جھلملائے اور وہ مسکرانے لگی۔ صمد پاشا نے اس کے لیے چائے تیار کی، دودھ اور چینی اس سے پوچھ کر ڈالی۔ اپنے لیے اس نے صرف سیاہ چائے نکالی تھی۔ میریا نے چائے چکھی اور بولی۔ ”آپ کے لیے کون سی حیثیت زیادہ اہم ہے؟“

”ظاہر ہے سرکاری حیثیت۔“ صمد پاشا نے صاف گوئی سے کہا۔

”لیکن ابھی آپ ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔“

”سلطنتِ عثمانیہ کا ہر ملازم خود کو ہمہ وقت ڈیوٹی پر تصور کرتا ہے۔“

میریا کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی۔ اس نے موضوع بدل دیا۔ ”مجھے برطانوی دفترِ خارجہ سے صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ سر گورڈن شمال مغربی مصر میں کہیں لاپتا ہو گئے اور مقامی حکام کوشش کے باوجود انہیں تلاش نہیں کر سکے۔“

”یہ درست ہے۔“ صمد پاشا نے سر ہلایا۔ ”سر گورڈن سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ قاہرہ سے شمال مغربی مصر کی طرف جانے کا اجازت نامہ لے کر آئے تھے لیکن وہ روانہ اسکندریہ سے ہی ہوئے تھے۔“

”کیا مقامی حکام نے انہیں گارڈز فراہم کیے تھے؟“

”نہیں۔“ صمد پاشا نے جواب دیا۔ ”کیونکہ انہوں نے اس کی درخواست ہی نہیں کی تھی۔“

''کیا یہ مقامی حکام کا فرض نہیں بنتا تھا کہ وہ ایک غیر ملکی کو تحفظ فراہم کریں جو کرسچن بھی ہے؟''

''غیر ملکی اور کرسچن دونوں مصر کے لیے اجنبی نہیں ہیں ہر سال بہت سے غیر ملکی بلاخوف وخطر یہاں آتے ہیں کیونکہ مقامی لوگ ہمیشہ غیر ملکیوں کو خوش آمدید کہتے ہیں جبکہ مصر کی دس فیصد آبادی عیسائی ہے، لیکن میں پھر کہوں گا، سر گورڈن نے اسکندریہ سے روانہ ہونے سے پہلے نہ تو مقامی حکام سے ملاقات کی اور نہ ہی انہوں نے اپنے لیے تحفظ مانگا تھا۔''

''یہ کیسے پتا چلا کہ سر گورڈن لاپتا ہو گئے ہیں؟''

''ان کی سیوا کی روانگی کے ایک مہینے بعد سیوا کے مقامی حکام نے اطلاع دی کہ سر گورڈن پندرہ دن کے لیے صحرا میں گئے تھے لیکن ایک مہینا ہونے کے باوجود واپس نہیں آئے۔ ان کے غیر ملکی اور ایک اہم فرد ہونے کی وجہ سے میں نے مناسب سمجھا کہ خود اس معاملے کی تحقیق کروں۔ میں سیوا پہنچا اور وہاں تمام حالات سے واقف ہوا۔ سر گورڈن چار افراد کا ایک قافلہ لے کر صحرا میں گئے تھے۔ انہوں نے کسی کو اپنے مقصد سے یا منزل سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ ان کے بعض واقف کار بس اتنا جانتے تھے کہ انہیں پندرہ دن بعد واپس آنا ہے لیکن جب ان کی واپسی نہیں ہوئی تو مقامی حکام نے ان کی تلاش میں لوگوں کو روانہ کیا اور جب ان کے قافلے کا کوئی سراغ نہیں ملا تو میرے دفتر کو اطلاع دی۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی مگر میں بھی ناکام رہا۔''

میریا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا آپ نے پوری کوشش کی تھی؟''

صمد پاشا کا چہرہ ایک لمحے کو سرخ ہوا مگر اس نے خود پر قابو رکھا۔ ''کوئی انسان سو فیصد کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن میرے بس میں جو تھا وہ میں نے کیا کیونکہ معاملہ ایک غیر ملکی کا بھی تھا اور ہماری حکومت اس کے لیے جواب دہ ہے۔''

''معاف کیجئے گا، میرا مقصد آپ کو الزام دینا نہیں تھا۔'' میریا نے فوراً معذرت کر لی۔ ''آپ کے خیال میں سر گورڈن اور ان کے قافلے کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟''

''میں نے اس پورے علاقے کو آخری حد تک دیکھا ہے یعنی جہاں تک ہماری عملداری ہے۔'' صمد پاشا نے سوچ کر کہا۔ ''جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے یہ افریقا کا خطرناک ترین علاقہ ہے۔ دنیا میں کہیں اتنی گرمی نہیں پڑتی جتنی اس علاقے میں ہوتی ہے۔ اگر آدمی کے پاس پانی نہ ہو تو وہ ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہاں کئی کئی دن کی مسافت پر کوئی آبادی نہیں ہے، خوفناک صحرائی طوفان معمول کی بات ہے۔ اس لیے ناواقف لوگ اس صحرا میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔''

میریا متفکر ہو گئی تھی۔ ''واقعی بہت خطرناک جگہ ہے یہ تو اس کی جغرافیائی پوزیشن ہو گئی اور اب سیاسی پوزیشن...؟''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں، یہاں بعض ایسے قبائل پائے جاتے ہیں جو کسی کی بالادستی قبول نہیں کرتے یہ ہمیشہ ہمارے لیے دردسر رہے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اس علاقے میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے اگر آپ یہاں اجنبی ہیں تو سمجھ لیں آپ کی زندگی کا چانس بہت کم ہے۔''

میریا غور سے سن رہی تھی، اس نے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے سر گورڈن کی گمشدگی میں ان دو عوامل کا دخل ہو سکتا ہے۔''

صمد پاشا نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''لیڈی گورڈن آپ صرف حسین ہی نہیں ذہین بھی ہیں۔''

''شکریہ۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''اس نقطہ نظر سے تلاش کرنے کے باوجود آپ گورڈن اور اس کے ساتھیوں کا کوئی سراغ پانے میں ناکام رہے؟''

''مجھے افسوس ہے لیکن یہ حقیقت ہے۔'' صمد پاشا نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اب بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ سر گورڈن نے اس علاقے کا رخ کیوں کیا؟''

''وہ ماہر آثاریات ہے اور مصر میں جگہ جگہ قدیم آثار پائے جاتے ہیں۔''

''یہ درست ہے لیکن وہ جس علاقے میں گئے ہیں وہاں میری معلومات کے مطابق کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کسی قدیم شہر یا بستی کے آثار ملے ہوں۔''

''ممکن ہے سر گورڈن کو کسی نے اس بارے میں بتایا ہو۔''

صمد پاشا خاموش رہا، اس نے اپنے سوال پر دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا لیکن وہ مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ چائے ختم کر کے وہ کھڑا ہو گیا۔ ''اب میں اجازت چاہوں گا لیڈی گورڈن، میری درخواست ہے رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیے۔''

میریا مان گئی، صمد پاشا نے کہا کہ وہ آٹھ بجے عبدل کے ساتھ آ جائے، وہ مہمان خانے کی طعام گاہ میں اس کا منتظر ہو گا۔ میریا واپس اپنے کمرے میں آئی، اس نے ڈنر کے لیے اپنا خاص سوٹ نکالا، یہ سیاہ ویلوٹ سے بنا ایسا

فراک سوٹ تھا جس کا گلا کچھ زیادہ ہی کشادہ تھا اور اسکرٹ پنڈلیوں سے اونچا تھا۔ وہ بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ آٹھ بجے تک تیار ہو کر اس نے خود کو ایک بڑی سی چادر میں چھپایا اور پھر عبدل کو آواز دی۔ وہ اس کے ساتھ باغ کے پار طعام گاہ تک آئی جہاں صمد پاشا اس کا منتظر تھا۔ میریا نے محسوس کیا کہ اسے دیکھ کر صمد پاشا کی نظروں میں وہی مخصوص چمک لہرائی تھی، عبدل کے جانے کے بعد اس نے چادر اتاری تو صمد پاشا چند لمحے کے لیے مسحور ہو کر رہ گیا۔ اس کی محویت دیکھ کر میریا جھینپ گئی تھی۔ پھر صمد پاشا چونکا اور اس سے نظریں چراتے ہوئے میز کی طرف اشارہ کیا۔

''آیئے لیڈی گورڈن۔''

میز کئی اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔ میریا اپنی جگہ کھڑی رہی۔ ''کیا تم مجھے میریا نہیں کہہ سکتے؟''

صمد پاشا ہچکچایا۔ ''یہ گستاخی ہوگی۔''

''اگر میں اجازت دوں؟''

صمد پاشا نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''تب ٹھیک ہے۔''

میریا مسکرانے لگی، اس نے اپنا ہاتھ صمد پاشا کی طرف بڑھایا لیکن اس نے میریا کا ہاتھ تھامنے اور چومنے سے گریز کیا۔ وہ حیرت سے بولی۔ ''اب کیا ہوا؟''

''میریا، ہم مسلمانوں کو غیر عورتوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے اس لیے میں معافی چاہوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میریا نے کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر ہاتھ واپس کھینچ لیا اور میز کی طرف بڑھی۔ صمد پاشا نے جلدی سے اس کے لیے کرسی سرکائی، میریا نے اپنی چادر تہہ کر کے اس کی پشت سے لٹکا دی اور خود بیٹھ گئی۔ میز بڑی تھی لیکن اس پر آمنے سامنے دو ہی کرسیاں لگی تھیں، میریا نے دیکھ لیا تھا کہ میز پر شراب نہیں ہے شاید صمد پاشا ایک اچھے مسلمان کی طرح غیر عورتوں کے ساتھ شراب سے بھی پرہیز کرتا تھا۔ وہاں کوئی ملازم نہیں تھا جو سرو کرتا اس لیے صمد پاشا یہ کام خود کر رہا تھا۔ اس نے خود زیادہ نہیں کھایا لیکن میریا کو اصرار کر کے کھلاتا رہا۔ کھانے کے دوران دو تین بار میریا نے اس سے گورڈن کی گمشدگی پر بات کرنی چاہی لیکن صمد پاشا ٹال گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اسے ساحل کی طرف کھلنے والے ٹیرس میں لے آیا اور طعام گاہ کے خادم سے قہوہ لانے کو کہا۔ یہ الائچی والا خوشبودار قہوہ تھا اور میریا کو اس کی مہک اچھی لگی تھی۔ خادم کے جانے کے بعد صمد پاشا نے کہا۔

''اب بات کرتے ہیں، آپ...''

''پلیز یہ تکلف ختم کرو، میں میریا ہوں۔'' میریا نے اسے ٹوک دیا۔

''ٹھیک ہے میریا، اب بتاؤ تم کیا چاہتی ہو، سرکاری طور پر مجھے پہلے ہی تم سے مکمل تعاون کا حکم ہے۔''

میریا نے اس کی بات پر غور کیا اس نے لفظ سرکاری استعمال کیا تھا۔ کیا وہ اس سے ہٹ کر بھی اس کے لیے کچھ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے نپے تلے لہجے میں کہا۔ ''میں جاننا چاہتی ہوں سر گورڈن پر کیا گزری ہے؟''

''میں اس سلسلے میں اپنی تفتیش سے آگاہ کر چکا ہوں۔''

''تم نے اپنی تسلی کر لی کیونکہ یہ تمہارے لیے ڈیوٹی ہے لیکن میری تسلی نہیں ہوئی ہے۔ یہ میرے لیے ڈیوٹی سے کہیں زیادہ اہم معاملہ ہے۔''

صمد پاشا نے نرمی سے کہا۔ ''میں آپ کے جذبات سمجھ رہا ہوں لیکن میں پھر کہوں گا یہ مسئلہ جذبات سے حل ہونے والا نہیں ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' میریا نے گہری سانس لی۔ ''اس لیے میں خود وہاں جانا چاہتی ہوں۔''

☆☆☆

صمد پاشا نے میریا کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت بالکل مختلف حلیے میں تھی، اس نے عربوں جیسا لبادہ پہن رکھا تھا اور سر پر مخصوص صافہ باندھا ہوا تھا۔ صحرا میں اس قسم کا لباس لازمی ہوتا ہے۔ شہری لباس یہاں کے شدید موسم کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ریت، خشک ہوا اور شدید گرمی، یہ لباس ان تینوں چیزوں سے بچاتا تھا۔ صمد پاشا کو میریا اس حلیے میں بھی پرکشش اور حسین لگی۔ میریا نے مسکراتے ہوئے صمد پاشا کی نظروں کا خراج تحسین قبول کر لیا تھا۔ ان کا قافلہ اسکندریہ سے روانہ ہونے کے لیے تیار تھا۔ قافلے میں میریا اور صمد پاشا کے علاوہ عبدل اور ایک باورچی کے ساتھ پانچ تربیت یافتہ مسلح محافظ بھی تھے۔ وہ تلواروں کے ساتھ ریوالوروں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ صمد پاشا کے پاس بھی ہتھیار تھے اور میریا کی فرمائش پر اس نے اس کے لیے ایک ریوالور مہیا کر دیا تھا۔ یہ جدید ترین، چھوٹا اور چھ فائر والا ریوالور تھا جو حال ہی میں منظر عام پر آیا تھا اور اس کی کارکردگی بہت شاندار تھی۔ میریا نے اسے اپنے لبادے میں چھپا لیا تھا۔ وہ صبح سورج نکلتے ہی اسکندریہ سے سیوا کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ وہ سب اونٹوں پر سوار تھے۔ قافلے میں پندرہ اونٹ تھے۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک اونٹ پر پانی لدا ہوا تھا کیونکہ اس خوفناک صحرا میں صرف پانی ہی زندگی کا

ضامن تھا۔ سفر کے آغاز میں ہی میریا کو اندازہ ہو گیا کہ صحرا کی گرمی اور شہر کی گرمی میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ سامنے سے جھلسا دینے والے لو کے تھپیڑے آرہے تھے۔ صمد پاشا اپنے اونٹ کو ذرا پیچھے اس کے پاس لے آیا۔

''تمہیں مشکل تو نہیں ہو رہی ہے؟''

''میں برداشت کر سکتی ہوں۔'' ہوا کے شور میں میریا نے چلا کر کہا۔ قافلے کے دوسرے افراد ان سے ذرا ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ دو محافظ آگے تھے اور تین پیچھے تھے۔ عبدل اور باورچی سامان والے اونٹوں کے ساتھ تھے۔

''تم بہت باہمت عورت ہو ورنہ اس صحرا میں مقامی عورتیں بھی سفر نہیں کرتیں جو گرمی کی عادی ہوتی ہیں۔''

''کیا ہم رات کو سفر نہیں کر سکتے؟''

''اگر چاند بڑا ہوتا تو رات میں سفر مناسب رہتا لیکن آج کل چاند چھوٹا ہے اور رات کو اتنی روشنی نہیں ہوتی جس میں آسانی سے سفر کیا جا سکے۔ پھر راستہ تلاش کرنے کا مسئلہ بھی ہو جاتا ہے۔''

اسکندریہ سے سیوا تقریباً چار سو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھا اور یہ فاصلہ اونٹوں پر تین دن میں طے ہوتا۔ ان کی اصل منزل سیوا سے آگے پھیلا ہوا وہ ہیبت ناک صحرا تھا جسے دنیا کا خوفناک ترین صحرا کہتے ہیں اور یہ صحرائے صحارا کا ایک حصہ ہے۔ مصر اور لیبیا سے ہوتا یہ صحرا شمالی اور وسطی افریقا تک چلا جاتا تھا۔ اس کا ایک حصہ کالاہاری کی صورت میں جنوبی افریقا بھی پہنچتا تھا۔ صمد پاشا نے میریا کو اس سفر سے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ عورت جتنی حسین ہے اتنی ہی ضدی بھی ہے۔ اس صحرا میں جانا چاہتی تھی جس میں جانے کی ہمت اچھے خاصے مرد بھی نہیں کر پاتے تھے۔ اس نے تین دن تک عبدل سے اونٹ سواری کی تربیت لی تھی اور یہ اونٹ اس نے خاص طور سے اپنے لیے خریدا تھا۔ چند دن میں وہ میریا سے یوں مانوس ہو گیا جیسے بچپن سے اس کے ساتھ رہا ہو۔ اب وہ پورے اعتماد سے اونٹ پر سواری کر رہی تھی۔ صمد پاشا فکرمند تھا کہ میریا کے لیے مشکل ہو گی، اس نے تجویز پیش کی تھی کہ اونٹ پر جھول باندھ کر وہ اس میں سفر کرے لیکن میریا نے اس کی یہ تجویز مسترد کر دی تھی، اس نے کہا۔

''اس طرح پتا چل جائے گا کہ قافلے میں ایک عورت بھی ہے اور میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہ سفر کرنا چاہتی ہوں۔''

اسی لیے میریا نے مردانہ مقامی لباس منتخب کیا تھا لیکن صمد پاشا کی فکر کم نہیں ہوئی تھی کیونکہ اسے گورنر سے صرف سیوا تک جانے کی اجازت ملی تھی، اسے معلوم تھا کہ انہیں آگے جانے کی اجازت نہیں ملے گی بلکہ عین ممکن تھا میریا کو فوری طور پر انگلستان جانے والے اگلے بحری جہاز پر بٹھا کر روانہ کر دیا جاتا۔ اس نے یہ بات میریا کو بھی نہیں بتائی تھی اور اسے صرف اتنا کہا گیا تھا۔ ''سیوا سے آگے صحرا میں مہم کی اجازت وہاں کے مقامی حاکم سے لینا پڑے گی۔''

''تم اس علاقے میں پولیس چیف ہو اور سیوا سے آگے کا علاقہ بھی تمہارے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔'' میریا نے اعتراض کیا۔

''یہ درست ہے لیکن سیوا ایک طرح سے مصر کی آخری حد بھی ہے اور اس سے آگے جانے کے لیے سیوا کے مقامی حاکم سے اجازت لینا پڑے گی۔'' صمد پاشا نے وضاحت کی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، اجازت مل جائے گی؟''

''ممکن ہے مل جائے اور ممکن ہے مقامی حاکم اتنے لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالنا پسند نہ کرے۔''

''کسی کو تلاش کرنا ان کی ذمے داری نہیں ہے؟''

''دیکھو، سرکاری حکام ایک مخصوص طریقۂ کار کے تحت کام کرتے ہیں اور ان کے طریقۂ کار میں کسی فرد کی پروا نہیں کی جاتی۔''

میریا خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے بعد باقی سفر کے دوران ان میں گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ شام سورج غروب ہونے سے پہلے وہ ایک پتھریلی وادی میں خیمہ زن ہو گئے تھے۔ دن کی گرمی میں کسی قدر کمی ہوئی تھی اس لیے ان سب کی جان میں جان آئی تھی۔ میریا سارا دن پانی پیتی رہی تھی صمد پاشا بھی معمول سے زیادہ پانی پی رہا تھا لیکن عبدل اور محافظ نارمل تھے، وہ اس گرمی کے عادی تھے۔ وہ دن کے بجائے رات کو پانی پیتے تھے کیونکہ دن میں یہ پانی پسینا بن کر اڑ جاتا تھا۔ البتہ رات کو نمی دیر تک محفوظ رہتی تھی۔ اونٹوں کو انہوں نے روانگی سے پہلے پوری طرح پانی پلا دیا تھا اور اب وہ سیوا جا کر ہی دوبارہ پانی پیتے۔ دوران سفر انہیں پانی نہیں دیا جاتا، میریا حیران تھی۔ ''یہ اتنی دیر پانی کے بغیر کس طرح رہ سکتے ہیں؟''

''قدرت نے اونٹ کا نظام ایسا بنایا ہے کہ اپنے جسم میں پانی ذخیرہ کر لیتا ہے اور شدید گرمی میں اس پانی سے کام چلاتا ہے۔ یہ مختلف صحرا ہے ورنہ عام صحراؤں میں اونٹ دس سے بارہ دن پانی کے بغیر وزن اٹھا کر روز سو کلومیٹرز سے

زیادہ سفر کر سکتا ہے۔''

عبدل نے صمد پاشا اور میریا کے الگ الگ خیمے لگائے تھے۔ جبکہ محافظوں اور ان دونوں کے لیے ایک بڑا خیمہ الگ سے لگا تھا۔ باورچی نے فوراً رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دی تھی کیونکہ انہوں نے دوپہر میں دوران سفر ہی معمولی سا کھایا تھا۔ صمد پاشا نے میریا کو بتا دیا تھا کہ وہ ناشتا بھاری کرتے ہیں اور پھر رات کو ٹھیک سے کھاتے ہیں۔ دوپہر میں بس اتنا کھاتے ہیں کہ سفر جاری رکھ سکیں اسی لیے میریا نے ناشتا ڈٹ کر کیا تھا اور دوپہر میں بھی خشک گوشت کے چند ٹکڑے روٹی کے ساتھ لیے تھے مگر اس وقت اس کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ کھانے کے بعد محافظ سونے اور پہرے پر چلے گئے۔ ان میں سے دو ہمہ وقت پہرے پر ہوتے۔ عبدل نے میریا اور صمد پاشا کے خیموں کے سامنے الاؤ روشن کر دیا تھا کیونکہ سورج غروب ہونے کے دو گھنٹے بعد ہوا بہت خنک ہو گئی تھی اور رات دس بجے میریا کو باقاعدہ سردی لگنے لگی تھی۔ ''میرے خدا! رات کو صحرا اتنا ٹھنڈا ہو جاتا ہے؟''

''ہاں! رات ہر چیز کو بدل دیتی ہے صحرا کو بھی۔'' صمد پاشا نے الاؤ کو ایک لکڑی سے کریدتے ہوئے کہا۔

''مگر صحرا کی رات کتنی خوب صورت ہوتی ہے، رومان پرور...'' میریا نے دور تک پھیلے صحرا کی طرف دیکھ کر کہا۔ عبدل ان کے لیے قہوہ بنا کر لے آیا۔ صمد پاشا نے اسے سونے کی اجازت دے دی تو وہ سونے چلا گیا۔ میریا نے شال اوڑھ لی تھی۔ ''یقین ہی نہیں آرہا، دن میں یہاں کس قدر گرمی تھی۔''

''زندگی انہی تغیرات کا نام ہے۔'' صمد پاشا نے کسی قدر بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کبھی دن اچھے ہوتے اور کبھی برے ہو جاتے ہیں، ویسے تم اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

میریا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''میرا اندازہ ہے سر گورڈن سے تمہاری شادی محبت کی نہیں تھی، ہاں رضامندی کی ضرور ہو گی۔''

میریا کا چہرہ سپاٹ ہو گیا اور وہ اتنے ہی سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''یہ تمہارا خیال ہے؟''

''نہیں۔'' صمد پاشا نے قہوے کی چسکی لی۔ ''مجھے یقین ہے۔''

''باوجود اس کے، میں اسے تلاش کرنے یہاں تک آئی ہوں اور دنیا کے خطرناک ترین صحرا کی طرف جا رہی ہوں؟''

''تم دنیا کے خطرناک ترین صحرا میں داخل ہو چکی ہو۔'' صمد پاشا نے تصحیح کی۔ ''ہاں، اس کے باوجود مجھے یقین ہے تم نے اس سے محبت کی شادی نہیں کی تھی۔''

''شاید تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں؟''

صمد پاشا کا چہرہ تمتما اٹھا اس نے قہوے کا پیالہ ایک طرف پھینک دیا۔ ''میری بات کا غلط مطلب مت نکالو، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم سر گورڈن کی تلاش میں اس لیے نہیں آئی ہو کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔''

میریا کچھ دیر اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرے خیال کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''اوہ، تب تمہارے بڑوں کا کیا خیال ہے؟''

''یہ بات تم جا کر بڑوں سے پوچھو۔'' صمد پاشا کا لہجہ تند ہو گیا۔ ''میرا تم سے صرف یہ سوال ہے کیا تم واقعی نہیں جانتیں کہ سر گورڈن یہاں کیوں آیا تھا؟'' وہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''شب بخیر۔''

صمد پاشا اس کی طرف دیکھے بغیر خیمے میں چلا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی میریا کے تیکھے خدوخال نرم پڑ گئے اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ مگر کچھ دیر بعد وہ اٹھی تو اس کی آنکھیں یوں خشک تھیں جیسے ان میں کبھی نمی آئی ہی نہ ہو۔ اگلی صبح وہ سو کر اٹھی تو قافلہ روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ دوسرے ناشتا کر چکے تھے۔ عبدل نے میریا کا ناشتا میز پر سجا دیا۔ اس نے آہستہ سے صمد پاشا کے بارے میں پوچھا۔ ''پاشا نے ناشتا کر لیا؟''

''وہ ناشتا کر چکے ہیں مادام۔'' عبدل نے جواب دیا۔ میریا کا موڈ یہ سنتے ہی خراب ہو گیا تھا شاید اس کا خیال تھا کہ اب صمد پاشا تینوں وقت کھانا اس کے ساتھ ہی کھائے گا لیکن اس نے میریا کا انتظار کیے بغیر ہی ناشتا کر لیا تھا۔

''یہ لے جاؤ۔'' میریا نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے ناشتا نہیں کرنا ہے۔''

صمد پاشا ان کی گفتگو سن رہا تھا وہ انجان بنا ہوا تھا لیکن جب میریا نے ناشتا کرنے سے انکار کیا تو وہ مجبوراً ان کی طرف آیا۔ ''لیڈی گورڈن، آپ ناشتا کر لیں کیونکہ اس کے بعد چھ گھنٹے تک آپ کو کچھ کھانے کو نہیں ملے گا۔''

''مسٹر پولیس چیف!'' میریا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے عبدل میز لے جاؤ۔''

''عبدل تم جاؤ۔'' صمد پاشا نے اسے حکم دیا، عبدل

وہاں سے چلا گیا۔ صمد پاشا نے میریا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے ہمارے درمیان اتنا ہی رابطہ بہتر ہے جتنا ہمارے بڑے برداشت کر سکیں۔“

میریا تیز لہجے میں بولی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو، مجھے بھیجا گیا ہے؟“

”میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔“ صمد پاشا نے اس بار نرمی سے کہا۔ ”بہتر ہے تم اس چکر میں پڑنے کے بجائے اپنے مقصد پر نظر رکھو جس کے لیے تم یہاں آئی ہو، ناشتا کر لو۔“

”میں صرف ایک شرط پر ناشتا کروں گی جب تم میرے ساتھ ناشتا کرو گے۔“

”میں ناشتا کر چکا ہوں۔“

”مجھے نہیں معلوم، میں صرف اسی صورت میں ناشتا کروں گی جب تم میرا ساتھ دو گے۔“

صمد پاشا کا دل چاہ رہا تھا لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ مجبور ہو کر میریا کی بات مان رہا ہو۔ جیسے ہی انہوں نے ناشتا مکمل کیا، میریا کا خیمہ بھی اکھاڑ دیا گیا اور چند منٹ بعد وہ روانگی کے لیے تیار تھے۔ مشرق سے طلوع ہوتا سورج ایک اور قیامت خیز گرم دن کی دھمکی دے رہا تھا۔ اسکندریہ سے روانگی کے بعد وہ ساحل سے دور صحرا میں سفر کرتے رہے تھے کیونکہ یہ علاقہ پتھریلا تھا اور تقریباً ہموار تھا۔ اس میں سفر کرنا آسان تھا جبکہ ساحل کے ساتھ صحرا بہت ریتیلا تھا اور اس میں سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ پہلے دن کے ختم ہونے سے پہلے وہ صحرا میں خاصے دور نکل آئے تھے۔ دوسرے دن کے سفر کے خاتمے پر وہ سیوا اور وسطی مصر کے ایک شہر باوتی کے درمیان ایک وادی میں تھے۔ انہیں ریت کے دشوار گزار ٹیلوں سے بچنے کے لیے جنوب مغرب کی طرف آنا پڑا تھا۔ اب سیوا سوا سو کلو میٹرز دور رہ گیا تھا۔ انہوں نے پڑاؤ ڈالا تو خلاف توقع میریا تھکن کا کہہ کر اپنے خیمے میں چلی گئی۔

اسکندریہ میں پہلی ملاقات میں ان دونوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں لیکن ابھی تک صرف اشارے کنائیوں میں اظہار کیا تھا اور یہ بھی میریا کی طرف سے تھا جیسے اس نے صبح جبراً اسے اپنے ساتھ ناشتے میں شامل کیا۔ اس جذبے کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی تھا جو ان دونوں کے درمیان جاری تھا اور اس کا تعلق سر گورڈن کی مصر آمد اور اس کی پراسرار گم شدگی سے تھا۔ وہ دونوں ہی اس موضوع پر کھل کر بات کرنے سے گریز کر رہے تھے اور جو جانتے تھے اسے بیان نہیں کر رہے تھے۔ صمد پاشا نے محسوس کیا کہ وہ گورڈن کے مقاصد کے بارے میں اس کے سوال کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اور شاید اسی لیے وہ تھکن کا بہانہ کر کے خیمے میں چلی گئی تھی۔ صمد پاشا یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے فرائض کے معاملے میں کمزور پڑ گیا تھا۔ اگر معاملہ میریا کا نہ ہوتا تو وہ خود کو مشکل میں نہ محسوس کرتا۔

میریا نے رات کا کھانا بھی اپنے خیمے میں کھایا تھا۔ صمد پاشا کھانے کے بعد الاؤ کے پاس بیٹھا تھا۔ عبدل نے اسے قہوہ دیا اور میریا کو قہوہ اس کے خیمے میں پہنچا دیا کیونکہ اس نے قہوے کے لیے بھی باہر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ محافظ سونے چلے گئے تھے، ان میں سے دو جاگ کر پہرا دے رہے تھے لیکن وہ خیموں سے ذرا دور تھے۔ صمد پاشا کسی کو پاس محسوس کر کے چونکا اور اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے ریوالور کی طرف بڑھا۔ لیکن وہ میریا تھی، اس نے سرگوشی کی۔ ”میں ہوں۔“

صمد پاشا کا ہاتھ رک گیا اور اس نے کسی قدر طنز سے کہا۔ ”اس وقت کون سی بات تمہیں باہر لے آئی؟“

وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”میں تمہارے الزام پر بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں نے بتایا ہے کہ یہ میرا خیال نہیں ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

”تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟“ میریا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں شعلوں کا عکس چمک رہا تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ صمد پاشا نے الٹا اس سے سوال کر لیا۔

”تم سمجھتے ہو درحقیقت سر گورڈن اس کام سے مصر نہیں آیا جو اس نے بہ ظاہر بیان کیا اور اس کی گم شدگی بھی تم لوگوں کے نزدیک مشکوک ہے۔ ایک مشکوک فرد کی بیوی یا بیوہ کی حیثیت سے میں خود بہ خود تم لوگوں کے لیے مشکوک ہو جاتی ہوں۔“

”کیا تم ہمیں اس معاملے میں قصور وار سمجھتی ہو؟“

”نہیں، اپنی سلطنت کے مفاد میں تمہیں غیر ملکیوں پر شک کرنے کا حق حاصل ہے۔“ میریا نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں اپنی صفائی پیش نہیں کروں گی کیونکہ اگر تم لوگوں نے میرے خلاف کوئی ثبوت حاصل کر لیا تو تم خود مجھے گرفتار کر لو گے... ہے نا؟“

صمد پاشا سوچ میں پڑ گیا۔ وہ شاید یہ سمجھنے کی کوشش کر

رہا تھا کہ میریا گورڈن یہ گفتگو کیوں کر رہی ہے جبکہ اگلے دن وہ سیوا پہنچ جاتے اور وہاں سے انہیں آگے جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ صمد پاشا جانتا تھا انہیں اجازت نہیں ملے گی، وہ صرف میریا کی خاطر یہ سفر کر رہا تھا، ورنہ وہ اسے براہ راست کسی محافظ دستے کے ساتھ بھی بھیج سکتا تھا جس کا نتیجہ یہی نکلتا کہ میریا کو وہاں سے واپس بھیج دیا جاتا اور پھر وہ اس کی انگلستان واپسی کا بندوبست کرتا۔ یہ سب اسے میریا سے پہلی ملاقات سے بھی پہلے بتا دیا گیا تھا۔ گورنر نے اسے براہ راست احکامات دیتے ہوئے واضح کیا تھا کہ یہ حکم خلافت سے آیا ہے اور اس پر سو فیصد عمل درآمد کرنا ان کی ذمے داری تھی۔ مرکزی حکومت کے ملوث ہونے کا مطلب تھا یہ اونچے درجے کی سیاست تھی۔ مصر ویسے ہی سلطنت کے لیے ہمیشہ سے دردسر رہا تھا۔ مقامی قبائل خودسر تھے اور وادی کے کاشت کار امن چاہتے تھے لیکن انہیں صحرائی لٹیروں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک بہت بڑی فوج درکار تھی جو یہاں ترک گورنر کے پاس نہیں تھی خاص ترک دستے شہروں اور اہم مقامات پر تھے جو مقامی سپاہی بھرتی کیے گئے تھے وہ کسی کام کے نہیں تھے اور اکثر خود جرائم اور لوٹ مار میں ملوث پائے جاتے تھے۔

فرانس، برطانیہ اور اٹلی کی حریص نظریں مصر کی دولت مند سرزمین پر مرکوز تھیں۔ نپولین کا حملہ اسی سلسلے کی کڑی تھا جسے برطانوی ایڈمرل نیلسن نے ناکام بنا دیا اور اب رفتہ رفتہ مصر کے نزدیک بحیرۂ روم یورپی بحری بیڑوں کا گڑھ بنتا جا رہا تھا۔ عثمانیوں کے پاس بحری قوت زیادہ نہیں تھی اور وہ سمندر پر اپنا مکمل تسلط قائم نہیں کر سکتے تھے۔ صمد پاشا ان تمام حالات سے واقف تھا۔ اندرونی مسائل کے ساتھ اب مصر بین الاقوامی سیاست و سازشوں کا مرکز بھی بنتا جا رہا تھا۔ یورپ کے ہوس کار جانتے تھے کہ مشرق وسطیٰ اور افریقا میں داخلے کی کنجی مصر ہے۔ میریا اسے غور سے دیکھ رہی تھی، اس نے اپنا سوال دُہرایا۔ ”کیا تم مجھے گرفتار کر لو گے؟“

”میں ابھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ صمد پاشا نے دامن بچایا۔

”دیکھو، میں نے تمہیں سب صاف بتا دیا ہے۔ کیا تم مجھے کچھ باتیں بتانا پسند کرو گے؟“

”اگر میں بتا سکا تو ضرور بتا دوں گا۔“

”کیا ہمیں سیوا سے آگے جانے کی اجازت ملے گی؟“

صمد پاشا نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”میرے ذرائع نے اطلاع دی ہے، ہمیں اجازت نہیں ملے گی۔“

”کیا مجھے نجی طور پر جانے کی اجازت بھی نہیں ملے گی؟“

”اجازت نہ ملنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے۔“

”گورڈن یہاں پراسرار حالات میں غائب ہوا ہے۔ کیا مصر کی مقامی حکومت اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ جانتی ہے جتنا اس نے برطانوی حکومت کو بتایا ہے؟“

”میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔“

میریا نے گہری سانس لی۔ ”تم نے جواب نہ دے کر بھی جواب دے دیا ہے۔ اب ایک آخری سوال ہے۔ گورڈن کی گم شدگی میں مقامی حکومت کا کوئی ہاتھ ہے؟“

”میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس بارے میں لاعلم ہوں۔“

”مجھے تمہاری سچائی پر بھروسا ہے۔“ میریا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”باقی میں معلوم کر لوں گی۔“

”میریا، میری تم سے ایک درخواست ہے۔“ صمد پاشا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”تم یہیں سے واپس چلی جاؤ۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”بالکل ممکن ہے، تم اس کام کے لیے بالکل موزوں نہیں ہو جو تم سے لیا جا رہا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے میں برطانوی حکومت کے لیے کام کر رہی ہوں؟“ میریا نے اتنی آہستہ آواز میں کہا کہ صمد پاشا بہ مشکل سن سکا تھا۔

”میرا ایسا کوئی مطلب نہیں ہے لیکن تم جو کر رہی ہو یہ تمہاری ہمت سے کہیں زیادہ ہے۔“

”تم فکر مت کرو۔“ میریا کھڑی ہو گئی۔ ”جب میری ہمت جواب دے جائے گی تو میں لوٹ جاؤں گی۔“

صمد پاشا اس ضدی عورت کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بھی اٹھ گیا، کل انہیں ہر صورت رات سے پہلے سیوا پہنچنا تھا اور اس کے لیے انہیں طویل سفر کرنا تھا۔ صمد پاشا نے عبدل کو حکم دیا تھا کہ وہ منہ اندھیرے روانہ ہو جائیں گے۔ وہ تاریکی میں اٹھ گئے اور ناشتا کر کے روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ اس صبح میریا اور صمد پاشا نے ساتھ ناشتا کیا تھا۔ میریا خوش نظر آ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ صمد پاشا نے اس سے کھل کر بات کی تھی اور اسے صورت حال کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ روانہ ہوئے تو سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا لیکن روشنی ہو چکی تھی۔ میریا نے صمد پاشا سے پوچھا۔ ”یہ بات یقینی ہے کہ ہم آج سیوا پہنچ جائیں گے؟“

''بالکل۔'' صمد پاشا نے کہا۔ ''ابھی اسی میل کا سفر باقی ہے اور ہم لگاتار آٹھ گھنٹے سفر کریں تو شام تک سیوا میں ہوں گے۔''

''سیوا سے ہمیں کہاں جانا ہوگا؟'' میریا نے کہا اور پھر جلدی سے تصحیح کی۔ ''اگر مجھے آگے جانے کی اجازت مل گئی تو...؟''

''جنوب مغرب کی طرف۔'' صمد پاشا نے کہا اور اپنے اونٹ کو بٹھانے لگا۔ میریا کا اونٹ پہلے ہی بیٹھ گیا تھا۔ ''لیکن پرسوں صبح ہمیں واپس آنا ہوگا۔''

میریا نے صمد پاشا کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ روانہ ہوئے اور سفر کے دو گھنٹے بعد سورج خاصا بلند ہو گیا تھا، محافظوں کے انچارج نے صمد پاشا کو آواز دی۔ ''جناب... موسم ٹھیک نہیں ہے۔''

صمد پاشا اونٹ دوڑا کر اس کے پاس پہنچ گیا، وہ قافلے میں سب سے آگے تھا۔ ''کیا ہوا؟''

انچارج نے دور مشرق کی طرف اشارہ کیا جہاں افق سرخ ہو رہا تھا۔ ''یہ آندھی کا نشان ہے، اس کی آمد سے پہلے ہمیں اونٹوں کو آپس میں باندھ دینا چاہیے ورنہ یہ بھاگ گئے تو انہیں تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔''

یہ اطلاع تشویشناک تھی کیونکہ ان کا بیشتر پانی ان اونٹوں پر تھا اور سواری والے اونٹوں پر بس اتنا پانی تھا جو سوار کے دن بھر کے لیے کافی ہو۔ صمد پاشا نے قافلے کو رکنے اور اونٹوں کو باندھنے کا حکم دیا اور پھر پلٹ کر میریا کے پاس آیا۔ وہ صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس نے صمد پاشا کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ صمد پاشا نے اسے مختصر الفاظ میں آنے والی آفت کے بارے میں بتایا۔ ''ہمیں تمام اونٹوں کو ایک جگہ کر کے باندھنا ہوگا ورنہ یہ بھاگ سکتے ہیں۔''

''ہمارا کیا ہوگا؟''

''ہمیں اونٹوں کے پاس لیکن ان کی زد سے دور رہنا ہوگا ورنہ یہ بھڑکیں گے تو ہمیں بھی زخمی کر سکتے ہیں۔''

ابھی وہ اونٹوں کو باندھ رہے تھے کہ ہوا کے جھونکے ریت اڑاتے ان تک آ پہنچے۔ اونٹ بھڑکنے لگے۔ وہ انہیں قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن بدقسمتی سے اونٹ پوری طرح بندھے نہیں تھے اس لیے وہ قابو سے باہر ہو گئے اور ایک ایک کر کے رسیاں تڑا کر فرار ہونے لگے۔ انہیں روکنے کی کوشش ناکام رہی تھی۔ آندھی نے ویسے ہی انہیں دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ میریا اپنے اونٹ پر اوندھے منہ پڑی تھی اور اس نے چہرہ کپڑے سے ڈھانپ لیا تھا۔ عبدل اس کے اونٹ کے پاؤں باندھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر تیز ہوا اور اڑتی ریت رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ اچانک اونٹ بھڑکا اور بلبلاتا ہوا کھڑا ہونے لگا۔ عبدل دھکے سے دور گرا اور میریا نے چیخ ماری۔ اس نے صمد پاشا کو آواز دی۔ وہ چیخ سن کر پہلے ہی میریا کی طرف لپکا اس نے اونٹ کو کھڑے دیکھ لیا تھا اور اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چھلانگ لگائی اور اس کی پشت کی طرف لٹکی رسی پکڑ لی۔ اسی وقت اونٹ بھاگا، صمد پاشا ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو اونٹ میریا کو لے کر نکل جاتا۔ وہ اب بھی بھاگ رہا تھا لیکن میریا اکیلی نہیں تھی، صمد پاشا اونٹ کے کوہان کے پیچھے کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ اوپر چڑھ گیا اور اس نے اونٹ سے چمٹی میریا کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اسے نزدیک پا کر وہ اس سے چمٹ گئی تھی۔

صمد پاشا جانتا تھا اونٹ کو روکنے کی کوشش بیکار تھی، وہ انہیں خود سے گرانے کی کوشش بھی کر رہا تھا اور ان کی بقا اسی میں تھی کہ وہ اونٹ پر سوار رہیں، ایک بار وہ انہیں گرا کر نکل جاتا تو بے یار و مددگار رہ جاتے۔ ان کا پانی بھی اسی اونٹ پر تھا اور صحرا کے اس خطے میں پانی کے بغیر چند گھنٹے گزارنا بھی ممکن نہیں تھا۔ جب تک میریا کو یہ نہیں پتا تھا کہ صمد پاشا بھی اونٹ پر سوار ہو گیا ہے، اس کی جان پر بنی ہوئی تھی اور اس کی چیخیں نہیں رک رہی تھیں لیکن اب وہ پرسکون تھی۔ صمد پاشا نے مہار ہاتھ میں لے لی تھی اور اضافی رسی سے میریا اور خود کو باندھ لیا تا کہ اونٹ انہیں گرا نہ سکے۔ وہ بار بار میریا سے کہہ رہا تھا۔ ''اپنے حواس بحال رکھو... اونٹ پر رہو۔''

''تم فکر مت کرو۔'' اس نے تنگ آ کر کہا۔ ''میں نہیں گروں گی۔''

ہوائیں بدروحوں کی طرح چنگھاڑ رہی تھیں اور ریت بارش کی طرح برس رہی تھی۔ اونٹ انہیں لیے نامعلوم سمت بھاگا جا رہا تھا۔ ایک دو بار صمد پاشا نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اونٹ مزید بھڑک گیا تھا۔ وہ آندھی سے بری طرح خوف زدہ تھا۔ جب اس نے انہیں گرانے کی کوشش کی تو صمد پاشا نے اپنی کوشش ترک کر دی اور عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ دونوں اونٹ سے چمٹے رہیں۔ یہ آسان کام نہیں تھا، تند ہوا کے جھونکے کسی ٹھوس وجود کی طرح ان سے ٹکرا رہے تھے اور انہیں اونٹ سے الگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ برستی ریت الگ مصیبت تھی جس میں وہ نہ آنکھ کھول سکتے تھے اور نہ منہ، وہ تو سانس بھی بہ مشکل لے رہے تھے۔ اونٹ بے تحاشا بھاگ رہا تھا اور خطرہ تھا کہ وہ ٹھوکر کھا کر گرتا تو وہ اس کے نیچے پس کر رہ جاتے۔ مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ آندھی ہی کم نہیں تھی؛ اوپر سے بے تحاشا بھاگتے اونٹ کے جھٹکے ان کو جھنجوڑ رہے تھے۔ میریا نازک عورت تھی، رفتہ رفتہ اس کا حوصلہ جواب دینے لگا اور اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی، صمد پاشا چلایا۔ ''میری! خود کو سنبھالو۔''

''مجھ میں اب... ہمت نہیں ہے۔'' وہ بولی اور یک دم ڈھیلی پڑ گئی، وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اگر صمد پاشا اسے نہ سنبھال لیتا تو وہ گر جاتی۔ اب اسے اپنے ساتھ میریا کو بھی سنبھالنا تھا۔ دشواری دوگنی ہو گئی تھی مگر اس نے ہمت نہیں ہاری، اسے معلوم تھا ہمت ہاری اور نیچے گرے تو پھر موت ان کا مقدر بن جائے گی۔ صرف میریا کو چھوڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ اس دوران میں اونٹ مسلسل بھاگتا ہی رہا۔ آندھی کی شدت میں پہلے کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ خاصی دیر بعد صمد پاشا نے محسوس کیا کہ اب ہوا کے جھونکے پہلے کی طرح تند نہیں رہے اور برستی مٹی میں بھی کمی آئی تھی۔ رفتہ رفتہ آندھی کی شدت میں اتنی کمی آئی کہ وہ چادر سے سر نکال کر باہر دیکھنے کے قابل ہوا۔ ماحول اب بھی گرد آلود تھا لیکن کچھ فاصلے تک دکھائی دے رہا تھا۔ اونٹ بھاگنے کے بجائے چل رہا تھا اور اس کے انداز میں وحشت نہیں رہی تھی۔ گویا خطرہ گزر چکا تھا۔

صمد پاشا نے ہمت کر کے اونٹ کی مہار کھینچی اور بالآخر اسے روکنے میں کامیاب رہا لیکن اس نے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی اس کے بجائے وہ اونٹ کو بٹھانے لگا۔ اونٹ آمادہ نہیں تھا مگر آخر میں مان گیا اور گھٹنے موڑ کر بیٹھنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی صمد پاشا پھسل کر میریا سمیت نیچے اتر آیا۔ اس نے میریا کو ریت پر ڈال دیا اور چادر کو اس کے گرد لپٹے رہنے دیا۔ پھر اس نے اونٹ کے اگلے پچھلے پاؤں رسی سے باندھے کہ وہ اٹھ نہ سکے۔ یہ ضروری تھا ورنہ اونٹ کا کیا بھروسا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے پہلوؤں سے بندھے مشکیزوں کا جائزہ لیا اور انہیں پا کر سکون کا سانس لیا تھا۔ ابھی وہ یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اونٹ اور آندھی انہیں کہاں لے آئے تھے۔ اپنا کام کر کے وہ ریت پر ڈھیر ہو گیا۔ تھکن سے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور چند لمحے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا۔

نیند کی حالت میں اسے لگا جیسے کوئی نرم اور نازک سی چیز اس کا چہرہ سہلا رہی ہے۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے میریا کا حسین اور دلکش چہرہ خود پر جھکے پایا۔ اس نے صمد پاشا کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو، میریا گنگنائی۔ ''زندگی مبارک ہو۔''

''تمہیں بھی۔'' صمد پاشا نے کہا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ بیٹھا۔ سورج مغرب کی طرف جا چکا تھا اور وہ اونٹ کے سائے میں ہونے کی وجہ سے دھوپ سے محفوظ تھے۔ صمد پاشا کچھ جھینپ گیا تھا۔ ''مجھے پتا ہی نہیں چلا کتنی دیر سوتا رہا؟''

''بہت دیر۔'' میریا نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''صمد، تم نے ناقابلِ یقین جدوجہد کر کے اپنی اور میری جان بچائی ہے ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ ہمارا آخری وقت آ گیا ہے۔''

صمد پاشا نے اپنے لباس سے مٹی جھاڑی۔ ''بعض اوقات تو مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔ اگر میں تم سمیت اونٹ سے نہ چمٹا رہتا تو یقیناً آخری وقت آ چکا ہوتا۔''

''لیکن اب ہم کہاں ہیں؟'' میریا نے چاروں طرف دیکھا۔ چاروں طرف ریتیلا صحرا تھا اور انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھے اور سیوا یہاں سے کتنی دور تھا۔ صمد پاشا نے پہلے مشکیزے سے پانی نکال کر خشک حلق تر کیا اور اس کے بعد اپنے لباس سے اس خطے کا ایک نقشہ نکالا جو باریک چمڑے پر بنا ہوا تھا اس نے نقشہ ریت پر پھیلایا اور انگلی رکھی۔ ''جب طوفان آیا تو ہم یہاں تھے... اس جگہ سے سیوا کوئی ساٹھ میل دور شمال مغرب میں ہے۔ طوفان نے ہمیں جنوب مغرب کی طرف دھکیلا ہو گا اس لیے ہمیں اب شمال مغرب کی طرف جانا ہوگا۔''

''لیکن ہمارا اندازہ غلط ہوا تو...؟''

اس سوال کا صمد پاشا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بھٹکنے کا مطلب سوائے اذیت ناک موت کے اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے پاس پانی کے صرف دو مشکیزے تھے جنہیں وہ کفایت شعاری سے چلاتے تو یہ دو دن چل سکتے تھے۔ اونٹ تقریباً پانچ چھ گھنٹے تک مسلسل بھاگتا رہا تھا اور اس دوران میں وہ اپنے اصل راستے سے چالیس پچاس میل دور نکل آئے تھے۔ انہیں جانا شمال مغرب کی طرف تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ سیوا کے اوپر نیچے سے ہو کر آگے نہ نکل جائیں جہاں دور تک کوئی اور آبادی نہیں تھی۔ چند گھنٹوں کے آرام نے انہیں تازہ دم کر دیا تھا اور وہ پھر سفر کے لیے تیار تھے۔ صمد پاشا نے اونٹ کی رسیاں کھولیں۔ میریا کو اونٹ پر سوار کرایا اور خود اس کی مہار تھام لی۔

''تم بھی آ جاؤ۔'' میریا نے پکار کر کہا۔

"نہیں، میں پیدل چلوں گا۔ اونٹ پر دو افراد کا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں ہے ورنہ یہ جلد تھک جائے گا۔"

"میں بھی پیدل چلوں گی۔" میریا اونٹ سے اتر آئی اور اس کے اصرار پر بھی نہیں مانی۔ "جب تھک جاؤں گی تو بیٹھ جاؤں گی۔"

آندھی کے بعد گرمی کی شدت میں کمی آئی تھی پھر دن بھی ڈھل رہا تھا اس لیے گرمی کم ہوتی جارہی تھی۔ صمد پاشا کے پاس ایک نقشہ اور قطب نما تھا، وہ اس کی مدد سے راستے کا تعین کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے صحرا میں راستہ تلاش کرنے کے کام میں مہارت نہیں تھی۔ ذرا دیر بعد سورج غروب ہوگیا اور تیزی سے رات کی تاریکی چھانے لگی۔ کچھ دیر بعد اتنا اندھیرا ہوگیا کہ وہ رکنے پر مجبور ہو گئے۔ جب تک چاند اور ستارے واضح نہیں ہو جاتے وہ دوبارہ سفر نہیں کر سکتے تھے۔ صمد پاشا نے ٹھنڈی ہوتی ریت پر چادر بچھا دی اور وہ اس پر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں خاموش تھے، پھر میریا نے کہا۔

"ہوسکتا ہے سرگورڈن کے قافلے کو بھی اسی طرح طوفان کا سامنا کرنا پڑا ہو اور وہ راستہ بھٹک گئے ہوں۔"

"ہوسکتا ہے کیونکہ سیوا کے جنوب مغرب میں آندھیاں معمول ہیں اور یہاں سیکڑوں میل تک کوئی آبادی نہیں ہے۔"

"اس علاقے کی کوئی خاص اہمیت ہے؟" میریا نے پوچھا۔

"کس لحاظ سے؟"

"سیاسی لحاظ سے؟"

صمد پاشا نے چونک کر میریا کو دیکھا۔ اس نے چادر اتار دی تھی، اس کے بالوں میں گرد جم گئی تھی۔ چہرہ تھکا ہوا اور مرجھایا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود وہ صمد پاشا کو ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگی۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھول گیا کہ میریا نے کیا سوال کیا تھا۔ پھر وہ چونکا۔ "سیاسی لحاظ سے یہ علاقہ بہت خطرناک ہے کیونکہ اس صحرا میں ایسے بدو قبیلے سفر کرتے ہیں جو خونخواری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور یہ ہماری حکومت کے لیے ہمیشہ دردِ سر بنے رہے ہیں۔ اگر سرگورڈن صرف آثاریات کی تلاش میں اس طرف آئے تھے تو انہوں نے اپنی زندگی کی سب سے بھیانک غلطی کی تھی۔"

"ممکنہ طور پر اپنی زندگی کی آخری غلطی بھی۔" میریا نے آہستہ سے کہا۔

"فرض کرلو کہ تم جان جاتی ہو کہ سرگورڈن پر کیا گزری تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"کچھ نہیں، سوائے اس کے کہ میرے دل کی خلش دور ہوجائے گی۔"

"اور اگر تم نہ جان سکیں تو یہ خلش برقرار رہے گی؟"

"ہاں، مجھے ہمیشہ یہ خدشہ رہے گا کہ سرگورڈن اچانک کسی دن واپس آجائے گا۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ دو حکومتیں اس کی موت کی تصدیق کر رہی ہیں اس کے باوجود میں اپنا اطمینان چاہتی ہوں۔"

"اوہ۔" صمد پاشا نے بغیر کسی تعجب کے کہا۔ "تو تم سرگورڈن کی واپسی نہیں چاہتیں؟"

"ہاں۔" میریا نے سرگوشی میں کہا۔ "میں نے پانچ سال قید کی طرح گزارے ہیں اور اب میں مزید قید میں نہیں رہنا چاہتی، میں آزادی چاہتی ہوں اور اسے یقینی بنانا چاہتی ہوں۔"

"اس لیے تم نے اتنے طویل سفر کی زحمت گوارا کی؟" صمد پاشا نے کہا، وہ اس جواب سے کسی قدر خوش اور مطمئن نظر آرہا تھا۔

"مگر تمہاری حکومت تو کچھ اور سمجھتی ہے۔" میریا کے لہجے میں شکوہ آگیا۔ "اس کا خیال ہے سرگورڈن جاسوس تھا اور شاید میں بھی جاسوس ہوں۔"

صمد پاشا نے حیرت سے کہا۔ "میریا تم بہت کھل کر بات کررہی ہو۔"

"شاید اس لیے کہ یہاں ہمارے سوا کوئی نہیں ہے اور شاید اس لیے کہ ہم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے۔"

"مایوس مت ہو، ابھی ہمارے پاس زندہ رہنے کی امید ہے۔" صمد پاشا نے اسے تسلی دی۔ "ہمارے پاس ایک اونٹ اور خاصا پانی ہے۔"

"ہاں، مگر کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"یہ ہے۔" صمد پاشا نے میریا کو ایک تھیلی پیش کی جس میں تقریباً ایک سیر خشک چھوارے تھے۔ "ویسے بھوک اتنا مسئلہ نہیں ہے، ہم سپاہی تو کئی کئی دن بھی بغیر کھائے گزارا کرسکتے ہیں۔"

میریا چھوارے دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد چاند نکل آیا، یہ چوتھی یا پانچویں کا چاند تھا جس سے صحرا میں اتنی روشنی ضرور ہوگئی کہ وہ آگے سفر کرسکتے تھے۔ اس بار صمد نے اصرار کرکے میریا کو اونٹ پر بٹھایا اور خود آگے تقریباً بھاگنے کے انداز میں چلنے لگا۔ سیوا تک طویل فاصلہ طے کرنے کے لیے تیز رفتاری لازمی تھی ورنہ ان کا پانی ختم ہوجاتا

اور صحرا میں دن کی گرمی ان کی جان لے سکتی تھی۔ اس لیے وہ رات میں ہی زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے قطب نما کی مدد سے اپنا رخ کسی قدر شمال کی طرف رکھا تھا تاکہ سیوا اگر راستے میں نہ بھی آئے تب بھی وہ سیوا جانے والے راستے تک پہنچ جائے۔ اس راستے کی نشانیاں تھیں اور وہ ایک بار اس صحرائی شاہراہ تک پہنچ جاتے تو پھر سیوا پہنچنا مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے میریا سے کہا کہ وہ آس پاس کا خیال رکھے اور اگر اسے کوئی چیز یا فرد نظر آئے تو اسے خبردار کرے۔ وہ صمد پاشا سے تقریباً آٹھ فٹ زیادہ بلند تھی اور اس کی نظر یقیناً زیادہ دور تک دیکھ سکتی تھی۔

وہ تقریباً چار گھنٹے سفر کرتے رہے تھے اور اس کے بعد صمد پاشا نے اونٹ روک دیا۔ سواری ہونے کے باوجود میریا کی حالت بہت خراب تھی جیسے ہی چادر بچھی وہ بے سدھ ہو کر سو گئی۔ جبکہ صمد پاشا اس دوران میں اونٹ کو باندھ رہا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے چند چھوارے نکالے اور پانی کے ساتھ انہیں حلق سے اتارنے لگا۔ وہ پانی بہت احتیاط سے استعمال کر رہا تھا۔

ابھی صبح ہونے میں وقت تھا۔ اس نے دو گھنٹے بعد میریا کو اٹھا دیا۔ "تم پہرا دو میں کچھ دیر آرام کر لوں۔ سورج نکلتے ہی ہمیں سفر کرنا ہوگا۔"

میریا کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی لیکن مجبوراً اٹھ گئی، صمد پاشا سو گیا۔ دو گھنٹے بعد صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تو وہ خود ہی اٹھ گیا۔ "تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔"

"سونے کا وقت نہیں ہے۔" صمد پاشا نے اونٹ کو کھولا۔ "ہمیں بہرصورت آج سیوا یا کسی آبادی تک پہنچنا ہے ورنہ کل کے لیے ہمارے پاس پانی نہیں ہوگا۔"

پانی کا ایک مشکیزہ نصف سے زیادہ خالی تھا۔ صرف دوسرے میں پورا پانی تھا۔ کفایت شعاری کے باوجود ایک مشکیزہ دوپہر تک خالی چکا تھا اور اس کا بیشتر پانی میریا نے پیا تھا۔ صمد پاشا صرف اپنا حلق تر کرتا رہا تھا۔ دوپہر کے بعد تو گرمی قیامت خیز ہو گئی تھی۔ میریا بار بار پانی مانگ رہی تھی۔ اس سے پیاس برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ جب مشکیزہ نصف رہ گیا تو صمد پاشا نے مزید پانی دینے سے انکار کر دیا۔ "اس طرح یہ پانی شام تک ختم ہو جائے گا۔ ابھی برداشت کرو، ہم یہ پانی شام کو پی سکتے ہیں اس وقت یہ ہماری جان بچائے گا۔"

ایک گھنٹے بعد میریا اس سے پانی کے لیے التجائیں کرنے لگی اور دو گھنٹے بعد وہ اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ تین گھنٹے بعد اس میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ مزید دو گھنٹے بعد جب سورج غروب ہونے والا تھا اور صمد پاشا نے اونٹ روکا تو میریا نیم غشی کی کیفیت میں تھی۔ اسے احتیاط سے اتار کر چادر پر لٹایا اور پھر پیالے سے تھوڑا تھوڑا پانی اس کے منہ میں ٹپکانے لگا۔ پانی پیتے ہی میریا کے حواس تیزی سے بحال ہوئے تھے۔ ایک پیالہ پی کر وہ پھر سے جی اٹھی تھی۔ دن میں اس نے ایسے کتنے ہی پیالے ختم کر دیے تھے اور اس کی پیاس جیسے مزید بھڑک جاتی تھی لیکن شام کے وقت اسی پانی نے جادو اثر کیا تھا۔ وہ پورے دن میں پہلی بار مسکرائی۔ "میں ایک بار پھر تمہاری شکر گزار ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے میں نے سختی سے کام لیا لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ..." اس نے مشکیزہ دکھایا۔ "خالی ہو چکا ہوتا۔"

اب بھی مشکیزے میں صرف تہائی پانی باقی رہ گیا تھا اور یہ زیادہ سے زیادہ صبح تک چل سکتا تھا اس کے بعد انہیں صحرا میں دن کی گرمی اور پیاس کا سامنا کرنا پڑتا۔ میریا یہ سوچ کر ہی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ پیاس کی وجہ سے اسے خیال نہیں آیا تھا۔ "صمد! ہم سیوا نہیں پہنچے؟"

صمد پاشا نے سر ہلایا۔ "صرف سیوا ہی نہیں ہم راستہ بھی کھو چکے ہیں۔ اگر ہم صحیح سمت میں سفر کر رہے ہوتے تو اب تک سیوا جانے والا راستہ آ جانا چاہیے تھا۔"

یہ ایک خوفناک خبر تھی۔ اس کا مطلب تھا ان کے کسی آبادی تک پہنچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ "اب کیا ہو گا... کیا ہم مر جائیں گے؟"

"میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔" صمد پاشا نے پختہ لہجے میں کہا۔ "اگر ہماری موت نہیں آئی ہے تو وہ خود ہماری مدد کرے گا۔ اگر موت آ گئی ہے تو کوئی بچا نہیں سکے گا۔"

زندگی و موت کا یہ سادہ سا فلسفہ میریا کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، اس لیے وہ بہ دستور خوفزدہ تھی اور اس پیاس کا سوچ کر ہی اس کی حالت خراب ہو گئی تھی جو اسے دن کے کچھ حصے میں برداشت کرنا پڑی تھی۔ اس رات انہوں نے سفر کرنے سے گریز کیا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا وہ صحرا کے نامعلوم حصے میں تھے اور انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ ان کی حرکت انہیں زندگی یا موت میں سے کس طرف لے جائے گی۔ رات میں بھٹکنے کے امکانات زیادہ تھے۔ صمد پاشا کے خیال میں گزشتہ رات سفر کے دوران میں اس سے کہیں غلطی ہوئی تھی اور وہ سیوا کی طرف جانے والے راستے سے گزر گئے تھے۔ دن میں وہ یہ غلطی نہ کرتے لیکن اب وہ غلطی کر

چکا تھا اور صرف اس کا خمیازہ بھگتنا باقی رہ گیا تھا۔

صمد پاشا ساکت بیٹھا تھا۔ میریا سرک کر اس کے پاس آئی اور اپنا سر اس کے شانے سے لگا دیا۔ "تم بہت عجیب آدمی ہو۔"

"میں ایک عام آدمی ہوں۔"

"نہیں تم عجیب آدمی ہو۔" میریا نے اصرار کیا۔ "تم اتنی دیر سے میرے ساتھ اکیلے ہو اور تم نے ایک بار بھی میری طرف توجہ نہیں دی۔"

"میریا، اس وقت ہم مشکل میں ہیں۔"

میریا نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ "تم نے ایک حد سے زیادہ تجسس بھی نہیں کیا جیسے تم میرے بارے میں سب جانتے ہو یا پھر تمہیں جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"یہ دونوں باتیں غلط ہیں، میں تمہارے بارے میں سب نہیں جانتا اور تم میں دلچسپی بھی رکھتا ہوں۔"

"پھر تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میرا اصل مقصد کیا ہے؟"

"میں نے ضروری نہیں سمجھا۔" صمد پاشا نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں اور تم جس کھیل کا حصہ ہیں اس میں ہمارا کردار بہت چھوٹا اور معمولی سا ہے۔ ہم اس کھیل کو روک نہیں سکتے اور نہ کوئی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ ہم صرف وہ کر سکتے ہیں جو ہمیں کرنا چاہیے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میریا نے سرد آہ بھری۔ "نہیں تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن زندگی کے اس موڑ پر جب مجھے موت سامنے نظر آ رہی ہے میرا دل چاہ رہا ہے میں تمہارے سامنے ایک اعتراف..."

"کوئی اعتراف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" صمد پاشا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میریا! میں نے کہا نا، ہم اس کھیل کا بہت چھوٹا سا حصہ ہیں۔ اپنے منہ سے ایسی کوئی بات مت نکالو جس پر بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے۔"

میریا چپ رہی پھر کچھ دیر بعد کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم اس کھیل میں مہرے ہیں اور ہمیں کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس پر بعد میں پچھتانا پڑے۔"

رات رفتہ رفتہ گزرتی رہی، میریا تھک گئی تو لیٹ گئی لیکن نیند کہاں تھی، صمد پاشا لیٹا بھی نہیں، کبھی کبھی وہ اٹھ کر آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو اس نے میریا کو اٹھایا۔ "ہمیں چلنا چاہیے، اس سے پہلے کہ دن پوری طرح نکل آئے اور گرمی و پیاس ناقابل برداشت ہو جائے۔"

میریا بے دلی سے اٹھ گئی۔ انہوں نے چھواروں کے ساتھ تھوڑے پانی سے ناشتا کیا اور روانہ ہو گئے۔ سورج نکلتے ہی قیامت خیز گرمی کا آغاز ہو گیا تھا۔ صمد پاشا پانی کے استعمال میں بہت محتاط تھا۔ میریا شروع میں بوکھلا گئی تھی اور اس کے منہ سے پانی کے سوا کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا لیکن وہ اس کے دس بار مانگنے پر اسے صرف ایک گھونٹ پانی دیتا تھا۔ یہ ایک گھونٹ ہی میریا کے لیے زندگی کا سہارا تھا۔ جب پیاس سے اس کی جان لبوں پر آ جاتی اور اسے لگتا کہ اب وہ مرنے والی ہے تب یہ ایک گھونٹ اسے پھر سے جینے پر مجبور کر دیتا تھا۔ خود صمد پاشا شدید ترین پیاس کے باوجود پانی پینے سے گریز کر رہا تھا۔ دوپہر تک اس نے مشکل سے دو بار ایک گھونٹ پانی لیا تھا اور اس کے باوجود مشکیزہ تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ دوپہر کے بعد اس نے میریا کو بھی پانی دینا ترک کر دیا۔ اب اسے سفر سے زیادہ کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں وہ اس قیامت خیز گرمی میں دھوپ سے بچ سکیں۔ بالآخر اسے ایک چٹان مل گئی جس کا چھجا سا باہر نکلا تھا اور اس کا رخ مشرق کی طرف تھا، چھجے کے نیچے سایا آ چکا تھا۔

صمد پاشا نے چٹان کے نیچے ریت ہٹائی اور ایک غار بنا لیا پھر اس نے بے سدھ میریا کو اونٹ سے اتار کر اس غار میں لٹا دیا۔ یہاں گرمی کی شدت کسی قدر کم تھی۔ اونٹ کو چٹان سے باندھ کر وہ خود بھی اس غار میں گھس آیا اور ریت سامنے کر لی تاکہ باہر کی گرمی کم سے کم آئے۔ چٹان نیچے سے ٹھنڈی تھی اور میریا کچھ دیر میں ہوش میں آ گئی۔ "ہم کہاں ہیں؟"

"ایک چٹان کے نیچے ہیں۔" صمد پاشا نے بتایا۔ "ہمیں شام تک کا وقت یہیں گزارنا ہے۔"

"اس کے بعد۔" میریا تلخی سے بولی۔ "موت تو پھر بھی مقدر ہے۔"

"ہم ابھی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔" وہ اپنے ذہن پر چھاتی غنودگی سے لڑتے ہوئے بولا۔ "ہمارے پاس بس چند گھونٹ پانی ہے اگر ابھی پی لیا تو پھر کچھ نہیں رہے گا یہ پانی شام کو ہمیں کم سے کم ایک رات زندہ رہنے کی مہلت دلوا سکتا ہے۔"

"اس کے بعد...؟"

میریا کے اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ویسے بھی پانی کی کمی اس پر اثر انداز ہو رہی تھی اور پھر کوشش کے باوجود اسے ہوش نہیں رہا۔ اسے پتا نہیں چلا کہ وقت کس طرح گزرتا چلا گیا اور کب دن ڈھل کر شام میں بدل گیا۔ اچانک اس کے منہ میں ٹھنڈے میٹھے پانی کے قطرے آئے تو وہ بے تابی سے انہیں چوسنے لگا۔ رفتہ رفتہ ان قطروں کی مقدار بڑھتی گئی۔ پھر اسے ہوش آ گیا تب اس

نے دیکھا وہ کھلی جگہ صحرا کی ٹھنڈی ہوتی ریت پر لیٹا تھا اور میریا پیالے سے تھوڑا تھوڑا پانی اسے دے رہی تھی۔ ناقابلِ یقین...... پانی تو ختم ہوگیا تھا تو پھر یہ پیالہ بھر کر پانی کہاں سے آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ میریا سے کوئی سوال کرتا، اس نے آہستہ سے کہا۔

''کوئی بات مت کرنا...''

تب صمد پاشا نے دیکھا نزدیک ہی خیمہ لگا تھا۔ اونٹ اور ان کے آس پاس چند مقامی افراد موجود تھے۔ ''یہ کون ہیں؟''

''گورڈن کے ساتھی۔''

صمد پاشا کے لیے یہ بات پانی سے زیادہ ناقابلِ یقین تھی، وہ اٹھ بیٹھا۔ ''سر گورڈن... وہ یہاں کہاں؟''

''میں نہیں جانتی... لیکن جب شام ہوئی تو میں نے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز سنی اور پھر چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو یہ لوگ جا رہے تھے، میں نے انہیں متوجہ کیا تو یہ اس طرف آگئے تب میں نے ان کے ساتھ گورڈن کو دیکھا۔ وہ بہت کمزور ہوگیا ہے اور اس نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا ہے۔''

''تم انجان بن جانا۔'' صمد پاشا نے کہا۔ ''اس کے سامنے کوئی اقرار مت کرنا۔ میں تمہارا رہنما ہوں، پولیس چیف نہیں ہوں۔''

''یہی میں تم سے کہنے والی تھی۔ اس کے سامنے ہمارے درمیان ہونے والی کسی بات کا ذکر مت کرنا۔''

ایک پیالے پانی نے صمد پاشا کی توانائی بحال کردی تھی۔ وہ کھڑا ہوا اور خیمے کی طرف بڑھا لیکن ایک بدو محافظ نے اسے روک دیا۔ ''تم اندر نہیں جاسکتے ہو۔''

بدو کی زبان بتا رہی تھی کہ اس کا تعلق مغربی وسطی قبائل سے تھا اور یہی قبائل مصر کی مقامی حکومت کا دردِ سر تھے۔ صمد پاشا نے ممکن حد تک مقامی لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے آقا کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

''جب وہ باہر آئیں تو کردینا۔'' بدو نے خشک لہجے میں کہا۔

میریا پانی کا مشکیزہ اور پیالہ باہر رکھ کر خیمے میں چلی گئی تھی۔ وہ اسمتھ گورڈن کی بیوی تھی اور اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ صمد پاشا نے اس اجڈ بدو کے بجائے ایک دوسرے شخص سے بات کی اور بالآخر وہ جان گیا کہ یہ لوگ شمال مشرق کی طرف جا رہے تھے۔ بدو نے منزل کا نہیں بتایا تھا لیکن ظاہر ہے ان کی منزل اسکندریہ یا قاہرہ تھی۔ قافلے میں چھ افراد تھے، ایک اسمتھ گورڈن اور پانچ اس کے یہ بدو ملازم تھے۔ وہ تمام مسلح تھے اور اپنی صورتوں سے چھٹے ہوئے قاتل نظر آتے تھے۔ صمد پاشا نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ اسمتھ گورڈن کے حکم پر اپنی جان بھی دے سکتے تھے اور کسی کی جان لے بھی سکتے تھے۔ تاریکی ہوئی تو انہوں نے مشعلیں جلا لی تھیں۔ کچھ دیر بعد اسمتھ گورڈن اندر سے برآمد ہوا۔ اس نے صمد پاشا سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ''میں شکر گزار ہوں کہ تم نے صحرا میں میری بیوی کا خیال رکھا اور اس کی حفاظت کی۔''

''یہ میرا فرض تھا جناب۔'' صمد پاشا نے یوں کہا جیسے اسے بس معمولی سی انگریزی آتی ہو۔ اسمتھ گورڈن اس کی توقع سے زیادہ معمر اور کمزور جثے والا شخص تھا۔ شاید اس سفر نے اسے نڈھال کردیا تھا، اس کے چہرے پر جھریاں گہری ہو رہی تھیں اور بال سفید ہوچکے تھے۔ وہ کسی طرح بھی جوان اور حسین میریا کے قابل نہیں تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ اس کا شوہر تھا۔

''میریا تمہاری بہت تعریف کر رہی ہے۔'' اسمتھ گورڈن نے اسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا لیکن صمد پاشا نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا تھا۔

''یہ مادام کی اعلیٰ ظرفی ہے۔''

''کل ہمیں قاہرہ کی طرف جانا ہے۔ کیا تم رہنمائی کر سکتے ہو؟''

''درحقیقت ہم خود بھٹک گئے ہیں۔'' صمد پاشا نے صاف گوئی سے کہا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ میں صحرا کے کس حصے میں ہوں تو پھر میں رہنمائی کرسکتا ہوں۔''

''ہمارا رہنما الشالمی ہے۔'' اسمتھ گورڈن نے ایک بڑی عمر کے بدو کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ تمہیں بتا سکے گا۔''

صمد پاشا نے الشالمی سے بات کی۔ پھر اس کے اور اپنے نقشوں کی مدد سے وہ جان گیا کہ اس وقت وہ کہاں تھے اور انہیں قاہرہ تک جانے کے لیے کس سمت سفر کرنا ہوگا۔ وہ سیوا سے جنوب مغرب میں تھے اور صمد پاشا حیران تھا کہ آندھی کے دوران وہ اتنا دور نکل گئے تھے کہ دو دن سفر کرنے کے باوجود صحیح راستے پر نہیں آسکے تھے۔ اس نے اسمتھ گورڈن سے کہا کہ اب وہ اس کی رہنمائی کرسکتا ہے تو اس نے اپنے بدو ملازموں کو اسی وقت فارغ کردیا۔ وہ ان کا معاوضہ پہلے ہی دے چکا تھا اور اس نے ان سے کہا کہ اب اسے ان کی ضرورت نہیں ہے اس لیے وہ جاسکتے ہیں۔ بدو بھی خوش تھے، معاوضہ انہیں قاہرہ تک لے جانے کا ملا تھا اور اب وہ درمیان سے واپس جا رہے تھے۔ انہوں نے فوری رختِ سفر باندھا اور چل پڑے۔ صمد پاشا نے محسوس کیا کہ اسمتھ گورڈن نہیں چاہتا تھا کہ بدو مزید یہاں رکیں اور صمد پاشا ان سے مزید گفتگو کرسکے۔ درحقیقت اسے افسوس تھا کہ وہ بدوؤں سے بات نہیں کرسکا تھا ورنہ وہ ان سے بہت کچھ معلوم کرسکتا تھا اور اسمتھ گورڈن یہ نہیں چاہتا تھا۔

کھانے کے لیے اسمتھ گورڈن کے پاس خشک کیا ہوا گوشت اور چنے تھے۔ انہوں نے رات کا کھانا کھایا اور پھر مسٹر اینڈ مسز گورڈن خیمے میں چلے گئے۔ صمد پاشا الاؤ کے پاس بیٹھا تھا اور اس نے خیمے میں جام و سبو کھنکنے کی آوازیں سنیں۔ رات گزرتی رہی اور خیمے سے آنے والی آوازیں ساکت ہوگئیں۔ وہ سو چکے تھے۔ مگر نہیں، صرف اسمتھ گورڈن سویا تھا، خیمے کا پردہ ہٹا اور میریا باہر آگئی۔ اس کی آنکھوں میں خمار تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ صمد پاشا کے پاس آبیٹھی اور جب اس نے پیش قدمی کی تو صمد پاشا چاہنے کے باوجود مزاحمت نہیں کرسکا۔ جب طوفان آکر گزر گیا تو میریا فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی اور صمد پاشا کے چہرے پر ندامت تھی۔ اس نے میریا سے کہا۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا۔''

''ہوسکتا ہے۔'' میریا بے پروائی سے بولی۔ ''یہ بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟''

''میں اسے قاہرہ لے جاؤں گا اور پھر یہ گرفتار کرلیا جائے گا۔''

''اس کے بعد؟''

''اس سے تفتیش ہوگی اور پھر ممکن ہے اسے لٹکا دیا جائے یا ہمیشہ کے لیے جیل ڈال دیا جائے...''

''یا رہا کردیا جائے۔'' میریا نے بات مکمل کی۔

''اس کا بھی امکان ہے۔''

میریا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اٹھ کر خیمے کی طرف بڑھ گئی۔ صمد پاشا کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسے پتا نہیں چلا کہ کب وہ سو گیا اور پھر اس کی آنکھ روشنی سے نہیں بلکہ فائر کی آواز سے کھلی تھی۔ وہ چونک کر اٹھا۔ خیمے کی طرف خاموشی تھی لیکن کچھ دور میریا کھڑی تھی۔ صمد پاشا اس کی طرف بڑھا اور جب وہ نزدیک پہنچا تو اس نے گڑھے میں پڑی اسمتھ گورڈن کی لاش دیکھی۔ گولی اس کے سر کے عقبی حصے میں لگی تھی اور وہ فوراً مر گیا تھا۔ جس ریوالور سے گولی نکلی تھی وہ میریا کے ہاتھ میں تھا اور اس سے اب بھی دھواں خارج ہو رہا تھا۔ میریا نے صمد پاشا کی طرف دیکھا۔ ''میں نے رہائی حاصل کرلی ہے۔''

صمد پاشا نے ہاتھ بڑھایا تو میریا نے بغیر مزاحمت کے ریوالور اس کے حوالے کردیا۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا کہ اب اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ صمد پاشا کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اسمتھ گورڈن گم شدہ ہے اور گم شدہ ہی رہے گا۔''

سورج طلوع ہونے سے پہلے اسمتھ گورڈن کی لاش ہمیشہ کے لیے اسی گڑھے میں دفن ہوچکی تھی اور جب سورج طلوع ہوا تو وہ روانگی کے لیے تیار تھے۔

☆☆☆

لیڈی گورڈن کا استقبال خود سیکریٹری خارجہ نے کیا تھا۔ وہ اہتمام سے آئی تھی۔ سیکریٹری خارجہ نے اسے کرسی پیش کی اور کہا۔ ''میں پہلے خوش خبری سنا دوں، حکومت نے آپ کو لارڈ اسمتھ گورڈن کا وارث مقرر کیا ہے اور اب اس کی جاگیر و دولت آپ کی ملکیت ہے۔''

''میں اس کے لیے ملکۂ معظمہ کی شکر گزار ہوں۔'' میریا نے کہا اور ایک چرمی جلد والی ڈائری سیکریٹری خارجہ کے سامنے رکھ دی۔ ''ایک تحفہ میں بھی لائی ہوں۔''

سیکریٹری خارجہ نے ڈائری اٹھائی اور اس کے مندرجات دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر جوش کے آثار تھے۔ یہ لارڈ گورڈن کی ڈائری تھی۔ کچھ دیر بعد سیکریٹری خارجہ نے کہا۔ ''واقعی یہ ایک تحفہ ہے... تاجِ برطانیہ آپ کی ان خدمات کو یاد رکھے گا۔''

''یہ میرا فرض تھا۔'' میریا نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔ سیکریٹری خارجہ اسے بگھی تک چھوڑنے آیا تھا۔ بگھی چلی تو میریا نے گہری سانس لی اور خود سے بولی۔ ''ایسا فرض جسے میں نے محبت قربان کر کے ادا کیا۔''

صمد پاشا کو علم نہیں ہوا تھا کہ میریا نے اسمتھ گورڈن کے سامان سے اس کی ڈائری نکال کر چھپا لی تھی اور یہی ڈائری اس نے سیکریٹری خارجہ کو پیش کی تھی۔ لارڈ گورڈن جس کام سے مصر گیا تھا، اپنی موت سے پہلے اس نے وہ کام کرلیا تھا۔ اس کی مکمل تفصیل ڈائری میں موجود تھی۔ میریا جانتی تھی کچھ عرصے بعد مصر پر برطانیہ کا قبضہ ہوگا اور ترکوں کو وہاں سے نکلنا ہوگا۔ اسے امید تھی کہ صمد پاشا زندہ سلامت رہے گا۔ صمد پاشا کا خیال جگنو بن کر اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا تھا پھر بگھی اس کی عالی شان حویلی میں رکی تو اس نے جلدی سے ان جگنوؤں کو آنکھوں سے جھٹک دیا۔

ہمارے اردگرد ایک بازی گر ہمیشہ موجود رہتا ہے اور کبھی کبھی تو ہمارے اندر ہی کہیں چھپا ہوتا ہے جو اکثر ہمیں جھوٹے خواب اور خوشگوار لمحات کا یقین دلاتا رہتا ہے... جس کے سہارے کچھ وقت واقعی بہت یادگار بھی گزرتا ہے مگر... بالآخر گزر جاتا ہے... وقت کی ایک یہی ادا بہت خوب ہے کہ کبھی ٹھہرتا نہیں۔ خواہ کسی پر جو بھی گزر جائے... لیکن گزرتے لمحوں کا حساب اگر کوئی وکیل کرنے بیٹھ جائے تو سارا جمع جُڑا سامنے آجاتا ہے... سارے کھاتے کھل جاتے ہیں۔

بیتے دنوں کی فہرست تیار کرنے والے بیگ صاحب کا دلچسپ انداز

موسم کے تیور صبح ہی سے خاصے خطرناک نظر آرہے تھے۔ آسمان گویا آگ برسا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، سورج سوا نیزے پر اتر آیا ہو۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے ماہِ مئی کو اتنا جھلسا دینے والا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں عدالتی مصروفیات کو نمٹانے کے بعد اپنے آفس پہنچا تو میری سیکریٹری شبانہ نے انٹر کام پر بتایا۔

''سر! مسز فرزانہ کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''کیا تم اس خاتون کا ذکر کر رہی ہو جو ویٹنگ روم میں بیٹھی ہیں؟''

''جی سر...... وہی۔'' شبانہ نے جلدی سے اثبات میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ ''انہیں میرے پاس بھیج دو......''

جب میں اپنے آفس میں داخل ہوا تھا تو چیمبر کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے ایک خاتون کو انتظار گاہ میں بیٹھے دیکھا تھا۔ یقیناً یہی خاتون مسز فرزانہ تھیں۔

کسی سیانے نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ موت اور گاہک کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ یہ کسی وقت اور کہیں سے بھی وارد ہو سکتے ہیں۔ سو، میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے کلائنٹس کا بھی کوئی بھروسا نہیں تھا۔ کبھی تو ویٹنگ روم میں بہ قول کسے، تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی، کبھی اِکا دُکا کلائنٹس بیٹھے دکھائی دیتے تھے اور کبھی یہی انتظار گاہ بھائیں بھائیں کرتی نظر آتی۔ بہرحال، کلائنٹ، گاہک اور مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور خدا کب، کس پر، کتنا مہربان ہو جائے اس بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد فرزانہ نامی وہ عورت میرے سامنے موجود تھی۔

میں نے اس کی عمر کا اندازہ تیس کے آس پاس قائم کیا۔ وہ متناسب بدن کی مالک ایک دراز قامت عورت تھی۔

اسے انتہائی خوب صورت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ بہرحال، وہ مناسب خدوخال کی مالک اور خوش شکل عورت تھی۔ وہ خاصی پریشان نظر آتی تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور خالصتاً پیشہ ورانہ لہجے میں پوچھا۔ ''جی فرمائیے...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''میرا نام فرزانہ ہے۔'' وہ اضطراری لہجے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ ''آپ کس قسم کے وکیل ہیں؟''

اس کا یہ سوال مجھے بڑا عجیب سا لگا تاہم میرے تجربے میں یہ آیا تھا کہ آپ کے سامنے بیٹھا ہوا کلائنٹ کسی وقت کوئی بھی سوال کرسکتا تھا اور اس کی پریشانی یا ضرورت کے پیشِ نظر آپ کو اس کے سوال کا کوئی نہ کوئی جواب بھی لازماً دینا پڑتا ہے۔ سو، میں نے مسز فرزانہ کے استفسار کے جواب میں الٹا اسی سے پوچھ لیا۔

''آپ کی نظر میں وکلا کی کتنی اقسام ہوتی ہیں......؟''

میرے لہجے کی سنجیدگی کے پیشِ نظر وہ جھینپ گئی، جلدی سے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''جی...... وہ میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کس قسم کے کیس ڈیل کرتے ہیں؟''

''ہر قسم کے......!'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا ''آپ کو کس قسم کا کیس کروانا ہے؟''

''نجات کا کیس...... جان چھڑانے کا کیس۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

''میں کچھ سمجھا نہیں فرزانہ صاحبہ!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کس سے جان چھڑانا چاہتی ہیں؟''

''عباسی سے!''

''کون عباسی؟'' میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

''مسعود عباسی۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ مسعود عباسی کی کیا ہیں؟'' میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''اور جان چھڑانے کے اسباب کیا ہیں......؟''

مسز فرزانہ نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں مجھے بتایا کہ مسعود عباسی اس کا شوہر تھا۔ ان دونوں کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اس مختصر سے عرصے کے دوران میں فرزانہ کو مسعود عباسی سے شدید نفرت ہوگئی تھی۔ بات کے اختتام پر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''میں عباسی سے طلاق لینا چاہتی ہوں......!''

میں نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''گویا آپ مسعود عباسی سے خلع حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟''

''طلاق ہو یا خلع......'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''ایک ہی بات ہے۔''

''ایک بات نہیں ہے فرزانہ صاحبہ!'' میں نے اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں بڑا فرق ہے۔''

''مثلاً...... کیا فرق ہے؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''جب کوئی مرد اپنی شریکِ حیات سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اسے اپنی زندگی سے نکالنے کا پختہ ارادہ کرلیتا ہے تو اس کے فیصلے کو 'طلاق' کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی عورت اپنے شریکِ حیات سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیتی ہے تو وہ عدالت کے ذریعے اپنے شوہر سے خلع کا مطالبہ کرتی ہے......'' میں نے لمحے بھر کو متوقف ہوکر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں، آپ کا معاملہ خلع کا ہے......!''

''جی، آپ قانون کے ماہر ہیں۔ مجھ سے زیادہ ہی جانتے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس سے مطلب نہیں ہے کہ میرا کیس طلاق کے زمرے میں آتا ہے یا خلع کے خانے میں فٹ ہوتا ہے۔ میں تو بس اس کمینے عباسی سے نجات چاہتی ہوں۔''

''بے شک! آپ کا فوکس ''نجات'' پر ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن جب آپ مجھے اپنا وکیل مقرر کررہی ہیں تو میرا یہ فرض بنتا ہے کہ خلع اور طلاق کے حوالے سے ایک اہم قانونی نکتے سے آپ کو آگاہ کردوں۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوکر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''جب کوئی عورت اپنے شوہر سے الگ ہونے کے لیے عدالت کے ذریعے خلع کا مطالبہ کرتی ہے تو اسے حق مہر اور بعض دوسری مراعات جو طلاق کی صورت میں اسے حاصل ہوتی ہیں، ان سے محروم ہونا پڑتا ہے......''

''مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے...... سوائے نجات کے!''

''آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟'' میں نے پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے پوچھا۔

اس کی جانب سے جواب آیا۔ ''لگ بھگ ڈیڑھ سال......''

''بچے وغیرہ......؟''

''اللہ کا شکر ہے وکیل صاحب......!'' وہ ایک آسودہ

سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''عباسی سے ابھی تک میری کوئی اولاد نہیں ہے......''

انسان بھی بڑی عجیب وغریب مشین ہے۔ جب بے اولاد ہوتا ہے تو صاحب اولاد بننے کے لیے سو سو جتن کرتا ہے۔ ڈاکٹری علاج کے علاوہ پیروں فقیروں، ٹونکے بازوں اور طرح طرح کی راہیں بجھانے والوں کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی مراد کے لیے منت، خوشامد اور التجائیں کرتا ہے اور کبھی...... اس کی اولاد نہیں ہوتی تو وہ اپنی اس محرومی پر اللہ کا شکر ادا کرتا بھی دکھائی دیتا ہے جیسا کہ فرزانہ کررہی تھی۔ بہرحال، زندگی کی کہانی بھی کسی پہیلی کے مانند ہے۔ دعوے کے ساتھ کسی انسان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بس، اپنے اپنے عذاب کی بات ہے!

فرزانہ نے اولاد نہ ہونے کے سلسلے میں جو ترت اللہ کا شکر ادا کیا تھا تو اس خوش گوار بیزاری کے پیچھے اس کے وہ تلخ حالات تھے جن سے چھٹکارے کے لیے وہ میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اس کے جواب پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہ جانا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ مجھے ان حالات سے تفصیلاً آگاہ کریں جن کی روشنی میں آپ خلع حاصل کرنے پر مجبور ہوئی ہیں اور یہ مجبوری آپ کو میرے پاس لے آئی ہے......''

''حالات کی روشنی میں...... نہ کہیں وکیل صاحب!'' وہ قدرے ترش لہجے میں بولی۔ ''میں جو کچھ بھی چاہ رہی ہوں، وہ میرے گھریلو حالات کی تاریکی میں ترتیب پایا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''اب آپ اپنے انہی گھریلو حالات سے مجھے بھی آگاہ کردیں۔''

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور شروع ہوگئی......!

فرزانہ کی زبانی جو حالات مجھ تک پہنچے، میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہوجائیں اور دورانِ سماعت میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

فرزانہ کا باپ اشفاق احمد لگ بھگ پانچ سال پہلے اس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل ہوگیا تھا۔ اس کی موت حرکت قلب بند ہوجانے سے واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست آفتاب حسین کے ساتھ مل کر پراپرٹی کا بزنس کرتا تھا۔ پارٹنر آفتاب نے نہایت ہی صفائی کے ساتھ اسے دھوکا دیا اور کم وبیش آٹھ لاکھ کی رقم خرد برد کرکے کہیں غائب ہوگیا۔ آج سے چالیس سال پہلے آٹھ لاکھ بہت بڑی رقم شمار ہوتی تھی۔ آپ آج کل کے لگ بھگ ایک کروڑ روپے سمجھ لیں۔ اشفاق یہ جھٹکا برداشت نہ کرسکا اور دل کی دغا پر وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا تھا۔

☆☆☆

فرزانہ اپنی والدہ اور بہن بھائی کے ساتھ فیڈرل بی ایریا کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی (عباسی سے، اس کی شادی سے پہلے) جیسا کہ میں اوپر بتاچکا ہوں کہ اس کے والد کا انتقال ہارٹ اٹیک سے ہوا تھا۔ فرزانہ سے چھوٹی ایک بہن ندرت اور ایک بھائی عرفان تھا۔ عرفان اس وقت میٹرک میں تھا۔ ندرت نے پچھلے سال اپنا گریجویشن مکمل کرلیا تھا اور اب ایک پرائیویٹ کمپنی میں بہ طور ٹائپسٹ جاب کررہی تھی۔

جب تک اشفاق احمد زندہ تھا، گھر کے کسی فرد کو روزگار کے سلسلے میں پریشان ہونے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ پراپرٹی کا کام ماشاءاللہ ایسی خوبی کے ساتھ چل رہا تھا کہ گھر میں کوئی مالی مسئلہ نہیں تھا۔ اسی پراپرٹی کے بزنس سے اس نے اپنا ذاتی گھر بھی بنالیا تھا۔

اشفاق کے انتقال کے بعد فرزانہ کی والدہ روحی بانو کو فکر ہوئی کہ اب گھر کا معاشی نظام کیسے چلے گا۔ اشفاق نے جس آفس میں پراپرٹی کا بزنس جمارکھا تھا وہ کرائے کا تھا۔ بس، وہاں کا فرنیچر وغیرہ اشفاق کی ذاتی ملکیت تھا۔ آفتاب نقدی کی صورت میں سب کچھ سمیٹ کر فرار ہوچکا تھا۔ اس ''لٹی پٹی'' دکان کو چلانا روحی بانو کے بس میں تھا اور نہ فرزانہ کو اس کام کا کوئی تجربہ تھا لہٰذا گھریلو معیشت کی گاڑی کو دھکا دینے کے لیے فرزانہ کو گھر سے باہر قدم رکھنا پڑا۔ باہر تو وہ پہلے بھی آتی جاتی تھی، یہ اقدام روزگار کے حصول کی خاطر تھا!

وہ ایم۔اے مکمل کرچکی تھی لہٰذا تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے ایک انشورنس کمپنی کے کلیم ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت مل گئی۔ مسعود عباسی سے اس کی پہلی ملاقات اسی کمپنی کے آفس میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے کسی دوست کے کلیم کیس کے سلسلے میں انشورنس کمپنی کے مذکورہ دفتر کے چکر کاٹتا رہتا تھا۔ اس کا دوست چونکہ انگوٹھا ٹیک اور شہری ماحول سے قطعی نابلد تھا لہٰذا عباسی اس کی راہنمائی اور مدد کے لیے ساتھ چلا آتا تھا۔ اس شخص کو کلیم حاصل کرنے میں کتنا وقت لگا اور اس دوران میں کون کون سے مراحل سے گزرنا پڑا یہ ایک الگ داستان ہے اور اس کا زیرِ نظر کہانی سے براہ راست کوئی تعلق

نہیں بنتا لہٰذا میں اس کی تفصیل میں جائے بغیر اہم واقعات کی طرف آتا ہوں اور ان واقعات میں سب سے خاص نکتہ یہ تھا کہ پانچ چھ ماہ کے اس عرصے میں فرزانہ اور مسعود عباسی کے درمیان اچھی خاصی شناسائی پیدا ہوگئی تھی۔ عباسی نے مختلف مواقع پر تھوڑا تھوڑا کر کے اسے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا اور ظاہر ہے، اگر بہت نہیں تو کم کم فرزانہ نے بھی اسے اپنے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔

فرزانہ کے مطابق، مسعود عباسی محراب پور کا رہنے والا تھا۔ اس کی فیملی کے باقی تمام افراد ادھر محراب پور ہی میں تھے۔ وہ کراچی میں اکیلا تھا یعنی دوست تو بہت تھے مگر کوئی قریبی رشتے دار یہاں موجود نہیں تھا۔ بہ قول عباسی، پیشے کے اعتبار سے وہ ایک وکیل تھا اور طارق روڈ کے کمرشل ایریا میں کرایے کے ایک فلیٹ میں اس کی رہائش تھی۔

فرزانہ نے مجھے بتایا کہ اس دوران میں عباسی دو تین مرتبہ اس کے گھر بھی آیا تھا اور اپنی باتوں سے اس نے روحی بانو پر ایسا جادو کیا کہ وہ تو اٹھتے بیٹھتے بس، اسی کا نام پکارنے لگی تھی۔ اس نوعیت کے تعلقات کا بالآخر جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، فرزانہ کے سلسلے میں بھی بالکل ویسا ہی ہوا۔ جب عباسی نے دیکھا کہ اس گھر میں اس کی خوب آؤ بھگت ہونے لگی ہے اور سب اس کی بات کو اہمیت دیتے ہیں تو اس نے اپنے من کی بات روحی بانو کے سامنے رکھ دی۔

''آنٹی......!'' ایک روز تنہائی میں اس نے روحی بانو سے کہا۔ ''آپ مجھے اپنا بیٹا بنا لیں......''

یہ کوئی ایسی پیچیدہ ''فرمائش'' نہیں تھی کہ روحی بانو کو سمجھنے کے لیے اپنی عقل کو امریکن بادام کھلانا پڑتے۔ وہ عباسی کی خواہش کو پوری تفصیل کے ساتھ سمجھ گئی تھی۔ اسے عباسی میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی سوائے اس کے کہ وہ عمر میں فرزانہ سے کم و بیش دس سال بڑا تھا اور یہ کوئی عیب نہیں تھا۔ علاوہ ازیں، وہ ایک پڑھا لکھا اور برسرِ روزگار شخص تھا۔ روحی بانو ایک ماں تھی اور اپنے فرائض کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اشفاق احمد کے انتقال کے بعد اسے ایک ماں ہی نہیں بلکہ باپ بن کر بھی اپنی اولاد کے معاملات کو دیکھنا تھا۔ اسے سب سے زیادہ فکر بیٹیوں کی شادی کی تھی۔ عرفان کے بارے میں تو وہ کہا کرتی تھی، یہ مرد ہے۔ میں زندہ نہ بھی رہی تو یہ خود ہی اپنی شادی کے معاملے کو دیکھ لے گا۔ بس، میری خواہش ہے کہ آنکھ بند ہونے سے پہلے میں فرزانہ اور ندرت کو ان کے گھر کا کر دوں۔

''عباسی صاحب!'' روحی بانو نے مسعود عباسی کی بات کے جواب میں کہا۔ ''مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت چاہیے۔''

''آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''پھر سوچنے والی کون سی بات ہے؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ آپ میرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں۔'' روحی بانو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن پھر بھی سوچنے اور سمجھنے والی بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔''

''مثلاً......؟'' عباسی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

روحی بانو نے کہا۔ ''مثلاً...... سب سے پہلے تو مجھے فرزانہ کی مرضی معلوم کرنا ہے۔ پھر آپ کے گھر والوں کی رضامندی اور شمولیت کو بھی یقینی بنانا ضروری ہے......!''

''ہوں!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہیں نا......؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' روحی بانو نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن میں نے جن امور کا ذکر کیا ہے وہ بھی بہت ضروری ہیں۔''

''میرے لیے تسلی کی بات یہ ہے کہ آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''باقی سب معاملات سے میں بہ خوبی نمٹ لوں گا اور...... مجھے یہ بھی یقین ہے کہ فرزانہ کو رضامند کرنے میں آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔''

''یہ تو ٹھیک ہے۔'' روحی بانو نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔ ''کیا آپ کے گھر والے اس شادی کے لیے تیار ہو جائیں گے؟''

''محراب پور والا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اپنے گھر والوں کو راضی کرنا میری ذمے داری ہے۔''

''اچھی بات ہے!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اگر تمام معاملات بہ خیر و خوبی طے پا جاتے ہیں تو پھر بھی میری دو شرائط ہوں گی......!''

''شرائط...... کیسی شرائط؟'' عباسی نے الجھن زدہ نظر سے روحی بانو کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میری پہلی شرط تو یہ ہے کہ شادی کے بعد فرزانہ کراچی ہی میں رہے گی۔ میرا مطلب ہے، آپ دونوں کو کراچی ہی میں رہائش اختیار کرنا ہوگی۔ محراب پور آنے جانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن

مستقلاً وہاں ڈیرا لگانے کے حق میں نہیں ہوں میں۔''

''میری اپنی بھی یہی خواہش ہے کہ شادی کے بعد کراچی ہی میں زندگی گزاروں۔'' وہ روحی بانو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لہٰذا آپ کو اس سلسلے میں تو فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں......'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اب آپ دوسری شرط بھی بتا دیں؟''

''دوسری شرط......'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہے کہ شادی کے بعد فرزانہ جاب نہیں کرے گی!''

''ہوں......!'' اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔ ''اس بات کا فیصلہ ہم فرزانہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر اس کی مرضی ہوگی تو جاب جاری رکھے گی اور اگر دل نہیں چاہے گا تو چھوڑ دے گی......''

آئندہ ایک ماہ تک عباسی اور گھر کے دیگر افراد کے بیچ مختلف قسم کے مذاکرات کا سلسلہ چلتا رہا، پھر سب کچھ طے پا گیا...... یہ طے ہو گیا کہ فرزانہ اور عباسی کی شادی ہو رہی ہے۔ فرزانہ اور روحی بانو کی رضامندی ہی کافی تھی۔ ندرت اور عرفان تو ہر معاملے میں ان کے ساتھ تھے۔ بالکل آخری مرحلے پر روحی بانو نے عباسی سے پوچھا۔

''آپ کے گھر والوں کی، شادی میں شرکت کس طرح ہوگی؟''

''پورا خاندان تو کراچی نہیں آسکے گا۔'' عباسی نے جواب دیا۔ ''میں اپنے والدین کو اور چند قریبی رشتے داروں کو یہاں بلا لوں گا۔''

روحی بانو، عباسی کی تجویز سے مطمئن ہوگئی حالانکہ اصولی طور پر اسے ان حالات سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ عباسی کے خاندان والوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ ان میں سے کسی ایک فرد سے بھی کبھی نہیں ملی تھی۔ شادی بیاہ کا معاملہ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہوتا۔ کم از کم شادی کی بات پکی کرنے سے پہلے عباسی کے والدین سے ایک دو ملاقاتیں کرنا بہت ضروری تھا لیکن روحی بانو نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ عباسی نے جو بھی کہا، اس نے آنکھیں بند کر کے بھروسا کر لیا تھا۔ یہی حال فرزانہ کا بھی تھا......!

طے شدہ پروگرام کے مطابق، فرزانہ اور عباسی کی شادی ہوگئی۔ عباسی کی طرف سے اندرونِ سندھ کے آٹھ دس خواتین و حضرات بھی اس شادی میں، عباسی کے قریبی رشتے داروں کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ سب کچھ امن و سکون سے انجام پایا اور فرزانہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر عباسی کے فلیٹ پر پہنچ گئی۔ اندرونِ سندھ سے آنے والے لوگ اسی روز واپس چلے گئے تھے۔ یہ حقیقت بہت بعد میں کھلی کہ وہ لوگ اندرونِ سندھ سے آئے تھے اور نہ ہی ان کی عباسی سے کسی قسم کی رشتے داری تھی۔

یہ تمام افراد کراچی کے رہائشی تھے جنہیں وہ خانہ پری کے لیے پکڑ لایا تھا۔ ان کا شمار عباسی کے جان پہچان والے لوگوں میں ہوتا تھا۔ جب یہ راز سامنے آیا، اس وقت تک پلوں کے نیچے اور اوپر سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔

یہ شادی کے ایک ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ فرزانہ نے اپنے آفس سے ایک ماہ کی چھٹی لے رکھی تھی جو اب ختم ہوگئی تھی۔ اس ایک ماہ کے دوران میں فرزانہ نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ آفس جا کر اس جاب کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دے گی لہٰذا جب عباسی نے اس سے ڈیوٹی کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

''کام آپ کرو گے اور میں صرف گھر سنبھالوں گی......!''

''ٹھیک ہے، مجھے تمہارے اس فیصلے پر کوئی اعتراض تو نہیں لیکن......!''

عباسی نے جملہ نامکمل چھوڑا تو فرزانہ نے جلدی سے کہا۔ ''لیکن کیا؟''

''لیکن یہ کہ......'' وہ بڑے محتاط الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم اس جاب کو جاری رکھتیں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ ہمارے گھر میں ایسے کون سے بکھیڑے ہیں جو تمہیں سنبھالنا پڑ رہے ہیں......'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''نہ ساس سسر ہیں، نہ دیور اور نندیں اور نہ ہی ابھی ہمارے بچے ہوئے ہیں جن کی خاطر تمہیں گھر کو وقت دینا پڑتا ہو......''

''اگر ابھی ہمارے بچے نہیں ہیں تو آخر ایک دن وہ ہو بھی جائیں گے۔'' فرزانہ نے کہا۔ ''لیکن مجھے تم سے ایک شکایت ہے عباسی!''

''کیسی شکایت؟'' عباسی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہماری شادی کو ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا

ہے لیکن ابھی تک تم مجھے محراب پور لے کر گئے ہو اور نہ ہی میری سسرال میں سے کوئی یہاں آیا ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات نہیں ہے؟'' فرزانہ نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''ہماری شادی کے موقعے پر آپ کی طرف سے جو لوگ شریک ہوئے تھے، میں تو اب ان کی شکلیں بھی بھول گئی ہوں۔ اس دن کے بعد سے تو انہوں نے کبھی پلٹ کر ہماری خبر ہی نہیں لی۔ مجھے اپنے سسرالی رشتے داروں کے بارے میں پتا تو ہونا چاہیے نا......!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں نے کسی خاص وجہ سے تمہیں اپنے گھر والوں سے دور رکھا ہوا ہے......''

''کہیں تمہارا اشارہ امی کی شرط کی طرف تو نہیں ہے......'' فرزانہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے عباسی کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔ ''وہ تو انہوں نے مستقل طور پر کراچی میں رہائش اختیار کرنے کی شرط لگائی تھی۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ آپ مجھے کبھی محراب پور لے کر ہی نہیں جائیں گے یا آپ کے گھر والوں میں سے کوئی یہاں نہیں آئے گا؟''

''ہوں......'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''تو پھر ہم کب چل رہے ہیں محراب پور؟'' فرزانہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں نے تو جاب چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا ہے اور تمہارے ساتھ نوکری والا کوئی بکھیڑا ہی نہیں۔ کیسوں کی تاریخیں آگے پیچھے کر کے دو چار دن کے لیے محراب پور جانے کا پروگرام بنا لونا......!''

''فرزانہ! یہ اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو......!''

''کیوں......'' وہ تعجب خیز لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''آخر مجھے بھی تو پتا چلے کہ ہمارے محراب پور جانے میں ایسی کون سی رکاوٹ حائل ہے......؟''

''میں بتا دوں گا......''

''کب؟''

''بہت جلد......'' عباسی جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''اس کا مطلب ہے، کوئی بات ہے ضرور۔'' وہ ٹٹولنے والے انداز میں بولی۔ ''جبھی تم نے کہا ہے کہ بعد میں بتاؤں گا؟''

''ہاں...... ایسا ہی سمجھ لو۔'' وہ گول مول انداز میں بولا۔

''اگر کوئی بات ہے تو ابھی بتانے میں کیا حرج ہے؟'' فرزانہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔ ''تمہیں بتانا پڑے گا عباسی۔ آج میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی......''

جب عباسی نے دیکھا کہ وہ کسی بھی طور ٹلنے والی نہیں تو گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''دیکھو فرزانہ! اگر میں تمہیں محراب پور لے گیا یا وہاں سے میرے گھر والے یہاں آنے لگے تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''گڑبڑ...... کیسی گڑبڑ؟'' فرزانہ نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے گھر والے ہماری شادی میں تو شریک تھے پھر ان کی آمد سے گڑبڑ کیوں ہوگی......؟''

''وہ بات یہ ہے فرزانہ کہ......'' وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تم سے اور تمہارے گھر والوں سے ایک بہت بڑی حقیقت چھپائی تھی۔ اگر ہم محراب پور گئے یا وہ لوگ یہاں آئے تو ایک قیامت برپا ہو جائے گی......''

''مگر تمہارے گھر والے تو ہماری شادی میں شرکت کر کے جا چکے ہیں......'' فرزانہ نے الجھن بھری نظروں سے عباسی کی طرف دیکھا۔ ''اب ان کے آنے میں کیا قباحت ہے؟''

''وہ لوگ میرے گھر والے اور دیگر رشتے دار نہیں تھے......!'' عباسی نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

''گھر والے نہیں تھے......؟'' فرزانہ چونک اٹھی اور اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''پھر وہ لوگ کون تھے جنہوں نے تمہارے گھر والوں کی حیثیت سے ہماری شادی میں شرکت کی تھی؟''

''وہ یہیں...... کراچی کے رہنے والے تھے۔'' عباسی نے خفت آمیز انداز میں بتایا۔ ''میرے دوست احباب اور جاننے والے جو میری درخواست پر، ہماری شادی میں شریک ہوئے تھے تاکہ تمام معاملات بہ خیر و خوبی انجام پا جائیں......''

فرزانہ کو عباسی کی باتوں میں کسی سازش کی بو محسوس ہوئی۔ اس نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''تم نے اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا عباسی؟'' اس کا لہجہ احتجاج سے معمور تھا۔

''یہ میری مجبوری تھی فرزانہ......!''

''کیسی مجبوری؟''

''میں اپنے گھر والوں کو کسی بھی قیمت پر اس شادی میں نہیں شامل کر سکتا تھا۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور ان کی شمولیت کے بغیر تمہاری امی

اس شادی کے لیے تیار نہ ہوتیں اس لیے...... اس لیے مجھے چند جاننے والے لوگوں کی مدد سے وہ ڈراما رچانا پڑا تھا۔''

''یہ سب فضول باتیں ایک طرف رکھ دو۔'' وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تمہاری ایسی کون سی مجبوری تھی کہ تم اپنی شادی میں گھر والوں کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے؟'' وہ سانس درست کرنے کے لیے لمحے بھر کو تھمی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اور...... وہ کون سی حقیقت ہے جو تم نے مجھ سے اور میرے گھر والوں سے چھپائی تھی؟''

''میں...... میں پہلے سے شادی شدہ تھا......'' عباسی نے گویا ایٹم بم کا دھماکا کیا۔

''کیا......؟'' فرزانہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''ہاں...... یہ سچ ہے فرزانہ!'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''سلمٰی کو میں بالکل پسند نہیں کرتا۔ والدین نے زبردستی اس سے میری شادی کرا دی تھی۔ میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں، میں نے......''

''سچی محبت کرنے والے کبھی دھوکا نہیں دیتے، جھوٹ نہیں بولتے......'' وہ درشت لہجے میں بولی۔ ''تم نے حقائق چھپا کر مجھ سے اور میری فیملی سے ایک بہت بڑا فراڈ کیا ہے۔ یہ ناقابلِ معافی جرم ہے عباسی!''

''میں مانتا ہوں، مجھ سے غلطی ہوئی۔'' وہ ندامت آمیز انداز میں بولا۔ ''اگر میں یہ غلطی نہ کرتا تو تمہیں حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ تم ہی بتاؤ......'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر سوالیہ نظروں سے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم ہی بتاؤ، اگر میں تمہیں اور تمہاری امی کو اپنے شادی شدہ ہونے کے بارے میں بتا دیتا تو تم لوگ اس شادی کے لیے راضی ہو جاتے؟ یقیناً تمہارا جواب یہی ہوگا کہ...... نہیں!''

''حقیقت بیانی کے بعد میرا اور میرے گھر والوں کا کیا ردعمل ہوتا یہ ایک الگ معاملہ ہے۔'' فرزانہ نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''لیکن اس وقت یہ انکشاف میرے لیے کتنا تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے عباسی۔ میں بہت دکھی ہوں......''

''مجھے تمہارے دکھ کا بہ خوبی اندازہ ہے فرزانہ۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''لیکن میں نے جو کچھ بھی کیا وہ میری مجبوری تھی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے اس عمل کی تلافی کروں گا۔ تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''اس سلسلے میں تم بھلا کیا تلافی کرو گے؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

''میں کبھی تمہیں محراب پور نہیں لے کر جاؤں گا۔'' وہ اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور نہ ہی کبھی سلمٰی اور علی کو یہاں لے کر آؤں گا۔ بس، میں خود ہی سال، چھ مہینے میں محراب پور کا ایک چکر لگا لیا کروں گا۔ میں زیادہ سے زیادہ وقت تمہارے ساتھ گزاروں گا۔ تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔''

فرزانہ نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کڑے لہجے میں پوچھا۔ ''سلمٰی تو غالباً تمہاری پہلی بیوی کا نام ہے اور یہ علی کون ہے؟''

''علی میرا بیٹا ہے۔'' عباسی نے بتایا۔ ''اس کی عمر دس سال رہی ہوگی۔''

''تو کیا تمہاری کوئی اولاد بھی ہے؟'' فرزانہ حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں، علی میرا اکلوتا بیٹا ہے۔'' عباسی نے اثبات میں جواب دیا۔ ''انسان کی شادی اپنی پسند سے ہو یا گھر والوں کی مرضی سے لیکن شادی کے بعد میاں بیوی سے زیادہ اللہ کی مرضی چلتی ہے اور یہ جو اولاد ہوتی ہے نا، یہ اللہ کی مرضی سے ہو ہی جاتی ہے۔ آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بعض میاں بیوی کو ایک دوسرے کی شکل سے شدید ترین نفرت ہوتی ہے، اس کے باوجود ہر سال کا ایک نیا کیلنڈر بھی آ رہا ہوتا ہے......''

''تم ان باتوں سے مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو عباسی!'' فرزانہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ جب امی، ندرت اور عرفان کو اس بات کا پتا چلے گا تو ان کے دل پر کیا بیتے گی......؟''

''انہیں کچھ بھی بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''کیا مطلب؟'' فرزانہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب یہ کہ......'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''اگر میری پہلی شادی والا راز ہم دونوں کے بیچ رہے تو اس میں خرابی والی کون سی بات ہے؟''

''خرابی والی بات یہ ہے کہ اگر امی کو بعد میں اس حقیقت کا پتا چلے گا تو وہ مجھ سے شاکی ہوں گی، میں اپنی نظر میں گر جاؤں گی......''

”تو پھر تم ایسا کرو کہ اپنے گھر والوں کو سب کچھ سچ سچ بتادو......“ مسعود عباسی نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

”اس کا نتیجہ جانتے ہو عباسی؟“

”جانتا ہوں......اسی لیے تو اس حقیقت کو چھپانے کی بات کررہا ہوں۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”لیکن اگر میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی تو تم اپنا شوق پورا کرکے دیکھ لو......“

عباسی کے اس دوٹوک انداز سے فرزانہ کو ایک دھچکا تو لگا لیکن چونکہ وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی اس لیے اس نے عباسی کے رویے کا زیادہ اثر نہیں لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مجھے اس قسم کا کوئی شوق نہیں ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ اب میں اپنے گھر والوں کو اس ٹریجڈی کی خبر سنا کر دکھی نہیں کرنا چاہتی۔ اگر یہ بات امی تک پہنچ گئی تو انہیں اتنا صدمہ ہوگا کہ...... کہ......!“

عباسی نے اسے کندھوں سے تھام لیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تم فکر نہ کرو فرزانہ! میں ہر دکھ پریشانی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم اسے میری مجبوری سمجھ کر معاف کردو۔ انشاءاللہ! میری طرف سے آئندہ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

یہ ایسی صورتِ حال تھی کہ فرزانہ نے بھی یہی سوچا، اس ایشو پر مٹی ڈال دیں تو زیادہ اچھا ہوگا لہٰذا بات آئی گئی ہوگئی۔

آئندہ دنوں میں عباسی نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے جاب جاری رکھنے کے لیے کہا اور اس نے حسب پروگرام ٹال دیا لیکن جب عباسی کے اصرار میں کمی واقع نہ ہوئی تو اس نے پلٹ کر پوچھ لیا۔

”کیا آج کل پریکٹس ٹھیک نہیں چل رہی......؟“

”بس، ٹھیک ہی سمجھ لو۔“ وہ ذو معنی انداز میں بولا۔

عباسی نے اسے یہی بتایا تھا کہ وہ ایک وکیل ہے اور سٹی کورٹ میں پریکٹس کرتا ہے۔ وہ روزانہ صبح گھر سے نکل جاتا اور پھر رات کو واپس آتا۔ بعض کلائنٹس اس سے ملنے کے لیے گھر پر بھی آجایا کرتے تھے۔ ایسا محسوس تو نہیں ہوتا تھا کہ اس کی پریکٹس کم زور جارہی ہو تاہم اس کے جواب کا مفہوم یہی نکلتا تھا۔

”ٹھیک ہے......“ فرزانہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اس سلسلے میں سوچ کر جواب دوں گی۔“

پتا نہیں کیوں، فرزانہ کو عباسی کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ اس بے یقینی کا بہ ظاہر کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بس، اس کے اندر سے ایک صدا اٹھ رہی تھی کہ عباسی غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ ان لمحات میں اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ سٹی کورٹ جاکر عباسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی تاکہ پتا چلایا جاسکے کہ اس کے مالی حالات واقعی آج کل دگرگوں تھے یا وہ کوئی نئی چکر بازی چلانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ فرزانہ کی نظر میں وہ اپنا اعتبار کھو بیٹھا تھا۔ فرزانہ نے اس کی غلط بیانی کو درگزر کردیا تھا کیونکہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا مگر وہ عباسی کی طرف سے کھٹک گئی تھی۔ اب وہ اس پر اندھا اعتماد نہیں کررہی تھی۔

آئندہ دس روز میں فرزانہ نے اپنے شوہر نام دار کے بارے میں جو تحقیق کی اس نے فرزانہ کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس نے نہایت ہی خفیہ انداز میں سٹی کورٹ جاکر عباسی کے بارے میں انتہائی رازداری سے معلومات حاصل کی تھیں اور گھر پر آنے والے افراد سے بھی موقع پاکر پوچھ گچھ کی تھی۔ فرزانہ نے ماسٹرز کررکھا تھا، علاوہ ازیں وہ ایک معروف انشورنس کمپنی کے کلیم ڈیپارٹمنٹ میں کام کرچکی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ ہوشیار اور سمجھ دار تھی لہٰذا اس تحقیق سے نتیجہ اخذ کرنے میں اسے کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی اور...... یہ نتیجہ بہت ہی بھیانک، بہت ہی تکلیف دہ تھا......!

عباسی سرے سے وکیل تھا ہی نہیں۔ اس نے قانون پڑھ رکھا تھا اور نہ ہی ایسی کسی ”چیز“ سے اس کا تعلق تھا۔ وہ درحقیقت مختلف وکلا کے لیے ایک ایجنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ ایک ایسا ایجنٹ جو اپنی چرب زبانی سے شکار (کلائنٹس) کو گھیر گھار کر وکیل تک پہنچاتا ہو۔ اس نوعیت کے کام کے دوران میں مختلف سرکاری محکموں میں اس نے مرتشی افسران سے بھی مراسم پیدا کرلیے تھے جن کے توسط سے وہ لوگوں کے کام بھی کروادیا کرتا تھا۔ وہ تھوڑے بہت پیسے متعلقہ افسر کو کھلا دیتا اور باقی اپنی جیب میں۔ کسی کو چھوٹی موٹی جاب دلادی، کسی کا بل پاس کروادیا، کسی کی جعلی ڈگری بنوادی، وغیرہ وغیرہ......اس نوعیت کے کاموں میں اس کی اچھی خاصی پیدا ہوجاتی تھی۔ وہ اپنے حلقے میں چکر باز اور فراڈیا بھی مشہور تھا۔

عباسی کوئی اعلیٰ سطح کا کام کرتا تھا یا نچلے درجے کے کاموں میں مصروف تھا، اس سے فرزانہ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اسے اذیت اس بات سے پہنچی تھی کہ اس کا شوہر ایک دھوکے باز اور چیٹر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اسی تحقیق کے دوران میں اسے یہ بھی سننے کو ملا کہ عباسی نے ایک خاص مقصد کے تحت اس سے شادی کی تھی۔ اس مقصد کا پہلا حصہ تو یہ تھا کہ جس ”لڑکی“ سے اس نے شادی کی تھی وہ ایک کارآمد محکمے میں جاب کرتی تھی۔ اپنی ”بیوی“ کے توسط سے وہ بہت سارے محکمہ جاتی کام بہ آسانی نکلوا سکتا تھا، علاوہ ازیں وہ آمدنی کا ذریعہ بھی تھی۔ فرزانہ کی اچھی خاصی سیلری تھی۔

اس کے مقصد کا دوسرا پہلو بڑا ٹیکنیکل تھا۔ وہ جس نوعیت کے کاموں میں ملوث تھا ان میں انسان کی ساکھ بڑا اہم کردار ادا کرتی تھی۔ لوگ اسے اپنے مختلف کاموں کے لیے پیسے دیا کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص گھربار والا ہو تو لوگ اس پر آسانی سے بھروسا کرلیتے ہیں۔ اسے چھڑا چھانٹ دیکھ کر بعض لوگ بدک جاتے تھے لہٰذا فرزانہ سے شادی کرکے گھر بسانے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے معتبر سمجھنے لگیں۔

اس رات فرزانہ اور عباسی میں شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا۔ فرزانہ نے پچھلے آٹھ دس روز میں جو ریسرچ کی تھی اس نے اس کے دل و دماغ کو تہ و بالا کرکے رکھ دیا تھا۔ اسے واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ عباسی سے شادی کا فیصلہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی......ایک بھیانک غلطی!

جب فرزانہ نے اس رات عباسی کو آئینہ دکھایا تو پہلے تو وہ آئیں، بائیں، شائیں کرنے لگا لیکن فرزانہ کوئی گاؤں دیہات کی لڑکی نہیں تھی جو اس کی لچھے دار باتوں سے مطمئن ہوجاتی۔ وہ ٹھوس دلائل کے ساتھ سوال پر سوال کیے جارہی تھی۔ جب عباسی اس کے سامنے لاجواب ہوگیا تو غصے اور جھنجلاہٹ میں اس نے چیخنا چلانا شروع کردیا اور اس بحث کے اختتام پر اس نے کہا۔

”جب تم میرے بارے میں سب کچھ جان چکی ہو تو پھر فیصلہ بھی تمہی کو کرنا ہے۔ میں تو جیسا ہوں، ویسا ہی رہوں گا......!“

عباسی کی ڈھٹائی کو دیکھتے ہوئے وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ ”میں تم جیسے کردار کے شخص کے ساتھ ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی......“

”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“ عباسی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں!“ فرزانہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

ازدواجیات

بیوی: ”دیکھیں میں بیوٹی پارلر گئی تھی۔“

شوہر نے غور سے بیوی کو دیکھا اور پوچھا۔

”تو؟ بند تھا کیا؟“

☆☆☆

شوہر بیوی سے بڑے رومانٹک انداز میں ”جانو! اگلے 1000 سال تک بھی میں تمہیں چاہتا رہوں گا۔“

بیوی جل کر بولی۔ ”کیوں، اس کے بعد کس چڑیل کے پاس جانے کا ارادہ ہے؟“

☆☆☆

میاں بیوی میں سخت لڑائی ہو رہی تھی، اچانک شوہر نے سخت انداز میں بیوی سے کہا۔ ”بس اب چپ ہوجاؤ یہ نہ ہو کہ میرے اندر کا حیوان بیدار ہوجائے۔“

بیوی تڑخ کر بولی۔ ”ہاں، ہاں! جاگ لینے دو، بھلا چوہے سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔“

☆☆☆

بیوی: ”اپنا فون تو دکھائیں ڈارلنگ۔“

شوہر: ”1 منٹ صبر کرو، اس کو آن تو کر لوں۔“

(Delete ویڈیو، پکچرز، میسج اینڈ Formate میموری کارڈ)

”یہ لو۔“

بیوی نے موبائل لیا اور بولی۔ ”اوہ، 11 بج گئے؟“

☆☆☆

لڑکی پیر صاحب سے۔ ”جناب دو لڑکے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میری شادی کس سے ہوگی؟ کون ہوگا خوش نصیب؟“

پیر صاحب۔ ”پہلے والے سے شادی ہوگی اور دوسرا خوش نصیب ہوگا۔“

مرسلہ: محمد قدرت اللہ خان نیازی، حکیم آباد، خانیوال

فرزانہ کے استقلال کو دیکھتے ہوئے وہ قدرے نرمی سے بولا۔ ''دیکھو! ہم میاں بیوی کی حیثیت سے ایک چھت کے نیچے رہ رہے ہیں۔ ہماری باقاعدہ شادی ہوئی ہے۔ اتنا بڑا فیصلہ بلاسوچے سمجھے کرنا ٹھیک نہیں......''

''اب سوچنے اور سمجھنے کے لیے باقی بچا ہی کیا ہے عباسی!'' وہ زخمی لہجے میں بولی۔

''جب میں نے اپنی غلطی تسلیم کرلی ہے تو تمہیں بھی اپنے ذہن میں تھوڑی گنجائش نکالنا چاہیے۔'' عباسی نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''میں خود کو سدھارنے کا وعدہ کررہا ہوں نا......!''

عباسی کے التجائیہ انداز کو دیکھ کر فرزانہ کے دل میں تھوڑی نرمی پیدا ہوگئی۔ اس نے گہری نظروں سے عباسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں اپنے معاملات درست کرنے کا ایک موقع دیتی ہوں لیکن یہ آخری موقع ہوگا......!''

''مجھے منظور ہے......!'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

فرزانہ نے گھائل لہجے میں کہا۔ ''عباسی! اگر تم کسی روڈ پر سبزی یا فروٹ کا ٹھیلا بھی لگاؤ گے تو میرے لیے شرمندگی کی بات نہیں ہوگی لیکن مارکیٹ میں تمہاری جو شہرت ہے وہ میرے لیے کسی بھی طور قابل قبول نہیں۔ میں کسی مفلس مزدور کے ساتھ تو زندگی گزار سکتی ہوں لیکن کسی کماؤ فراڈیے شوہر کے ساتھ رہنا قطعاً گوارا نہیں......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم میری بات سمجھ رہے ہونا عباسی؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

آئندہ ایک ماہ خیر خیریت سے گزر گیا۔ فرزانہ کو بھی محسوس ہوا کہ عباسی سدھر گیا ہے لیکن اندر کا حال تو اللہ ہی جانتا تھا یا پھر عباسی کو خبر تھی۔ اس کی ساری زندگی جس نوعیت کی سرگرمیوں میں گزری تھی ان سے سردست کنارا کش ہوجانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ وہ بھی...... چور، چوری سے جاتا ہے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں...... کے مصداق اپنے ''کام'' میں مصروف تھا لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر تاکہ فرزانہ کو اس کے کرتوت کا پتا نہ چل سکے۔ فرزانہ نے دوبارہ آفس جانا شروع کردیا تھا تاکہ گھر کو اس کی سیلری سے معاشی تعاون حاصل رہے۔

کچھ عرصے تک یہ معاملات بڑی خوش اسلوبی سے نبھے رہے لیکن ہمیشہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا لہٰذا جب عباسی کے ''کارنامے'' گاہے بگاہے فرزانہ کے سامنے آنے لگے تو گھر میں سخت نوعیت کی کشیدگی کی فضا قائم ہوگئی۔ اس دوران میں ان کی شادی کو ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ روز روز کے لڑائی جھگڑے نے فرزانہ کو اس ماحول کا عادی سا بنادیا تھا اور اس نے ابھی تک اپنے گھر والوں کو عباسی کی پہلی شادی کے بارے میں بھی نہیں بتایا تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی یا کوئی مصلحت لیکن ان کا معاملہ سرطان کے مرض کے مانند اندر ہی اندر توانا ہوتا چلا گیا اور لگ بھگ دو ماہ پہلے پتا چلا کہ یہ مرض تیسرے اسٹیج میں داخل ہوچکا ہے۔ ایک ایسا اندوہ ناک واقعہ پیش آیا جس نے فرزانہ کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

ایک شام جب عباسی گھر واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک موٹی تازی دیہاتن اور ایک اجڈ سا دس سال کا لڑکا بھی تھا۔ فرزانہ کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ ان لوگوں کو دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ سلمٰی اور علی ہوں گے۔ بعدازاں اس کا یہ اندازہ سوفیصد درست ثابت ہوا جب عباسی نے کچھ اس انداز میں ان کا تعارف کرایا۔

''فرزانہ! یہ میری بیوی سلمٰی ہے اور یہ......'' اس نے لڑکے کی جانب اشارہ کیا۔ ''علی ہے...... میرا اکلوتا بیٹا۔ میں نے سلمٰی کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔ یہ لوگ کچھ دن یہاں رہیں گے پھر واپس محراب پور چلے جائیں گے۔''

فرزانہ یہ سوچ کر خاموش ہوگئی کہ جب سلمٰی اس کی بیوی ہے تو اس کے چند دن یہاں رہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس نے عباسی سے پوچھا۔

''کیا تم ان لوگوں کو لینے کے لیے خود محراب پور گئے تھے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''محراب پور اتنا بھی نزدیک نہیں کہ میں دس بجے صبح گھر سے نکلوں اور وہاں سے ہوکر شام کو واپس بھی آجاؤں۔ سلمٰی کا بھائی انہیں یہاں میرے پاس کورٹ پہنچا گیا تھا اور میں اپنے ساتھ گھر لے آیا ہوں۔''

فرزانہ، عباسی کے جواب سے وقتی طور پر مطمئن تو ہوگئی لیکن بہت ساری باتیں اس کے ذہن کو بڑے تواتر کے ساتھ الجھا رہی تھیں مثلاً یہ کہ...... عباسی نے اپنی پہلی بیوی اور بیٹے کو اس کے بارے میں کیا سمجھایا تھا۔ اس ہتھنی سلمٰی کی حرکات اور تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ فرزانہ کو اپنی سوکن سمجھ رہی ہے۔ وہ بڑے کروفر اور دھڑلے سے

فلیٹ میں داخل ہوئی تھی اور اس کے کسی بھی انداز سے نہیں جھلکتا تھا کہ اسے عباسی کی دوسری شادی سے کوئی دکھ پہنچا ہو۔ اسی نوعیت کے اور بھی بہت سے امور تھے جو فرزانہ کی الجھن میں مسلسل اضافہ کررہے تھے۔ علی ایک انتہائی بدتمیز اور فضول قسم کا لڑکا تھا اور سلمٰی کی مثال اتنی من کی اس دھوبن ایسی تھی جسے صرف کھانے اور سونے سے مطلب ہو۔ وہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔

چند دن تو مہمان جان کر فرزانہ ان کے نخرے برداشت کرتی رہی لیکن پھر یہ سب کچھ اس کے اختیار سے باہر ہوگیا۔ اسے بڑے واضح انداز میں محسوس ہونے لگا کہ اس کی حیثیت اس گھر میں کسی نوکرانی سے زیادہ نہیں۔ وہ صبح آفس جاتی۔ سارا دن وہاں گزارنے کے بعد وہ واپس آتی تو گھر کا تمام تر سامان ادھر سے ادھر بکھرا نظر آتا۔ وہ گھر کا حلیہ درست کرتی پھر کچن کے کام میں مصروف ہوجاتی۔ صفائی ستھرائی اور کھانا پکانا سب اسی کے ذمے تھا۔ اس ناانصافی بلکہ ظلم پر جب اس نے عباسی سے شکایت کی تو اس نے خشک لہجے میں کہا۔

''بھئی! یہ لوگ تو چند دن کے مہمان ہیں اور تمہیں ساری زندگی میرے ساتھ رہنا ہے۔ میں انہیں کچھ کہتے ہوئے اچھا تھوڑا ہی لگوں گا......!''

''اگر یہ مہمان ہیں تو پھر گھر میں تمیزدار مہمانوں ہی کی طرح رہیں، جنگلی پن کا مظاہرہ نہ کریں۔'' فرزانہ نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میری مدد کرنے کے بجائے یہ لوگ میرے کام کو بڑھانے اور بگاڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہ کہاں کی شرافت ہے؟''

''تم تو جانتی ہو، یہ لوگ گاؤں کی زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔'' عباسی نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اب میں انہیں شہری زندگی کے طور طریقے تو سکھانے سے رہا......!''

''یہ چیزیں سیکھنے سے نہیں آتیں عباسی!'' وہ احتجاجی انداز میں بولی۔ ''طریقہ اور سلیقہ تو انسان کے اندر سے اٹھتا ہے۔''

''میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ روکھے انداز میں بولا۔ ''اگر تم ان لوگوں کی وجہ سے اتنی ہی تنگ آگئی ہو تو ایک کام کرتے ہیں......!''

''کون سا کام؟'' فرزانہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جب تک یہ لوگ یہاں ہیں، تم اپنی امی کے گھر چلی جاؤ۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''جب یہ لوگ واپس چلے

احسان بہت بڑی عبادت ہے

ایک خداپرست آدمی حجاز کے سفر پر بڑے ذوق وشوق سے روانہ ہوا۔ ہر قدم پر دو رکعت نماز ادا کرتا تھا اور اگر پاؤں میں کوئی کانٹا چبھ جاتا تو فرطِ ذوق وشوق میں اسے پاؤں ہی میں رہنے دیتا۔ شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تجھ سے بڑھ کر عبادت گزار اور راہِ خدا میں مصیبت برداشت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ قریب تھا کہ یہ وسوسہ اس کے اجروثواب کو ضائع کردیتا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس کو گمراہی کے گڑھے میں گرنے سے بچالیا۔ غیب سے آواز آئی۔ اگر تو نے عبادت کی ہے تو گھمنڈ نہ کر۔

نصیحت: ''ایک دل کو احسان سے راحت پہنچانا ہر منزل پر ہزار رکعت پڑھنے سے بہتر ہے۔''

***

احسان کے ذریعے دلوں کا شکار کرو

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ میں کہیں جارہا تھا کہ راستے میں ایک نوجوان کو دیکھا جو ایک بکری کی رسی پکڑے ہوئے تھا اور بکری اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ یہ رسی کی برکت ہے ورنہ یہ بھاگ جاتی۔ نوجوان نے اس کی رسی کھول دی اور دائیں بائیں چلنا شروع کردیا۔ وہ جدھر کا رخ کرتا بکری بدستور اس کے پیچھے پیچھے جاتی۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو نوجوان نے کہا۔ ''میرے بزرگ! رسی اس کو میرے پیچھے نہیں لاتی بلکہ احسان کا پھندا اس کے گلے میں پڑا ہوا ہے جو اس کو کہیں بھاگنے نہیں دیتا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ یہ روزانہ میرے ہاتھ سے جو اور سبز چارہ کھاتی ہے۔''

نصیحت: ''اے نیک آدمی بروں پر مہربانی کر۔ کتا جب تیری روٹی کھاتا ہے تو تیری حفاظت بھی کرتا ہے۔''

مرسلہ: یاسر علی راجپوت، گوجرہ نواں، لاہور

جائیں گے تو تم اس گھر میں آجانا۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا؟" فرزانہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "میں گھر چھوڑ کر کیوں جاؤں......؟"
"اگر سلمٰی کو تمہاری وجہ سے کوئی شکایت ہوتی تو میں فوراً اسے گاؤں روانہ کردیتا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "شکایت تو تمہیں ہے نا ان لوگوں سے لہٰذا تمہیں ہی جانا ہوگا......"
"میں کہیں نہیں جانے والی!" وہ اٹل انداز میں بولی۔ "یہ میرا گھر ہے اور میں یہیں پر رہوں گی۔"
"دونوں ایک چھت کے نیچے رہوگی تو آئے دن فساد بھی ہوتا رہے گا۔" عباسی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "یا تو میرا مشورہ مان کر اپنی امی کے گھر چلی جاؤ اور یا پھر ان لوگوں کو برداشت کرو۔"
"میں ان دونوں میں سے کوئی کام بھی نہیں کروں گی۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ "عباسی! تم مجھے اتنا کم زور مت سمجھو......!"
"کیا مطلب ہے تمہارا......!" وہ الجھن زدہ انداز میں فرزانہ کو تکنے لگا۔ "تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"
"میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں جاؤں گی اور نہ ہی کسی کی بے ہودگی اور بدتمیزی برداشت کروں گی؟" فرزانہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے واضح کیا۔
"پھر تم کیا کروگی؟"
"میں ڈٹ کر ان لوگوں کا مقابلہ کروں گی۔" وہ بڑے عزم سے بولی۔
"ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔
آئندہ روز سے فرزانہ نے جس حکمت عملی کو اپنایا وہ دو روز بعد ہی اس کی جان کا عذاب بن گئی۔ اس نے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ آفس سے نکلتے وقت کچھ نہ کچھ کھالیتی اور گھر آکر تھکاوٹ کا بہانہ کرکے لیٹ جاتی۔ عباسی نے اس تبدیلی کو زیادہ محسوس نہ کیا لیکن دو روز بعد جب عباسی گھر پر موجود نہیں تھا تو سلمٰی نے اس کی ایسی کم تیسی کرکے رکھ دی۔
جب فرزانہ کی آرام طلبی پر سلمٰی نے اسے کھری کھری سناڈالیں تو وہ بھی خاموش نہ رہی اور اس روز فرزانہ نے اپنے دل کا غبار دھوڈالا۔ آخر میں اس نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔
"تم لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں کوئی تمہاری نوکرانی تو نہیں......؟"

"عباسی نے تو یہی بتایا تھا!" سلمٰی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔
"کیا؟" فرزانہ حلق کے بل چلّا اٹھی۔
فرزانہ کے "کیا" کے جواب میں سلمٰی اور علی نے اسے جو کہانی سنائی وہ اس کے دماغ کے پرخچے اڑا دینے کے لیے کافی تھی اور اس سنسنی خیز کہانی کا ون لائنر یہ تھا کہ ......عباسی نے سلمٰی کو فرزانہ کے بارے میں یہی بتایا تھا کہ وہ اس کی نوکرانی ہے۔
اس رات ان تینوں کے بیچ بڑی زبردست لڑائی ہوئی۔ فرزانہ کے دل و دماغ پر جو بیت رہی تھی وہ کوئی اور محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے سلمٰی اور عباسی کو بے نقط سنائیں۔ فرزانہ کے استحکام اور مضبوط قدمی کو دیکھتے ہوئے سلمٰی کو بھی شک نہیں بلکہ یقین ہوگیا کہ عباسی نے یقیناً اس سے شادی کررکھی ہوگی۔ وہ خود بھی فرزانہ کی کیفیت سے مطمئن نہیں تھا۔ عباسی نے اس کے سامنے فرزانہ کو نوکرانی تو ظاہر کردیا تھا لیکن اس لنگڑی وضاحت سے اس کی تسلی نہیں ہوسکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس قسم کی نوکرانی ہے جو مالکن سے زیادہ صاف ستھرے کپڑے پہنتی ہے اور رات کو اپنے گھر بھی واپس نہیں جاتی۔ سلمٰی ان پڑھ، جاہل اور دیہاتن ضرور تھی لیکن عورت کی مخصوص حس سے قطعاً محروم نہیں تھی۔ اسے فوراً شک ہوگیا تھا کہ عباسی اور فرزانہ کے درمیان کوئی اور بھی سنجیدہ رشتہ موجود تھا۔ سلمٰی نے جب بھی عباسی سے تنہائی میں اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی وہ مختلف بہانوں سے اسے ٹال دیتا اور اب تو سارا معاملہ کھل کر سامنے آگیا تھا۔ جب سلمٰی اور فرزانہ کی طرف سے عباسی پر تلخ اور ترش سوالات کی بوچھاڑ ہوئی تو اس نے ایک جملے کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی۔
"میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا......!"
"میرے پاس بھی اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ابھی اور اسی وقت اپنے گھر چلی جاؤں۔" فرزانہ نے غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ "میں اب تمہارے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہ سکتی......!"
سلمٰی تو اس کی سوکن تھی لیکن اس موقعے پر عباسی نے بھی فرزانہ کو روکنے کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی اور وہ اٹھ کر اپنی امی کے گھر آگئی۔
نہ صرف امی کے پاس چلی آئی بلکہ روحی بانو کو تمام تر حالات کی حقیقت سے بھی آگاہ کردیا۔ وہ پچھلے سال بھر سال سے جو کرب ناک راز اپنے سینے میں دبائے بیٹھی تھی

جب وہ روحی بانو، ندرت اور عرفان تک پہنچا تو گویا اس گھر میں ایک کہرام سا جاگ اٹھا۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ ہوا ہوگا اس کی تفصیل بیان کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ آپ بڑی آسانی سے اس کا تصور کرسکتے ہیں......!
اس ہنگامے کے اختتام پر فرزانہ نے بڑے واضح انداز میں اپنا فیصلہ سنادیا تھا۔ "امی! میں کسی بھی قیمت پر اس شخص کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں!"
اور اس حتمی فیصلے کے تین روز بعد وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

میں نے پوری توجہ سے اس کی دکھ بھری کہانی سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "تو یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے کہ آپ کو مسعود عباسی سے ہر قیمت پر جان چھڑانا ہے؟"
"بالکل......" وہ قطعیت سے بولی۔ "میں اس شیطان کے ساتھ ایک بھی لمحہ زندگی گزارنے کا تصور نہیں کرسکتی۔"
"اور آپ کی امی کا اس سلسلے میں کیا موقف ہے؟"
"وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کررہی ہیں؟"
"کیا سمجھانے کی کوشش کررہی ہیں؟"
"یہی کہ مجھے اپنے رویے میں لچک پیدا کرنا چاہیے۔"
"عباسی کے تمام تر کارنامے سے آگاہی کے باوجود بھی......؟"
"ہاں...... اور اس کے پیچھے بھی عباسی ہی کا ہاتھ ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔
"عباسی کا ہاتھ!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب؟"
"وہ میری غیر موجودگی میں دو مرتبہ امی سے آکر مل چکا ہے۔" فرزانہ نے بتایا۔ "اور اس نے امی کے سامنے اپنے گناہوں اور غلطیوں کا اقرار کرتے ہوئے معافی مانگی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس مکار نے امی کو یقین دلایا ہے کہ دو چار روز میں وہ سلمٰی اور علی کو واپس محراب پور بھجوادے گا اور آئندہ فرزانہ کو......یعنی مجھے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دے گا......"
"اور آپ کی امی نے اس کے وعدے کا یقین کرلیا ہے......؟"
"ہاں، امی کے رویے سے میں نے تو یہی محسوس کیا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "تبھی وہ اصرار کررہی ہیں

کہ عباسی کی خطاؤں کو معاف کرکے مجھے اپنے حالات سے سمجھوتا کرلینا چاہیے۔ وہ کہتی ہیں......" وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
"ان کا کہنا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا وہ قسمت کا لکھا تھا۔ تلخ یادوں کو بھلا کر آنے والی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرنا چاہیے......"
"ایک لحاظ سے آپ کی امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہر دانا و بینا شخص آپ کو اسی قسم کا مشورہ دے گا۔"
"آپ بھی......؟" اس نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔
"ہاں!" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ایک وکیل ہونے کے ناتے مجھے صرف آپ کے کیس اور اپنی فیس پر نظر رکھنا چاہیے لیکن میرا بھی مخلصانہ مشورہ وہی ہے جو آپ کی امی کی تجویز ہے۔ ماننا نہ ماننا آپ کی مرضی پر منحصر ہے......" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
"ازدواجی معاملات بہت ہی نازک اور حساس ہوتے ہیں لہٰذا کوئی بھی سنگین قدم اٹھانے سے پہلے سو بار سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے!"
"آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ۔" وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے جو فیصلہ کیا ہے اسے بدل نہیں سکتی۔ مجھے ہر قیمت پر عباسی سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اگر آپ یہ کیس لینے کو تیار نہیں ہیں تو میں کسی دوسرے وکیل کے پاس چلی جاتی ہوں......"
"میں نے آپ کو فری میں ایک مشورہ دیا ہے، کیس لینے سے انکار نہیں کیا۔" میں نے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ نے کوئی حتمی فیصلہ کرلیا ہے اور اپنے اس فیصلے پر ثابت قدمی سے کھڑی ہیں تو ٹھیک ہے، میں آپ کی قانونی مدد کے لیے تیار ہوں۔"
"شکریہ وکیل صاحب!" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ "مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔"
"کیا آپ کی امی کو اس بات کی خبر ہے کہ آپ کورٹ کے ذریعے خلع لینے کے لیے میرے پاس آئی ہیں؟" میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھ لیا۔
"نہیں!" اس نے دوٹوک انداز میں اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "اگر میں انہیں اپنے مقصد سے آگاہ کرکے گھر سے نکلتی تو وہ مجھے کبھی نہیں آنے دیتیں۔"
"فرض کریں، میں آپ کی جانب سے خلع کے کیس کو عدالت میں لگا دیتا ہوں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں استفسار

کیا۔ ''اس کے بعد آپ کی امی کو پتا چلتا ہے۔ اس صورت میں وہ ہمارے کام میں کوئی مداخلت تو نہیں کریں گی؟''

''اول تو اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں ایک انچ ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتی اور اگر امی ایسی کوئی کوشش کرتی بھی ہیں تو ان کو روکنا میری ذمے داری ہوگی۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔''

سچی بات یہ ہے کہ مجھے فرزانہ سے ایک خاص قسم کی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ جو بھی واقعات پیش آئے تھے وہ بہت بڑی زیادتی کے زمرے میں آتے تھے جب وہ اپنی زندگی کے بارے میں ایک اٹل فیصلہ کر ہی چکی تھی تو پھر اس کی قانونی مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا تاہم میں نے چند اہم باتیں اس پر واضح کرنا بہت ضروری جانا۔

''فرزانہ صاحبہ!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کل ہی آپ کی طرف سے خلع کا کیس عدالت میں داخل کر دیتا ہوں لیکن یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ اس مقدمے کا فیصلہ ہونے میں چند دن بھی لگ سکتے ہیں اور چند ماہ بھی اور اس دوران میں آپ کو عباسی سے دور رہنا ہوگا۔''

''میں پچھلے تین دن سے اس سے دور ہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اور آئندہ بھی اس کے گھر میں قدم رکھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔''

''گڈ!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''یہ نکتہ میں نے محض اس لیے اٹھایا ہے کہ آپ کی امی آپ کو عباسی کے گھر بھیجنے کی تگ و دو میں لگی ہوئی ہیں۔ عدالت میں کیس چلنے کے بعد اگر آپ اور عباسی ایک ہی چھت کے نیچے رہے تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''آپ فکر نہ کریں وکیل صاحب۔'' وہ بڑے عزم سے بولی۔ ''انشا اللہ! اس کی کبھی نوبت نہیں آئے گی۔''

''اوکے!'' میں نے اطمینان بخش سانس خارج کی۔

وہ پندرہ بیس منٹ تک مزید میرے پاس رکی۔ میں نے مختلف حوالوں سے اسے چند ہدایات دیں اور اس سے وہ ضروری معلومات حاصل کیں جو اس کیس کے سلسلے میں مجھے چاہیے تھیں۔ اس نے میری مطلوبہ فیس ادا کی اور سلام کر کے رخصت ہو گئی۔

جاتے جاتے میں نے چند کاغذات پر اس سے دستخط کروا لیے تھے۔ یہ سادہ قانونی کاغذات تھے جن پر بعد میں مجھے مختلف نوعیت کے مضامین ٹائپ کرنا تھے۔ ان میں قابل ذکر فرزانہ کی جانب سے میری وکالت میں، عدالت میں دائر کی جانے والی خلع کی درخواست تھی اور میرا وکالت نامہ تھا۔

فرزانہ کا کیس زیادہ پیچیدہ نہیں تھا۔ اس قسم کے خلع کے کیس دو تین پیشیوں کی مار ہوتے ہیں۔ اگر فرزانہ اور عباسی کو قانون کے ترازو میں ڈالا جاتا تو یقیناً فرزانہ کا پلڑا جھکتا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک تو عباسی نے پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کی تھی۔ اگر اس نکتے کو کوئی اہمیت نہ بھی دی جاتی تو بھی عباسی کا ایک سنگین جرم فرزانہ والے نکاح نامے کی صورت میں موجود تھا۔ مذکورہ نکاح نامے کے ایک کالم میں اس نے ''عقدِ اول'' درج کرایا تھا جبکہ درحقیقت فرزانہ سے اس کی شادی ''عقدِ ثانی'' میں شمار ہوتی تھی۔ یہ تحریری غلط بیانی کسی سنگین جرم سے کم نہیں تھی۔ علاوہ ازیں بہت سی واقعاتی شہادتیں بھی اکٹھا کی جا سکتی تھیں جو سراسر عباسی کے خلاف جاتیں۔

میرے ذاتی اطمینان کے لیے یہی بہت تھا کہ میری موکلہ پوری طاقت کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے مکمل تیاری کے ساتھ، فرزانہ کے خلع کے کیس کو عدالت میں دائر کر دیا۔ آنے والے دنوں میں عدالت نے ابتدائی کارروائی کی۔ ظاہر ہے، عباسی کو کورٹ میں حاضر ہونے کے لیے قانونی نوٹس عدالت کی جانب سے جاری کیا گیا ہوگا۔ عام فہم زبان میں آپ اسے سمن کہہ سکتے ہیں۔ جب کسی شخص کے خلاف فیملی کورٹ میں کوئی کیس دائر ہوتا ہے تو ابتدائی کارروائی کے طور پر اسے بلاوے کے لیے سمن ہی روانہ کیا جاتا ہے۔

چند روز کے بعد ایک صحت مند شخص میرے دفتر میں داخل ہوا۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک اور سانولا مرد تھا۔ صورت واجبی سی اور عمر پینتالیس کے قریب۔ اس نے اپنی صحت کی مناسبت سے خاصی توانا مونچھیں بھی پال رکھی تھی۔

اپنی باری پر وہ میرے چیمبر میں داخل ہوا۔ وہ خاصے جارحانہ موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے حسبِ معمول پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اپنے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تشریف رکھیں......!''

اس نے ایک جھٹکے سے ''تشریف'' رکھ دی پھر ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے بلکہ پھینکتے ہوئے خاصی بدتمیزی سے بولا۔

''یہ آپ کا کارنامہ ہے......؟''

میں نے مذکورہ لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ عدالت کی جانب سے بھیجا جانے والا کوئی سمن تھا اور اس پر مسعود عباسی کا نام اور پتا درج تھا۔ شناسائی کے تاثر کو دباتے ہوئے، میں نے گھور کر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے گینڈا نما شخص کی طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''آپ کی تعریف؟''

''میں اپنی تعریف تو بعد میں کروں گا۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں......''

''کون سے سوال کا؟'' میں بالکل انجان بن گیا۔

اس نے لفافے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس کارنامے کی بات کر رہا ہوں......!''

''یہ تو کورٹ کی جانب سے جاری ہونے والا ایک سمن ہے، کسی مسعود عباسی کے نام۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ اس لفافے کو میرے ساتھ جوڑنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟''

''مسعود عباسی میں ہی ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''اب تو آپ کو بہ خوبی یاد آ گیا ہوگا کہ میں اس لفافے کو آپ کا کارنامہ کیوں کہہ رہا ہوں؟''

''آپ آسان الفاظ میں اگر مجھے سمجھا دیں تو اچھا ہوگا!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے غصیلی نظر سے مجھے دیکھا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں مجھے وہ کچھ سمجھانے کی کوشش کی جو میں پہلے سے جانتا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

''اس عدالتی لفافے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ فرزانہ کی طرف سے دائر کیے جانے والے خلع کے کیس کا وکیل میں ہوں؟''

''میں نے آنٹی سے تمام تر معلومات حاصل کر لی تھیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''کون آنٹی؟'' میں نے پوچھا۔

''آنٹی روحی بانو!'' اس نے جواب دیا۔ ''میری ساس اور فرزانہ کی ماں۔''

فرزانہ نے مجھے یہ تو بتایا تھا کہ اس نے اپنی امی اور گھر کے دیگر افراد کے سامنے اس کیس والا معاملہ کھول کر بیان کر دیا ہے۔ یہ بات بھی میرے علم میں تھی کہ روحی بانو کے دل میں عباسی کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا لہٰذا یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ سمن کی وصولی کے بعد عباسی روحی بانو سے جا کر ملا ہوگا اور روحی بانو نے اسے اس کیس اور میرے بارے میں بتا دیا ہوگا جبھی وہ اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''فرض کریں، آپ کی بیوی فرزانہ نے یہ کیس میرے توسط سے عدالت میں ڈالا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پھر آپ میرے پاس کیا لینے آئے ہیں۔ آپ کو تو اس سمن کے جواب میں سیدھا سیدھا عدالت سے رجوع کرنا چاہیے۔''

''میں غوری صاحب کے ساتھ ہوتا ہوں۔'' اس نے اچانک ایک غیر متعلق بات کر دی۔

''کون غوری صاحب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''جمشید غوری!'' اس نے جواب دیا۔ ''غوری صاحب آپ ہی کے پیٹی بھائی ہیں۔ وہ بھی سٹی کورٹ ہی میں پریکٹس کرتے ہیں۔''

''ہاں، یہ نام سنا ہوا تو لگ رہا ہے......'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

جمشید غوری نامی اس وکیل کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی شہرت بہت خراب تھی۔ وہ عموماً جرائم پیشہ افراد کے کیس لیا کرتا تھا اور انہیں چھڑا کر لمبی لمبی رقمیں بٹور لیا کرتا تھا تاہم میں نے عباسی کے سامنے غوری کے ''اوصاف'' بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ عباسی کی عدالتی چکر بازیوں کے قصے فرزانہ کی زبانی پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکے تھے۔

''بیگ صاحب!'' وہ غصے کو ایک طرف رکھتے ہوئے خاصے دوستانہ انداز میں بولا۔ ''میں اس وقت آپ کے پاس ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔''

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ''جی فرمائیں۔''

''میں نے اس سمن کی وصولی کے بعد غوری صاحب سے ملاقات کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ''انہوں نے مجھے آپ سے ملنے کا مشورہ دیا ہے، جبھی میں آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں راضی نامہ چاہتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اگر فرزانہ صلح کے لیے تیار ہو جائے اور خلع کا کیس واپس لے لے تو میں اس کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ اس طرح یہ کیس عدالت میں جائے بغیر یہیں آپ کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے حل ہو جائے گا۔''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ

فرزانہ اپنے کیس کو واپس لینے کے لیے تیار ہو جائے!''

''اسے آپ تیار کریں گے ......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں ......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ کیوں؟''

''آپ اس کے وکیل ہیں ......'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے اس کا کام کرنے کے لیے یقیناً فیس وصول کی ہوگی۔ کیا آپ اس کے خیرخواہ نہیں ہیں؟''

''میں نے فرزانہ سے جس کام کی فیس وصول کی ہے وہ بڑی دیانت داری کے ساتھ کر رہا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے بڑی اس کی خیرخواہی اور کیا ہو سکتی ہے؟''

''اس سے بڑی خیرخواہی بھی ہو سکتی ہے ......!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''وہ کیا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''دیکھیں بیگ صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تاحال ہمارے بیچ میاں بیوی کا رشتہ قائم ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ ہماری زندگی کی آخری سانس تک یہ رشتہ بحال رہے۔ کیا آپ ایسا نہیں چاہیں گے؟''

''اس میں میرے چاہنے یا نہ چاہنے کا سوال نہیں ہے مسٹر عباسی!'' میں نے واضح انداز میں کہا۔ ''مجھے اپنے موکل کی خواہش اور ضرورت کو بھی دیکھنا ہوگا۔''

''آپ اسے سمجھا تو سکتے ہیں ......!''

''یہ کوشش میں کر چکا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کیس لینے سے پہلے میں نے فرزانہ کو ازدواجی معاملات کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا لیکن وہ ایک ہی بات پر مصر ہے کہ کسی بھی قیمت پر آپ کے ساتھ نہیں رہے گی۔''

''یہ اس کی فضول سی ضد ہے۔'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''آنٹی روحی بھی میری ہم خیال ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ فرزانہ اپنے گھر واپس چلی جائے اور میری بھی یہی خواہش ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے میں اس کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں ......'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ فرزانہ کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں تو میں یہاں آپ کے دفتر میں بیٹھ کر پکے کاغذات پر سب کچھ لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ آئندہ اسے میری طرف سے کسی قسم کی کوئی شکایت ہرگز ہرگز نہیں ہوگی۔ وہ جو بھی مطالبہ کرے گی، میں مان لوں گا ......''

''مسٹر عباسی! آپ بہت بڑی بات کہہ رہے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کچھ بھی مطالبہ کر سکتی ہے۔''

''ہاں، ہاں ...... میں اس کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''اگر اس نے یہ شرط رکھ دی کہ ......'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ صرف ایک صورت میں آپ کے ساتھ رہنے کو تیار ہے کہ آپ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دیں تو اس پر آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟''

''ظاہر ہے جناب ...... یہ تو ممکن نہیں ہوگا۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''سلمیٰ سے شادی میری مرضی سے ہوئی تھی اور نہ ہی میں اسے اپنی مرضی سے طلاق دے سکتا ہوں۔ البتہ میں آپ کی موجودگی میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر فرزانہ سے ایک وعدہ ضرور کر سکتا ہوں۔''

''کیسا وعدہ؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ وعدہ کہ میری اور فرزانہ کی زندگی میں، سلمیٰ کسی بھی حوالے سے نہ تو کبھی داخل ہوگی اور نہ ہی میں کبھی اس کا نام لوں گا۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''سلمیٰ کے سارے معاملات محراب پور تک محدود رہیں گے۔ فرزانہ کی زندگی ان لوگوں کی وجہ سے کبھی متاثر نہیں ہوگی۔''

وہ بڑی سنجیدگی سے خاصی معقول بات کر رہا تھا۔ فرزانہ کی زبانی عباسی کا جو ریکارڈ مجھ تک پہنچا تھا وہ کوئی تسلی بخش نہیں تھا لیکن ایک شوہر کی حیثیت سے اس وقت وہ میرے سامنے جس ذمے داری کا مظاہرہ کر رہا تھا اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دلوں اور نیتوں کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ انسان، انسان کے ظاہری رویے اور عمل ہی سے نتائج اخذ کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور ان لمحات میں عباسی کا رویہ اور عزم اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اسے اپنے کیے پر پشیمانی ہے اور وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ فرزانہ کو اپنی زندگی میں شامل رکھنا چاہتا ہے۔

''ٹھیک ہے مسٹر عباسی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی خواہش کے مطابق ایک کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں لیکن اس سلسلے میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔''

''آپ سنجیدگی سے کوشش کریں گے، میرے لیے یہی کافی ہے۔'' وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔ ''باقی میں خود دیکھ لوں گا ......!''

تھوڑی دیر کے بعد وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے

رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد، میں اس کے آخری جملے پر غور کرنے لگا ...... ''باقی میں خود دیکھ لوں گا ......''

یہ جملہ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا جسے سردست میں کوئی حتمی معنی نہ پہنا سکا لیکن لاشعوری طور پر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ عباسی ڈھکے چھپے الفاظ میں کوئی دھمکی دے گیا تھا ......!

آئندہ روز میں نے فرزانہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے عباسی سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور اس کی مرضی جاننے کی کوشش کی۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''بیگ صاحب! اس کیس میں آپ میرے وکیل ہیں یا عباسی کے؟''

''ظاہر ہے، میں آپ ہی کا وکیل ہوں۔''

''لیکن اس وقت آپ وکالت تو عباسی کی کر رہے ہیں ......!''

''آپ کا اندازہ درست نہیں ہے فرزانہ صاحبہ!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں سمجھی نہیں؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھا۔

''دیکھیں میں آپ کا وکیل ہوں اسی لیے آپ کو اس کیس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بتا رہا ہوں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں کوئی فیصلہ آپ پر مسلط نہیں کر رہا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں بالکل مطمئن رہیں اور جہاں تک عباسی کی تجویز کا تعلق ہے تو ......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر پکے قانونی کاغذات پر میری موجودگی میں آپ دونوں کے بیچ کوئی معاہدہ ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ......!''

''حرج ہے!'' وہ چٹانی لہجے میں بولی۔ ''اس وقت عباسی پھنسا ہوا ہے اس لیے بھیگی بلی دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایسا سیدھا اور معصوم ہے نہیں جیسا خود کو ظاہر کر رہا ہے۔ میں اس کی چالاکی اور مکاری سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔''

''ٹھیک ہے!'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ''اگر آپ کے رویے میں کوئی لچک نہیں تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آئندہ عباسی جب میرے پاس آئے گا تو میں اسے آپ کے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔''

''بیگ صاحب! میں اس وقت کئی طرف دباؤ سے

گزر رہی ہوں۔'' وہ بوجھل آواز میں بولی۔ ''پتا نہیں، اس نامراد عباسی نے امی کو کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ اس کا کچا چٹھا سامنے آجانے کے باوجود بھی وہ اسی کی حمایت پر کمربستہ ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے وہ مجھے زندگی کا یہ راز سمجھانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ عورت اپنے گھر ہی میں اچھی لگتی ہے۔ جب عباسی اپنے کیے پر شرمندہ ہے تو اسے ایک موقع ضرور دینا چاہیے......''

''یہ ٹھیک ہے کہ عباسی کی وجہ سے آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''لیکن آپ روحی بانو کی پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہیں۔ وہ ایک ماں ہیں اور...... ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی اپنے گھر میں خوش و خرم رہے۔ اگر غیر جانب داری سے صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو روحی بانو کا کردار کہیں سے غلط نظر نہیں آتا......!''

''یہی تو خرابی والی بات ہے بیگ صاحب!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''عباسی سراسر غلط ہے لیکن حالات اسے مسکین اور یتیم ظاہر کر رہے ہیں۔ امی بہ ظاہر میری ہمدردی میں سرگرم عمل ہیں لیکن میں جانتی ہوں، وہ جو کچھ بھی کر رہی ہیں، عباسی کے جذباتی دباؤ کے نتیجے میں کر رہی ہیں، اور تو اور...... اب اس عیار شخص نے آپ کو بھی شیشے میں اتارنے کی کوشش شروع کر دی ہے لیکن میں بھی ہمت ہارنے والی نہیں ہوں۔ آپ اسے میری ضد کہہ لیں یا پاگل پن، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ مجھے ہر قیمت پر یہ جنگ جیتنا ہے۔ یہ میری عزت اور انا کا مسئلہ بن گیا ہے بیگ صاحب......!'' وہ ڈرامائی انداز میں متوقف ہوئی پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے ہر حال میں عباسی سے چھٹکارا چاہیے۔ اس نجات کی خاطر میں بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں......!''

''ڈن!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اب میں اس سلسلے میں آپ کو کوئی نصیحت نہیں کروں گا۔''

☆☆☆

دو روز کے بعد عباسی مجھ سے ملنے آیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ فوراً اپنے مطلب کی بات پر آگیا اور اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''بیگ صاحب! کیا پروگریس ہے؟''

''کوئی پروگریس نہیں عباسی صاحب!'' میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''آپ نے اسے سمجھانے کی کوشش تو کی ہے نا؟''

''ہر کوشش کر کے دیکھ لی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کی سوچ کی سوئی ایک ہی مقام پر ٹھہر گئی ہے۔''

''ہوں......!'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں نے اس موقع پر تھوڑی سی غلط بیانی بھی کر ڈالی اور عباسی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''عباسی صاحب! آپ کی بیوی اور میری موکلہ فرزانہ بڑی ہی ضدی عورت ہے۔ میں نے اس کی ضد کو توڑنے کے لیے آپ کی مرضی کے خلاف اس پر ایک خطرناک حربہ بھی استعمال کر ڈالا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسے ہر قیمت پر خلع چاہیے۔''

''آپ کون سے حربے کی بات کر رہے ہیں بیگ صاحب؟'' اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

میں نے بتایا۔ ''میں نے اس سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ کیس کا خیال دل سے نکال دے اور آپ کے ساتھ مصالحت کرنے کو تیار ہو جائے تو آپ اپنی پہلی بیوی سلمیٰ کو طلاق دے دیں گے۔''

''آپ نے یہاں تک کہہ دیا اور وہ پھر بھی راضی نہیں ہوئی؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''جی ہاں، یہی حقیقت ہے!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وہ ایک مرتبہ پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں نے کہا۔ ''عباسی صاحب! میں نے آپ کی فرمائش پر کوشش کر کے دیکھ لی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اب تو آپ کو کورٹ میں اس کیس کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔''

''میں اس کے لیے تیار ہوں......!'' وہ پرعزم لہجے میں بولا۔ ''میں یہ ساری منت خوشامد اس لیے نہیں کر رہا تھا کہ میں فرزانہ سے کمزور ہوں۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ اس ضدی عورت کو میری طاقت اور اختیار کا قطعی کوئی اندازہ نہیں......'' اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! جی تو یہی چاہ رہا ہے کہ میں آپ کی موکلہ کو ابھی اور اسی وقت طلاق دے کر فارغ کر دوں لیکن میں ایسا کروں گا نہیں......!''

وہ میری موکلہ کے بارے میں مبہم اظہار خیال کر رہا تھا اور اس بات میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ہماری مخالف پارٹی تھا، یہ الگ بات کہ حالات کا جھکاؤ اسے دھکیل کر میرے پاس لے آیا تھا۔ میں نے یہ جاننا ضروری سمجھا کہ فرزانہ کے حوالے سے اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔

''اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو پھر آپ نے کیا منصوبہ بنایا ہے؟'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''منصوبہ تو آپ کی موکلہ ہی کا ہے بیگ صاحب!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''میں تو اس کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچاؤں گا......''

اس کی معنی خیز باتوں سے کسی سازش کی بو اٹھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پوچھ لیا۔

''کیا مطلب عباسی صاحب...... میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا؟''

''بات بالکل سیدھی سی ہے بیگ صاحب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''گھر کے اس نازک معاملے کو آپ کی موکلہ اٹھا کر عدالت میں لے گئی ہے تو پھر اس کیس کا فیصلہ بھی عدالت ہی میں ہوگا۔ میں اسے طلاق تو ہرگز نہیں دینے والا اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کس طرح خلع حاصل کرتی ہے......!''

عباسی کے آخری جملے میں ایک خطرناک چیلنج چھپا ہوا تھا لیکن اس سلسلے میں، میں نے اس سے کوئی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بہرحال، وہ میرے لیے مخالف پارٹی کی حیثیت رکھتا تھا۔ مخالف پارٹی کے ساتھ زیادہ فری ہونا بعض اوقات نقصان دہ بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

اب تک میں نے عباسی کو جتنی بھی لفٹ کرائی تھی وہ محض ایک مثبت مقصد کی خاطر تھی۔ حالات چاہے کچھ بھی تھے لیکن روحی بانو کی طرح میری بھی یہی خواہش تھی کہ اگر ان میاں بیوی کے درمیان مصالحت ہو جائے تو اچھا ہے لیکن بہ وجوہ ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ فرزانہ کی ضد نے میری کوشش کو رائگاں بنا دیا تھا۔

اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں......!

☆☆☆

جیسا کہ میں نے پیچھے ذکر کیا ہے، خلع کا کیس دو، تین پیشیوں کی مار ہوتا ہے، میری نظر میں فرزانہ کا کیس بھی اسی نوعیت کا تھا لیکن چونکہ اس دوران میں، میری عباسی سے تین چار ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور میں نے فرزانہ کے حوالے سے اس کی سوچ کے مختلف شیڈ ملاحظہ کر لیے تھے لہٰذا میں اس کی طرف سے خاصا محتاط بھی تھا۔ میں نے اس کیس کی تیاری کچھ ایسے انداز سے کی تھی کہ عباسی کی کوئی بھی چال کامیاب نہ ہو سکے۔

میں نے جو اندازہ قائم کیا تھا وہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ عباسی نے مختلف حربوں سے اس کیس کو معمول سے زیادہ طول دے دیا تھا تاہم لگ بھگ تین ماہ کے بعد مذکورہ کیس کا فیصلہ میری توقع کے عین مطابق، فرزانہ کے حق میں ہو گیا۔ عباسی کی بہانے بازیاں اور دیگر تاخیری حربے کارآمد ثابت نہ ہو سکے اور اسے فرزانہ کے مقابلے میں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔

عباسی سے میری آخری ملاقات فیصلے والے روز عدالت کے کمرے ہی میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ البتہ اس فیصلے کے دو روز بعد فرزانہ مٹھائی کے ساتھ میرا شکریہ ادا کرنے دفتر آئی تھی۔ میں نے اسے جیت کی مبارکباد دی۔ وہ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ کر واپس چلی گئی تھی۔

جن لوگوں سے اکثر آپ کا میل ملاپ رہے یا گاہے بہ گاہے ملاقات ہوتی رہے وہ اور ان کے معاملات ذہن میں تازہ رہتے ہیں۔ کلائنٹس کے سلسلے میں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ کلائنٹس کے کیسز جب تک عدالت میں چل رہے ہوتے ہیں، کاروباری ہی سہی لیکن ان سے ربط ضبط استوار رہتا ہے۔ ادھر عدالت کا فیصلہ آیا، ادھر یہ منظر سے غائب۔

فرزانہ کا قصہ بھی کچھ ایسا ہی تھا......!

جب وہ مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اس دن کے بعد سے میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ میرے ذہن، میری یادداشت ہی سے نکل گئی تھی البتہ، اس نے آخری ملاقات میں مجھے یہ بتا دیا تھا کہ وہ اپنی جاب کو جاری رکھے گی اور یہ کہ...... زندگی بھر شادی کے بارے میں نہیں سوچے گی۔

میں نے اس کے جذباتی فیصلے کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ انسان مختلف ذہنی کیفیات کے زیر اثر مختلف فیصلے کرتا ہی رہتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے غلط فیصلوں پر نظرثانی کرتے ہوں، فرزانہ کا شمار بھی انہی معدودے چند افراد میں ہوتا تھا جو اس اصول کے سائے تلے پوری زندگی گزار دیتے ہیں کہ جو کہہ دیا، سو کہہ دیا...... ایک سوت آگے نہ پیچھے۔

میں کیس کے سلسلے میں فرزانہ کی مستقل مزاجی یا ثابت قدمی یا ہٹ دھرمی کو بڑے واضح انداز میں دیکھ چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ ہمیشہ شادی نہ کرنے کے فیصلے پر بھی ڈٹی رہے گی۔ چونکہ یہ کوئی اہم بات نہیں تھی لہٰذا میں فرزانہ اور اس کے حتمی فیصلے کو بھول بھال کر زندگی کے جھمیلوں میں مصروف ہو گیا۔

شاید میں اسے ہمیشہ کے لیے بھول جاتا اگر اخبار کی ایک خبر مجھے چونکا نہ دیتی۔ یہ فرزانہ والے کیس سے چند ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک صبح میں حسبِ معمول اخبار کا مطالعہ کررہا تھا کہ ایک سنسنی خیز خبر نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس خبر کے مطابق، ایک عورت کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ میں نے اس خبر کی تفصیلات پر نگاہ دوڑائی تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

تفصیلات کے مطابق، ایک معروف انشورنس کمپنی کے کلیم ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے والی فرزانہ نامی ایک عورت کو کسی نامعلوم راہزن نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ خبر کے مطابق، فرزانہ نامی وہ عورت چھٹی کے وقت اپنے دفتر سے نکلی اور سڑک عبور کر کے اپنے اسٹاپ کی طرف چل پڑی تھی جہاں سے اسے واپسی کے لیے بس ملتی تھی۔

وہ بس اسٹاپ سے ابھی چند گز دور ہی تھی کہ ایک راہزن نے اس کا پرس جھپٹنے کی کوشش کی۔ فرزانہ نے مزاحمت کی اور اپنے پرس کو اس راہزن کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر مذکورہ راہزن طیش میں آگیا اور اس نے فائر کر کے فرزانہ کو وہیں گرا دیا اور اس کا پرس چھین کر ایک گلی میں غائب ہوگیا۔ واقعات کے مطابق، گولی فرزانہ کے دل میں لگی تھی چنانچہ اسے زندگی سے موت کی جانب سفر کرنے میں بہ مشکل ایک منٹ لگا ہوگا۔ وہ گولی کھا کر زمین پر گری اور ختم ہوگئی۔

بہ ظاہر یہ ڈکیتی یا راہزنی کی واردات محسوس ہوتی تھی اور پولیس نے بھی اس واقعے کو اسی کھاتے میں ڈال دیا تھا لیکن میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچ رہا تھا کیونکہ یہ وہی فرزانہ تھی جو چند ماہ پہلے میری موکلہ رہ چکی تھی اور میں نے اسے اس کے شوہر سے چھٹکارا دلایا تھا۔

شوہر کا خیال آتے ہی میرا دھیان آپوں آپ عباسی کی طرف چلا گیا، پھر مجھے اس کے کہے ہوئے معنی خیز جملے یاد آنے لگے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کہیں فرزانہ کے قتل میں عباسی کا ہاتھ تو نہیں......؟

ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ فرزانہ نے خلع کا کیس جیت کر اسے شکستِ فاش سے ہم کنار کیا تھا۔ وہ کینہ پرور شخص انتقاماً کچھ بھی کرسکتا تھا۔ اس کا ریکارڈ بھی مجھ سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ فرزانہ کے گھر کا فون نمبر میرے آفس والی ڈائری میں درج تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آفس جا کر اس کے گھر فون کروں گا تاکہ صورتِ حال کی وضاحت ہوسکے۔

جب میں آفس پہنچا تو میرے فون کرنے سے پہلے ہی روحی بانو کا فون آگیا۔ اس نے گلوگیر آواز میں مجھے فرزانہ کی موت کے بارے میں بتایا اور یہ بھی خدشہ ظاہر کیا کہ اس اندوہناک واقعے میں عباسی کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ میں خود بھی چونکہ اسی انداز میں سوچ رہا تھا لہٰذا اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”میرا شک بھی اسی کی طرف جارہا ہے......“

”اب کیا فائدہ وکیل صاحب......!“ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”فرزانہ کی موت میں کچھ نہ کچھ حصہ آپ کا بھی ہے۔“

”میرا حصہ......!“ میں اچھل پڑا۔ ”وہ کس طرح......؟“

”اگر آپ طریقے سلیقے سے اس نادان کو سمجھانے کی کوشش کرتے تو مجھے یقین ہے وہ اپنی ضد سے باز آجاتی اور آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

”آپ کو کیا پتا کہ میں نے اسے کتنا سمجھایا تھا۔“ میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”لیکن اس نے میری ایک نہیں مانی۔ وہ ایک ہی......“

”سب جھوٹ ہے، بکواس ہے......!“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی۔ ”وکیل بے حس اور سفاک ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنی فیس اور فائدے پر نظر رکھتا ہے۔ موکل جائے جہنم میں!“

”ایسی بات نہیں ہے خاتون!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو یقیناً میرے بارے میں کوئی غلط فہمی......“

اسی لمحے لائن بے جان ہوگئی۔ روحی بانو نے اپنے دل کی بات کہنے کے بعد ریسیور رکھ دیا تھا۔ وہ فرزانہ کی لرزہ خیز موت پر جس ذہنی کیفیت سے گزر رہی تھی میں نے اس کے پیشِ نظر اس کی بات کا قطعاً برا نہیں منایا۔ میرا خدا بہتر جانتا تھا۔ میں اپنے ضمیر کے سامنے ایک دم مطمئن تھا کہ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔

فرزانہ کی موت میں عباسی ہی کا ہاتھ تھا یا واقعی یہ کسی غیر متعلق اور نامعلوم راہزن کی کارروائی تھی، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ نجات کی خواہاں تھی اور اسے نجات مل گئی تھی۔ میں نے بہ طریقِ احسن اسے عباسی سے چھٹکارا دلا دیا تھا۔

یہ الگ بات کہ اس کی نجات دائمی حیثیت کی حامل قرار پائی تھی!

(تحریر حسام بٹ)

جو کیڑی سو کائی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

یوں تو دنیا دلکش رنگوں کا مجموعہ ہے مگر... تقدیر کا رنگ ڈھنگ ہی نرالا ہے... کہیں رنگین لمحات تو کہیں سنگین حالات... کسی کا دماغ عرش پر تو کوئی فرش پر چلنے کے قابل بھی نہیں... زندگی کا یہی تفاوت احساس دلاتا ہے کہ نصیبوں کا لکھاری کس قدر بااختیار ہے۔

قدم قدم پر سانسوں کی قیمت چکانے والے مفلوک الحال کی حالتِ زار

وہ لمبا آدمی لمبی سی گندی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ گندی سی شلوار، گندی سی قمیص کے نیچے پھنسی ہوئی تھی۔ سر پر میلی کچیلی پگڑی لگی ہوئی تھی۔ قمیص اور شلوار پر بہت سارے دھبے لگے ہوئے تھے، آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ سر، ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال سفید تھے۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا ہے۔

اس نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور تقریباً

روتے ہوئے کہا۔ ”سائیں، میری بہو کی جان بچالو، وہ مر گئی تو ہم سب مر جائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے جیسے معافی مانگ رہا ہو۔

اس کی حالت دیکھ کر میرا دل جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، ایسا لگا جیسے دل کے اندر ہر طرف خون کی تیز بارش ہو رہی ہے۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”بابا وہ سب کچھ کریں گے۔ جو کچھ کرسکتے ہیں کریں گے۔ پر اس کا حال اچھا نہیں ہے، اس کا خون بہت چلا گیا ہے جسم سے باہر، سانس ٹوٹ رہی ہے۔“

وہ اپنی تقریباً مری ہوئی بہو کو کسی گاؤں سے گدھا گاڑی پر لٹا کر لایا تھا۔ سندھ دھرتی کے کسی گاؤں کی کسی جھگی میں بچہ جننے کے بعد جو خون جانا شروع ہوا تو جاتا ہی رہا۔ گاؤں کی دائی نے فوراً ہی کہہ دیا کہ معاملہ اس کے بس سے باہر ہے۔ آٹھ دس بچوں کی کئی ماؤں کو ایسے ہی مرتے دیکھا ہے میں نے۔ نہ جانے کیا ہو جاتا ہے، بچہ تو جن دیتی ہیں مگر خون نہیں رکتا۔ ایسا ہی کچھ مینا کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

اس کے چھ بچے پہلے تھے اور اب ساتویں بچے کی پیدائش کا وقت آیا تو دائی نصیبو والی نے وہی سب کچھ کیا جو ایسے موقعوں پر اس کی ماں، ماں کی ماں اور شاید اس کی بھی ماں کی ماں کرتی رہی تھیں مگر...... سب کچھ کرنے کے باوجود خون رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اس نے بیٹے کو کھیت پر کام کرتے ہوئے چھوڑا اور گاؤں میں موجود گدھا گاڑی پر جو کچھ بچھا سکتا تھا بچھا کر اسے لٹا دیا اور نہ جانے کن کن راستوں سے مینا، اس کی بڑی بیٹی اور بیٹے کو لے کر نواب شاہ کے سرکاری اسپتال پہنچا تھا۔

نواب شاہ کے اسپتال میں تو روزانہ ہی ایسے مریض آتے ہیں، آس پاس کے گاؤں دیہاتوں سے، ایسے علاقوں سے جہاں دیہی صحت کے مراکز ہیں مگر ان میں وڈیروں نے مہمان خانے بنا لیے ہیں۔ جیسے اسکولوں کو جانوروں کے باندھنے کے اصطبل بنا لیتے ہیں۔ اگر آس پاس کوئی رورل ہیلتھ سینٹر ہو بھی تو وہاں جمعدار، ویکسی نیٹر اور کمپاؤنڈر کے علاوہ کوئی ڈیوٹی کرنے آتا نہیں ہے۔ نرسوں کا تو ویسے بھی وجود نہیں ہے اور رہی بات ڈاکٹروں کی تو انہوں نے اپنی تقرری شہر میں کرائی ہوتی ہے۔ جمہوریت اور آمریت دونوں میں یہ کام چلتا ہے۔ تنخواہ رورل ہیلتھ سینٹر سے ملتی ہے اور تقرری کسی ایسی جگہ پر جہاں کام نہیں کرنا پڑتا...... بلکہ اکثر و بیشتر تو جانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ گھر بیٹھے تنخواہ اور صبح شام پرائیویٹ کام۔ ایسی عیاشی صرف ہمارے ملک میں ممکن ہے۔ یہ باتیں سب کو پتا ہیں مگر کوئی بھی کچھ کرنے تیار نہیں ہے کیونکہ جو کچھ کرسکتے ہیں ان کا یہ مسئلہ نہیں اور جن کا یہ مسئلہ ہے وہ کچھ کر نہیں سکتے۔ وہ صرف ووٹ دے سکتے ہیں، اپنی لاعلمی سے مجبور انہی لوگوں کو ووٹ دیتے ہیں جنہوں نے نہ پہلے کچھ کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کچھ کرسکیں گے۔

پیر بخش جیسے لوگوں کے خاندان تو ہوتے ہی اسی لیے ہیں کہ کھیتوں کھلیانوں میں کام کرتے رہیں، مختلف امراض کا شکار بنتے رہیں۔ ان کی آنکھوں کے عدسے اندھے ہوجائیں، ان کے بچوں کو ٹیکے نہ لگیں، انہیں پولیو ہو، ہیپاٹائٹس ہو، اگر بچ جائیں تو خیر ہے، اندھے ہوجائیں تو بھی ٹھیک اور مر بھی جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ غریب کے مرنے سے کوئی طوفان نہیں آتا، کہیں دھرتی نہیں ہلتی، کوئی آسمان نہیں پھٹتا، سب کچھ چلتا رہتا ہے۔ موت تو صرف ایک عام واقعہ ہے، روزمرہ کا واقعہ جیسے بڑے لوگ شہر میں چکن تکا کھاتے ہیں یا کسی چائنیز ریسٹورنٹ میں چکن کارن سوپ پیتے ہیں یا پھر صبح فوجی کارن فلیکس کا ناشتا کرلیتے ہیں۔

کئی اور سرکاری اسپتالوں کی طرح نواب شاہ کے اسپتال میں بھی سہولتیں واجبی سی ہیں۔ گندا سا لیبر وارڈ جہاں اکثر و بیشتر پانی نہیں ہوتا۔ بجلی چلی جائے تو لالٹینوں، ٹارچ، موم بتی اور موبائل فونوں کی روشنی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جنریٹر چلتا تو چل کر بند ہوجاتا اور پھر دوبارہ چلتا، بند ہوتا۔ چلتا اور اسی چکر میں کام کرنے کی عادت سی ہوجاتی ہے ڈاکٹروں کو۔ خون کے بینک میں ٹیکنیشن کی کمی کے ساتھ ساتھ خون کی کمی ہمیشہ ہوتی، اکثر و بیشتر خون ہوتا ہی نہیں، مریض ہی اپنے رشتہ داروں کو خون دینے کے لیے لے کر آتے ہیں۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوا کہ غلط قسم کا خون دے دیا گیا اور پھر خون کی پہلی بوند جاتے ہی مریض کی موت ہوگئی۔

جونیئر ڈاکٹرنیاں گھروں سے جمع کیے ہوئے خیرات زکوٰۃ کے پیسوں سے دوائیں خرید خرید کر جمع رکھتیں تاکہ ہنگامی حالات میں مریضوں کو دے سکیں۔ ایک ایک ڈاکٹر تعیناتی کے دوران کئی کئی دفعہ خود اپنا خون دیتی تاکہ مریضوں کی جانیں بچا سکیں۔

اخبارات میں یہ خبریں تو ضرور چھپتیں اور ٹیلی وژن پر دکھائی جاتی ہیں کہ ڈاکٹر نے آپریشن کے دوران مریض کے پیٹ میں قینچی چھوڑ دی جس پر سرکار تادیبی کارروائی کا آغاز بھی کردیتی، کبھی ڈاکٹروں کے خلاف مقدمہ بھی بن جاتا مگر یہ خبر کبھی نہیں چھپتی اور نہ ٹی وی پر دکھائی جاتی کہ سہولتوں کے نہ ہونے کے باوجود ڈاکٹروں نے ان گنت جانیں اپنے خون کا عطیہ دے کر بچائیں، تنخواہیں نہ ملنے کے باوجود اپنے گھروں سے پیسے لا لا کر، مریضوں کے لیے دوائیں خرید کر انہیں بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ خبریں بھی نہیں چھپتی تھیں کہ سیاست دانوں اور نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ سے تعلقات رکھنے والے ڈاکٹر اپنی ذمے داریوں کو نہیں نبھاتے ہیں، دنیا ایسے ہی چل رہی ہے اور شاید ایسے ہی چلتی رہے گی...... مگر کب تک؟

مینا کو ہم لوگ نہیں بچا سکے۔ خون بہت ضائع ہوچکا تھا۔ بڈھا پیر بخش کسی نہ کسی طرح سے اسے لے کر اسپتال تو پہنچ گیا مگر بہت دیر ہوچکی تھی۔ مینا کو خون بھی دیا گیا، سفید خون کی صورت میں خون کے وہ اجزا بھی دیے گئے جن میں خون کو بہنے سے روکنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ خون بند کرنے کے لیے دوائیں بھی دی گئیں۔ ابھی یہ فیصلہ ہوا ہی تھا کہ اس کا پیٹ کھول کر بچہ دانی ہی نکال دی جائے کہ اس کے دل نے دھڑکنا بند کردیا۔ کب تک دھڑکتا آخر ایک حد ہوتی ہے دل کے دھڑکنے کی۔ کب تک ساتھ دیتا ناکارہ ہوجانے والے گردوں کا جنہوں نے پیشاب بنانا بند کردیا تھا، اس جگر کا جو اپنے ہی اندر خون کو بہنے سے نہیں روک پارہا تھا۔ جب دماغ بھی ساتھ چھوڑ گیا تب اس کی ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں نے آخری دفعہ جھپکی لی اور دل بھی بند ہوگیا۔

ایسی حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ روزانہ اس ایٹم بم رکھنے والے ملک میں جوان لڑکیاں اور جوان بچے بچیوں کی مائیں جان دے دیتی ہیں۔ انہیں خون نہیں ملتا، ان کے گردے ناکارہ ہوجاتے ہیں، ان کے جگر فیل ہوجاتے ہیں، ان کا دماغ کام کرنا بند کردیتا ہے پھر بے چارہ دل بھی جواب دے دیتا ہے۔

شاید موہنجوڈرو کے زمانے سے یہ ہورہا ہے اور شاید آگے کے زمانوں تک یہی ہوتا رہے گا۔ میں سر جھکائے پیر بخش کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے چہرے پر نظر نہیں ڈال سکتا تھا۔ غم واندوہ سے بھرا ہوا چہرہ جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کا چہرہ دیکھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔

اپنی گدھا گاڑی میں اپنی بہو کی لاش لے کر وہ خاموشی سے اپنے گاؤں کی طرف واپس چلا گیا۔ میں بھی اسے اور بہت سارے مریضوں کی طرح بھول گیا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مریض، مریض کے رشتے دار، دوست، گھر والے، محلے والے، روزانہ ہی ان لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ روزانہ ان کے ساتھ برا ہوتا ہے۔ کبھی نظام کی ناکامی، کبھی فرد کی نااہلی، کبھی بجلی کا مسئلہ، کبھی پانی کا بحران۔ افسوس ناک حادثے کے بعد روتے پیٹتے ہوئے لوگ اپنے گوٹھوں، گھروں کو چلے جاتے ہیں اور ہر کوئی سب کچھ بھول بھال کر اپنے روزانہ زندہ رہنے کے چکروں میں چکرانے لگتا ہے۔ میں بھی پیر بخش کو بھول گیا۔

اس واقعے کو دو سال ہوگئے تھے کہ بہت اصرار کے بعد تو شہرو فیروز کے علاقے میں شکار کی دعوت ملنے پر میں بھی چلا گیا۔ میں شکاری قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ درحقیقت معصوم و بے زبان جانوروں کو مارنے والے اس کھیل کو کبھی میں نے دلچسپ نہیں سمجھا۔ اکثر دوستوں کے بارے میں پتا چلتا کہ وہ شکار پر گئے ہوئے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ یہ کس قسم کا کھیل ہے جس میں جدید ہتھیاروں سے مسلح ہوکر ان نہتے جانوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے جو اوپر والے کی طرف سے سنسار کے اس جنگل میں آزاد گھومنے، دوڑنے پھرنے کے لیے بنائے گئے ہیں مگر یہ تو میری سوچ تھی، ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی اس سوچ کو صحیح سمجھتا۔ ڈاکٹر اسرار کے بہت اصرار پر نہ جانے کیوں میں بھی ساتھ ہولیا تھا۔ شکار کیا تھا ایک میلا تھا۔ بھیڑ اور چار وہیل پر دوڑنے والی گاڑیوں کا اژدحام تھا۔ یہ میری زندگی کا عجیب و غریب تجربہ تھا۔

ہوا یہ کہ سعودی عرب سے آئے ہوئے کچھ شہزادوں کے لیے علاقے کے بڑے زمیندار کی طرف سے شکار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ درپردہ شاید کچھ اور ہی مقاصد رہے ہوں گے، شاندار انتظام کیا گیا تھا۔ جنگل کے بیچوں بیچ چھولداریوں کا ایک شہر آباد کردیا گیا تھا۔ دن بھر جنگل میں کچے راستوں پر گاڑیاں دوڑتی رہیں تھیں۔ شہزادوں کے لیے کہیں پر پہلے سے پکڑے ہوئے ہرن چھوڑ دیے گئے اور کہیں پر تیتر اڑا دیے گئے کہ ان کا شکار کرلیا جائے۔ شام کے بعد چھولداریوں میں نہانے دھونے، کھانے پینے اور ناچنے گانے کے ساتھ ہر قسم کا انتظام تھا۔ ایسا انتظام میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ پانچ ستاروں والے ہوٹلوں کے کمروں جیسی چھولداریاں تھیں، گرم پانی تھا اور کھانے کے لیے ہر قسم کے کھانے اور پھلوں کے ساتھ پینے کی بھی ہر چیز موجود تھی۔

رات گئے تک پارٹی چلتی رہی۔ دوسرے دن دوپہر کے کھانے کے ساتھ ناشتے کا انتظام تھا۔ ایسا انتظام کہ ہوٹل بھی شرما جائیں۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ مالداروں کے پاس کتنا پیسا ہے اور دنیا بھر کے مالدار اپنے معاملات میں یکساں ہیں، متحد ہیں اور مستعد ہیں۔ اس رات شکار کے بعد عیش وعیاشی کے مظاہر تھے۔ وہ ساری باتیں شاید میں کبھی نہ بھول سکوں۔ میں نے وہ سب کچھ دیکھا جو میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔

تین دن شکار کے نام پر ہونے والی عیش وعیاشی کے بعد شہزادے اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں پنجاب کی طرف روانہ ہوگئے جہاں ان کا پروگرام چولستان اور ملتان کے صحراؤں سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچنا تھا۔

میں اور اسرار ایک دن کے لیے اور ٹھہرے تھے۔ علاقے کے بڑے زمیندار کے باپ کی بیماری میں اسرار کا علاج چلا تھا اور اسرار کی خصوصی مہمانداری ضروری تھی۔ جس کے لیے اسے اور اس کے ساتھ مجھے بھی روک لیا گیا۔ حویلی کی زندگی کا تجربہ بھی پہلا تھا۔ روپے پیسوں کی زیادتی سے جو کچھ ہوسکتا وہ سب کچھ دیکھنے کو ملا۔ قدیم اور جدید دنیا کا امتزاج نظر آیا۔ ایئر کنڈیشنڈ، مائیکروویو، گیس اور بجلی سے چلنے والے لوازمات کے ساتھ پرانے ہندوستان کے غلاموں کی طرح کے ہاری اور مزدور بھی تھے۔ مغلوں کی کیا شان ہوگی جو آج کے زمینداروں کی شان ہے۔ دیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ سمجھنے کے لیے بھی بہت کچھ اور کرنے کے لیے بھی بہت کچھ مگر ایسا لگتا تھا کہ دنیا جیسے اپنی جگہ پر تھم گئی ہے، ساکت وجامد۔

اس دن دوپہر کھانے کے بعد واپسی ہوئی۔ کھیتوں کے درمیان سے پتلی سی لہراتی ہوئی سڑک کے ساتھ چلتے چلتے ایک جگہ گاڑی روک کر میں کھڑی فصل کی تصویر لے رہا تھا کہ مجھے وہ نظر آیا۔ وہی لمبی سی، گندی سی شلوار قمیص، وہی چہرہ اور چہرے پر سفید ڈاڑھی اور وہی بڑی بڑی آنکھیں جن میں موٹے شیشے کا عینک لگی ہوئی تھی۔

وہ ایک درخت کے نیچے چھ سات بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں اسے فوراً ہی پہچان گیا اور وہ بھی مجھے پہچان کر کھڑا ہوگیا۔

"یہ سارے اسی کے بچے ہیں سائیں۔" اس نے بڑی مایوسی سے مگر مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا کہ سارے ہی بچے کھیتوں پر کام کررہے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں سب ہی لوگ۔

"کیا یہ اسکول نہیں جاتے؟" میں نے سوال کیا۔

"اسکول جاتے تھے پر مینا کے علاج پر جو خرچا [...] اسے تو دینا ہی پڑے گا۔ سارے کے سارے زمینوں [...] کام کرتے ہیں تو جاکر کچھ کھانے کے لیے کماتے ہیں۔ زمیندار کا قرضہ تو چکانا ہوگا۔" بوڑھے کی آواز جیسے کنویں سے آرہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا بولوں کہ وہ آہستہ سے بولا۔

"وہ بڑی اچھی عورت تھی ڈاکٹر۔ اس کا شوہر [...] تو پاگل ہی ہوگیا ہے اس کی موت کے بعد سے۔ کچھ کام نہیں کرتا، نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، بس سوچتا رہتا ہے اور [...] ہے ایک دن ایسے ہی مرجائے گا، دو سال میں وہ ختم ہوگیا۔ پہلے اس کی ہمت ٹوٹی اب جسم بھی ٹوٹ گیا ہے۔ بیٹا میرا ہے پر مجھ سے زیادہ بوڑھا ہوگیا ہے۔" اس نے بڑے افسوس سے کہا۔

اس کے چہرے پر چھائی ہوئی گمبھیر سنجیدگی سے مجھے جیسے خوف سا آیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"اسے مرنا نہیں تھا ڈاکٹر! کیوں مرگئی، وہ کیوں مرگئی۔ سب کو چھوڑ کر، ابھی دیکھا ہی کیا تھا اس نے دنیا میں۔"

میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکا، میں نہیں کہہ سکا اس سے کہ وہ اس لیے مرگئی کہ سندھو دریا کے ساتھ سندھ دیش کی دھرتی بھی بنجر ہوگئی ہے، سندھو ماں کی کوکھ بانجھ ہوگئی ہے، وہ بیٹے نہیں جنتی بیوپاری جنتی ہے جو عربوں کے لیے چھولداریوں کا شہر بساتے ہیں جہاں راگ رنگ کی محفل میں عورت کو بیچ دیتے ہیں تاکہ انہیں مراعات ملیں، انعامات ملیں، بخششیں ملیں۔ پہلے بھی پیر بخش جیسے لوگ ہاری بن کر اپنے آپ کو بیچتے تھے۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو بیچ رہے ہیں قرضہ چکانے کے لیے لیکن پہلے امید تھی اب امید بھی نہیں ہے۔ اب ہاری فقیر ہیں اور مزدور بھکاری، پڑھنے لکھنے والے عالم لوگ اپنی ٹوپی اور ڈاڑھی کے ساتھ دیکھتے ہیں، خاموش رہتے ہیں، کس میں دم ہے کہ کھڑا ہو اور کھڑا ہو کے کہے جو کیڑی سوکائی۔ کوئی نہیں، کبھی نہیں۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہا کہہ نہ سکا، اسے دیکھتا رہا جس کے پوتے پوتیاں کھیتوں میں اتر رہے تھے کسی کے لیے کمانے کو، کسی قرضے کو چکانے کو۔

میں دریچے کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ دونوں کہنیاں چوکھٹ پر ٹکادیں اور مضمحل نظروں سے باہر دیکھا۔ کچھ دیر پہلے ہونے والی بارش کے باعث فضا نکھری نکھری، مرطوب اور قدرے خوش گوار ہوگئی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے مکانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پرانی وضع کی کھپریل کی چھتوں والے مکان۔ کہیں کہیں نیم اور پیپل اور گولر کے عظیم الجثہ درخت۔ بارش کے بعد آسمان کھل گیا۔ بس یہاں وہاں بادلوں کے اِکّادُکّا ٹکڑے نظر آرہے تھے۔ جن کے پیش نظر مرغابیوں کی دو ڈاریں مغرب سے مشرق کی جانب اڑتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میری نظر چند ثانیے آسمان پر بھٹکتی پھر کھپریل کی سرخ چھتوں پر چلتی ہوئی بہت دور کرائسٹ چرچ کالج پر جاٹکی۔ کرائسٹ چرچ کالج جہاں میں نے زندگی کے تین بہترین سال گزارے تھے۔ ان تین برسوں کا ایک ایک دن میری یادوں میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ کیونکہ وہ دن مسرت اور بےفکری کے تھے۔ زندگی کو زندگی کی طرح جینے کے تھے۔ دل کی بازیاں کھیل کر ہارنے یا جیتنے کے تھے۔ میں نے بھی دل کی بازی کھیلی تھی مگر شاید میں اچھا کھلاڑی نہیں تھا۔ شاید مجھے اس کھیل کے سب ہی مطالبات اور داؤ پیچ کا علم نہیں تھا کیونکہ میں جیت نہیں سکا تھا بلکہ ہار میرا مقدر ٹھہری تھی۔

میں نے گردن جھکائی اور نیچے بازار پر نظر ڈالی۔ بازار

ش۔ صغیر ادیب

بوڑھا درخت

جب دل کی دنیا جوبن پر ہو تو باہر کے سارے موسم خوشگوار لگتے ہیں مگر... جب اس جوبن پر خزاں چھاجائے تو ہر لمحہ ویرانی اور زندگی حیرانی کے سوا کچھ بھی نہیں... کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا لیکن دل کی ویرانیوں میں بالآخر جب پھر سے بہار کا گزر ہوا... تو اس کا جوش اور ولولہ دیکھنے کے لائق تھا۔

حسرت اور مایوسی کی چادر کو تار تار کرنے والے عقل مند کی روداد

کی رونق اور چہل پہل جو بارش کے باعث رک گئی تھی پھر بحال ہو چکی تھی۔ لوگوں کا ہجوم فٹ پاتھ پر رواں دواں تھا۔ دکانوں میں لوگ خریداری میں مصروف تھے۔ سڑک پر وقفے وقفے سے رکشے، تانگے اور کبھی کبھار کوئی کار بھی گزر رہی تھی۔ میں نے ذرا دھیان کے ساتھ مگر ایک لاشعوری تجسس کے عالم میں لوگوں کو دیکھا۔ کیا بات ہے؟ اتنے بہت سارے لوگوں میں ایک چہرہ بھی ایسا دکھائی نہیں دے رہا جس پر غم اور افسردگی کی ذرا سی گرد بھی ہو۔ ہر شخص خوش نظر آتا ہے۔ مطمئن اور بے فکر۔ کیا واقعی ان کو کوئی دکھ نہیں۔ کیا واقعی ان میں سے ہر فرد دل کے کھیل میں ہارا نہیں بلکہ سرخرو ہوا ہے؟ میں نے افسردگی اور تجسس کے ساتھ سوچا اور گردن گھما کر میز پر پڑے لفافے پر نظر ڈالی۔

شاید ایسا ہی ہے کہ کسی کو کوئی رنج نہیں ہے۔ زندگی ان کے لیے صرف مسرت اور بے فکری کا نام ہے یا شاید یوں ہے کہ ان میں سے کسی نے کبھی دل کی بازی کھیلی ہی نہیں مگر میں نے تو کھیلی بھی ہے اور ہارا بھی ہوں... اور اب ہار کا صدمہ دل پر لیے اس کھڑکی میں چپ چاپ بیٹھا ہوں۔ شکستہ خاطر، پژمردہ اور گمشدہ۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ میرے پاس کوئی کل ہے یا نہیں؟ ان سوالوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ زندگی میرے لیے اس کھلونے کے مصداق ہو گئی ہے جسے دل بھر جانے پر بچے توڑ دیتے ہیں۔ کیا میں بھی اس کھلونے کو توڑ دوں گا۔

حالانکہ میں جانتا ہوں کہ یہ صریحاً پاگل پن ہے۔ وہ دن جو خوشیوں اور رنگوں سے عبارت تھے، پرندوں کی طرح اڑ اڑ کر انجانے دیسوں کو چلے گئے اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ پھر بھی ان پرندوں کو یاد کرتے رہنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ مجھے سنبھلنا چاہیے۔ ماضی کی کھڑکیاں بند کر کے مستقبل کی طرف دیکھنا چاہیے۔ زندگی ایک بیش بہا نعمت ہے اور دنیا اپنے تمام تر داغ دھبوں کے باوجود بہت حسین ہے۔ مجھے جینا چاہیے اور دنیا میں بکھری نعمتوں سے بہرہ مند ہونا چاہیے۔ زندگی بار بار تو نہیں ملتی۔

لیکن کیا میں ایسا کر سکتا ہوں۔ ہر چند کہ چاہتا ہوں کہ اس ردائے دکھ کو اتاروں اور ایک بار پھر جینا شروع کر دوں مگر شاید یہ میرے بس کی بات نہیں۔ شاید میں ہجوم یاس میں اس طرح گم ہو گیا ہوں کہ اب خود کو تلاش کرنا میری دسترس میں نہیں۔ اتنا تنہائی پسند ہو گیا ہوں کہ دنوں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ کسی شے سے دلچسپی نہیں رہی۔ دوستوں سے کتراتا ہوں۔ صحت بھی متاثر ہوئی ہے۔ اماں میری حالت سے پریشان اور متردد رہتی ہیں۔ بڑی آپا کو بھی میری فکر ستاتی ہے۔ کئی بار کہہ چکی ہیں "بھیا، کیا بات ہے۔ کیوں اتنے اداس رہتے ہو۔ کیوں اپنے آپ سے لڑتے جا رہے ہو۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے سارے دکھ اپنے سر لے لوں گی۔"

"نہیں آپا تم پریشان مت ہو۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"کیا کوئی لڑکی ہے۔ مجھے بتاؤ۔ میں اس کے گھر جاؤں گی۔"

"ارے نہیں آپا، ایسی کوئی بات نہیں۔"

اب میں آپا کو کیا بتاتا حالانکہ جانتا ہوں کہ وہ میرے لیے سب کچھ کر سکتی ہیں۔ زبان سے صرف کہتی ہی نہیں بلکہ واقعی میرے سارے دکھ کو اپنے سر لے سکتی ہیں مگر میں جس دکھ میں مبتلا ہوں، اس کا مداوا ان کے پاس نہیں۔ یہ جہنم جو میرے اندر جل رہا ہے، اس میں مجھے ہی جلنا ہے اور کسی سے کچھ کہے بغیر۔ جہنم ...... مگر صرف چند ماہ پہلے تک تو یہ جہنم نہیں تھا بلکہ میرے اندر ایک گلستان آباد تھا جو رنگوں اور خوشبوؤں سے معمور رہتا تھا مگر پھر کیا ہوا؟ کیسے اس گلستان کو آگ لگ گئی اور سارے پھول جل کر خاکستر ہو گئے۔ کیا یہ سب کچھ صرف ایک لفافے کی بدولت ہوا ہے۔ ہاں، یہ ٹھیک ہے صرف ایک لفافے کے باعث ...... میں نے گردن گھما کر ایک بار پھر میز پر پڑے لفافے پر نظر ڈالی۔

☆☆☆

اس لفافے کا رنگ گلابی ہے۔ اندر ایک کارڈ ہے۔ دعوتی رقعہ، جس پر میری محرومی کی کہانی سنہری حروف سے لکھی ہے۔ میرے من میں یکا یک ایک مجروح خواہش نے سر ابھارا۔ ایک بار پھر اس کہانی کو پڑھوں جو محض چند لفظوں میں بیان کر دی گئی ہے مگر ہمت نہ کر سکا پھر میں نے ایک سگریٹ جلائی اور افسردہ نظروں سے باہر دیکھنے لگا۔ سہ پہر کی دھوپ اب کمہلا گئی تھی۔ آسمان پر محو پرواز مرغابیوں کی ڈاریں بھی کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ مگر چند ایک کبوتر، چیلیں اور کچھ دوسرے پرندے یہاں وہاں اڑتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ پتنگیں بھی اڑ رہی تھیں۔ پیلے رنگ کی ایک پتنگ کو کسی دوسری پتنگ نے کاٹ دیا تھا اور وہ پیلی پتنگ ڈگمگاتی ڈولتی ہوا کے رحم و کرم پر بہتی چلی جا رہی تھی۔ بے مقصد، بے منزل، اسے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ ہوا اسے جدھر لے جائے گی اسے جانا ہوگا۔ میں یکا یک پژمردگی سے مسکرا دیا، پتنگ زندگی ہاں یوں بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی زندگی کی پتنگ بھی اسی طرح کٹ جاتی ہے۔ پھر اسے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ حالات کی ہوا جدھر لے جاتی ہے، اسے جانا ہوتا ہے۔

بے آسرا بے مقصد اور بے منزل۔ پتنگ اور زندگی میں کتنی گہری مماثلت ہے۔ میں نے افسردگی سے سوچا اور گردن جھکا کر نیچے سڑک پر نظر ڈالی۔

میرے مکان کے دائیں جانب فٹ پاتھ پر ایک پیڑ ہے۔ اتنا اونچا کہ اس کی شاخیں میرے دریچے تک پہنچتی ہیں اور اتنی قریب آ جاتی ہیں کہ موسم بہار میں جب ان ٹہنیوں میں چھوٹے چھوٹے سفید پھول کھلتے ہیں تو میں ہاتھ بڑھا کر ٹہنیوں کو چھو لیتا ہوں اور کبھی کبھی دو چار پھول توڑ لیتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس درخت کا کیا نام ہے مگر یہ درخت مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس کی پتیاں قدرے زردی مائل سبز ہیں اور پھولوں کی طرح پتیوں میں بھی ایک بھینی بھینی مدھم سی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ بہار کا موسم جب اپنے جوبن پر پہنچتا ہے تو پورا پیڑ مخملی پتیوں اور پھولوں سے لدپھند جاتا ہے اور میری کھڑکی پر اس کی بھری بھری شاخیں سایہ کیے رہتی ہیں۔ مگر بہار تو ابھی کچھ دور ہے۔ ابھی تو خزاں کے آخری ایام ہیں۔ اور پیڑ ابھی اپنے لباس سے محروم ہے۔ بس یہاں وہاں اکا دکا پتیاں ہی نظر آتی ہیں۔ میں کچھ دیر یونہی افسردہ نظروں سے پیڑ کی سیاہ شاخوں کو دیکھتا رہا جو مجھے اپنی ہی طرح تنہا اور آزردہ محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے ہم دونوں کا دکھ مشترک ہے۔ وہ بھی ٹھکرا دیا گیا ہے اور میں بھی۔ اس کا بھی کوئی رفیق، کوئی غمگسار نہیں ہے اور میں بھی بے آسرا رہ گیا ہوں۔ داغ ہم دونوں کے سینے میں ہے۔ محرومی کا داغ۔ کیا واقعی ہم دونوں ہم نصیب ہیں۔ سوچتے سوچتے میری آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے۔ میں نے ہاتھ دفعتاً آگے بڑھایا اور اس ٹہنی کو چھوا جو کھڑکی کے بالکل نزدیک تھی۔ ٹہنی نم اور خنک تھی۔ مجھے معاً ایسا محسوس ہوا، جیسے ایک المناک لمس میرے وجود میں اترتا جا رہا ہے۔ چند لمحے میں شاخ کو انگلیوں سے پکڑے رہا۔ پھر میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ شاخ کو آہستہ آہستہ سے جنبش دے کر چھوڑا اور گردن موڑ کر میز پر نظر ڈالی۔ گلابی رنگ کے لفافے کو چند ثانیے دیکھا اور اس دن کو یاد کیا جب پہلی بار نوشابہ سے ملا تھا۔

☆☆☆

پہلی ملاقات کالج ہی میں ہوئی تھی۔ وہ کالج کی طالبہ نہیں تھی مگر کسی کام سے اکثر پروفیسر انصاری کے پاس آتی تھی۔ میرا دوست اکرم اس کے بھائی سے واقف تھا۔ اس بنا پر وہ نوشابہ کو بھی جانتا تھا۔ پہلی بار ہمارا تعارف اس نے ہی کرایا تھا۔ مختصر تعارفی کلمات کے اختتام پر میں نے کہا "ہیلو۔"

اس نے کہا: "ہیلو۔"

میں نے کہا: "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

جواب میں وہ ہولے سے مسکرائی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا اور چند لمحے محو ہو کر دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ایک انوکھا خوابیدہ نور تھا۔ جیسے سویا ہوا گلاب کا پھول۔ ساتھ ہی ایک ایسی تمکنت بھی تھی جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی، صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ میں کچھ دیر تک اسے اپنے آپ سے اور گرد و پیش سے بے خبر ہو کر دیکھتا رہا اور اپنے دل کی دھڑکنیں سنتا رہا۔ جو ہر پل کے ساتھ تیز اور بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد میری محویت اس وقت ٹوٹی جب اکرم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔

"اچھا بھئی، اب تم دونوں ایک دوسرے کو بور کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اکرم چلا گیا تو میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "آپ کو پہلے تو کبھی کالج میں نہیں دیکھا؟"

"میں یہاں پڑھتی نہیں ہوں۔ پروفیسر انصاری کے پاس آئی ہوں۔ کچھ کام ہے۔"

قریب ہی ایک میز کے گرد چند کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم دو کرسیوں پر ٹک گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ایسی باتیں جن میں کوئی ربط نہیں تھا اور ان کا بظاہر کوئی مقصد بھی نہیں تھا۔ ایسی گفتگو عموماً پہلی ملاقات پر کچھ تکلف کے ساتھ ہوتی ہے۔ محض رسمی طور پر۔ چنانچہ ہم نے ادب کی باتیں کیں۔ ایک دوسرے سے اپنی پسندیدہ کتابوں کا ذکر کیا۔ پھر کچھ تھوڑا سا ذکر سیاست کا بھی ہوا۔ گفتگو کرتے وقت نوشابہ کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی ریشمی مسکراہٹ رقصاں رہتی تھی۔ اس کی آواز نرم تھی اور اس میں چاندی کی کھنک جیسی مدھم سی گونج کا تاثر محسوس ہوتا تھا۔ وہ عموماً چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کرتی تھی۔ الفاظ کا انتخاب بھی نہایت نپا تُلا اور شائستہ تھا۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد واضح ہوگیا کہ اس کی معلومات مختلف موضوعات پر کافی وسیع ہیں۔ ادب، فنون لطیفہ، رسوم ورواج وغیرہ۔ نیز یہ انکشاف بھی ہوا کہ اس کی اور میری پسند میں کافی مماثلت ہے۔ جو اشیا اور رنگ اور فنون مجھے پسند ہیں، وہی اسے بھی پسند ہیں۔ مزید کہ اس کے اور میرے خیالات اور نظریات میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں۔ ملاقات کے اختتام پر میں نے زور سے سانس لی اور اس کی طرف مسمسی صورت بنا کر دیکھا۔

"بھئی اب تو مجھے افسوس ہو رہا ہے۔"

"کیوں......؟" وہ حیرت سے بولی۔

"نقصان جو ہوگیا ہے۔"

"کیسا نقصان؟" وہ مزید حیران ہوئی۔

"بھئی آپ سے اب ملاقات ہوئی ہے۔ پہلے کیوں نہیں ہوئی۔ یہ نقصان نہیں تو اور کیا ہے۔"

اس نے قدرے شوخ نظروں سے میری طرف دیکھا اور تیکھے انداز میں مسکرائی۔

پھر یوں ہوا کہ اکثر ہماری ملاقات ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ تکلفات میں کمی ہوئی اور ہم ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طور پر جاننے اور سمجھنے لگے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ جہاں اس کے والدین اور چھوٹے بھائی بہن سے ملاقات ہوئی۔ اس کا گھر میرے علاقے سے قدرے فاصلے پر ایک ایسے علاقے میں تھا۔ جہاں بیشتر آبادی متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے ملازمت پیشہ افراد پر مشتمل تھی۔ اس کا گھر بھی کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ صحن، بیٹھک، آنگن اور غالباً تین کمرے۔ مگر گھر صاف ستھرا اور سلیقے سے آراستہ تھا۔ جس سے اس کے والدین کے اچھے ذوق اور خوش مزاجی کا پتا چلتا تھا۔ اس گھر کو دیکھ کر اور اس کے والد سے گفتگو کر کے مجھے یک گونہ اطمینان ہوا کہ اس کے اور میرے سماجی مرتبے میں کوئی نمایاں فرق جواز نظر نہیں آتا تھا جو میرے لیے کسی قسم کی رکاوٹ بن سکتا۔ اس کے ابا برسوں کسی دفتر میں کلرکی کرنے کے بعد اب ملازمت سے سبکدوش ہوچکے تھے اور اب فرصتِ ایام کا لطف لے رہے تھے۔ وہ دیر تک حالاتِ حاضرہ اور عالمی سیاسی معاملات پر گفتگو کرتے رہے۔ چند سوالات میرے بارے میں بھی کیے۔ جن کا تعلق زیادہ تر تعلیم اور آئندہ زندگی کے منصوبوں سے تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ کالج میں میرا آخری سال ہے۔ کالج کے بعد کیا کروں گا؟ کچھ کہنا مشکل ہے۔ انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"تو کیا یونیورسٹی نہیں جاؤ گے؟"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "آپ تو جانتے ہیں۔ تعلیم اب کتنی مہنگی ہوگئی ہے۔ یونیورسٹی جانا آسان تو نہیں ہوتا۔"

"ہاں بھئی، یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تعلیم جب سے کاروبار بنی ہے، بہت گراں ہوگئی ہے۔ بے شمار ذہین اور حوصلہ مند نوجوان محض اس لیے ترک تعلیم پر مجبور ہوجاتے ہیں کیونکہ ان کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔ یوں نہ جانے ہمارے ملک میں کتنے جوہر قابل ضائع ہوجاتے ہیں حالانکہ میں نے سنا ہے کہ اکثر ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیم کی سہولت بالکل مفت مہیا کی جاتی ہے۔ جانے ہمارے ملک میں کبھی ایسا ہوگا یا نہیں۔"

"یہ ایک ایسا سپنا ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ بھی ہنسے۔ "خیر میاں کوشش کرنا کہ تعلیم منقطع نہ ہونے پائے۔ زندگی میں کچھ بننے اور ترقی کرنے کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔"

☆☆☆

میں نے سنا تھا اور چند ایک ایسے افراد سے ذاتی طور پر بھی واقف تھا۔ جنہوں نے محبت کی تھی اور ناکام ہونے پر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ زندگی ان کے لیے ایک بوجھ، ایک عذاب بن گئی تھی بلکہ کچھ تو زندگی سے ہی فرار ہوگئے تھے۔ مجھے ایسے افراد کی بابت جان کر ہمیشہ اچنبھا ہوا تھا۔ کیا واقعی یوں ہوتا ہے کہ لوگ دل لگاتے ہیں، دل کی بازی ہارتے ہیں اور پھر بددل ہو کر دنیا تیاگ دیتے ہیں۔ زندگی سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ مگر ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے؟ زندگی تو بہت خوب صورت بڑی انمول شے ہے اور صرف ایک بار ملتی ہے۔ ہاں صرف ایک بار آدمی اس دنیائے رنگ ونور میں آتا ہے۔ صرف ایک زندگی گزارتا ہے اور زمین کے چپّے چپّے پر بکھرے ہوئے انمول حسن اور خوب صورت نعمتوں سے مسرت کشید کرتا ہے۔ حظ اٹھاتا ہے اور پھر قیامت تک جینے کی آرزو کرتا ہے کہ زندگی ایسی ہی خوب صورت اور بیش قیمت شے ہے تو پھر ایسا کیوں کر ممکن ہے کہ آدمی اتنی پیاری شے کو جس کا کوئی بدل نہیں، اتنی آسانی سے ٹھکرا دیتا ہے۔ صرف محبت میں نامراد ہو کر مگر یہ تو دانش مندی کے منافی ہے۔ سراسر حماقت بلکہ پاگل پن ہے۔ محبت بے شک ایک فطری جذبہ ہے اور قدرت کا ایک دلکش عطیہ بھی۔ مگر محبت کی قدر و قیمت زندگی سے زیادہ تو نہیں۔ زندگی ہے تو محبت ہے۔ اگر زندگی ہی نہ رہے تو آدمی کیا خاک محبت کرے گا۔ گویا محبت زندگی کی محتاج ہے۔ آدمی زندہ رہے تو ایک بار محبت کرسکتا ہے اور بار بار بھی کرسکتا ہے۔ اس نگارخانۂ ہستی میں پری جمالوں کی کمی تو نہیں۔

لیکن نوشابہ سے ملنے، اسے جاننے اور پھر اس کی محبت میں مبتلا ہونے کے بعد اسے پانے کی شدید ترین آرزو میرے دل میں پیدا ہوئی تو میں نے سوچا فرض کرو، نوشابہ مجھے نہ ملی۔ وقت کے کسی موڑ پر وہ مجھ سے بچھڑ گئی تو میں کیا کروں گا؟ یہ خیال حد درجہ دہشت ناک اور لرزہ خیز تھا۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا کیونکہ مجھے محسوس ہوا کہ شاید میں بھی وہی کروں گا جو میری نظر میں پاگل پن ہے۔ صرف پاگل پن۔

☆☆☆

مگر میں نوشابہ کی محبت میں اچانک مبتلا نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ تو ٹھیک تھا کہ پہلی ہی نظر میں اس کی چاہت میرے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ تاہم اس کا احساس مجھے رفتہ رفتہ ہوا تھا۔ ابتدا میں تو بس یوں ہوتا تھا کہ ہم اکثر ملتے تھے۔ تفریح کے لیے مال روڈ پر نکل جاتے۔ کبھی دریا کا رخ کرتے۔ کبھی پارک اور کبھی کسی ریستوران میں بیٹھ جاتے اور کسی فضول سے موضوع پر زور وشور سے نہایت بے تکی اور مہمل بحث کرتے۔ ادب پر بات ہوتی تو کبھی ترقی پسندی کے بخیے ادھیڑتے، کبھی جدیدیت کی ایسی کی تیسی کرتے اور کبھی مابعد الطبیعیات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے۔ ایک بار میں نے نہایت معصومیت سے کہا۔

"مگر بھئی نوشابہ سوال یہ ہے کہ آخر یہ مابعد الطبیعیات ہے کس چڑیا کا نام؟"

نوشابہ نے اور بھی زیادہ معصومیت سے کہا۔ "پتا نہیں۔"

ایک بار کچھ دیر کے لیے میں اسے اپنے گھر بھی لایا۔ اور اپنی اماں، آپا اور چچی وغیرہ سے ملوایا۔ گویا ملاقات مختصر تھی مگر وہ خوش دلی اور بے تکلفی سے سب سے ملی۔ فطری طور پر آپا کو

تجسس ہوا۔ سرگوشی میں استفسار کیا۔
"کون ہے؟"
"میرے ایک دوست کی بہن ہے۔ اس بنا پر میں بھی واقف ہوں۔" میں نے بہانہ بنانے کی کوشش کی۔
"صرف واقفیت ہے؟" آپا نے گہری نظروں سے گھورا۔
"ہاں بھئی، تم خواہ مخواہ الجھن میں مت پڑو۔"
"خیر......" آپا نے طویل سانس لی "اگر کچھ ایسا ویسا ہو تو مجھے بتا دینا۔ سمجھے۔"
لیکن آپا کو کچھ بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ اس کے بعد بھی ایسا موقع نہیں آیا کہ آپا کو نوشابہ کے گھر لے جاتا۔ چنانچہ بات آئی گئی ہوگئی۔ اور غالباً آپا بھی اسے بھول بھال گئیں۔ مجھے اس وقت تک نوشابہ کے تئیں اپنے جذبات کی اہمیت اور شدت کا کوئی خاص اندازہ نہیں تھا۔ بس ایسا لگتا تھا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ وہ خوب صورت ہے۔ خوش مزاج اور خوش مذاق ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی لڑکی میں ہونی چاہیے اور اگر اس کی رفاقت مجھے سدا کے لیے نصیب ہو جائے تو مجھے خوشی ہی ہوگی۔ یوں میں نے اپنے دل میں اسے پانے کی تمنا کا ادراک کیا۔ لیکن اسے کتنا چاہتا ہوں اور یہ کہ وہ میرے لیے کتنی ناگزیر ہو چکی ہے' اس کا اندازہ تو اس دن ہوا جب اس نے مجھے اچانک مطلع کیا کہ کچھ دن کے لیے وہ دارالحکومت جا رہی ہے۔
میرا دل زور سے دھڑکا پھر معاً رک سا گیا۔ "کیوں؟"
"میں ایک کورس کر رہی تھی جو بوجوہ ادھورا رہ گیا تھا۔" وہ بتانے لگی "اب مکمل کروں گی۔"
"کتنے دن لگ جائیں گے؟" مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ممکن ہے سال بھر لگ جائے۔"
"سال بھر؟" میں نے متوحش ہو کر کہا۔ "یہ تو بڑی لمبی مدت ہے۔"
"ارے ایک ہی سال کی تو بات ہے۔ صرف بارہ مہینے۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی واپس آجاؤں۔" وہ شوخی سے بولی "پلک جھپکتے یہ وقت گزر جائے گا۔ تم آخر اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو۔"
میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ ہاں، میں اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہوں۔ یہ دہشت سی کیوں مجھ پر طاری ہوگئی ہے۔ نوشابہ آخر کیا لگتی ہے میری؟ اور تب پہلی بار مجھے شدت سے احساس ہوا کہ وہ میری کیا لگتی ہے۔ ارے وہ تو سب کچھ ہے میرے لیے۔ رگ جان کی طرح ناگزیر ہو چکی ہے۔ وہ میری سانسوں کی آمد و رفت ہے۔ آنکھوں کا نور اور دل کی دھڑکن ہے۔ وہ ہے تو گویا سب کچھ ہے اور نہیں ہے تو گویا کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ میری زندگی سے نکل جائے تو...... یہ خیال بہت لرزہ خیز تھا۔ میں اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا۔ دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ دل میں ایک مدوجزر سا اٹھا۔ کہہ دوں؟ سب کچھ کہہ دوں۔ اس شدید چاہت کا اظہار کردوں، جس کا انکشاف مجھ پر ابھی ابھی ہوا ہے لیکن میں نے اپنے آپ کو روک لیا۔
"نوشابہ یہ شہر ویران ہو جائے گا تمہارے بغیر۔" آخر کار میرے ہونٹوں سے نکلا۔
وہ مجھے گہری تجسس آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے چہرہ پڑھ کر میری اندرونی کیفیت جاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر یکایک وہ ہنسی۔ اس ہنسی کا مفہوم اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں مجھ پر منکشف ہوا۔ پھر اس نے ذرا شوخی سے کہا۔ "شہر بھی یونہی رہے گا اور اس کی رونقیں بھی۔ میں کچھ دن میں واپس آجاؤں گی۔"
دوسرے دن وہ چلی گئی۔
میں پلیٹ فارم پر موجود تھا اور ایک ستون کی آڑ میں کھڑا تھا۔ نوشابہ کو علم نہیں تھا کہ میں وہاں موجود ہوں اور نہ اس کے والدین اور دوسرے عزیزوں کو۔ جو اسے رخصت کرنے آئے تھے۔ میں ستون کے عقب میں کھڑا اس وقت تک ٹرین کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ پھر میں نے نوشابہ کے والدین کو دیکھا۔ وہ سب واپس جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے مگر کچھ فاصلہ دے کر میں بھی اسٹیشن سے باہر آیا اور یوں ہی بلا مقصد ایک طرف چل پڑا۔ دراصل مجھے قطعی احساس یا اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ بس میرے قدم خود بہ خود اٹھتے رہے اور میں وحشت زدہ اپنے آپ سے بچھڑا ہوا سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ گو سڑکوں پر ہجوم تھا۔ آوازیں تھیں مگر میرے کان کوئی آواز نہیں سن رہے تھے۔ وہاں تو صرف نوشابہ کی ہنسی کی آواز گونج رہی تھی۔ شوخ، کھنکتی ہوئی اور شاید کسی حد تک طنزیہ بھی۔ کیا مطلب تھا اس ہنسی کا۔ ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اسے میرے تردد اور پریشانی کی کوئی پروا نہیں ہے۔ جیسے اسے میرے جذبات کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ کیا واقعی؟
رات میں گھر پہنچا اور اپنی اداسی اور تنہائی کو اوڑھ کر سو گیا۔
☆☆☆

نوشابہ مجھے اپنی ایک دوست کا پتا دے گئی تھی۔ چنانچہ میں نے اسے پے در پے کئی خط لکھے۔ غالباً ہر تیسرے چوتھے دن ایک خط ضرور لکھا اور شاید لاشعوری طور پر یا نادانستگی میں اپنے دل کا حال بھی بین السطور بیان کردیا۔ یہ کہ میں کتنا افسردہ ہوں اس کے بغیر، یہ کہ میں رفتہ رفتہ اپنے آپ سے بچھڑتا جارہا ہوں اور یہ کہ ہر لمحہ اس کا منتظر رہتا ہوں۔ ابتدا میں اس نے میرے کچھ خطوط کے جوابات پابندی سے دیے۔ ایک بار یہ بھی لکھا کہ وہ میرے جذبات کی قدر کرتی ہے پھر اس کی چٹھیوں کی آمد میں وقفہ پڑنے لگا۔ تحریر بھی بتدریج رسمی سی ہوتی گئی۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے خطوط آنا بالکل بند ہوگئے۔ شاید وہ بھی رسمی باتیں کرتے کرتے اکتا گئی تھی اور شاید میرے خطوط پڑھے بغیر ہی ردی کی ٹوکری کی نذر کردیتی تھی۔

مگر میں اسے خط لکھتا رہا۔ بیتے دنوں کی باتیں کرتا رہا اور اسے یاد دلاتا رہا کہ ہم دونوں نے کتنا خوب صورت وقت ایک ساتھ گزارا تھا۔ اس سے اصرار کرتا رہا کہ میرے خط کا جواب دے کیونکہ انتظار میرے لیے عذاب بنتا جارہا ہے۔ بہت اصرار کے بعد آخر کار اس نے ایک خط کا جواب دیا۔

''میں نے تمہارے اور اپنے بارے میں غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہم دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ درمیان میں فاصلہ ہے۔ جو تم طے کرسکتے ہو اور نہ میں۔ ذات پات، عقائد نیز روایات اور قدروں میں اگر خامیاں ہیں تو ان کی کچھ افادیت بھی ہے اور ہم اس سے روگردانی نہیں کرسکتے۔ نیز یہ کہ مجھے بہرحال یہ بھی دیکھنا تھا کہ اگر ہمارا مستقبل مشترکہ ہو تو ہمیں کن حالات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں ایک بار تمہارے ساتھ تمہارے گھر گئی تھی۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ وہاں تمہارے گھر والوں میں میرے لیے کوئی گرمجوشی نہیں تھی۔ شاید انہوں نے مجھے پسند نہیں کیا تھا اور مجھے لگتا ہے کہ ان کے احساسات میں آئندہ بھی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ نیز مجھے یہ بھی خوف ہے کہ میرے گھر والوں کا طرزِ عمل بھی شاید تمہارے لیے کچھ ایسا ہی ہو۔ ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ ہم ایسے خواب نہ دیکھیں جن کی بنیاد دھوئیں پر ہو۔ یہ آخری خط تھا۔ اس کے بعد میں نے بھی خط نہیں لکھا۔ نوشابہ کا آخری خط اور دوسرے تمام خطوط اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ کبھی کبھی میں انہیں دیکھتا ہوں اور جب بھی دیکھتا ہوں اندر ہی اندر ٹوٹ جاتا ہوں۔ میرا دکھ روز بروز فزوں تر ہوتا گیا۔ اکثر میں نے اپنے دل کو ٹٹولا ہے اور اپنا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور مجھے لگا کہ نوشابہ کو نہ پاسکنے کا دکھ تو بہرحال ہے۔ مگر شاید اس سے زیادہ مجھے ٹھکرائے جانے کے احساس نے بے توقیر کیا ہے۔

☆☆☆

میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور گھوم کر ایک بار پھر میز پر پڑے لفافے پر نظر ڈالی۔ پھر باہر دیکھا، سہ پہر کی بجی بجی دھوپ اپنے آخری دم پر تھی۔ دھندلکا بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر میں اجالا ڈوب جائے گا اور اندھیرا آسمان سے اتر کر سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ میری ویران نظر چھتوں پر دبے قدموں اترتے اندھیرے پر چلتی ہوئی بہت دور دارالحکومت جا پہنچتی ہے اور مجھے یاد آتا ہے کہ میں وحشت کی انگلی تھام کر ایک دن گھر سے نکل پڑا تھا۔ شاید خود کو گم کردینے کے لیے یا شاید اپنے آپ کو پانے کے لیے۔ پھر شہروں شہروں بھٹکتا ہوا آخر کار دارالحکومت جا پہنچا تھا۔ یہ کوئی دو ڈھائی ماہ پہلے کی بات ہے۔ میں وہاں کیوں گیا تھا۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ ممکن ہے، میرے ذہن کے کسی ڈھکے چھپے گوشے میں نوشابہ کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش موجود رہی ہو۔ ہاں شاید یہی بات تھی کیونکہ ایک صبح میں اس سڑک پر جا پہنچا تھا جہاں نوشابہ کی دوست کا فلیٹ تھا اور فٹ پاتھ پر دیر تک کھڑا رہا تھا اور فلیٹ کو تکتا رہا تھا۔ میں نے اوپر جانے اور دستک دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس چپ چاپ کھڑا کھڑکیوں کی جانب دیکھتا رہا تھا۔ شاید میرے ذہن میں یہ امید اور خواہش تھی کہ ابھی نوشابہ فلیٹ سے اترے گی اور میں اسے ایک نظر دیکھ لوں گا مگر یہ توقع پوری نہیں ہوئی تھی۔

لیکن اسی شام میں نے بہرحال اسے دیکھ لیا تھا۔ فلیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں بلکہ شہر کے ایک انتہائی فیشن ایبل بازار میں۔ زخموں میں اٹھنے والی ٹیس کی طرح وہ منظر میری آنکھوں میں ابھرتا ہے۔ میں فٹ پاتھ پر ایک لیمپ پوسٹ سے ٹکا ہوا کھڑا ہوں۔ سامنے سڑک کے دوسری جانب ایک فیشن ایبل اسٹور ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ نوشابہ اسٹور سے باہر آرہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی پرس ہے اور گلے میں بیش قیمت طلائی ہار۔ اس کے ساتھ ایک آدمی ہے۔ بہترین تراش کے بھورے سوٹ میں ملبوس، ہاتھوں میں دو تین پیکٹ تھامے ہوئے۔ جن میں غالباً اسٹور سے خریدے گئے تحفے پیک کیے گئے تھے۔ وہ دونوں مسکراتے اور باتیں کرتے ہوئے دکان کے دائیں جانب کھڑی ایک خوب صورت کار میں بیٹھ گئے۔ کار روانہ ہوئی اور میرے سینے میں دل آہستہ آہستہ ڈوبتا چلا گیا کیونکہ اس ایک لمحے میں اچانک مجھ پر منکشف ہوا کہ میرے اور نوشابہ کے درمیان دراصل ''ہار'' حائل تھا۔ سونے

کی زنجیر، جو دولت سے آتی ہے۔ روایات، فرقہ اور عقائد وغیرہ تو محض بہانہ تھے۔ اصل بات صرف یہ تھی کہ میرے پاس چلتی دکتی کار نہیں تھی۔ مہنگے اسٹوروں سے تحفے خریدنے کے لیے چیک بک نہیں تھی اور اسے سونے کا ہار مہیا کرنے کی استطاعت میں نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے ہار میرا مقدر ٹھہری تھی۔

چشم تصور کے سامنے متحرک یہ منظر اتنا اذیت ناک تھا کہ میں نے گھبرا کر زور سے سر کو جھٹکا دیا اور پیڑ کی شاخوں کو غور سے دیکھا اور تب یکایک میری نگاہ ان ننھی، اُن چھوئی کنواری کونپلوں پر جم گئی۔ جو ٹہنیوں پر پھوٹ رہی تھیں۔ سیاہ شاخوں پر ننھی ننھی سفیدی مائل سبز کونپلیں۔ پھر میری نگاہ بھٹکی اور پورے پیڑ پر دوڑتی چلی گئی اور میں نے دیکھا کہ سب ہی شاخوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور بعض کونپلوں میں ننھی ننھی سبز ریشمی پتیاں بھی اگ آئی ہیں۔ یکایک میرا دل زور سے دھڑکا۔ یہ کیا ہے؟ مجھے یوں لگا جیسے پیڑ ہولے ہولے ہنس رہا ہے اور سرگوشی میں مجھ سے کہہ رہا ہے۔ کیا کہہ رہا ہے؟ میں نے غور سے پیڑ کو دیکھا۔ وہ اکیلا تو ضرور تھا، میری طرح مگر مایوس بالکل نہیں تھا، جیسے میں تھا۔ وہ مجھ سے سرگوشی کررہا تھا۔ تم اداس ہو۔ شکستہ خاطر ہو، صرف اس لیے کہ محبت میں ناکام ہوگئے ہو اور اب تمہیں زندگی بوجھ معلوم ہورہی ہے۔ یہ کتنی بری بات ہے۔ مجھے دیکھو، میں بھی اکیلا ہوں اور تب سے اس جگہ کھڑا ہوں، جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے مگر میں کبھی مایوسی اور ناامیدی سے ہارتا نہیں۔ جیسے تم ہار گئے ہو۔ مجھے جینے کا قرینہ آتا ہے۔ تم جانتے ہو، خزاں آتی ہے اور میرا سب کچھ چھین لیتی ہے۔ بے لباس کردیتی ہے مجھے۔ میرا سارا حسن فنا ہوجاتا ہے۔ مگر میں پژمردہ نہیں ہوتا بلکہ انتظار کرتا ہوں، بہار کا اور جب بہار آتی ہے تو پھر سے نیا لباس پہنتا ہوں۔ نئی پتیاں نکلتی ہیں۔ نئے شگوفے پھوٹتے ہیں اور میں اپنا کھویا حسن اور زندہ رہنے کی امنگ پھر سے حاصل کرلیتا ہوں۔ تم بھی جینا سیکھو۔ میں ہونٹ پر ہونٹ جمائے گم صم نظروں سے پیڑ کی ہولے ہولے جھولتی، مچلتی، مسکراتی شاخوں کو دیکھتا رہا اور میرا دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔

کیا میں ایسا کرسکتا ہوں۔

ہاں تم کرسکتے ہو۔

تب یکایک ایک عجیب بات ہوئی۔ میں نے اپنے اندر ایک نئے احساس کو کروٹیں لیتے محسوس کیا۔ ایک انوکھی اور انجانی توانائی رگ وپے میں دوڑی۔ میرے اندرون میں نئی کونپلیں پھوٹنے اور نئے شگوفے چٹکنے لگے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے بہار آرہی ہے اور مجھ میں زندگی پھر سے لوٹ رہی ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھایا اور کارڈ نکال کر اس کی تحریر پر نظر ڈالی۔ یہ دراصل نوشابہ کی شادی کا دعوتی رقعہ تھا۔ جو اس شام ہونے والی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دن قبل نوشابہ دارالحکومت سے واپس آگئی تھی۔ اس نے مجھے اپنی واپسی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ علم اس طرح ہوا تھا کہ کوئی دس دن قبل میں نے اسے بازار میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ خریداری کررہی تھی۔ اس کے بعد مجھے تین دن پہلے اس کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا، بذریعہ ڈاک۔ اس کی شادی زبیر حسن نامی کسی شخص سے ہورہی تھی اور یہ زبیر حسن غالباً وہی تھا جسے میں نے نوشابہ کے ساتھ دارالحکومت میں اسٹور سے نکلتے دیکھا تھا۔ رقعے میں درج تھا ''آپ کی شرکت ہمارے لیے باعثِ افتخار ہوگی۔'' میں نے رقعے کی سنہری تحریر پر نظر ڈالی اور یکایک مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ خزاں کے ایک لمبے وقفے کے بعد بہار کے موسم میں پھوٹنے والی پہلی کلی کی طرح نمودار ہوئی تھی۔ ٹھیک ہے، میں اب اٹھوں گا۔ یہ ردائے رنج، ہزیمت ابھی اتار کر پھینکوں گا۔ نوشابہ کے سارے خطوط نذرِ آتش کروں گا۔ پھر خوب اہتمام سے تیاری کروں گا میرے جسم پر میرا سب سے بہترین سوٹ ہوگا۔ ریشمی ٹائی، طلائی کف لنکس اور بٹن اور اس طرح شادی کی تقریب میں پہنچوں گا کہ میری چال میں شکست کی لغزش نہیں بلکہ اپنی ذات کا اعتماد اور بھرم ہوگا اور پھر محترمہ نوشابہ میں تمہیں اس طرح شادی کی مبارک باد دوں گا کہ میری آواز سب سے بلند ہوگی اور ساتھ ہی ہمیشہ خوش رہنے کی دعا بھی دوں گا کیونکہ محترمہ نوشابہ حسین شاید تمہیں یہ علم نہیں کہ یہ زندگی تمہارے بغیر بھی گزاری جاسکتی ہے۔

کچھ دیر بعد جب میں گھر سے نکلا تو اپنے سب سے عمدہ سوٹ میں ملبوس تھا اور میرے کوٹ کے کاج میں پیڑ کی شاخ سے حاصل کی ہوئی ایک تازہ سبز کونپل سجی ہوئی تھی۔

☆ایک لڑکا دکاندار کے پاس گیا اور جلدی سے کہا ''آپ کے پاس پنسل ہے۔'' تو دکاندار نے کہا۔ ''ہاں۔''
بچہ معصومیت سے۔ ''میرے پاس بھی ہے۔''

مرسلہ: یاسر روبی، جہلم

محفلِ شعروسخن

❀ غلام رسول خان...... مانگا منڈی، لاہور
بڑا مزہ ہو کہ محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے

❀ راجا افتخار علی افقی...... چوآسدن شاہ (موہڑہ)
کچھ ان کی وفاؤں نے لوٹا کچھ ان کی عنایت مار گئی
ہم رازِ محبت کہہ نہ سکے چپ رہنے کی عادت مار گئی
دل نے بہت مجبور کیا ملنے بھی لاکھوں بار گئے
جی بھر کر ان کو نہ دیکھ سکے آنکھوں کی شرافت مار گئی

❀ محمد افتخار جوئیہ...... گورکھ سنگھ
وہ کون ہیں جنہیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

❀ محمد مقبول عاشق...... خوشاب
عمر اتنی تو عطا کر میرے فن کو خالق
میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

❀ ذیشان منہاس...... گلشن اقبال، کراچی
میں تجھے بھول گیا ہوں اے دوست
تو مگر مجھ کو بھلا مت دینا

❀ محمد کامران خالد...... ضلع اٹک
وہ اس خیال سے سوئے چمن نہیں جاتے
کہ پھول سیکھ نہ لیں انداز مسکرانے کا

❀ راشد حبیب تابش...... چھب، ضلع اٹک
ابرِ بہاراں کے ارادے بھی پُراسرار سے ہیں
ابھی برسے گی گھٹا کھل کے یہ آثار سے ہیں
وہ اگر چاہے تو دے شرفِ ملاقات مجھے
سب امیدیں میری وابستہ میرے یار سے ہیں

❀ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر...... نئی منڈی سکھیکی
اس شرط پہ ہے ترکِ تعلق کی اجازت
بدنام زمانے میں مرا نام نہ کرنا
ہم بھی نہ دکھائیں گے سرِراہ گریباں
تم بھی مرے وعدوں کو سرِعام نہ کرنا

❀ جنید احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
مجھ سے کرتا ہے نہ ملنے کے بہانے کتنے
اب گزارے گا میرے ساتھ زمانے کتنے

❀ ماہا ایمان...... پنجاب
اسے جنون کہ صحرا میں کشتیاں اتریں
مجھے یہ شوق کہ پانی پہ گھر بناؤں گی
کچھ اس طرح سے بنی ہوں اس کا آئینہ
وہ مجھ سے کچھ نہ کہے گا، میں جان جاؤں گی

❀ عبدالمالک کیف...... صادق آباد
درد میٹھا ہو تو رگ رگ کے کسک ہوتی ہے
یاد گہری ہو تو تھم تھم کے قرار آتا ہے

❀ رانا محمد عامر شاد...... میاں چنوں
کوئی تو فیصلہ کرتا ہے پتھر کے مقدر کا
کسے ٹھوکر پہ رکھنا ہے کسے بھگوان ہونا ہے

❀ نبی ایمان...... پنجاب
تعبیر کر رہا ہے محبت کا وہ حصار
میرے لیے خلوص کی زنجیر ہے بہت
بیٹھا رہا وہ پاس تو میں سوچتی رہی
خاموشیوں کی اپنی بھی تاثیر ہے بہت

❀ عون عباس بابر...... اوکاڑہ
وصل کی شب نہ جانے کیوں اسرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

❀ تفسیر عباس بابر...... اوکاڑہ
تیرے درد، تیری چاہت، تیری یاد سنبھالے گا
کون میرے بعد یہ جائداد سنبھالے گا

❀ سعید عباسی...... نامعلوم مقام
ہر ایک شب ہری نئے عذاب میں گزری
تمہارے بعد تمہارے خواب میں گزری

❀ سید صادق حسین...... خانیوال
میں چپ کی جھیل تھا مگر اک سنگِ آرزو
ایسا گرا کہ موجِ صدا کر گیا مجھے

❀ رمضان پاشا...... گلشن اقبال، کراچی
دوستی کو دولت کی نظر سے نہ دیکھ اے دوست
اہلِ وفا اکثر غریب ہوا کرتے ہیں

❀ محمد انور مرزا...... پکا بازار میلسی
بدن سے روح کا رشتہ ہے چند ساعت کا
ملی حیات تو یہ بات ہم کبھی بھول گئے

❀ ابرار وارثی...... سندیلیانوالی
آنکھوں کو انتظار کے لمحات سونپ کر
نیندیں بھی کوئی لے گیا اپنے سفر کے ساتھ

❀ ریحانہ وارث...... ورآباد، سندیلیانوالی
بے رخی اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا ہوگی
اک مدت سے ہمیں اس نے بتایا بھی نہیں

❀ طالب حسین طلحہ...... نیو سینٹرل جیل بہاولپور
یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

❀ عبدالغفور خان خٹک...... چھب، اٹک
کاش کہ مل جائے مجھے مقدر کی وہ سیاہی اور قلم
لمحے لمحے کی خوشی لکھ دوں تمہاری زندگی کے لیے

❀ محمد جاوید راؤ...... بہاولنگر
ہنسنے پہ بھی آجاتے ہیں بے ساختہ آنسو
کچھ لوگ مجھے ایسی دعا دے گئے ہیں

❀ ارحم علی...... ماڈل کالونی، کراچی
میں نہ گر نیند سے باہر آتا
خواب آنکھوں پہ حکومت کرتے

❀ پروفیسر ملک ابراہیم...... پشاور
ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے

❀ یاسر علی راجپوت...... گوجرہ، نواں لاہور
آدم کے کسی روپ کی تحقیر نہ کرنا
زمانے میں خدا پھرتا ہے بھیس بدل کر

❀ انیلہ رشید سیال...... خیرپور (میرس)
رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ
وہ لوگ کبھی ٹوٹ کر بکھرا نہیں کرتے

❀ مرزا طاہر الدین بیگ...... میرپور خاص
پھرتی ہے میری خاک صبا دربدر لیے
اے چشمِ اشکبار یہ کیا تجھ کو ہو گیا

❀ علی ناصر...... حافظ آباد
بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

❀ ریاض بٹ...... حسن ابدال
اک تبسم ہزار شکووں کا
کتنا پیارا جواب ہوتا ہے

❀ احسان سحر...... میانوالی
وہ تو کچھ اور بھی بنتے گئے انجان عدم
میں سمجھتا رہا پہچان ہوئی جاتی ہے

❀ سنسان دل...... جودھپور، کبیروالا
یہی ہے اپنا شیوہ کسی کا دل نہ دکھے
جدائیوں کو بھی چاہا ہے قربتوں کی طرح

❀ سارہ...... نیو کراچی۔
دلِ وحشی کی یہ حسرت بھی نکالی جائے
چاندنی جتنی بھی ممکن ہو چرا لی جائے
یہ سمندر بھی تو پانی کے سوا کچھ بھی نہیں
اس کے سینے سے اگر لہر اٹھا لی جائے

❊ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل مل
کس دل سے کہتے ہو کہ تمہیں بھلا دوں
ہر روز نئی دنیا بسائی نہیں جاتی

❊ مقبول حسین......خوشاب
پتا منزل کا نہیں ہے تو معذرت کرلو
لیے لیے نہ پھرو شوقِ راہنمائی میں

❊ مدحت......کراچی
کبھی عشق کرو تو پھر دیکھو اس آگ میں جلتے رہنے سے
کبھی دل پر آنچ نہیں آتی کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا

❊ ڈاکٹر ایچ اے لطیف......فقیروالی
انتہائے یاد یار اور کثرت غم دوراں
اک دل ہے بیچارہ کہاں کہاں تڑپے

❊ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
آخر کرتے تو کس سے کرتے تمہاری شکایت وصی
وہ شہر بھی تیرا تھا وہ عدالت بھی تیری تھی

❊ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
یہ بزم ہے یاں کوتاہ دستی کبھی ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

❊ محمد قدرت اللہ خان نیازی......خانیوال
اک تم ہی میرے نہ ہوئے ورنہ
اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا؟

❊ محمد کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
اب اپنی یاد کی خوشبو بھی ہم سے چھینو گے
کتابِ دل میں یہ سوکھا گلاب تو رہنے دو

❊ محمد جاوید بلوچ......تحصیل علی پور
نیندیں گروی ہیں اس کے پاس
محبت لی تھی جس سے میں نے

❊ محمد اظہر......ملیر، کراچی
کون سے نام سے تعبیر کروں اس رت کو
پھول مرجھائے ہیں، زخموں پہ بہار آئی ہے

❊ عدنان صدیقی......اسلام آباد
جیسے ساحل سے چرا لیتی ہیں موجیں دامن
کتنا سادہ ہے تیرا مجھ سے گریزاں ہونا

❊ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
اک تبسم جو ان کا مل جاتا
ہم بھی سرمایہ دار ہوجاتے

❊ احسان اللہ بھٹی......سکھیکی گاؤں
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

❊ بشیر احمد بھٹی......فوجی بستی، بہاول پور
یاد آتا ہے وہ ظالم ستمبر کے مہینے میں
دل کی جگہ پتھر تھا اس ستمگر کے سینے میں

❊ یمنیٰ احمد......کراچی
موسم کرب انتظار بھی جھوٹ
دل نہ مانے تو وصالِ یار بھی جھوٹ

❊ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی......خوشاب
تنہائی کی رات، میری کھڑکی کا چاند اور کروٹیں بدلتا میں
نہ رات کٹے، نہ چاند ڈھلے، نہ تم آؤ، نہ نیند آئے

❊ امیر بخش......کوئٹہ
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

❊ محمود صدیقی......بفرزون، کراچی
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا ہی دل مہر و وفا کا باب تھا

❊ نور العین......سرگودھا
ہم تجھ پہ اتنی تو عنایت کرتے
اور کچھ دیر محبت کرتے

❊ ثمر سنی، احسن کاشی......نور پور تھل، خوشاب
گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جائے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کوپن برائے شماره دسمبر 2012	محفل شعر وسخن
	نام : ....
	پتا : ....

تنویر ریاض

خطرناک عشق

ایک عام انسان تو شاید بزدل ہوسکتا ہے مگر عاشق ہمیشہ خطروں کا کھلاڑی ثابت ہوتا ہے۔ وہ جو تماشبین میں سے تھا جانے کیسے اس کھیل کا حصہ بن گیا اور دل بے ایمان جانتے بوجھتے اس جال میں الجھنے کو بے قرار ہوگیا۔ بہرحال جو بھی ہوا، اس خطرناک عشق کے نتیجے میں ہوا جو وہ بے اختیار کر بیٹھا تھا... تو اب رونا کس بات کا... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

ایک پرفریب منظر کی کرشمہ سازیاں......اور عشق کی جولانیاں

مجھے ساڑھے بارہ بجے ایک فنانسر سے ملنے کے لیے لنچ پر پہنچنا تھا لیکن معاملہ تیس لاکھ ڈالرز سرمائے کی فراہمی کا تھا اور میں اس سلسلے میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے وقت سے کچھ پہلے ہی آ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ریستوران تھا جہاں شوبزنس کے لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا اور بیشتر کاروباری معاملات یہیں طے پاتے تھے۔ بیرے نے مجھے ایک پرسکون گوشے میں بیٹھا دیا اور میرے سامنے عمدہ شراب کی ایک فہرست رکھ دی۔ اس جگہ سے پورے ہال اور بار کا منظر صاف طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرا بھانت بھانت کے لوگوں سے بھر گیا۔ ان میں زیادہ تر کام کے متلاشی افراد تھے۔ چھوٹے موٹے اداکار، نوآموز مصنفین اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ہنرمند۔ وہ سب اسی امید پر یہاں آتے تھے کہ آج کا لنچ ان کی قسمت بدل دے گا۔

میری نظریں اپنے ملاقاتی کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ جب میں نے پہلی بار ایڈن فولیٹ کو دیکھا وہ کسی فلم اسٹار کے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سفید سلک کا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس کے گلے میں پڑا نیکلس اس کی گہری نیلی آنکھوں سے میچ کر رہا تھا۔ جب میں ہال میں داخل ہوا تو اس وقت میری نظر اس پر نہیں گئی تھی لیکن اس نے

مجھے دیکھ لیا تھا اور لگ رہا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہو اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ مجھے پہچان جاتے تھے جبکہ میں ان میں سے بیشتر کو نہیں جانتا تھا۔

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ملاقاتی اب نہیں آئے گا تو میں نے اپنے لیے سلاد کا آرڈر دے دیا اور شراب کے گھونٹ بھرنے لگا جو بیرا پہلے ہی میری میز پر رکھ گیا تھا۔

''تمہارے دوست نے کافی انتظار کروا دیا۔ لگتا ہے اب وہ نہیں آئے گا۔''

اس کی آواز میں ایسا خمار تھا جیسے وہ برانڈی کی پوری بوتل چڑھا کر آئی ہو۔ ''شراب کیسی ہے؟''

میں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا دیا اور پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ میری میز کے سامنے بار اور ہال کی محراب کے درمیان اس طرح کھڑی تھی جیسے فریم میں کوئی تصویر۔ اس کے چہرے پر ہمدردانہ مسکراہٹ تھی، اس جیسی گہری نیلی آنکھیں میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھیں۔ اس کے سنہرے بال یوں چمک رہے تھے جیسے وہ ابھی ابھی سن باتھ لے کر آئی ہو۔

''اچھی شراب بھی اسی وقت مزہ دیتی ہے جب کوئی خوب صورت ساتھی ہمراہ ہو۔'' میں نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔ ''اوہ!'' پھر وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگی۔''

''ویسے مجھے شراب کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں جو اچھی لگے وہی پی لیتا ہوں۔''

ایڈن کی نظروں نے ایک بار بیرے کا تعاقب کیا اور دوبارہ مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی مسکراہٹ نے مجھے حوصلہ دیا میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی میز تک لے آیا۔ وہ میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیرے نے جلدی سے ایک اور گلاس لا کر رکھ دیا اور اس کے لیے بوتل سے شراب انڈیلنے لگا۔ اس نے بے تکلفی سے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی تو اس کا اسکرٹ تھوڑا سا اوپر کھسک گیا پھر اس نے آہستہ سے میری ٹانگ پر ٹھوکر لگائی تو میں بھی پیش قدمی پر آمادہ ہو گیا اور آدھ گھنٹے تک ہم دونوں مے نوشی کرتے رہے۔ اس روز میں نے بہت پی لی تھی۔

اس کے بعد میں باقاعدگی سے وہاں جانے لگا۔ روزانہ نہیں تو ہفتے میں دو تین چکر ضرور لگ جاتے اور ہر بار مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ سے ملنے کے لیے بے چین رہتی ہے۔ یہ تو مجھے شروع میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی میں پہلے سے کوئی مرد موجود ہے، وہ اس کا بوائے فرینڈ ہو سکتا ہے یا پھر شوہر، وہ جو کوئی بھی تھا لیکن وہ اس کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ آنے والے ہفتوں میں میری آمد و رفت بڑھ گئی۔ میں اس وقت وہاں جاتا جب وہ بہت زیادہ مصروف نہ ہوتی۔ ریستوران روزانہ دوپہر تین بجے سے شام پانچ بجے تک بند ہوتا، تاکہ کچن کا عملہ رات کے کھانے کی تیاری کر سکے اور ایڈن کو بھی شام کے لیے تیاری کا موقع مل جائے کیونکہ بار میں عموماً رات گئے تک گاہکوں کا ہجوم رہتا اور ان کے لیے ایڈن کو پہلے سے انواع و اقسام کی شراب کا اہتمام کرنا پڑتا۔ نہ جانے کب کوئی سرپھرا گاہک کون سی شراب مانگ لے۔ میں ان دنوں اپنا لنچ ذرا پہلے کر لیتا تاکہ وقت مقررہ پر اس سے ملنے کے لیے پہنچ جاؤں۔

❊❊❊

ایک روز دوپہر کو میں وہاں پہنچا تو وہاں قدرے سناٹا تھا۔ سب لوگ وقفے کے دوران آرام کے لیے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ایڈن مجھے دیکھتے ہی عقبی حصے میں چلی گئی اور میوزک آن کر دیا پھر وہ اس دھن پر تھرکتی ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔ ''کیا تم رقص کرتے ہو؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' میں نے پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

ایڈن نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے، میں اپنے اسٹول سے اٹھا اور اس کے وجود کو بازوؤں میں سمیٹتا ہوا، اس محراب تک لے گیا جو بار روم اور ڈائننگ ہال کے درمیان واقع تھی۔

''میں شاید ہی کبھی اس طرح رقص کر سکوں۔'' اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے بالوں سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔

''تمہیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو تمہارے ساتھ رقص کر سکے۔'' میں نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

ایڈن نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے اس کی پتلی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچا تو وہ کچھ خوفزدہ نظر آنے لگی لیکن فوراً ہی پرسکون ہو گئی۔ میری ہمت بڑھی اور میں اسے ایک نیم تاریک گوشے میں لے گیا۔ پہلے تو اس نے میری پیش قدمی کا جواب گرم جوشی سے دیا لیکن اچانک ہی اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا جیسے اسے کسی کا ڈر ہو۔ میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''دفع کرو اسے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

یہ کہہ کر میں نے اس کی کمر کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی کارروائی دوبارہ شروع کر دی۔ اس نے ایک بار پھر بڑی مشکل سے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑایا اور ہانپتے ہوئے بولی۔ ''نک۔ یہ میں نہیں کر سکتی، ابھی نہیں۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ......''

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی نیلی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھیں پھر اس کی آنکھ سے آنسو نکلا اور گال پر بہنے لگا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہماری شادی نو ماہ قبل ہوئی تھی لیکن میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں مگر اس کے لیے ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔''

میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور جوش کے عالم میں بولا۔ ''میں ایک دولت مند شخص ہوں اور تمہیں اس سے نجات دلا سکتا ہوں، تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟''

اس کی آنکھوں سے جھلکتا خوف دور ہو گیا، جس سے مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھ پر اعتبار کر رہی تھی۔ میں بھی اس عورت کو چاہنے لگا تھا اور اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ چاہے اسے حاصل کرنے کے لیے مجھے کسی کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

''مجھ پر بھروسا کرو نک۔'' وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہم بہت جلد......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ریستوران کی کھڑکی سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو پھر ہم دونوں تیزی سے محراب کی آڑ میں ہو گئے۔

''اوہ، میرے خدا۔'' وہ گھبراتے ہوئے بولی۔ ''جلدی کرو نک۔ فوراً بار میں چلے جاؤ۔''

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر پھیلا خوف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ ایڈن نے اپنے عقب میں دیکھا اور بولی۔ ''مجھ پر بھروسا کرو ڈارلنگ۔ میں تمہیں بعد میں سب کچھ بتا دوں گی۔''

یہ کہہ کر اس نے مجھے بار کی جانب دھکیلنا شروع کیا اور خود اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اپنا اسٹول سنبھالا اور محراب میں سے ڈائننگ روم کی طرف دیکھنے لگا پھر سامنے کا دروازہ کھلا اور ایمرسن ہیڈوک اندر داخل ہوا، اسے وہاں دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ لاس اینجلس کی سٹی کونسل کا ممبر تھا۔

❊❊❊

''ایمرسن!'' اسے دیکھ کر ایڈن حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''سویٹ ہارٹ! تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا۔ میں کھانے پر تمہارا انتظار کر لیتی۔''

ایمرسن نے آگے بڑھ کر اس کے گالوں پر بوسہ دیا اور ایڈن اس سے لپٹ گئی۔ ہیڈوک کے پیچھے ایک اور عورت بھی تھی۔ اس کے بال بھی سنہرے تھے اور وہ وزن، قد اور عمر کے لحاظ سے ایڈن سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اس نے مجھے بار میں بیٹھے دیکھا اور رسماً مسکرا دی۔

''روڈی تمہیں کہاں مل گئی۔'' اس نے ہیڈوک سے پوچھا پھر اس لڑکی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''روڈی ڈارلنگ، ادھر آؤ۔'' لڑکی آگے بڑھی اور دونوں گلے مل کر ایک دوسرے کو پیار کرنے لگیں۔

ان تینوں کو یوں گھلتے ملتے دیکھ کر میرا غصہ عروج پر پہنچ گیا۔ ہیڈوک نے اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور میری موجودگی کو نظرانداز کر دیا۔ مجھے اس کے چہرے پر تجسس یا حسد کا کوئی شائبہ نظر نہیں آیا۔ شاید وہ مجھے ایک عام گاہک سمجھ رہا تھا۔

ایڈن کو جیسے کچھ یاد آ گیا اور وہ بولی۔ ''ایمرسن، تم یقیناً نک ٹرینر سے ملنا چاہو گے۔ یہ بیورلے ہلز میں پراپرٹی کا کاروبار کرتا ہے۔''

میں نے آگے بڑھ کر ہیڈوک کی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے اس نے بے دلی سے تھام لیا۔

''یہ صرف بروکر ہی نہیں بلکہ جائیداد میں سرمایہ کاری بھی کرتا ہے۔'' وہ میرا مکمل تعارف کرواتے ہوئے بولی۔ ''اس نے تو میرے ریستوران کے لیے بھی بڑی معقول پیشکش کی تھی مگر میں نے انکار کر دیا۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' میں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ریستوران بہت اچھی جگہ پر ہے۔''

ہیڈوک کی تیوری پر بل پڑ گئے اور وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے لیے یہ جگہ خواہ کتنی ہی پرکشش کیوں نہ ہو لیکن یہ کسی قیمت پر بھی قابل فروخت نہیں ہے۔''

مجھے وہ شخص انتہائی خود پسند اور متکبر لگا لیکن میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ روڈی نے شاید ماحول کی تلخی کو محسوس کر لیا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی اور میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''مجھے روڈی نیلسن کہتے ہیں۔''

میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”آج کل ایسے مردوں کی کمی ہوگئی ہے جو جنس مخالف سے رغبت رکھتے ہوں۔“ وہ اپنی جاندار مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”تم میری نمائش میں ضرور آنا۔“

”روڈی۔ اسے بخش دو۔“ ایڈن اسے جھڑکتے ہوئے بولی۔ ”تم نے کیسے جان لیا کہ یہ......“

”نہیں، نہیں۔“ میں نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو پہلے ہی گھائل ہو چکا ہوں۔“

”نک! اس کی باتوں پر دھیان مت دینا۔“ ایڈن، روڈی کا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ ”سب لوگ بیٹھ جائیں۔ میں شراب لے کر آتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ کچن میں کھانے کے لیے کیا کچھ ہے۔“

میں بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا اور بار میں جا کر شراب پینے لگا۔ میں نے شاید ایمرسن ہیڈوک کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ ایک متکبر شخص ہی نہیں بلکہ اس کا وجود ناقابل برداشت کانٹے کی طرح تھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے وہاں سے چلا آیا۔

❁❁❁

گو کہ ایمرسن کی وجہ سے میری طبیعت خاصی مکدر ہو چکی تھی لیکن دوسرے روز میں تصویروں کی نمائش دیکھنے چلا گیا۔ میرے پاس نہ جانے کے کئی بہانے تھے لیکن روڈی نے جس اپنائیت اور لگاوٹ سے مجھے دعوت دی تھی اس کا تقاضا تھا کہ میں وہاں ضرور جاؤں۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح ایڈن کے اندر رقابت کی آگ بھڑک اٹھے اور وہ زیادہ تیزی سے میری جانب ملتفت ہو جائے۔

یہ نمائش ایڈز کے بارے میں تحقیقی کام میں مدد دینے کے لیے منعقد کی گئی تھی اور اس کا اہتمام سانتا مونیکا میں واقع ایک چھوٹی سی گیلری میں کیا گیا تھا جو روڈی کی رہائش گاہ میں بنائی گئی تھی۔ گیلری کی دیواریں سفید تھیں جس کی وجہ سے تصویریں خاصی نمایاں ہو گئی تھیں گو کہ آرٹ کے لحاظ سے ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی البتہ پیش کی جانے والی شراب بہت عمدہ تھی اور ہالی ووڈ اسٹارز کی موجودگی نے نمائش کی رونق بڑھا دی تھی۔ بہت سی تصویریں نامور شخصیات نے عطیہ کی تھیں۔ ان میں سے کئی تصویروں پر مشہور اداکاروں کے دستخط تھے۔ میں نے بھی مارلن منرو کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر خرید لی۔

پارکنگ لاٹ میں کافی اندھیرا تھا۔ میں ابھی اپنی گاڑی تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ اچانک تاریکی سے دو سائے نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میرے سر پر لگنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ میں ایک زوردار چیخ مارنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے اور ذہن تاریکی میں ڈوبا جا رہا تھا تبھی میری سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔ ان میں سے ایک سایہ کہہ رہا تھا۔

”اسے یہیں پڑا رہنے دو جیک۔ اگلی مرتبہ یہ آئی سی یو میں ہوگا۔“

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے پہلی بار سائیکل چلاتے ہوئے آپ گر جائیں لیکن دوسری یا تیسری کوشش میں آپ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میں بھی دوسری کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا۔ پھر میں نے ایک مانوس آواز سنی۔

”اوہ میرے خدا! یہ کیا ہوا۔“ ایڈن دوڑتی ہوئی آئی اور میرے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولی۔

”نک، کیا ہوا؟“

پھر میں نے ایک اور آواز سنی۔ ”روڈی۔ کیا تمہارے پاس فون ہے، جلدی سے نو گیارہ ملاؤ۔“ یہ ایمرسن تھا جو اپنی بیوی کے برابر میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”میں نے انہیں فون کر دیا ہے۔“ روڈی میرے پاس آتے ہوئے بولی۔ اس نے ایڈن کی طرف دیکھا اور میرا سر اٹھا کر اپنی رانوں پر رکھ لیا۔

”پولیس کو بلانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

ایمرسن اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور مسکرا دیا۔ مجھے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس بار تو بچ گئے۔ آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔

❁❁❁

پولیس آئی اور ضابطے کی کارروائی کر کے چلی گئی۔ ایمرسن ہیڈوک نے اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے کہا۔

”میرے دوست نک ٹریز پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ وہ زیادہ زخمی نہیں ہوئے۔“

اس کے بعد رپورٹرز میری جانب متوجہ ہوئے لیکن میں نے کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔ میں اپنا حساب خود چکانے کا عادی تھا اور اس کے لیے مجھے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ روڈی اس لیے پشیمان تھی کہ یہ حملہ اس کی پارکنگ لاٹ میں ہوا۔ ایمرسن کا اصرار تھا کہ وہ مجھے اپنی لیموزین میں گھر پہنچا دے گا لیکن میں نے منع کر دیا۔ روڈی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کے ساتھ مبلیبو جا سکتا ہوں تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں وہی کروں گا جو ڈاکٹر کہے گا۔“

وہ جون کی ایک خوشگوار شام تھی جب میں اور روڈی مبلیبو کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم ہائی وے پر اپنی نئی گاڑی میں سفر کر رہے تھے اور میں نے کار کی رفتار پچھتر میل تک بڑھا رکھی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے فرحت بخش محسوس ہو رہے تھے۔ روڈی نے نورا جونز کا گانا لگا دیا اور بولی۔ ”اس موسم میں تمہارے لیے یہی مناسب رہے گا۔“

اس کے لڑکوں جیسے بال تیز ہوا کے جھونکوں سے بے ترتیب ہو رہے تھے جنہیں وہ بار بار سنوارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نورا جونز کی آواز سن کر مجھے بہت سکون ملا۔ گو کہ گزشتہ روز جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا، اس کی وجہ سے طبیعت بہت بوجھل تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایمرسن نے ہی ان دونوں بدمعاشوں کو بھیجا ہوگا۔ میں نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

جب روڈی نے دوسرا گانا لگایا جس کے بول تھے۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ تو میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“

”اسے سن کر تمہاری طبیعت بحال ہو جائے گی۔“ روڈی بولی۔ ”اور تمہارے سارے زخم بھر جائیں گے۔“

❁❁❁

وہ مبلیبو روڈ کے کنارے ایک عالی شان بنگلے میں رہتی تھی جو بالکل ساحل کے قریب تھا۔ وہ غالباً 1940ء میں تعمیر ہوا تھا لیکن حال ہی میں اس کی جدید انداز میں تزئین و آرائش کی گئی تھی۔ ہم محفوظ راستے سے مکان میں داخل ہوئے جہاں ایک وسیع و عریض لونگ روم تھا اور شیشے کے پار سمندر صاف نظر آ رہا تھا۔ جب روڈی نے کمرے کی روشنی جلائی تو ہمیں اس شیشے میں اپنا عکس لہراتا محسوس ہوا۔ کمرا قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا اور دیواروں پر نادر و نایاب تصاویر لگی ہوئی تھیں۔

”تم اس کونے میں رکھی الماری میں سے اپنی پسند کی شراب لے سکتے ہو۔“ وہ دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔“

میں الماری کی طرف بڑھا اور اس میں سے شیوا اس کی ایک بوتل نکال لی۔ وہیں ایک چھوٹے سے فریج میں برف بھی موجود تھی۔ میں نے گلاس میں شراب انڈیلی اور اسے منہ سے لگایا ہی تھا کہ روڈی کی آواز آئی۔ ”تم تو واقعی پینے لگے۔“

”تمہارے پاس عمدہ شراب کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔“ میں نے اس کے ذوق کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

روڈی نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور اب وہ سفید ٹی شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس نظر آ رہی تھی لیکن اس کے پیر ننگے تھے۔ اس نے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر روشنی مدھم کی اور میرے ساتھ پینے میں شریک ہو گئی، پھر اس نے میوزک آن کر دیا۔

موسیقی کی آواز گونجتے ہی اس کے چہرے پر وہی خطرناک مسکراہٹ پھیل گئی جو اچھے خاصے عقل مند شخص کو دیوانہ بنا دے۔ اس نے اپنے آپ کو صوفے پر گرا لیا۔ میں بھی درمیان میں ایک کشن رکھ کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”مجھے یقین نہیں کہ یہ سب کر سکوں گی۔“ اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا اور میز پر رکھے آبنوسی بکس سے ایک سگریٹ نکال لیا۔ ”تم پولیس میں رہ چکے ہو؟“

”پہلے کبھی تھا لیکن اب نہیں ہوں۔“

❁❁❁

میں تین سال پہلے ویسٹ ویلی میں پیٹرول آفیسر کے طور پر کام کر چکا تھا جب میں نے میئر کے ایک خاص آدمی فیلیکس سلازار کے جسم میں اپنے ریوالور کی گولیاں خالی کر دی تھیں۔ اس وقت میں ڈیوٹی سے فارغ ہو چکا تھا لیکن میں نے یونیفارم پہن رکھی تھی جب اس نے میرا راستہ روک کر مجھ پر گن تان لی۔ مجبوراً مجھے اپنا دفاع کرنا پڑا جس کے نتیجے میں سلازار کی جان چلی گئی۔ کسی نے مجھے اس پر گولی چلاتے نہیں دیکھا اس لیے مجھ پر کوئی الزام نہ آ سکا۔ البتہ یہ افواہ ضرور پھیل گئی کہ قاتل کے سلازار کی بیوی سے تعلقات تھے۔

اس واقعے سے لاس اینجلس پولیس اور میئر کے دفتر میں ہلچل مچ گئی لیکن میئر نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر لی۔ وہ ایک منشیات کے ڈیلر کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی یہ خاموشی میرے حق میں بہتر ثابت ہوئی اور اس نے بہت سی باتوں پر پردہ ڈال دیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرے اور سلازار کی بیوی کے بارے میں جو افواہ پھیلائی گئی تھی وہ درست ثابت ہوئی اور دوسری افواہوں کی طرح اسے بھی زندگی مل گئی اور روڈی نے کہیں سے اس بارے میں سن لیا۔

روڈی نے لائٹر سے سگریٹ جلایا اور ایک گہرا کش لینے کے بعد میرے حوالے کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے معلوم

ہوا ہے کہ تم کافی خطرناک ہوا کرتے تھے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "اب ویسا نہیں رہا لیکن کسی وقت بھی برا آدمی بن سکتا ہوں۔"

ڈیک پر اسٹیلی ڈین کی آواز گونج رہی تھی۔ شاید میں گھر پر اتنا آرام محسوس نہ کرتا جتنا کہ اس پرکشش عورت کی موجودگی میں کر رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی قربت کی وجہ سے ایڈن میرے ذہن سے اتر گئی تھی یا پھر مجھے ایمرسن پر غصہ تھا کہ اس نے اپنے کتے مجھ پر کیوں چھوڑے۔

"میں نہیں جانتی کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔" روڈی نے کہا اور مجھے یوں لگا جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ "میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے لیکن کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔" اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں اسے خالی کرتے ہوئے بولی۔ "ایمرسن نے اسی لیے اپنے بازو کس لیے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے اگلے جملے کا انتظار کرنے لگا۔

"تمہیں کچھ معلوم ہے۔" روڈی نے کہا۔ "جب میں نے تمہیں اپنے ساتھ یہاں آنے کے لیے کہا تو تم اس کی وجہ جان گئے ہو گے؟"

"نہیں۔" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "تم شاید اس بارے میں بہتر طور پر جانتی ہو گی۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں ایڈن کو ملانے میں تمہاری مدد کروں لیکن تمہارے یہاں آنے کی وجہ یہ نہیں ہے، تم یہاں اس لیے آئے ہو کیونکہ میں تمہاری آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ چکی تھی۔"

میں نے بے ساختہ اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ حالانکہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ تم اپنی صفائی میں کیا کہو گے لیکن تم میرے ساتھ آنا چاہ رہے تھے۔ اب تم ایڈن کو بھول جاؤ۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گی اور یہ ہمارے درمیان ایک راز رہے گا۔"

میں نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور جب اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسے تھامنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی جیسے وہ یہ سب کچھ بہت پہلے سیکھ چکی ہو۔

میں نے اسے صوفے سے اٹھایا اور بیڈ روم میں لے گیا پھر ہم ساحل پر آگئے۔ سورج کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور ہم دونوں ساڑھے تین گھنٹے سے ایک ساتھ تھے۔ اس دوران ہم نے خوب باتیں کیں، لیکن حد سے گزرنے کی نوبت نہیں آئی یا شاید اس نے مجھے یہ موقع ہی نہیں دیا۔

اس نے مجھے ہیڈوک کی وہ رہائش گاہ بھی دکھائی جہاں وہ گرمیوں میں آیا کرتا تھا۔ وہ گھر تین دروازے چھوڑ کر جنوب میں واقع تھا۔ گھر کی بتیاں بند تھیں جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے پھر بھی روڈی نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے کہا کہ ایڈن وہاں نہیں ہے۔ "میں تمہاری اور ایڈن کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنے گھر کے سامنے ریت کے ٹیلے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ایمرسن ایک ظالم اور سنگ دل انسان ہے اور ایڈن اس سے شادی کر کے پچھتا رہی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی مخصوص، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور بولی۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ میں تم دونوں کو ملانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہوں۔"

جب میں وہاں سے روانہ ہونے لگا تو روڈی نے مجھ سے اگلے ہفتے بیچ پارٹی میں شریک ہونے کا وعدہ لے لیا۔ اس نے بتایا کہ ایڈن بھی اس پارٹی میں موجود ہو گی اور روڈی کا خیال تھا کہ اس پارٹی کے ذریعے اسے کچھ اچھے کاروباری تعلقات قائم کرنے کا موقع مل سکے گا۔ کاش میں جان سکتا کہ اس کہانی کا انجام کیا ہو گا۔ کاش یہ بات مجھے اسی وقت معلوم ہو جاتی جب میں نے پہلی بار ایڈن کا بوسہ لیا تھا۔

❊❊❊

میری گاڑی سانتا مونیکا کی پہاڑیوں کے درمیان بنی ہوئی سڑک پر اس طرح دوڑ رہی تھی جیسے کوئی بلی پنجرے سے نکل کر بھاگتی ہے۔ میں بیورلے ہلز جانے کے لیے سن سیٹ بلیوارڈ سے گزر رہا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے میرے ذہن کو پوری طرح بیدار کر دیا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی ایک خطرناک محبت کا مزہ چکھ چکا تھا اور اس کے نتیجے میں سلازار میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی لیکن وہ محض مجھے دھمکانے آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے نشانہ بناتا، میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔

اب میں ایک اور طاقتور شخص کی بیوی سے محبت کر رہا تھا اور جانتا تھا کہ اس کا انجام اچھا نہ ہو گا لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہر قیمت پر ایڈن فولیٹ کو حاصل کرنا ہے، چاہے اس کے لیے میں خود ہی برباد کیوں نہ ہو جاؤں۔

❊❊❊

ہفتہ بہت تیزی سے گزر گیا۔ اس دوران میں ریستوران نہیں گیا۔ میں بریڈ پٹ نہیں تھا جو ایک عورت کی

خاطر بے وقوف بن جاتا۔ ایڈن کی بھی کچھ ذمے داری تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ مجھ سے رابطہ کرنے میں پہل کرتی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ مجھے چاہتی ہے تو اسے میری شرائط پر چلنا ہو گا۔ شاید میری سوچ میں یہ تبدیلی روڈی کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے نتیجے میں آئی تھی۔

میں تین بجے کے بعد مبلیبو پہنچا۔ وہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں نہانے کے لباس میں ساحل سمندر پر موج مستی کر رہے تھے اور سوفٹ ڈرنک کی طرح بیئر پی رہے تھے۔ وہاں ہر عمر کی عورتیں موجود تھیں۔ ان میں کچھ ایڈن اور روڈی سے عمر میں بڑی اور کچھ چھوٹی تھیں لیکن ان سب کے جسم حیرت انگیز طور پر متناسب تھے اور وہ بڑی پھرتی کے ساتھ والی بال کھیل رہی تھیں جبکہ مرد دریوں پر لیٹے اور کمبل اوڑھے ان پر بے رحمانہ تبصرے کر رہے تھے۔

روڈی مجھے دیکھتے ہی چلائی۔ اس نے جلدی سے گیند والی بال کے نیٹ پر پھینکی اور دوڑتی ہوئی میرے پاس چلی آئی۔ اس نے سرخ رنگ کا نہانے کا لباس پہن رکھا تھا اور اس میں خاصی پرکشش لگ رہی تھی میرے لیے اسے نظر بھر کر دیکھنا محال تھا۔

"تمہیں آنے میں دیر ہو گئی۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ "میں ڈر رہی تھی کہ کہیں تم اس پارٹی سے محروم نہ رہ جاؤ۔"

"نہیں۔" میں نے اس کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تھوڑی سی دیر ضرور ہو گئی لیکن نہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

روڈی نے میرا ہاتھ پکڑا اور بنگلے کی طرف لے جانے لگی۔ "پہلے میں تمہارے لیے کچھ پینے کا بندوبست کر دوں۔" پھر میری قمیص کی آستین پکڑتے ہوئے بولی۔ "تم نے ضرورت سے زیادہ کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنے برابر ریت پر بٹھا لیا۔ "اگر میں نے کپڑے اتار دیے تو تمہاری کئی سہیلیاں مجھ پر مر مٹیں گی۔"

روڈی نے زوردار قہقہہ لگایا اور مجھ پر ریت پھینکتے ہوئے بولی۔ "تم کیا سمجھتے ہو، یہ سب ایڈن کی طرح بے وقوف ہیں۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا اور بنگلے کی طرف چل دی لیکن سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بجائے وہ عقبی حصے کی طرف گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپری منزل پر چلی گئی۔ ہم شیشے

ڈاکٹر یا ڈاکٹری

"او کراچی یونیورسٹی والو! نہ دو ہمیں ڈاکٹری کی ڈگری۔ ہم ڈاکٹر ہو ہی گئے۔ یہاں کے لوگوں کا ہمیں ڈاکٹر انشا کہتے ہوئے منہ سوکھتا ہے۔ ہم بھی اپنے دستخط کرتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا نہیں بھولتے۔ اجمال اس تفصیل کا یہ ہے کہ ہم جس قافلہ سخت جاں میں سفر کر رہے ہیں۔ ان میں بھی کچھ ترک ہیں، کچھ ایرانی، قریب قریب بھی ڈاکٹر۔ پاکستانیوں میں فضل الباری صاحب وزیر صحت ہیں یعنی ڈاکٹروں کے ڈاکٹر۔ مسئلہ فقط بیگم وجیہہ ہاشمی کا تھا کہ اپوا (APWA) کی انٹرنیشنل سیکریٹری ہیں اور اسلام آباد کی رہنے والی ہیں یا پھر ہمارا۔ لوگوں سے تعارف میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ آخر ایک مختصر سی اور سنجیدہ کنووکیشن (Convocation) میں ہم نے انہیں اعزازی ڈاکٹر کی ڈگری پیش کی اور انہوں نے ہمیں ڈاکٹریٹ کے خریطے سے نوازا۔ انہیں اتنی دواؤں کے نام یاد ہیں اور ان کے نسخے کہ ڈاکٹر بھی ان کے تلمذ میں فخر محسوس کریں لہٰذا ان کی ڈاکٹری بے غل و غش چل جاتی ہے۔ ہم میڈیکل ڈاکٹروں کے سامنے علم و ادب کے ڈاکٹر بنتے ہیں اور کوئی ادب و فلسفہ کا سوال کر بیٹھے تو میڈیکل ڈاکٹر ہونے کا عذر کرتے ہیں۔ ایک بزرگ نے دونوں طرح کے سوالات شروع کر دیے تو ہمیں ہومیو پیتھی میں امان ملی اور ہمیں اس کے فضائل پر تقریر کرنا پڑی۔ ایک بار تو دانتوں کا ڈاکٹر بھی بننا پڑا اور ڈاکٹر طیب محمود کی بتائی ہوئی اصطلاحیں کام آگئیں۔ بہرحال ہم پہلے سے بتائے دیتے ہیں کہ ہم اور ڈاکٹر وجیہہ ہاشمی پاکستان لوٹیں تو ہمیں باقاعدہ ڈاکٹر کہہ کر بلایا جائے۔ جب دوسرے ملکوں کے لوگوں نے قبول کر لیا ہے تو ہمارے پیارے ہم وطنوں کو اس پر ہرگز اعتراض نہ ہونا چاہیے۔"

"ابن انشا کی کتاب "دنیا گول ہے" سے انتخاب

مرسلہ: ساحر علی، سوہادہ

کے دروازے سے اندر داخل ہوئے جہاں کئی اجنبی چہرے موجود تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ساحل پر موجود لوگوں کے مقابلے میں انہوں نے تھوڑا بہت لباس پہن رکھا تھا۔ زیادہ تر مرد بنیان اور نیکر میں ملبوس تھے جبکہ عورتیں بھی بغیر آستین کے بلاؤز اور مختصر اسکرٹ میں نظر آرہی تھیں۔ روڈی نے مجھے کئی لوگوں سے ملوایا اور پھر بار کی طرف بڑھ گئی۔ ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھ کر مشروب سے دل بہلانے اور باتیں کرنے لگے۔ وہ مجھ سے سر کی چوٹ کے بارے میں پوچھ رہی تھی جبکہ میں اس سے ایڈن کی باتیں کرتا رہا۔

اچانک ہی مجھے احساس ہوا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ روڈی نے اچانک میرا ہاتھ پکڑا اور لونگ روم سے نکل کر کچن کی طرف جانے لگی۔ وہ کچن بالکل کسی ریستوران جیسا تھا جس کے وسط میں گوشت اور سبزی بنانے کے لیے ایک بڑا سا کاؤنٹر بنا ہوا تھا اور دیوار گیر الماریوں میں مختلف اقسام کے برتن اور کچن کا دوسرا سامان سجا ہوا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے کاؤنٹر کے ساتھ بار بھی موجود تھا جس میں انواع و اقسام کے مشروب رکھے ہوئے تھے۔

کچن میں ایک مضبوط جسامت کا شخص کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائے اس طرح کھڑا ہوا تھا جیسے وہ ہماری ہی آمد کا منتظر ہو۔ اس نے زرد رنگ کی ٹی شرٹ اور ڈینم کی نیکر پہن رکھی تھی اور پیروں میں کاؤبوائے نما جوتے تھے جبکہ کمر کے پیچھے ایک ہیٹ بھی لٹک رہا تھا جیسا کہ عموماً کاؤبوائے پہنتے ہیں۔ میں نے پہلی ہی نظر میں دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ باورچی نہیں بلکہ قسائی ہے۔

روڈی نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”نک، یہ ٹیری ہیریسن ہے۔“ پھر اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ ”ٹیری، ایڈن کا بہترین دوست ہے اور بھروسے کا آدمی ہے۔“

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے صرف میری انگلیاں چھوئیں جیسے کرنٹ لگنے کا خطرہ ہو۔

”مجھے روڈی سے پوچھنا ہوگا کہ میرے لیے کیا حکم ہے۔“ اس نے اپنے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور مجھے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”تم اسے لے کر وہاں جاؤ گے۔“ روڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ٹیری تم سے مذاق کر رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایڈن تم سے فوری طور پر ملنا چاہتی ہے۔“

میں مسکراتے ہوئے اپنے کپڑوں کو دیکھنے لگا کہ آیا اس لباس میں اس کے سامنے جانے کے قابل ہوں یا نہیں۔

”میرے ساتھ آؤ خوب صورت لڑکے۔“ ٹیری عقبی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ٹیری مجھے کچھ مشکوک کردار کا لگا۔ اس کے ساتھ جاتے ہوئے مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ ساحل پر بہت سے لوگوں نے مجھے معنی خیز انداز میں دیکھا تو میں جھینپ گیا۔ سڑک کے کنارے اس کی مزدا کھڑی تھی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس گاڑی میں بیٹھنا نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجبوری تھی کیونکہ روڈی نے مجھے اس کے ساتھ بھیجا تھا۔

ٹیری نے آندھی اور طوفان کی طرح گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک لمبا چکر کاٹ کر دوبارہ اسی سڑک پر آگیا جو ایمرسن ہیڈوک کی رہائش گاہ کی طرف جاتی تھی۔ میری مٹھیاں شدت جذبات سے بھینچ گئیں اور چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ٹیری نے میری کیفیت کو بھانپ لیا اور ہیڈوک کے گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایڈن اس وقت یہاں اکیلی ہے اور ایمرسن سٹی کونسل کی میٹنگ میں مصروف ہے، اس کا ایک گھنٹا پہلے فون آیا تھا۔“

میری پریشانی کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں، ایڈن سے اس طرح چوری چھپے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ہماری ملاقات کسی اچھے سے ریستوران یا کلب کے رومان پرور ماحول میں ہوگی۔ مجھے اس طرح ملنا پسند نہیں تھا لیکن میں اسے دیکھنا چاہ رہا تھا۔ جیسے ہی ہم آگے کی طرف بڑھے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور بولا۔ ”تم اندر جا کر اس سے مل سکتے ہو۔“

میں کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اسے دیکھنے لگا تو وہ بولا۔ ”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آدھ گھنٹے بعد آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔ دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

میں نے دروازہ کا ہینڈل گھمایا تو اس نے اپنے ہاتھ سے میری کلائی پکڑ لی۔ اس کی گرفت کافی مضبوط تھی میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”ایڈن کے ساتھ زبردستی مت کرنا۔“ اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”کیونکہ وہ مظلوم ہے۔ صحیح معنوں میں مظلوم اور اس کا شوہر بہت کمینہ ہے۔“

اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہوگیا تھا اور اس کا انداز دھمکی آمیز تھا۔

میں نے پوری قوت سے زور لگا کر اپنے ہاتھ کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا۔ غالباً اسے میری جانب سے اس

رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ حیرانی کے عالم میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔ میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر گھر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

یہ ایک بہت بڑا اپارٹمنٹ تھا لیکن اس جیسا نہیں جو میں نے چند ماہ پہلے فروخت کیا تھا۔ یہ بالکل اسی انداز میں تعمیر کیا گیا تھا جیسا کہ جنوبی کیلی فورنیا میں تعطیلات گزارنے کے لیے گھر بنائے جاتے ہیں۔ اس کے فرش اور دیواروں پر ٹائل لگے ہوئے تھے جبکہ کھڑکیاں ہسپانوی طرز کی تھیں اور انہیں زنگ سے بچانے کے لیے ان پر ایک خاص قسم کا پلاستر کر دیا گیا تھا۔ یہاں سے بحرالکاہل کا نظارہ ایسا تھا جس کی قیمت لاکھوں ڈالر دے کر بھی ادا نہیں ہوسکتی تھی اور پہاڑی کا نظارہ ممکن ہے کہ اس سے آدھی قیمت رکھتا ہو، اگر یہ گھر کسی اور علاقے میں ہوتا تو اس کی قیمت کم از کم تیس لاکھ ڈالرز ہوتی۔

جب میں اینٹوں سے بنی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچا تو ایڈن زیر آب ٹینک پر جھکی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں ربر کا ایک بڑا سا پائپ تھا۔ شام کا سورج اس کے عقب میں واقع بحرالکاہل کے پانی پر اپنی آخری کرنیں بکھیر رہا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے اس کے سنہری بالوں نے چہرے کو پوری طرح ڈھانپ دیا تھا۔ اس لیے وہ فوراً ہی مجھے نہ دیکھ سکی لیکن جب میں اس کے بالکل سامنے آگیا تو مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات نمایاں ہوگئے۔

ہم دونوں ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئے۔ وہ سکتے کے عالم میں مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کی کیفیت نمایاں تھی۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے جیسے اسے شدید سردی لگ رہی ہو پھر وہ بہ مشکل تمام بولی۔ ”میں سمجھ رہی تھی کہ تم نہیں آؤ گے اور میں تمہارا انتظار ہی کرتی رہ جاؤں گی۔“

اس نے خاکی رنگ کی ہاف پینٹ اور چست قمیص پہن رکھی تھی اور پیروں میں مردانہ طرز کے بوٹ تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے ورکشاپ میں کام کرنے والے مستری یاد آگئے۔ بس اس کے ہاتھ میں اوزار دینے کی ضرورت تھی۔

میں نے کچھ نہیں کہا اور اس کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا پھر میں نے اس کے ہاتھ سے پائپ لیا اور اسے ایک جانب پھینک دیا۔ اب وہ میری بانہوں کے حصار میں تھی۔ میں اس کا چہرہ اپنے قریب لاتے ہوئے بولا۔ ”آج کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔ اب وہ رہے گا یا میں۔“

یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے سے مزید قریب کر لیا۔ وہ تھوڑا سا کسمسائی پھر میری کمر کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی۔ ”اوہ میرے خدا، میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں نک۔“

”وہ آج رات یہاں آئے گا۔“ وہ اپنی سانسوں کو اعتدال پر لاتے ہوئے بولی۔ ”اور یہ کوئی اچھا وقت نہیں ہے۔“

”جانے دو۔“ میں اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”اچھا وقت کبھی نہیں آئے گا لیکن آج کی رات فیصلہ کن ہے۔“

ایڈن نے میرا بازو پکڑ لیا اور التجائیہ انداز میں بولی۔ ”ڈارلنگ پلیز، کل صبح۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں لیکن روڈی کی پارٹی خراب مت کرو، تم نہیں جانتے کہ اس کے کتنے کاروباری دوست آئے ہوئے ہیں۔“

میں نے اپنا سر گھمایا اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"صرف آج کی رات۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "میں وعدہ کرتی ہوں......"

میں نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا پھر ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، کل ہی سہی لیکن اس کے بعد ایک دن کی بھی گنجائش نہیں ہوگی۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہونا اور اگر آج کی رات اس مردود نے کوئی گڑبڑ کی تو میں اس کا بھیجا نکال دوں گا جیسا کہ اس نے پہلے بھی مجھ پر حملہ کروایا تھا۔"

"اوہ نک! یقین کرو، وہ حرکت اس نے نہیں کی تھی۔"

"مجھے اس بارے میں بالکل بھی شبہ نہیں ہے اور روڈی بھی یہی سمجھتی ہے۔"

ایڈن کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید میرے سچ نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "آج کی رات میں تم سے دور رہوں گا۔ ہم کل صبح گیارہ بجے اسٹور پر مل سکتے ہیں۔"

میں نے اسے الوداعی بوسہ دیا اور وہاں سے چلا آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔

پورے چاند نے مبلیبو کالونی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا اور اس کی سفید روشنی سمندر کے پانی پر منعکس ہو کر عجیب سماں باندھ رہی تھی۔ میں اپنی دونوں کہنیاں ریلنگ پر ٹکائے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا عقب میں ادھ کھلے دروازے سے موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں اور اس کی دھن پر نیم عریاں ...لڑکے لڑکیاں بے ہنگم انداز میں رقص کر رہے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور دوبارہ اپنی کہنیاں ریلنگ پر جما دیں۔ اس رات میں نے بہت پی لی تھی بلکہ پارٹی میں شریک سبھی لوگ بے تحاشا پی رہے تھے۔ مبلیبو میں ہونے والی زیادہ تر پارٹیاں اسی انداز میں ہوتی ہیں۔ ابتدا میں لوگ تہذیب و شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن گیارہ بجے کے بعد ان کے اندر کا حیوان بیدار ہو جاتا ہے۔

ایمرسن ہیڈوک لونگ روم میں کسی فلم پروڈیوسر سے باتیں کر رہا تھا جو وہیں چند گھر چھوڑ کر رہتا تھا جبکہ روڈی اور ایڈن دوسرے کمرے میں خواتین سے مصروف گفتگو تھیں۔ ہیڈوک کا پیٹ کافی بڑھا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی جسمانی مشقت یا ورزش نہیں کرتا۔ اس کی انگلیوں کے درمیان سگار دبا ہوا تھا اور وہ فلم پروڈیوسر کو متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

اچانک ہی کسی کے چلانے کی آواز آئی اور مہمان دوڑتے ہوئے باہر چلے آئے۔ کسی نے چلاتے ہوئے بتایا کہ اس نے گرونین کو ساحل پر چلتے دیکھا ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی مچھلی ہوتی ہے جو صرف کیلی فورنیا کے ساحل پر پائی جاتی ہے۔ مادہ مچھلی ساحل پر آکر ریت میں اپنی دم سے جگہ بناتی ہے اور وہاں انڈے دیتی ہے، دس دن تک وہ انڈے وہیں دبے رہتے ہیں اور جب طوفانی لہریں ساحل کا رخ کرتی ہیں تو یہ انڈے بہہ کر پانی میں چلے جاتے ہیں اور مچھلی کے بچوں کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔

کچھ لوگ ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور جھک کر اس مچھلی کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے جبکہ کچھ بے صبرے سیڑھیاں اتر کر ساحل پر چلے گئے تاکہ چاند کی روشنی میں اس مچھلی کو قریب سے دیکھ سکیں۔ ہیڈوک اور پروڈیوسر بھی اپنے اپنے گلاس تھامے ان کے پیچھے چل دیے۔

میں ریلنگ پر جھکا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا، جب میں نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا، وہ روڈی تھی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ جلدی کرو نک! ہمیں جانا ہے۔"

میں روڈی کے پیچھے پیچھے چھت کی دوسری جانب چل دیا۔ ہیڈوک اور فلم پروڈیوسر وہاں سے کافی فاصلے پر تھے۔ ایڈن چاندنی میں نہائی ہوئی کسی حور کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مارٹینی کا گلاس تھا۔

"ایڈن کے دیوانے۔" روڈی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر ایڈن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "زیادہ دیر مت لگانا، میں دروازے پر نظر رکھتی ہوں۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف جا رہی تھی۔

"ایڈن بھی ساری رات یہاں نہیں کھڑی رہ سکتی۔" میں نے روڈی کی آواز سنی۔ اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو میں نے اس سے پہلی بار ملتے وقت دیکھی تھی پھر وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ "ایڈن ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔"

میں نے مشروب کا گلاس ریلنگ کی پٹی پر رکھ دیا اور اس کی طرف بڑھا۔ ایڈن نے بھی میری تقلید کرتے ہوئے اپنا گلاس اس کے برابر میں رکھا اور اس کے بازو میری کمر کے گرد لپٹ گئے اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

"چلو، یہاں سے کہیں دور چلے جاتے ہیں۔" میں نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "ہم کل صبح فلوریڈا میں

ہو سکتے ہیں۔"

"اوہ ڈارلنگ!" وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ مجھے یہاں سے کہیں دور لے چلو۔"

یہ میری زندگی کا سب سے سنسنی خیز لمحہ تھا جس نے مجھے بے خود کر دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت ایک جگہ تھم گیا ہو لیکن جلد ہی اس لمحے کا سحر ٹوٹ گیا اور ایک کرخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایمرسن ہیڈوک میرے عقب میں کھڑا ہوا تھا۔

ایڈن جلدی سے علیحدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات کبھی نہیں بھلا سکتا گو کہ اس وقت میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی فاتح کی سی چمک تھی۔

میں اس کی جانب مڑا۔ ہیڈوک مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔

"میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔" میں نے بے خوفی سے کہا۔

"تم!" اس نے مجھے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا پھر ایڈن سے بولا۔ "تم اس کے ساتھ جاؤ گی۔ یہ قاتل ہے۔ یہ ایک بدنام زمانہ پولیس والا ہے جو قانون کی نظروں سے چھپتا پھر رہا ہے اور قانون اس سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ہے۔"

میرے سینے میں آگ بھڑک اٹھی۔ ہونٹ جلنے لگے اور بازو کی مچھلیاں سخت ہو گئیں۔ میں اسے بھی قتل کرنا چاہ رہا تھا۔

اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "میں نے پولیس کو مطلع کر دیا ہے......"

میں نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا اور پوری طاقت سے اس کے کولہے پر لات رسید کی۔ وہ پانچ فٹ پیچھے جا گرا، اگر ریلنگ کا سہارا نہ ہوتا تو شاید وہ اتنی اونچائی سے گر کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ میں نے اپنے اطراف میں لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنیں لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس پر تابڑ توڑ حملے کرنے شروع کیے اور پوری قوت سے اس کے چہرے اور جسم پر گھونسے مارنے لگا۔ مجھے یاد ہے کچھ مضبوط بازو کندھے اور گردن سے پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روڈی نے مجھے بہ مشکل تمام اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دی اور مجھ سے کہا کہ میں اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ساحل پر چلا جاؤں۔ دوسری بات جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ میں لاس اینجلس کے سٹی کونسلر ایمرسن ہیڈوک کے قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھا۔

اخبار ٹائمز نے سرخی لگائی۔ "کیا بے وفا عورتوں کے محبوب پولیس والے نے ایک اور قتل کر دیا۔" یہ خبر میں نے لنکاسٹر کے مضافات میں واقع ایک ہوٹل کے کمرے میں آرام کرتے ہوئے پڑھی۔ یہ جگہ لاس اینجلس سے ساٹھ میل دور شمال مشرق میں واقع تھی۔ خبر میں بڑی تفصیل کے ساتھ روڈی کی پارٹی کے دوران میرے اور ہیڈوک کے جھگڑے اور اس کی نو ماہ پرانی بیوی ایڈن فولیٹ کے ساتھ میرے تعلق کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ آگے چل کر لکھا تھا کہ اس جھگڑے کے بعد ہیڈوک اپنی چھت پر مردہ پایا گیا۔ لاش کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے کسی نے قتل کیا ہے۔ ایڈن اس واقعے پر تبصرہ کرنے کے لیے دستیاب نہیں تھی جبکہ روڈی نے ٹی وی رپورٹرز سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس خبر کے ساتھ لاس اینجلس پولیس کی وردی میں میری ایک تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔

اس وقت روڈی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں ساحل پر چلا گیا تھا اور ایک گھنٹا ٹہلنے کے بعد واپس پارٹی میں آگیا جہاں بہت سے مہمانوں نے میرا ایک ہیرو کی طرح استقبال کیا جبکہ فلم پروڈیوسر مجھے اس طرح نظر انداز کر رہا تھا

☆ واعظ جو کر رہے ہیں منبروں پہ چڑھ کے یاسر
وقت تہجد جاگتے ہیں، رقص و ہوا کے لیے
☆ اسے جواب دینے کی عادت نہ تھی۔
مجھے سوال کرنے کا حق بہت تھا۔

☆☆☆

☆ اک بزرگ سے کسی نے کہا۔ "میں سکون چاہتا ہوں۔"
بزرگ نے فرمایا۔ "بیٹے اس جملے سے میں نکال دو یہ تکبر کی علامت ہے، اور چاہتا ہوں، یہ بھی نکال دو یہ خواہش نفس ہے تو باقی بچے گا صرف، سکون۔"

مرسلہ: یاسر روبی، جہلم

جیسے میں اس سے اپنے معاہدے کی تجدید کروانا چاہ رہا ہوں۔ روڈی تھوڑی سی ناراض تھی لیکن اس نے مجھے مشروب دیا اور صوفے پر بٹھا کر سمجھانے لگی کہ میں گھر چلا جاؤں اور اس کے فون کا انتظار کروں۔

میں تقریباً ڈھائی بجے شب اپنے گھر پہنچا اور غسل کرنے کے بعد بستر پر لیٹ گیا۔ صبح چار بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ میرا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے لونگ روم کے بار سے ایک بوتل نکالی اور گلاس میں مشروب ڈال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ٹی وی آن کیا تو خبریں چل رہی تھیں اور پورے پردے پر ایمرسن ہیڈوک کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ خبر کی تفصیل سن کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں مشکل میں پڑ گیا ہوں۔

میں نے ریموٹ اٹھا کر دوسرے چینل کی تلاش شروع کر دی۔ ایک جگہ سے واقعے کی لائیو رپورٹ آ رہی تھی۔ ہیڈوک کے مکان کے باہر ایک شخص ٹی وی رپورٹر سے باتیں کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اس نے پولیس کے آنے سے کچھ دیر پہلے یہ منظر دیکھا اور یہ کہ اسے مسز فولیٹ نے فون کر کے بلایا تھا۔ وہ شخص ان کے برابر والے گیسٹ ہاؤس میں گزشتہ دو ماہ سے مقیم تھا۔

"میں نے یہاں کچھ نہیں دیکھا۔" وہ شخص پیچھے کی طرف گھومتے ہوئے بولا۔ "یہاں یہ ربر کا پائپ پڑا ہوا تھا جو عام طور پر گیس اسٹیشن کے ایئر کمپریسر پر لگایا جاتا ہے اور اس میں سے ہوا تیزی کے ساتھ گزرتی ہے۔"

جب اس سے مزید سوالات کیے گئے تو اس نے بتایا کہ ہیڈوک کا چہرہ سیاہ اور نیلا پڑ گیا تھا اور بری طرح سوج گیا تھا جبکہ اس کا سر خون میں تربتر تھا۔ رپورٹر کا خیال تھا کہ ہیڈوک کو اس پائپ کے ذریعے بے ہوش کیا گیا اور تنفس بحال نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندرونی نظام نے کام کرنا چھوڑ دیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں نے گھبرا کر ٹیلی وژن بند کر دیا۔

مجھے یقین تھا کہ ہیڈوک کی موت کا ہمارے درمیان ہونے والی لڑائی سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ جب لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا اور میں ساحل کی طرف جانے لگا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہیڈوک اپنے قدموں پر کھڑا ہو رہا تھا گو کہ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ زندہ تھا شاید میرے تابڑتوڑ گھونسوں نے اس کی ناک کی ہڈی توڑ دی تھی لیکن اسے کوئی شدید جسمانی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ اس سہ پہر جب میں ایڈن سے ملنے گیا تو وہ اس پائپ کے ذریعے زیرِ آب ٹینک بھر رہی تھی اور میں نے اس کے ہاتھ سے پائپ لے کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ لازمی بات ہے کہ اس پر میری انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ یہی نہیں بلکہ پورے مکان میں جہاں جہاں سے میں گزرا تھا۔ وہاں وہ نشانات موجود ہو سکتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے پاگلوں کی طرح دوڑ لگا دی۔

مصیبت اکیلے نہیں آتی بلکہ اپنے ساتھ اور بھی بہت کچھ لے کر آتی ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرا مقدمہ شروع ہونے سے ایک ہفتہ پہلے ٹیری ہیریسن کو کسی نے قتل کر دیا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھے ایڈن سے ملوانے ہیڈوک کے مکان پر لے کر گیا تھا۔ لہٰذا اب اس بات کی شہادت دینے والا کوئی نہیں تھا کہ ایمرسن ہیڈوک کے کمپریسر، چھت اور مکان کے دیگر حصوں پر میری انگلیوں کے نشانات کیسے آ گئے۔ پولیس اس کے قاتل کا سراغ نہیں لگا سکی۔ بعد میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ایڈن اور روڈی نے ہی اسے ہیڈوک کو قتل کرنے کے لیے کرایہ پر رکھا ہوگا اور کام مکمل ہونے کے بعد اسے بھی ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اب سارے ثبوت میرے خلاف تھے اور میرے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

6 جون کو روڈی اور ایڈن نے ایک چرچ میں شادی کر لی۔ جی ہاں، یہ خبر پڑھ کر میں بھی حیران ہوا تھا لیکن جب تمام واقعات پر دوبارہ غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ روڈی لڑکی نہیں بلکہ لڑکا تھی جو اپنے نسوانی خدوخال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مردوں کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ ایمرسن ہیڈوک جیسا شاطر شخص بھی اس کے جھانسے میں آ گیا پھر انہوں نے ہیڈوک کو راستے سے ہٹانے کے لیے مجھے چارہ بنایا۔ پہلے ایڈن نے مجھ سے محبت کا ناٹک رچایا پھر روڈی کو آگے بڑھا دیا۔ اب میں سمجھا کہ اپنے گھر میں ساڑھے تین گھنٹے میرے ساتھ تنہا گزارنے کے باوجود وہ کیوں اتنی محتاط تھی۔ اس نے مجھے رجھانے اور لبھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن مجھے حد سے نہ گزرنے دیا جسے میں اس کی پاکبازی سمجھتا رہا۔

اس ساری کہانی کا لب لباب یہ ہے کہ ہیڈوک کی وصیت کے مطابق ایڈن اس کی تین کروڑ مالیت جائداد کی اکلوتی وارث ہوگی۔ میری دعا ہے کہ خدا ہم سب کو ایسے خطرناک عشق سے محفوظ رکھے۔

سگ گزیدہ

اختر بیگ

کتا کتنا ہی کتا کیوں نہ ہو، وہ کاٹ لے تو اس کا علاج ممکن ہے لیکن حضرتِ انسان کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں... بعض لوگ بغیر کاٹے بھی محض اپنی زبان کے نشتر سے دوسروں کے ہوش وحواس زائل کر دیتے ہیں... مختصر سی، ایسی ہی ایک ہوش ربا کہانی۔

بے ترتیب معاشرے کی بگڑی ہوئی صورت حال

وہاں کتے کے کاٹے کا علاج ہوتا تھا۔ اسپتال کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت وہاں ایمرجنسی ڈیوٹی پر ایک سفید پوش نرس موجود تھی۔ جب سے وہ آئی تھی، بیکار بیٹھی تھی کیونکہ کسی مریض کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ بے کاری کی بے زاری اس کے چہرے سے مترشح تھی، وہ اکتائے ہوئے انداز میں بار بار جمائیاں لیے جا رہی تھی۔ اس دوران میں اس کی زیرِ لب خود کلامی بھی جاری تھی۔ "کوئی بے کاری سی بے کاری ہے...... یوں تو میں پاگل ہو جاؤں گی...... نہ کوئی مریض ہے نہ تیماردار...... کوئی ہوتا تو اسی سے باتیں کر کے میں اپنا دل بہلا لیتی۔ اتنا بڑا اسپتال ہے اور ایسا سناٹا...... معلوم ہوتا ہے کہ

شہر کے سارے کتے ہڑتال پر گئے ہوئے ہیں۔"

اس کے دماغ میں یہی سب باتیں چکرا رہی تھیں کہ ایک خوش پوش شخص بہت تیزی سے اسپتال میں داخل ہوا۔ اندر آتے ہی وہ تیر کی طرح نرس کی طرف آیا تھا۔

"مسٹر...... بب...... بات یہ ہے کہ......"

"جی، جی! فرمایئے! کیا بات ہے؟" نرس نے اس کی بات کاٹ کر بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"کل شام میں اپنے ایک عزیز دوست سے ملنے کے لیے اس کے گھر گیا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ گویا سانس لینے کے لیے رکا۔

"لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھر ملاقات کے لیے جاتے ہی رہتے ہیں۔" نرس نے کہا۔ "یہ بات آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

"دراصل میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ انہوں نے اپنے گھر میں ایک کتا پال رکھا ہے......"

"اچھا! تو شاید اس کتے نے آپ کو کاٹ لیا ہے...... یہ لیں! یہ ایک سوال نامہ ہے، جلدی سے اسے پُر کردیں۔" یہ کہتے ہوئے نرس نے اپنی میز کی دراز سے ایک فارم نکالا جو کئی صفحوں پر مشتمل تھا۔ فارم دیکھ کر اس شخص کے چہرے پر الجھن کے آثار ابھر آئے۔

"اوہ...... یہ تو کئی صفحات ہیں، میں ان کی خانہ پری کروں گا تو دفتر پہنچنے میں دیر ہوجائے گی۔ میرا باس بہت تندخو ہے...... ذرا ذرا سی بات پر بے عزتی کر ڈالتا ہے...... کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ مجھے کوئی احتیاطی یا حفاظتی انجکشن لگادیں اور میں اپنے دفتر چلا جاؤں!"

"مجھے افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا...... آپ جلدی سے اپنا نام بتائیں!" نرس نے فارم اس کے ہاتھ سے لے کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔

"انور خان!"

"انور صاحب! آپ کو کس چیز نے کاٹا ہے؟"

"جیک نے۔"

"یہ کون ہے...... آپ کا کوئی دوست یا رشتے دار؟"

"مسٹر! آپ ڈھنگ سے بات کریں...... جیک ایک کتا ہے اور میں آپ کی طرح اشرف المخلوقات...... یعنی انسان۔ ایک کتا میرا رشتے دار کیسے ہوسکتا ہے؟"

"سوری! واقعی انسان نظر آرہے ہیں...... مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اصل میں غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے۔ کتا اور انسان...... انسان اور کتا...... کیسی عجیب بات ہے۔ اچھا! یہ بتایئے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟"

"جی! میں اکاؤنٹنٹ ہوں!" اس نے ناگواری سے جواب دیا۔

"کس ادارے میں کام کرتے ہیں؟" نرس فارم پر لکھتی جارہی تھی۔

"براڈلینڈ کمپنی میں!"

"کس کمپنی میں؟" نرس نے بھویں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"براڈلینڈ...... براڈلینڈ کمپنی!" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"فراڈلینڈ؟"

"فراڈ نہیں...... براڈ...... براڈ...... براڈ!"

"تم فراڈ لینڈ...... یعنی براڈ لینڈ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ ہو...... کیا میں یہ بات درست سمجھی ہوں!" وہ یکایک آپ سے تم پر اتر آئی۔

"غنیمت ہے کہ میں تمہیں اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہوگیا۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ہاں تو مسٹر انور! تم میرے سوال سمجھ رہے ہو نا؟"

"میں تو سمجھ رہا ہوں...... کیا تم بھی میرے جواب اچھی طرح سمجھ رہی ہو؟"

"پوری طرح سمجھنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔"

"پھر بھی لکھے جارہی ہو۔ کیا لکھ رہی ہو؟"

"یہ میرا کام ہے، میں اسے خوب سمجھتی ہوں۔ اس بارے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" نرس نے رکھائی سے کہا۔ "میں جو کچھ پوچھ رہی ہوں، آسان اردو میں اس کے جواب دیتے جاؤ...... یہ بتاؤ کہ پہلے کبھی کسی جانور نے تمہیں کاٹا ہے؟"

"ضرور کاٹا ہے!"

"کس نے...... وہ کون سا جانور تھا؟"

"کھٹمل...... راتوں کو اکثر کاٹتے ہیں۔"

"کھٹمل جانور نہیں ہوتا...... میں چوپایوں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں جیسے بلی، کتا، شیر، چیتا یا گیدڑ وغیرہ......!"

اس نے ہاتھ اٹھا کر نرس کو روک دیا۔ "نہیں...... کبھی نہیں!"

"آخر کیوں...... کیوں نہیں کاٹا؟"

"شاید میرا گوشت لذیذ نہیں ہے...... جانور بھی ذائقہ چاہتے ہیں یا پھر میرا کسی بھوکے جانور سے پالا ہی نہ پڑا ہو۔"

"ویری گڈ...... یہ بتاؤ کہ تمہاری کتنی بہنیں ہیں؟"

"ایک بھی نہیں!"

"اور بھائی کتنے ہیں؟"

"وہ بھی نہیں ہیں۔"

"کیا انہیں کبھی کسی جانور نے کاٹا ہے؟"

"مسٹر! تم میرا وقت برباد کر رہی ہو...... کیا احمقانہ سوال کیا ہے تم نے...... جب کوئی ہے ہی نہیں تو انہیں کون کاٹے گا؟"

"دیکھو...... اب تم بدتمیزی پر اتر آئے ہو...... اگر تم نے اپنا یہ رویہ نہ بدلا تو میں اسپتال کے ملازموں کو بلا کر تمہیں بندھوا دوں گی۔"

"سوال ٹھیک ہوں گے تو جواب بھی ٹھیک ہوگا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے والدین تو ہوں گے، ان کو کبھی کسی جانور نے کاٹا تھا؟"

"خدا کا خوف کرو مسٹر...... اولاد کے ہوتے ہوئے والدین کو کون کاٹنے کی ہمت کرے گا۔"

"ان کے دوست بھی یہ کام کرسکتے ہیں۔"

"وہ چوپائے نہیں ہوتے، ان کے دو پاؤں ہوتے ہیں۔"

"بحث مت کرو۔ اس بارے میں، میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔"

وہ سر جھٹک کر زیرِلب کچھ بڑبڑایا۔ نرس کے پلے کچھ نہ پڑ سکا۔

"تمہارے کوائف مکمل ہوگئے۔ اب بتاؤ کہ تمہیں کس نے کاٹا ہے؟"

"ایک پلّے نے...... مجھے یہ بات کتنی مرتبہ بتانی پڑے گی۔"

"پلّے نے...... یہ کون سا جانور ہے...... ہمارے سرکاری ریکارڈ میں اس نام کا کوئی جانور نہیں ہے۔"

"پِل...... لا!" اس نے دُہرایا "یعنی سن آف اے بچ!"

"زبان کو لگام دو...... تم یہ گالی کسے دے رہے ہو؟" نرس غرائی۔

"اوہ...... میرا مطلب تھا کہ پلا کسی کتیا کا بچہ ہوتا ہے۔"

"تم سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ وہ کتا تھا۔"

"ہاں...... ہاں...... وہ کتا ہی تھا...... خدا کا شکر ہے کہ گیدڑ یا بھیڑیا نہیں تھا۔"

"نر تھا یا مادہ؟" نرس نے پوچھا۔

"کتیا۔"

"شٹ اپ! اب تم حد سے تجاوز کر رہے ہو!" اس بار نرس کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔

"وہ مادہ پلا تھا۔ اسے میں کتا کیسے کہہ سکتا ہوں...... وہ کتیا تھی۔" انور نے بےبسی سے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے...... معلوم ہوتا ہے کتے کے زہر نے تمہیں پاگل کردیا ہے۔ میں ابھی اپنے اسٹاف کو بلاتی ہوں!"

"تم کتے کے زہر سے زیادہ خطرناک ہو...... پاگل لگتی ہو...... شاید تمہیں کسی پاگل کتے نے کاٹ کر اس حال کو پہنچایا ہے۔"

"شٹ اپ! میں تین سال سے یہاں ہوں۔ مجھے آج تک کسی کتے نے تو کیا، مچھر نے بھی نہیں کاٹا۔"

"کسی نے نہیں کاٹا تو آج میں تمہیں کاٹوں گا۔" انور اشتعال آمیز سرگوشیانہ لہجے میں غراتا ہوا نرس کے قریب آگیا۔ "تم کو تمہاری گھٹیا حرکتوں اور بدزبانی کا مزہ چکھانا ضروری ہوگیا ہے۔"

نرس خوف زدہ ہوکر الٹے قدموں وہاں سے بھاگی پھر پلٹ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

"اس پر پاگل کتے کے زہر کا اثر تیزی سے ہو رہا ہے۔" وہ نکلتے ہوئے چیخی۔

انور غصے سے بےقابو ہوا جارہا تھا۔ اسی عالم میں اس نے کمرے میں موجود ساز و سامان کو اٹھا کر ادھر ادھر پھینکنا شروع کردیا اور نرس کی شان میں ناروا الفاظ بکتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

چند لمحوں بعد نرس نے پچھلے راستے سے کمرے میں جھانکا تو اسے سارا ساز و سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا نظر آیا۔ کمرے میں سناٹا دیکھ کر اس میں ہمت پیدا ہوئی اور وہ جھجکتے ہوئے اندر آگئی۔ وہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔ نرس نے ایک گہرا سانس لیا اور زیرِلب بڑبڑائی۔ "مردود بھاگ گیا...... اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔ اب وہ بازار میں دیوانوں جیسی حرکتیں کرتا پھر رہا ہوگا۔"

نرس نے قریب ہی رکھے ہوئے فون پر تیزی سے ایک نمبر ملایا اور سلسلہ مل جانے پر تقریباً ہانپتے ہوئے بولی۔ "ہیلو...... ہیلو...... میں سگ گزیدوں کے اسپتال سے بول رہی ہوں...... جلدی ایمبولینس بھیجیں...... ابھی یہاں سے ایک مریض نکل بھاگا ہے، اسے کسی باؤلے کتے نے کاٹا ہوا ہے اور اب وہ پاگل ہوکر بازار میں نکل گیا ہے...... ہاں، ہاں...... وہ کسی کتے کی طرح لوگوں کو کاٹتا پھر رہا ہوگا...... باؤلے کتے کے کاٹنے سے یہی ہوتا ہے...... ہرگز نہیں...... بالکل نہیں، اس نے کوشش ضرور کی تھی مگر مجھے نہیں کاٹ سکا...... در...... دراصل ہم لوگوں کو خطرناک مریضوں سے بچاؤ کی ٹریننگ دی جاتی ہے...... ہم ان سے نمٹنے کے طریقے خوب اچھی طرح جانتے ہیں...... آپ ایمبولینس بھیجیں اور اسے جلدی پکڑوائیں!"

وہ ریسیور رکھ کر مڑی تو وہاں کھڑا ہوا ڈسپنسر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "علاج اور ٹریننگ کے علاوہ ہمارے پاس ایک لمبا سوال نامہ بھی ہے جو اچھے خاصے آدمی کو سگ گزیدہ بنا سکتا ہے!"

نرس غصیلی نظروں سے اسے گھور کر رہ گئی۔

(روسی ادیب وکٹر آروف کی کہانی سے ماخوذ)

ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر:9

گل و گلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر ہیں، راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے جسے لوگ پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا کہ ایک روز جب میری عمر پانچ برس تھی ایک خونچکاں واقعے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کردیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی

طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبریٰ رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آگیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا، میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کردیا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا اور سواریاں لے کر قریشی موڑ تک جاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی کیونکہ اس سے پہلے کوئی ڈاکٹر زیادہ عرصے گاؤں میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص مگر کچھ قنوطی انسان تھے لیکن نڈر اور بہادر۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کررہا تھا اس کے علاوہ مجھے ان کے ہاں سے کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ ایک درزی مراد بخش دیوانہ سے بھی دوستی تھی جو کہ شاعر بھی تھا اور اس کے درد بھرے دوہڑے کافی اثر رکھتے تھے۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہوگیا اور اپنی قلبی کیفیت کا مجھ سے اظہار کیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کردیا جس پر وریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی انتقامی سازش ضرور کرے گا جو کہ شاہ جی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ میں نے کھالے سے مشورہ کیا اور ہم دونوں نے شاہ جی کی رہائش گاہ کی نگرانی کی لیکن شاہ جی بھی غافل نہیں تھا انہوں نے پیش بندی کررکھی تھی، یہ سازش ناکام ہوگئی جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں وریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی میں نے سوچا کہ حیات خان سے ان کی شکایت کروں گا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہوگئی زینان نے میرے ذریعے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہوگیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے میرے جسم کو خنجر کے ذریعے زخمی کردیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں، سب کھالے پر لعن طعن کررہے تھے میں نے اسے معاف کردیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کرلیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہوگیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا ہیرو ٹائپ نوجوان وہاں آگیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہوگئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان مونی کا قتل ہوگیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوالے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوالیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کرلیا۔ یہاں سے فارغ ہوکر نور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ کھالا بھی لاپتا تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور قتل کا نشان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر جلاڈالا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیا نامی لڑکی سے ہوئی جس نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چیز دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اسما تھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہوگیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ببلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آگیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرالیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر

میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرادی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہوگیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے ڈھول چاٹنے پر مجبور کردیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربہ کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ ہم ڈیرے پر پہنچے لیکن وہاں ہمارے لیے کوئی اچھی خبر نہ تھی، وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دل جیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کرکے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کرکے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کرکے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ میڈم نے مشورہ دیا کہ مجھے اپنے رشتے داروں کو نور پور سے نکال لانا چاہیے لہٰذا ہم نور پور پہنچے لیکن، ہم سے پہلے ہی ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو خالی ہاتھ تھا، اسے یوں مایوس دیکھ کر مجھے دھچکا لگا۔ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ لیکن موجو کو لے آیا تھا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا اور ایک سابق فوجی ہماری خدمت پر مامور تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائداد کی خاطر، بخت جان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں پیا نے میری تربیت کی اور مجھے فارم ہاؤس میں میڈم سے ملاقات کا حکم ملا لیکن یہ ملاقات ایک خونی مقابلے کی صورت تھی جس میں، میں بہ مشکل تمام غالب رہا یہ میڈم کے امتحان لینے کا ایک طریقہ تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کردیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ واپسی کے سفر میں ہم جب گاڑی میں بیٹھے تو عقب سے ہم پر ہتھیا تان لیے گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میرا ذہن بڑی تیزی سے اس نئی افتاد سے نمٹنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ ابھی ہم نے بہ مشکل دو ڈھائی کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ میڈم نے مجھے مخاطب کیا۔ ”کیا تمہارے پاس سگریٹ ہے؟“

میں نے حیرت سے جواب دیا۔ ”نہیں تو......“

ساتھ ہی میں نے میڈم کی طرف دیکھا۔ حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ وہ بالکل نارمل دکھائی دینے لگی تھی۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ پکنک اسپاٹ کی طرف اپنی مرضی سے ڈرائیو کررہی ہو۔

اس نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، پھر بیک مرر میں جھانک کر کہا۔ ”اوئے مونچھوں والے! تمہارے پاس سگریٹ تو ہوگی، مجھ کو سلگا کر دو۔“

اس کے عقب میں آگے کی سمت جھک کر بیٹھے ہوئے شخص نے ڈپٹ کر کہا۔ ”بکواس نہ کرو ورنہ......“

میڈم پر اس کی ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ منہ بنا کر بولی۔ ”کیا ورنہ؟ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جو تمہیں پسند نہ ہو، پھر دھمکیاں کیوں دیتے ہو، سگریٹ سلگا کر دو۔“

وہ غرایا۔ ”میں سگریٹ نہیں پیتا۔“

”پھر تمہارے ہونٹ سیاہ کیوں ہیں؟“ میڈم نے عقب نما میں دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

وہ تلملا کر بولا۔ ”خاموش رہو ورنہ تمہیں گولی ماردوں گا۔“

”سگریٹ مانگنے کے جرم پر؟“ میڈم کا لہجہ خاصا استہزائیہ تھا۔ ”اس سے بڑی کمینگی دنیا میں شاید کوئی نہیں ہوگی۔ اپنے ساتھی سے مانگ لو، اس کے پاس تو ہوگی ناں!“

میں حیرت سے میڈم کو دیکھ رہا تھا جو لحظہ بہ لحظہ اپنے عقب میں بیٹھے ہوئے شخص کو تاؤ دلاتی جارہی تھی۔

”مم...... میں کہہ رہا ہوں کہ خاموش رہو۔ ہمارے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ اب اگر تم نے سگریٹ کا نام لیا تو میں......“

”گولی ماردوں گا...... واہ......“ میڈم نے اس کی بات کاٹ کر مسخرانہ انداز میں اس کی نقل اُتاری۔ ”کیا تمہارے پاس ہے؟“

اس نے گردن موڑ کر میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص سے سوال کیا تھا۔

وہ کیا کرنا چاہتی تھی، میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ میرے عقب میں بیٹھے ہوئے شخص نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے قدرے بلند اور غصیلی آواز میں کہا۔ ”میں نے ایک سگریٹ مانگی ہے، وائن کا سوال تو نہیں کردیا جو تم لوگ یوں نخرے دکھانے لگے ہو۔“

بھاری آواز والا بیزاری سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس کے ساتھی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر تم کوئی ڈراما کرنے کے بارے سوچ رہی ہو تو یاد رکھو، میں ٹرائیگر دبانے میں لحظہ بھر کی دیر بھی نہیں کروں گا۔“

میڈم نے اچانک بریک لگا دیے۔ کار چالیس پچاس کی اسپیڈ سے خستہ حال سنگل سڑک پر جارہی

تھی۔ بریک لگانے سے ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے دیکھا۔ گڑھوں والی سڑک بائیں ہاتھ نوے درجے کے زاویے پر مڑ رہی تھی۔

میڈم نے اسٹیئرنگ پر سے ہاتھ اُٹھا لیے اور بولی۔ ”سگریٹ کے بغیر مجھ سے ڈرائیونگ نہیں کی جا سکتی۔ اگر تم لوگ کار چلا سکتے ہو تو آ کر چلاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

بھاری آواز والا دانت پیس کر بولا۔ ”میں کہتا ہوں، شرافت سے گاڑی چلاؤ......“

”میں کہتی ہوں، نہیں چلاؤں گی۔“ میڈم نے قطعی لہجے میں کہا۔

اس کو کور کرنے والے نے پستول کی نال کا دباؤ گردن پر بڑھاتے ہوئے دانت کچکچائے، ظاہر کیا کہ وہ گولی چلانے والا ہے، پھر سرد لہجے میں بولا۔ ”میں تمہارے ساتھ کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا مگر تم مجھے مجبور کر رہی ہو...... میں تین تک گنوں گا، اگر تم نے گاڑی نہ چلائی تو شوٹ کر دوں گا۔“

میڈم کے لبوں پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ تیر گئی۔ جونہی دھمکی دینے والے نے ’ایک‘ کہا، وہ فوراً بول پڑی، ”دو...... اور تین...... اب گولی چلا دو۔ میں نے تمہاری مشکل حل کر دی ہے۔“

میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ کن اکھیوں سے میڈم پر تنے ہوئے پستول والے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا، میڈم کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ پر نگاہ ڈال رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میڈم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟ وہ ایسی طفلانہ حرکتیں کیوں کرنے لگی تھی؟ میں نے یہ بھی سوچا کہ کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا تھا مگر پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ بہت قوی اعصاب کی مالک تھی، ایسی سچویشن میں کوئی بھی غیر ذمے دارانہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔

اس پر گولی نہیں چلائی گئی بلکہ دھمکانے والے نے گویا شکست تسلیم کر لی، بولا۔ ”مجھے مجبور نہ کرو کہ میں......“

میڈم نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ ویل پر اکتائے ہوئے انداز میں مارے اور کہا۔ ”بار بار گولی مارنے کا ڈراوا نہ دو، ہمت ہے تو مار دو۔ جس زندگی میں سگریٹ جیسی سستی شے بھی نہ ملے، اس کا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہوتا ہے۔“

مجھے اس کے پیچھے بیٹھا ہوا پستول بردار شخص نظر آ رہا تھا۔ اس نے گہرے کلر کا دہری تہ والا اونی مفلر گلے میں ڈال رکھا تھا۔ خاصا جسیم اور گٹھے ہوئے بدن کا مالک تھا اور چہرے بشرے سے بہت سفاک اور عادی مجرم معلوم ہوتا تھا۔ وہ دانت کچکچا رہا تھا، اس کے جبڑوں کے اعصاب تیزی سے متحرک رہے تھے اور آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گولی مارنا چاہتا ہو مگر فائر نہ کرنے پر مجبور ہو۔ اچانک مجھے میڈم کی چالاکی سمجھ میں آ گئی۔ وہ یہی کچھ بھانپ کر اسے زچ کر رہی تھی۔ پیاجی نے مجھے سمجھایا تھا کہ دشمن کو بوکھلاہٹ کا شکار کرو، اسے زچ کرو اور مجبور کر دو کہ وہ اشتعال میں آ کر احمقانہ حرکت کر ڈالے۔ ایسے میں خود کو فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار رکھو۔ شاید میڈم اسی کھیل میں مشغول تھی۔

مفلر والے کے ساتھی نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکال کر میڈم کی طرف اچھالی اور ایک غلیظ گالی دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے مجھے ماں بہن کی گالی دی ہو، میرا دورانِ خون یک لخت تیز تر ہو گیا اور آنکھیں جل اُٹھیں۔ میں نے اپنی جھولی میں رکھی ہوئی گن کے دستے پر ہاتھ رکھا اور شعلہ بار لہجے میں کہا۔ ”تیری تو......“

میڈم کو گالی دینے والا چوکس تھا۔ لمحہ بھر میں اپنی سیٹ سے اُٹھ کر مجھ پر جھک گیا اور اس نے پستول کی نال میری گردن میں بے دردی سے چبھو دی۔ مجھے اشتعال میں اُس کی پروا نہیں تھی مگر میڈم کے اشارے نے مجھے ساکت کر دیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”نہیں ڈیئر! مجھے سگریٹ پینے دو۔ بڑی مشکل سے ملی ہے۔ یہ اناڑی لوگ شاید اغوا کرنے کے آداب سے واقف نہیں ہیں۔“

میں نے شکوہ کناں نظروں سے میڈم کو دیکھا جو سگریٹ منہ میں دبا کر دیا سلائی جلا رہی تھی۔ اس نے جونہی دھواں حلق میں اُتارا، اسے کھانسی آ گئی۔ اس نے پھر کش لیا، پھر کھانسنے لگی۔

عقب میں درشت آواز ابھری۔ ”گاڑی بڑھاؤ، یہ اداکاری بعد میں کر لینا۔ ہم تمہیں بہت سے ایسے مواقع دیں گے۔“

میڈم نے گیئر لیور دبایا اور گاڑی بڑھا دی۔ موڑ کاٹنے کے بعد بہ مشکل ایک کلومیٹر ہی آگے گئے تھے کہ اس نے پھر بریک لگا دیے۔

کار میں غراہٹ گونجی۔ ”اب کیا مصیبت ہے؟“

وہ کھانستے ہوئے بولی۔ ”میں نے کبھی کار میں بیٹھ کر سگریٹ نہیں پی، تم لوگ ادھر رکو، میں باہر کھڑے ہو کر دو چار لمبے لمبے کش لے لوں۔ پھر آگے چلیں گے۔“

کہتے ہی اس نے بڑی بے خوفی سے دروازہ کھول دیا۔ گن پوائنٹ پر رکھنے والے شاید اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ وہ اچانک گھبرا سے گئے اور فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ایسی حالت میں انہیں کیا کرنا چاہیے تھا۔

مجھے کور کرنے والے نے دبی دبی آواز میں اپنے ساتھی سے کہا۔ ”نیچے اُترو، فوراً...... بھاگے تو بے دریغ شوٹ کر دینا......“

مفلر والے نے بھی میڈم کے پیچھے گاڑی سے اُترنے میں دیر نہیں لگائی مگر میڈم جو بہ ظاہر اپنا گیٹ کھول کر بے دردانہ انداز میں کھڑی تھی، ہاتھ دکھانے میں کامیاب ہو گئی۔ مفلر والے جسیم شخص کے پیر جونہی زمین پر پڑے، میڈم نے اس کے دروازے کو پوری قوت سے واپس دھکیل دیا۔ نتیجتاً وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر گیا۔ اس کا سر کار کے اندر جبکہ نچلا بدن زمین پر جا گرا۔ میڈم نے دوسرے لمحے دروازہ اپنی جانب کھینچا اور ایک مرتبہ پھر پوری قوت سے دھکیل دیا۔ مفلر والے کی تیز کراہ بلند ہوئی اور اس کے منہ سے مغلظات کا سیلاب اُمڈ آیا۔ میڈم نے یہ سب کچھ اتنی اچانک اور ناقابلِ بیان پھرتی سے سرانجام دیا تھا کہ مجھے کور کرنے والے کو اپنے ساتھی کی مدد کرنے کا موقع تک نہ ملا۔

چونکہ گاڑی کے اندر لائٹ کی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی اور باہر گہری اور سیاہ رات طاری تھی اس لیے مجھے میڈم دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھ پر مسلط شخص ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا جبکہ میں کن اکھیوں سے اپنی گردن میں چبھی ہوئی پستول کی نال کو دیکھ رہا تھا اور اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے موقع ڈھونڈ رہا تھا۔

شاید اُن دونوں کے درمیان خاموش کمٹمنٹ ہو چکی تھی کہ ایک میڈم کو کور کرے گا جبکہ دوسرا مجھے گن پوائنٹ پر رکھے گا، تبھی مجھے کور کرنے والے نے اپنے ساتھی کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایسے ہی وقت میں پُرسکوت ماحول فائر کی تیز آواز سے لرز اُٹھا۔ ساتھ ہی ایک ہولناک چیخ سناٹے کا قلب چیر گئی۔ مفلر والے شخص کو میڈم نے موقع پاتے ہی گولی مار دی تھی۔ چند لمحوں کے بعد دوسرا فائر ہوا اور گاڑی کو ایک جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی عقبی دروازہ ’ٹھک‘ کی زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

”امجد...... امجد...... کیا ہوا؟“ میرے عقب نشین کی تیز اور قدرے گھبرائی ہوئی آواز اُبھری مگر اُسے جواب نہیں ملا۔ اس نے دو تین مرتبہ اپنے ساتھی کو پکارا اور پھر شاید اپنے تئیں طے کر لیا کہ اُسے اَب کسی مدد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

چند لمحوں بعد میڈم کا ہیولا فرنٹ گیٹ میں لہرایا اور وہ دائیں ہاتھ میں پستول لیے ڈرائیونگ سیٹ پر آن گری۔ گرتے ہی مچھلی کی طرح تڑپی اور پہلو بدل گئی۔ اب اس کے پستول کا رُخ دونوں سیٹوں کے درمیانی خالی جگہ کی طرف تھا۔ اسپاٹ لہجے میں بولی۔ ”تم نے مجھے سگریٹ دی تھی...... دی تھی ناں؟...... اس لیے تمہیں زندہ چھوڑ دیتی ہوں، کیا یاد کرو گے۔“

گاڑی کے اندر کی سچویشن یکسر بدل کر رہ گئی تھی۔ میں دم بخود میڈم کو دیکھ رہا تھا جس نے چند ہی لمحوں میں کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ میری گردن پر نال کا دباؤ بہ دستور موجود تھا جبکہ میڈم اکیلے بچ جانے والے اغواکار پر پستول تانے بیٹھی تھی۔

”پستول نیچے کر لو ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔“ وہ دہاڑا۔ اس کی آواز نے اس کی گھبراہٹ کو مجھ پر آشکار کر دیا تھا۔

”بھلے مار دو، میں تمہیں مار دوں گی۔ معاملہ برابر رہے گا۔“ میڈم نے عام سے انداز میں کہا۔ ”اگر تم چاہو تو میں گاڑی وہاں تک لے جا سکتی ہوں جہاں تم ہمیں لے جانا چاہتے تھے۔ کیا خیال ہے؟“

اسے یقین نہیں آیا۔ آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ تبھی اُلجھ کر بولا۔ ”چلو، گاڑی چلاؤ۔“

”پستول اس کی گردن سے ہٹا لو۔ میں بھی تمہارا نشانہ چھوڑ دیتی ہوں۔ ہم دشمن ہی سہی، مگر یہ مختصر سا سفر اچھے دوستوں کی طرح طے کر سکتے ہیں۔“

وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ بازی ہار چکا ہے۔ اگر وہ مجھ پر گولی چلا بھی دیتا تو میڈم کے پستول سے نکلنے والی گولی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے پستول کی نال میری گردن پر سے ہٹا لی۔ میڈم نے آنکھوں سے دونوں سیٹوں کے درمیان خالی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس پستول کو یہاں رکھ دو......“

اس نے پستول رکھ دیا جو میڈم کے پیروں کی طرف لڑھک گیا۔

میں نے گن سنبھالی، میڈم کا اشارہ پا کر گیٹ کھولا اور کار سے اُتر گیا۔ گاڑی کے پیچھے سے گھوم کر ڈرائیونگ سائڈ کے پچھلے دروازے کی طرف آیا۔ کار سے دو تین فٹ کے فاصلے پر مفلر والا اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کا سر روڈ

سائڈ پر پڑا تھا جبکہ دونوں ٹانگیں ڈھلوانی جھاڑیوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ اس کا پستول والا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے بہ طور احتیاط پاؤں کی ٹھوکر اس کے ہاتھ پر رسید کی۔ پستول اس کی مردہ گرفت سے نکل کر جھاڑیوں میں جا گرا۔

میں نے دروازہ کھولا، سیٹ پر سر ٹکائے، آنکھیں مونڈے شکست خوردہ انداز میں بیٹھے ہوئے شاہ زور پر نظر ڈالی اور اس کے برابر بیٹھ گیا۔ میں نے گن کی نال اس کی پسلیوں سے لگا دی۔ میڈم نے اطمینان بھرے انداز میں مجھے دیکھا اور پستول اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ عقب نما میں دیکھ کر بولی۔ ''انہیں ہماری زندگی کی ضرورت تھی، ہمیں نہیں ہے۔ یہ کوئی بھی حرکت کرے تو گولی مار دینا۔''

''جی میڈم!'' میں نے سخت مگر مودبانہ لہجے میں کہا۔

میڈم نے ہونٹ سکیڑے، سیٹی بجائی اور گاڑی چلا دی۔ اس نے رفتار کم رکھی تھی اور صاف عیاں تھا کہ وہ ٹرن لینے کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں تھی۔ سڑک تنگ تھی۔ جھاڑیاں، سرکنڈے اور مختلف قسموں کے درخت سڑک کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ ایک کلومیٹر کے بعد تھوڑی سی کھلی جگہ میسر آئی۔ میڈم نے بڑی مہارت سے ٹرن لیا اور بولی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ ابھی تک آنکھیں مونڈے پڑا تھا۔ اس کے تازہ شیو یافتہ سانولے چہرے پر جا بہ جا زخموں کے نشانات تھے۔ کنڈل دار مونچھیں، گھنگھریالے بال اور موٹے سیاہ ہونٹ...... اس کا صورتی تاثر ہی کسی بدقماش شخصیت کا سا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر گن کا دباؤ بڑھایا اور درشت لہجے میں کہا۔ ''جواب دو، کیا نام ہے تمہارا؟''

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے گھورا۔ یوں کہ مجھے سمجھ آگئی کہ وہ خوفزدہ نہیں تھا، محض شکست خوردہ تھا اور کسی بھی وقت اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا ارادہ کر سکتا تھا۔ میرا لہجہ مزید کرخت ہو گیا۔ ''کیا تم نے سنا نہیں؟''

اس نے مجھ پر نگاہیں مرتکز رکھیں، ایک گہری سانس خارج کی اور بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''ماں باپ نے پیدائش رجسٹر میں ظفر اقبال لکھوایا تھا مگر قانون کے رجسٹروں میں ظفری ڈکیت لکھا گیا۔''

اس کی آواز اور شکل گواہی دیتی تھی کہ وہ نامی گرامی ڈکیت تھا اور سچ بول رہا تھا۔

میڈم نے گاڑی روک دی۔ پلٹ کر اُسے بہ غور دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے میڈم؟ کیا آپ اسے جانتی ہیں؟''

وہ بہ دستور اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں! اس کا نام تو بہت سن رکھا تھا، آج اس سے ملاقات بھی ہو گئی۔''

ظفری ڈکیت نے پھر اپنی آنکھیں بند اور چہرہ سپاٹ کر لیا۔ میڈم نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر کڑی نظر رکھنے کا حکم دیا اور گاڑی چلا دی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک مرتبہ پھر فارم ہاؤس پر تھے۔ میڈم نے فارم ہاؤس پر حملہ آور ہونے والوں، جن میں سے ایک اس وقت میری تحویل میں تھا، کی پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر کے برابر میں کار روکی اور اُتر کر کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ چونکہ اُس نے مجھے اُترنے کا حکم یا اشارہ نہیں دیا تھا، اس لیے میں ظفری ڈکیت کو گن پوائنٹ پر رکھے گاڑی میں بیٹھا رہا۔

اس نے اچانک اپنی آنکھیں کھول دیں اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

میں نے میڈم کے انداز کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ ''میں...... میں اُس سگریٹ پینے والی کا باڈی گارڈ ہوں۔''

اس کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ اُبھری۔ ''اچھا! میں سمجھا کہ شاید وہ تمہاری باڈی گارڈ ہے۔''

اس نے 'اچھا' پر خصوصی زور دیا تھا۔ میں اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ ایک ذرا غصہ بھی آیا مگر برداشت کر کے بولا۔ ''وہ کون تھا جو میڈم کی گولی کا شکار ہو گیا؟''

''وہ میرا ساتھی تھا......''

''الو کے پٹھے! یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے ڈانٹا۔

''ڈکیت کا ساتھی ڈکیت ہی ہو سکتا ہے، کوئی امام مسجد تو نہیں...... یہ علم تو تمہیں ہونا چاہیے۔''

''مجھے کیا علم ہونا چاہیے، اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ اس کا نام کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس دوران میں نے میڈم کو موبائل فون پر کسی سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ گیٹ پر لگے ہوئے سو واٹ کے بلب کی روشنی میں ہماری جانب پشت کیے کھڑی تھی۔

''امجد خانیوالیا...... بڑا نام تھا اُس کا علاقے میں، آج پتا چلا کہ وہ مٹی کا مادھو تھا۔ ایک زن (عورت) نے اُسے احمق بنا کر اُوپر روانہ کر دیا۔'' اس کے لہجے میں اپنے ساتھی کی موت کا دُکھ نہیں بلکہ گہرا طنز چھپا ہوا تھا۔ مجھے ایک ذرا حیرت ہوئی۔ اُسے علم نہیں تھا کہ وہ جسے محض ایک زن سمجھ رہا تھا، وہ ایک وقت میں کئی مردوں پر بھاری ثابت ہونے والی میڈم شکیلہ تھی جس کے آگے بڑے بڑوں کی اکڑ خاک میں مل جاتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اپنے ساتھی کے

جانے وہ میڈم کے مقابلے میں اُترنے کی غلطی کر بیٹھتا تو اس کا انجام بھی اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا۔ گزرنے والی گھڑیوں اور سرد رات میں مجھے یہ کڑا اور جاں گسل تجربہ ہو چکا تھا کہ اگر قسمت میرا ساتھ نہ دیتی تو وہ میری ہڈی پسلی ایک کر چکی ہوتی۔

میں نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ کتنے آدمی تھے؟''

''کس وقت؟'' وہ چونکا۔

''جس وقت تم لوگوں نے اس فارم ہاؤس پر حملہ کیا تھا؟''

''ہم سات آدمی تھے۔''

میں نے دل ہی دل میں حساب کیا۔ مرنے والوں کا شمار کیا تو پتا چلا کہ اُس نے تقریباً درست تعداد بتائی تھی۔

''تمہیں یہاں پر حملہ کرنے کے لیے کس نے بھیجا تھا؟'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میں نے بتایا تو ہے کہ میرا نام ظفری ڈکیت ہے، ڈکیت کیوں حملہ کرتے ہیں؟ یہ علم تو تمہیں ہونا چاہیے۔'' وہ شاطرانہ انداز میں غچہ دیتے ہوئے بولا۔ ''میں اگر تم سے پوچھوں کہ تم دونوں یہاں کیا کر رہے تھے تو تم یہی کہو گے ناں کہ جوان عورت اور مرد تنہائی میں کیا کرتے ہیں؟ یہ علم تو تمہیں ہونا چاہیے۔ ہے ناں؟''

یکبارگی میرا جی چاہا کہ میں اس کا منہ توڑ دوں، اُسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں مگر میں نے بڑی ہمت سے خود پر قابو پا لیا۔ پھر بہ ظاہر مسکرایا اور پوچھا۔ ''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

وہ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ میڈم کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے ظفری سمیت باہر آنے کا حکم دے رہی تھی۔ میں نے اُسے گن کی نال سے ٹہوکا دیا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور دروازہ کھول کر نیچے اُتر گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے کار سے اتر آیا۔ اس دوران میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ وہ خطرناک آدمی تھا اور کسی بھی لمحے مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی عیاری، سفاکی اور بربریت دیکھ لی تھی۔ اس نے وقتی طور پر شکست قبول کرتے ہوئے خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑا تھا۔ اس مزاج کے لوگ موقع شناس ہوتے ہیں۔ جہاں مقابل سے کوتاہی سرزد ہوئی، ان لوگوں نے اپنا ہاتھ دکھا دیا۔

میڈم گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں ظفری کی تلاشی لی۔ ایک خنجر اور بیس کے قریب گولیاں برآمد ہوئیں۔ اس کا بڑے سائز کا سیاہ پستول میڈم کی کار کے فرش پر پڑا تھا۔ تسلی کرنے کے بعد میڈم نے اُسے دیوار کے ساتھ بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ پژمردہ انداز میں بولا۔ ''کیا تم لوگ مجھے شوٹ کرنا چاہتے ہو؟''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو زندہ بچ جاؤ گے اور جو شخص خرمستی کرتا ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ یہ تو تمہیں علم ہونا چاہیے۔''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پشت پر ہاتھ رکھ کر ٹہلنے کے سے انداز میں دیوار کی طرف چل پڑا۔ چند لمحے کھڑا رہا، پھر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر پیروں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ میڈم میرے قریب آگئی۔ میرے ننگے بازو پر پستول کی مزل پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میرو شاہ آرہا ہے۔ اس کے پہنچتے ہی میں شہر چلی جاؤں گی۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

''کیوں؟'' وہ چونکی۔

''ان حالات میں آپ کو اکیلے نہیں جانا چاہیے۔''

''ایسے حالات تو ہر وقت ہماری اور ہم ان کی راہ تکتے رہتے ہیں ڈیئر!''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر میرا دل آپ کو تنہا بھیجنے پر آمادہ نہیں ہو رہا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اَب خاصا تھک چکا تھا۔ مجھے سردی لگ رہی تھی۔ پیشانی اور چھاتی پر آنے والی چوٹیں دکھنے لگی تھیں۔ ناک میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں سکون آور گولیاں پھانک کر دو چار گھنٹے آرام کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ مجھے میرو شاہ کے پاس چھوڑ کر واپس چلی جاتی تو مجھے مزید کئی گھنٹے بے آرام رہنا پڑتا۔

وہ چند لمحوں تک مجھے بہ غور دیکھتی رہی۔ میں ظفری ڈکیت پر گن تانے کھڑا تھا۔

''میں تمہیں ایک شرط پر اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں شرارت عود کر آئی۔

''شرط؟ میں آپ کے حکم کی تعمیل کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہوں، حکم کیجیے۔'' میں نے بہ صد احترام کہا۔

''تم ایک گھنٹا میرے ساتھ رہو گے۔ جیسا کہوں گی، ویسا کرو گے۔ 'تو' اگر...... 'تو' مگر...... آر یو ایگری؟''

میں نے بے ساختہ اُسے دیکھا مگر اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا کیونکہ اُس کے عقب میں بلب روشن تھا۔ وہ سنجیدہ تھی یا شرارت پہ آمادہ تھی، یہ اندازہ نہ ہو سکا۔ میں نے کہا۔ ''مگر میں اپنے گھر جاؤں گا، آپ اپنی کوٹھی پر......''

اُس کی گھنٹیوں جیسی مترنم ہنسی نے میری بات اُچک لی۔ میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ وہ ہنستی رہی، اپنی بانہیں پوری وسعت میں کھول کر چکراتی رہی، پھر بولی۔ ''بس؟...... بہت جلد ڈر جاتے ہو۔''

میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ ایسے ہی وقت میں درختوں پر روشنی رقص کرنے لگی۔ ہم دونوں نے بہ یک وقت راستے کی طرف دیکھا۔ میڈم بولی۔ ''لگتا ہے کہ میرو شاہ آن پہنچا ہے۔''

ساتھ ہی اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ پر واضح کر دیا کہ میری توجہ ظفری ڈکیت سے ہٹ گئی ہے۔ میں خفت زدہ سا ہو گیا۔ منٹ بھر کے بعد ایک اسوزو ٹروپر، جس پر ہم نور پور گئے تھے، اور سنہرے کلر کی ایک ہائی روف ٹویوٹا ویگن ہمارے قریب آن رکیں۔ ٹروپر کی اگلی سیٹ پر سے میرو شاہ اُتر کر ہمارے پاس آیا، میرے کندھے پر ہاتھ مارنے کے بعد میڈم کے سامنے تعظیماً سر جھکا کر بولا۔ ''ماڑی مہارانی کیا حکم دیوے ہے اس سمے...... میرو شاہ حاجر (حاضر) ہووت رانی جی!''

میڈم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اُسے جانتے ہو؟ وہ اپنے آپ کو ظفری ڈکیت کہتا ہے...... اُسے اپنی کسٹڈی میں لو، فارم ہاؤس میں اس کے چار پانچ ساتھی مردہ حالت میں پڑے ہیں، انہیں ٹھکانے لگاؤ، ایک ساتھی ادھر کوئی دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر سڑک پر کتے کی طرح مرا پڑا ہے، اس کے دفن کفن کا انتظام کرواؤ...... اور ہاں! ظفری ڈکیت آخری دشمن ہے۔ اسے مرنے سے پہلے بہت کچھ بتانا ہے۔ اس نے کس کے کہنے پر اور کیوں فارم ہاؤس پر حملہ کیا؟ یہ بھی یاد رکھنا کہ یہ لوگ مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے۔''

میڈم حسب عادت غیر معمولی روانی کے ساتھ، یوں جیسے کوئی لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہی ہو، بولتی چلی گئی۔ میرو شاہ کا ایک ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور ایک مخصوص اشارہ نشر ہو گیا جس کے نتیجے میں اسوزو ٹروپر اور ہائی روف کے دروازے کھلے اور کم و بیش دس افراد نے چھلانگیں لگائیں اور آن کی آن میں سبھی ہمارے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ وہ سب مختلف نوع کے اسلحہ سے لیس تھے۔ مجھے توقع رہی تھی کہ ان میں پیا جی اور عقیل بھی ہوں گے مگر دونوں دکھائی نہیں دیے۔ میرو شاہ کی تازہ فوج کے سبھی لوگ میرے لیے اجنبی تھے۔

میرو شاہ نے ظفری ڈکیت کی طرف اشارہ کیا۔ ''او ماڑا مشہور ڈکیت...... تو جفری باچھا (ظفری بادشاہ) ہووت ہے...... اوئے لونڈو اجرا (ذرا) پیار سے رکھت ہے جا لے ڈکیت کو......''

اس نے مختلف لوگوں کے ذمے مختلف کام لگائے، فارغ ہو کر میڈم سے بولا۔ ''میڈم رانی! ماڑے غنچے کو لے کر شہر جاوت ہے...... اب ماڑی فوجان جانے اور یہ فارم ہاؤس جانے...... پر یہ بول دیوت ہے ماڑے کو کہ اس غنچے نے پیٹھ تو نہ دکھائی ہووت ناں؟''

میڈم نے ظفری ڈکیت کی طرف دیکھا جس کے سر پر دو جوان جا کھڑے ہوئے تھے، پھر مجھے دیکھا اور فخر سے بولی۔ ''نہیں میرو شاہ! تمہارا غنچہ بڑا لاجواب ہے۔ تمہارا تحفہ قبول کر لیا گیا ہے۔''

''ایک دم گھوڑا ہووت ہے...... ہے ناں؟'' میرو شاہ کے لہجے میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''ہاں...... اب بکواس بند کرو اور توجہ اپنے کام پر مرکوز کرو۔'' میڈم نے اُسے ڈانٹ دیا۔ وہ دانت نکالتا ہوا اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ گیا۔

ایسے ہی وقت مجھے سردار نصر حیات کے ڈیرے پر دیکھی ہوئی نیوز رپورٹ یاد آئی جس میں پولیس اور سردار حیدر خان نے ملی بھگت کے ذریعے اپنے کارندوں کے قتل کو اپنی تضحیک آمیز شکست کو اپنی خوبی بنا کر میڈیا اور سرکار کے سامنے پیش کرتے ہوئے انعام و اکرام وصول کر لیے تھے۔ میں نے میڈم اور میرو شاہ کو اس کارنامے کے بارے میں مختصراً بتایا۔ شاید انہیں یہ سب کچھ بتانے کا مقصد میرے نزدیک یہ رہا تھا کہ میڈم بھی فارم ہاؤس پر زندگی ہارنے والے دشمنوں کے سینوں پر اپنے چہیتے اہلکاروں کے نام کے تمغے سجا دے۔ میڈم نے بڑی دلچسپی سے یہ سب کچھ سنا، پھر سر جھٹک کر قدرے نخوت سے بولی۔ ''میرو شاہ! کیا جو کچھ شہریار نے کہا ہے، قابلِ عمل ہے؟''

وہ بولا۔ ''ہتھیلی پر سرسوں جمانی کیا مشکل ہووت ہے مہارانی...... اپنا تھانیدار ہے ناں، انسپکٹر اجہر (اظہر)...... ایک دم حرام جادہ ہووے، پر ماڑا جیا اس کو پھول پتری لگانے کو مانگت ہے۔ اگر رانی کی اجاجت (اجازت) ہووے تو......''

اس نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ اُس سے فون پر رابطہ کرو۔ اگر اُس کا عملہ اُس کا ساتھ دیتا ہے تو یہ گیم کھیلنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔'' میڈم نے کہا۔ ''فارم ہاؤس کے دو ملازم بھی مارے گئے ہیں۔ ایک کا تو آگے پیچھے کوئی نہیں ہے، دوجے کی بیوی اور تین بیٹیاں رنگ پور میں رہتی ہیں۔ لاش کے ساتھ ...

آدمی رنگ پور روانہ کردو۔ بیوہ کو دو تین لاکھ روپے دے آنا۔ او کے؟"

میروشاہ نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور ہنس کر کہا۔ "میڈم! ایک دم بے فکر ہو کر کوٹھی میں جا کر سو جاوے ہے، میروشاہ سب کچھ سنبھال لیوے گا۔ اے غنچے! تم ماڑی مہارانی کے ساتھ میں جاوت ہے۔ کان کھول کر سن لیوت ہے کہ ماڑے کو تمہاری موت تو قبول ہووے ہے پُر رانی کی تکلیف برداشت نہ ہووے ہے...... سمجھ میں آوے میری بات کہ ناں؟"

میں نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو شاہ جی! جب تک میں زندہ ہوں، میڈم کو کوئی ہاتھ تک نہیں لگا سکتا۔"

میڈم ہنسی۔ "اگر کسی نے ہاتھ لگائے بغیر گولی ماردی تو؟"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "اللہ نہ کرے!"

میروشاہ نے اپنے چغے کی جیب سے موبائل نکال لیا، کوئی بٹن دبا کر ایل سی ڈی روشن کی اور میموری میں محفوظ شدہ نمبر دیکھنے لگا۔ وہ شاید انسپکٹر اظہر کا نمبر تلاش کر رہا تھا، ایسے میں بڑبڑایا۔ "کم بخت کا نمبر اوپر نیچے ہو جاوے ہے کیا؟ نجر (نظر) ہی نہ آنے کا سالا......"

تھوڑی تگ و دو کے بعد اس کا نمبر مل گیا تو میروشاہ میڈم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "وہ سالا بڑا چالاک ہووے ہے، پکی پکائی کھیر ہڑپ کرنے کو سر کے بل بھاگت ہے...... پُر تم تو جاوے، میروشاہ کو اپنا کام کرنے دیوے ناں!"

میڈم نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ میرے عقب میں میروشاہ کی آواز سنائی دی۔ "اڑے جالم تھانیدار...... تیرے کو خواب دیکھنے کی پڑی ہووے، خواب میں میروشاہ کو حوالات میں کھڑا کر کے خوش ہووت...... ہے ناں؟ پُر دیکھ لے یہ سالا میروشاہ اپنے یار انسپکٹر اجہر (اظہر) کو پھر بھی ڈی ایس پی بنانے کو اس سے بھی جاگت ہے۔ رجائی (رضائی) سے نکل کر ماڑی بات سن لیوے، جیا مانے تو عمل بھی کر لیوے......"

میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور اپنی گن ٹانگوں کے بیچ کھڑی کر لی۔ میڈم نے گاڑی اسٹارٹ کی، ائر ہیٹر آن کیا اور بولی۔ "آج قدرے زیادہ سردی تھی۔"

جب تک ہمارے وجود حرکت میں رہے، تب تک سردی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ فراغت پاتے ہی رات کے پچھلے پہر کی خنکی نے ہمارے تھکن زدہ بدنوں پر اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیے تھے۔ چونکہ فارم ہاؤس کے اطراف میں آم کے باغات، سبز چارہ اور ملی جلی فصلوں کی بہتات تھی، دریا قریب سے گزرتا تھا اس لیے نمی کا تناسب بھی کہیں زیادہ تھا۔ ائر ہیٹر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تو میرے تھکے ہوئے جسم کو حدت میسر آنے لگی۔

واپسی کا راستہ بخیریت کٹا۔ میڈم تمام راستے سنجیدہ رہی، خاموش اور کسی گہری سوچ میں غرقاں رہی اور اس کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رہی۔ کوٹھی کا گیٹ ظاہر خان نے کھولا۔ کار کے عقب میں بھاگتا ہوا پارکنگ تک چلا آیا۔ کار رکی تو اس نے بڑے احترام سے میڈم کا دروازہ کھولا اور سلام کیا۔ میڈم نے اسے کچھ ہدایات دیں اور کسی کی آمد پر ڈسٹرب نہ کرنے کا حکم دیا۔ ظاہر خان نے مجھے بھی کار سے اُترتے دیکھا تھا مگر میڈم کی موجودگی کی وجہ سے نظرانداز کر دیا تھا۔ میڈم کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اس کے کمرے تک آیا اور دروازے پر رُک گیا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ "کم ان!"

میں میڈم کی قربت سے گریز کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ وہ کسی بات کا برا نہ مان جائے مگر یہ بھی عجیب تضاد تھا کہ اس کے قریب رہنا بھی چاہتا تھا۔ اس کی موجودگی میں عجیب طرح کی طمانیت محسوس کرتا تھا۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا حکم دیا، بیڈ پر اوپر تلے دو کشن رکھے اور ان کی ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ عیاں تھا کہ وہ کسی نہایت عمیق سوچ میں مستغرق تھی۔ شاید شبِ رواں کی طویل اور تھکا دینے والی ریاضت کے شمار میں مصروف تھی اور دل ہی دل میں نتائج اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں گزشتہ شام کو ملتان سے نکلا تھا، صبح ہونے سے پہلے لوٹ آیا تھا مگر اس دوران ایک لمحے کو بھی چین نہ آنے کی وجہ سے بُری طرح تھکا ہوا تھا۔ میڈم کو مجھ سے زیادہ تھکا ہوا ہونا چاہیے تھا مگر اس کے چہرے پر نقاہت یا بے آرامی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بہ ظاہر بہت نازک مگر حقیقت میں وہ بہت سخت جان لڑکی تھی۔ اس سے ہونے والی فائٹ کی فلم میرے ذہن میں چل پڑی۔ اس کی طاقت، پھرتی اور وار کرنے کی غیر معمولی مہارت نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس تند و تیز مقابلے میں مجھے دانتوں تلے پسینا آ گیا تھا۔ باوجود کہ اس نے میری برتری تسلیم کر لی تھی مگر میں اپنے تئیں اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا کہ میں نے اسے نیچا دکھا دیا تھا۔ تبھی میں اپنی فتح کو محض حسنِ اتفاق قرار دے رہا تھا۔ ایسے میں بے ساختہ میرا ہاتھ سینے کو سہلانے لگا۔ چارپائی کی بانہہ کی سینے پر لگنے والی چوٹ بہت دردناک تھی۔

چند دن قبل پیا جی نے مجھے فارم ہاؤس میں جنگی بنیادوں پر کیے گئے انتظامات دکھائے تھے جن میں سے ایک ہمارے کام آ گیا تھا۔ اس نے مختلف جگہوں پر ایسی ہی کسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اسلحہ چھپا کر رکھا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور سوچا، اگر مجھے بھوسے والے کمرے میں چھپائی گئی گن اور گولیوں کا اور اس کی چھت پر بنائے گئے ایمرجنسی بنکر کا پتا نہ ہوتا تو بے رحم دشمن ہمیں اغوا یا قتل کرنے میں کتنی آسانی سے کامیاب ہو جاتا......

میں نے بیڈ پر لیٹی ہوئی شکیلہ عرف میڈم نامی نازک اندام اور نہایت خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ یقین نہیں آیا کہ یہ وہی تھی جس کے حسنِ مہارت کے ثبوت میری پیشانی اور ناک پر ثبت تھے اور جس نے بے حد بے باکی اور سفاکی سے امجد خانیوالیے جیسے بدنامِ زمانہ ڈکیت کو چٹکی بجاتے میں عالمِ ارواح روانہ کر دیا تھا۔ میں نے جب چشمِ تصور میں کار کے اندر کا منظر سجایا، مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کا سگریٹ مانگنے کا انداز، حد سے بڑھی ہوئی بے پروائی اور بے خوفی...... مجھے سب کچھ عجیب اور غیر یقینی سا لگا تھا۔ اگر یہ سب کچھ میں نے اپنی زندہ اور بیدار آنکھوں سے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔

میں امجد خانیوالیے اور ظفری ڈکیت سمیت فارم ہاؤس میں مردہ حالت میں پڑے ہوئے کسی بھی حملہ آور کو جانتا تھا اور نہ مجھے ان کے جرائم کی تفصیل کا علم تھا مگر یہ یقین تھا کہ میڈم اور میروشاہ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت معمولی سطح کے ڈاکو یا جرائم پیشہ لوگ نہیں کر سکتے۔ یقیناً ان ڈاکوؤں کے عقب میں کوئی بڑا آدمی چھپا بیٹھا تھا جو ڈوریں ہلا کر کٹھ پتلی تماشا دیکھ رہا تھا۔ چونکہ ان دنوں سردار حیدر خان تیغ پا ہو کر میدان میں اُترا ہوا تھا اس لیے پہلا شک اُسی کی ذات پر جاتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی بازیابی کے لیے انتہائی خطرناک قدم اُٹھا سکتا تھا۔ میری دانست میں بڑے خان کے علاوہ اتنا طاقت ور اور باخبر دشمن کوئی اور نہیں تھا۔

میڈم نے اچانک موبائل نکال لیا۔ چند لمحوں تک اُس سے بے طرح کھیلتی رہی، پھر بولی۔ "شہریار! کیا ہم پر کیے جانے والے حملے کو اتفاقیہ قرار دیا جا سکتا ہے؟"

میں چونکا۔ "میرا خیال کہ ایسا نہیں ہے۔"

"کیوں؟" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

میں نے چند ثانیے سوچا، پھر کہا۔ "جہاں تک مجھے علم ہے، آپ کا وہاں پہنچنا آپ کے معمول کا حصہ نہیں تھا۔ میری پوزیشن بھی بالکل ایسی ہی ہے کہ میں پہلے کبھی فارم ہاؤس میں جا کر نہیں سویا۔ اگر مجھے قتل یا اغوا کیا جانا مقصود ہوتا تو پھر اتنی دیر گئے حملہ نہ کیا جاتا، پہلے بھی کیا جا سکتا تھا۔" میں نے الفاظ مجتمع کیے اور سلسلۂ کلام جوڑا۔ "آپ کے آنے کے بعد ہی وہ لوگ فارم ہاؤس پہنچے اور انہوں نے بڑی دیدہ دلیری اور مشاقی سے فارم ہاؤس کو گھیرے میں لیا تھا۔ اگر ہم جاگ نہ رہے ہوتے یا غافل ہوتے تو اس وقت سچویشن مختلف ہوتی۔"

"رزلٹ؟" اس کی آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔

"سچ کہوں تو بُرا تو نہیں مانیں گی؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...... تم مجھے اچھے لگتے ہو، یقیناً تمہاری کہی ہوئی بات بھی اچھی ہوگی۔"

"ان لوگوں کو آپ کے یہاں سے نکلنے اور رات گئے فارم ہاؤس پر پہنچنے کا علم تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپ کے ساتھ گروہ کے دوسرے لوگ نہیں ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ڈرو مت، جو کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔" میڈم نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری ٹیم میں کوئی غدار موجود ہے، دشمن کا آلۂ کار یا مخبر؟ جس نے یہ خبر اپنے ہیڈ کوارٹر تک فی الفور پہنچائی۔"

میں سوچ یہی رہا تھا مگر اتنی بڑی بات، وہ بھی بغیر کسی ثبوت کے، کہنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے پوچھا تو میں نے سر جھکا لیا۔ اس نے اپنا سوال دُہرایا تو میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ "سچ کیا ہے، میں نہیں جانتا۔ جو بات دل میں آئی وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ کسی گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھایا ہے۔ اب وہ بھیدی کون ہے، یہ نتیجہ اخذ کرنا آپ کا کام ہے۔"

وہ یک ٹک مجھے دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے نفی کے انداز میں سر ہلایا اور بولی۔ "نہیں شہریار! ایسا کوئی شخص میرے اردگرد موجود نہیں ہے۔"

میں نے کندھے اُچکائے۔ "یہ آپ بہتر جانتی ہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ فارم ہاؤس میں آپ کے سوا کوئی قیمتی چیز موجود نہیں تھی جس کو حاصل کرنے کے لیے اتنا بچ سنور کر دھاوا بولا جاتا۔"

وہ ایک ذرا مسکرائی، بولی۔ "میرا خیال ہے کہ یہ سردار حیدر خان کے گُرگے نہیں تھے۔ حیدر خان استاد بلو پر بھروسا کرتا ہے اور اسی سے کام لیتا ہے۔ بلو کے سارے کارندوں

کو میں جانتی ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی اس کا کارندہ نہیں تھا۔'' میں خاموش رہا تو وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ظفری ڈکیت اور امجد خانیوالیا...... دونوں خاصے بدنام وارداتیے ہیں مگران کا عمل دخل چناب کے اوپر والے علاقے تک ہے۔ انہوں نے اس سے پہلے ملتان کی حدود میں کوئی واردات نہیں کی...... نہ مجھ سے ٹکراؤ ہوا ان کا...... بہ ظاہر یہ خانزادی اسما کا چکر نہیں بلکہ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ لوگ کس بڑے کے لیے کام کرتے ہیں اور انہیں کس نے مجھے اغوا کرنے کا حکم دیا۔''

اس میدان میں میری معلومات صفر تھیں۔ کوئی رائے نہیں دے سکتا تھا۔ خاموش رہا تو وہ بولی۔ ''شہر یار! میرا ایک نہیں، کئی دشمن ہیں جو مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ ہر وقت میری تاک میں رہتے ہیں اس لیے مجھے بڑی احتیاط برتنا پڑتی ہے۔''

میں نے ازراہِ گفتگو کہا۔ ''تو آپ کو تنہا آدھی رات کو کوٹھی سے نکل کر فارم ہاؤس پر نہیں جانا چاہیے تھا۔''

اس نے ہنکارا بھرا، کچھ سوچا پھر مسکرا کر بولی۔ ''شاید تم ٹھیک کہتے ہو مگر ایسا کرنا ضروری تھا۔ میں تمہیں کسی مشن پر تب تک نہیں بھیج سکتی تھی جب تک تمہاری صلاحیتوں سے خود واقف نہ ہو جاتی۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم میری ٹیم میں بہت اچھا اضافہ ثابت ہوئے ہو۔''

پھر اُس نے مجھے فریج سے ٹھنڈا پانی اور الماری سے بوتل نکال لانے کا حکم دیا۔ میں نے دونوں چیزیں پیش کر دیں۔ وہ بیڈ پر اُٹھ بیٹھی اور اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی۔ ''شہر یار! سردی ہے۔ ہے ناں؟ تبھی تو بدن تپش مانگنے لگتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ یخ بستہ پانی معدے میں اُتر کر تن بدن میں آگ لگا دیتا ہے۔''

اس کی آنکھیں بڑا جاندار مگر عجیب اور بے عنوان تاثر لیے مجھ پر مرتکز رہیں پھر پھسل کر بلوریں گلاس پر ٹھہر گئیں۔ اس نے جام تیار کیا، ایک ننھا سا گھونٹ بھرا اور مجھے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیڈ کے کنارے پر ٹک سا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹھنڈا گلاس میرے رُخسار سے مس کیا اور بولی۔ ''دیکھو! کتنا ٹھنڈا پانی ہے، ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دانستہ آنکھیں چرا لیں۔ وہ بولی۔ ''مگر تمہیں یہ تجربہ نہیں ہوا کہ اس کی یخ بستگی میں کتنی حرارت پوشیدہ ہے۔ یہ انسان کی طرح ہوتا ہے۔ اوپر سے ٹھنڈا، اندر سے گرم...... یعنی دھوکے باز۔''

شاید وہ ٹھیک کہتی تھی۔ ابھی اُس نے پینا شروع کیا تھا۔ اتنی جلدی نشہ اعصاب پر سوار نہیں ہوتا مگر اس کی آواز اگر بھاری ہونے لگی تھی، لہجہ ایب نارمل ہوا جاتا تھا۔ عیاں تھا کہ اس تغیر کا سبب کچھ اور تھا۔

میں نے آہستگی سے احساس دلانا چاہا۔ ''آپ تھکی ہوئی ہیں، کچھ دیر آرام کر لیں۔''

اس نے گلاس لبوں سے ہٹایا، اپنے گالوں پر نرمی سے پھیرا اور تکیے سے پشت ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ گلاس میں شراب کا آخری گھونٹ لرزنے لگا اور ادھ کھلے ہونٹ آبِ سوختہ کا انتظار کرنے لگے۔

وہ میک اَپ کی عادی نہیں تھی۔ اگر کرتی بھی تھی تو خاص مواقع پر کرتی ہوگی۔ میں نے اُسے جب بھی دیکھا تھا، ایسے ہی دیکھا تھا۔ اس کے اَبرو بنے ہوئے نہیں تھے، اُس کی ناک اور دونوں کان چھدے ہوئے نہیں تھے اور نہ ہی میں نے اُسے اب تک کسی نوع کا زیور پہنے دیکھا تھا۔ اُس کے ناخن بڑھے ہوئے نہیں تھے اور نہ وہ نیل کور اور نیل پالش لگاتی تھی۔ اس کا لباس بہت سادہ اور عمومی نوعیت کا ہوتا تھا جس میں برہنگی کا عنصر شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا یہ درویشانہ رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ وہ جتنی امیر تھی یا اُس کا اُٹھنا بیٹھنا جس سوسائٹی میں تھا، وہاں اس حقیقت پسندی کو قدامت پرستی کا نام دیا جاتا تھا۔ شاید اُسے یہ طعنہ بھی سننے کو ملتا ہوگا اور وہ نظر انداز کر دیتی ہوگی۔

اس کے باوجود وہ لاکھوں میں ایک تھی۔ اس کے حسن کی تاب و تمکنت آنکھوں کو خیرہ کرنے کی بھرپور استعداد رکھتی تھی۔ اس وقت وہ اپنی دُنیا میں گم تھی اور میں اپنے شوقِ دید سے نبرد آزما۔ مگر اُس نے اچانک آنکھیں کھول دیں اور کہا۔ ''جب میں دیکھتی ہوں، تم آنکھیں پھیر لیتے ہو۔ جب میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں تو تمہاری نظریں مجھ پر ثبت ہو جاتی ہیں۔ یعنی تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو مگر مجھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے ڈرتے ہو۔ میں نے ٹھیک کہا ہے؟''

میں نے 'جی' کہا اور سر جھکا لیا۔

وہ بولی۔ ''تمہاری منگیتر کا نام کیا تھا؟''

سوال بڑا بے ساختہ تھا۔ میں گڑبڑا سا گیا۔ ''جی! وہ...... غزالہ نام ہے اُس کا...... میری پھوپی زاد ہے۔''

''کیا تم دونوں کبھی تنہائی میں ملے ہو؟''

''جج...... جی ہاں...... جی نہیں......''

وہ لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا مطلب؟''

''کئی بار ملے ہیں جی!''

''تم نے اُس کا بوسہ بھی لیا؟''

میرا لہو میرے چہرے پر سمٹ آیا۔

''ہوں!'' اس نے میری خاموشی کو اقرار جانا، تبھی ہنکارا بھر کر بولی۔ ''تم نے کبھی اُسے سینے سے لگایا؟''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں میڈم! گاؤں میں اتنی آزادی نہیں ہوتی۔''

''واقعی؟'' وہ یقین نہ کرنے کے انداز میں بولی۔ ''پھر...... پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟''

مجھے اچنبھا ہوا، بے ساختہ پوچھا۔ ''کیا محبت کرنے کے لیے یہ باتیں ضروری ہیں؟''

وہ معانی خیز انداز میں مسکرائی، لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر بولی۔ ''محبت کرنے والے یقین دہانی اور اظہار کا سیرپ ایک دوسرے کے حلق میں ٹپکاتے رہتے ہیں۔ دونوں اپنے طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسرے پر اپنی لگن ظاہر کر رہے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی قلبی اور روحانی تسکین کر رہے ہوتے ہیں۔''

اس کا لہجہ دم بہ دم بوجھل ہو رہا تھا۔ پوچھ رہی تھی۔ ''کیا اَب وہ تمہیں یاد آتی ہے؟''

میں نے صدقِ دل سے کہا۔ ''نہیں...... میں اُسے اتنا یاد نہیں کرتا، جتنا مجھے کرنا چاہیے تھا۔''

''کیوں؟'' اُس کے ہونٹ نیم دائرہ شکل میں سکڑ گئے۔

''مجھے جب تک اپنی بہن نہیں ملتی، میں تب تک اس کے بارے میں تو کجا، اپنے بارے میں بھی کچھ سوچ نہیں پاؤں گا۔''

''یعنی محبت آسودگی اور بے فکری کے ماحول میں زندہ رہتی ہے؟''

میں چونکا۔ ''جی...... شاید!''

''تم غلط کہتے ہو۔'' اس نے یک لخت تکیے کی ٹیک چھوڑ دی اور گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''ایسا نہیں ہے۔ محبت ہر حال میں انسان کے ساتھ رہتی ہے۔ کبھی طاقت دیتی ہے، کبھی سہارا...... تو کبھی بے حد کمزور کر دیتی ہے۔''

''جج...... جی میڈم!'' تذبذب نے مجھے ہکلانے پر مجبور کر دیا۔

''اگر تمہیں تمہاری بہن...... کیا نام بتایا تھا تم نے اُس کا، ہاں! پروین...... کیا تم پروین کے مل جانے کے بعد اپنی منگیتر غزالہ کو مس کرو گے، پہلے نہیں...... ہیں؟''

''نہیں میڈم!'' میں نے اچانک سنبھل کر مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اب میرے سامنے زندگی کے تین مقاصد کا حصول اہم ہے۔ پروین کو تلاش کرنا، اپنے والدین اور چاچا چاچی کے قاتلوں سے انتقام لینا...... اور......''

''ہاں! رُک کیوں گئے؟ کہو ناں!'' اس نے دلچسپی لی۔

''اور اپنی بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنا۔''

اس کا چہرہ اسپاٹ ہو گیا، بولی۔ ''اور غزالہ کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے؟''

''اگر قسمت میں ہوئی تو وہ میری ہم سفر بن جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک اور جام تیار کیا۔ اب کے اس نے شراب کی مقدار کم اور پانی کی زیادہ رکھی تھی۔ کچھ دیر تک گلاس سے کھیلتی رہی، پھر بولی۔ ''حیدر خان کو قتل کرنا چاہتے ہو؟''

''جی...... نہ صرف اُس کو قتل بلکہ اس کے محل کو اپنے ہاتھوں سے آگ بھی لگانا چاہتا ہوں۔'' میں نے عہدِ مصمم کا اظہار کیا۔

''وہ بڑا بااختیار اور شیطان صفت آدمی ہے۔ کیا تم اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟''

''جی! اگر آپ اسی طرح مجھ پر توجہ دیتی رہیں تو میں اس قابل ہو جاؤں گا۔''

''دیکھ لو...... وہ اِس وقت بپھرا ہوا زخمی شیر ہے۔''

میری آنکھوں کے سامنے سائیں دل جیت کا لہو سے تر چہرہ گھوم گیا جسے میں نے اپنے ہاتھوں عالمِ بالا روانہ کیا تھا۔ میں نے جبڑے بھینچ کر کہا۔ ''پروا نہیں ہے۔''

''سردار یارن خان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

میرے پاس جتنی معلومات تھی، اُسے بہم پہنچا دیں تو وہ بولی۔ ''یعنی تم اُسے نہیں جانتے ہو۔''

''آپ اُسے جانتی ہیں؟''

''ہاں! وہ ان میں سب سے بڑا شیطان ہے۔''

میں چونکا۔ ''اچھا! آپ کیسے جانتی ہیں اُسے؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ بولی۔ ''تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ وہ نور پور سے لاہور کیوں منتقل ہو گیا؟''

''سنا تھا کہ اُس کا دل یہاں سے بھر گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لاہور تو لاہور ہی ہے ناں میڈم! جس کے پاس پیسا ہو، جائداد ہو، وہ گاؤں سے نکل کر شہر جانے کے خواب تو دیکھتا ہی ہے۔''

''پیسا تو دوسرے خانزادوں کے پاس بھی ہے، وہ لاہور کیوں چلے نہیں گئے اَب تک؟''

''بڑے کہتے ہیں کہ سردار یارن خان کے پاس ان سب خانزادوں سے کہیں زیادہ دولت ہے۔''

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اچھا! چھوڑو اسے، یہ بتاؤ کہ تمہارے جگری یار خالد عرف کھالے کا کیا حال ہے؟ کیا اُسے اسما کی یاد اَب نہیں ستاتی؟''

اس کا اشارہ کھالے کی طرف تھا۔

''کافی دن ہوئے، ملاقات نہیں ہوئی۔ ویسے وہ اسما کو بھلانے والا نہیں ہے۔''

''اُسے خود سے علیحدہ کر دو۔ اگر ممکن ہو تو اُسے نور پور بھیج دو۔ وہ وہاں رہ کر تمہیں معلومات پہنچا کر بہتر اعانت کر سکتا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ میرا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔''

''یہ تمہاری بھول ہے کیونکہ تم بھول چکے ہو کہ وہ اسما کا دیوانہ ہے۔ اس کی خاطر وہ تم پر ہاتھ اُٹھا چکا ہے۔ وہ اس کی رہائی سے مایوس ہو کر تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ بالواسطہ طور پر مجھے نقصان ہوگا۔''

میں نے سختی سے میڈم کے اندیشے کی نفی کی اور کہا۔ ''نہیں میڈم! وہ ایسا شخص نہیں ہے۔''

وہ ہنسی اور بولی۔ ''میں ضد نہیں کرتی مگر ایک دن تمہیں میرا اہم خیال ہونا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اب اسما کو روکے رکھنا ضروری ہے؟''

وہ بولی۔ ''ہاں! کیونکہ اس کی وجہ سے سردار حیدر خان اور میرے درمیان دشمنی کا سانپ جنم لے چکا ہے۔ اگر میں اُسے لوٹا دوں، تب بھی وہ میرا ابھی خواہ نہیں بنے گا۔ اسے جب بھی موقع ملے گا، مجھ پر وار کرے گا اور مجھے ڈس لے گا۔''

''پھر آپ نے کیا سوچا ہے اس کے بارے میں؟''

اس نے عادتاً نچلا ہونٹ اوپر والے ہونٹ پر چڑھایا اور بچوں کی طرح آنکھیں چندھیا کر بولی۔ ''وہ سونے کی چڑیا ہے۔ اُسے وقت آنے پر کسی جوہر شناس کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے عام سے لہجے میں کتنی کڑواہٹ اور بربریت چھپی ہوئی تھی۔ میں اسما کی حمایت میں کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس کے اٹل انداز کے سبب جراُت نہ کر پایا۔

وہ بولی۔ ''تمہیں اسما سے ہمدردی ہے؟''

میں نے صدقِ دل سے اپنا من ٹٹولا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ میرے دشمن کی بیٹی تھی۔ دشمن بھی وہ جس کے پاس ظرف اور اصول نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ اس نے میری بہن کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانے کی گندی سوچ پر عمل کرتے ہوئے یہ تک نہیں سوچا تھا کہ میں اس کی برادری کا آدمی تھا۔ اس کا سپورٹر تھا۔ پھر اس نے میرے چاچا کے خاندان کو نیست و نابود کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ اس جنگ کا حصہ نہیں تھے جو اس نے مجھ پر مسلط کی تھی۔

میڈم شکیلہ بڑے غور سے میرے چہرے کے لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد گویا ہوئی۔ ''شہریار! تم اب دنیا کو سمجھنے لگے ہو۔ یہ تبدیلی بہت اچھی ہے۔ مجھے پسند آئی ہے۔''

میں نے لمبی سانس سینے میں اُتاری اور کہا۔ ''میڈم! میرے دل میں آگ دہک رہی ہے۔ یہ تب بجھے گی جب میں اپنے ہاتھوں سے اسما کے باپ کے وجود کو جلتی ہوئی آگ میں پھینکوں گا۔ خون کا بدلہ خون سے لوں گا تب مجھے چین آئے گا۔''

اس نے میرا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا پھر گلاس تھما کر اُسے تپائی پر رکھنے کا اشارہ کیا اور کہا۔ ''مجھے اسی آگ کی ضرورت ہے...... تمہیں ایک نہ ایک دن موقع دوں گی، اس شیطان کی سرکوبی کا...... پھر دیکھوں گی کہ تمہارے بازوؤں میں کتنا دم ہے۔''

میں نے احساسِ ممنونیت سے سرشار ہو کر اُسے دیکھا اور کہا۔ ''آپ بہت اچھی ہیں میڈم!''

باتوں کے دوران گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ نیند سے اُس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ میں نے اجازت چاہی تو اس نے بڑے دل ربا انداز میں مسکرا کر مجھے جانے کی اجازت دے دی اور کہا۔ ''ظاہر خان سے کہو، وہ تمہیں گلگشت میں پہنچانے کا بندوبست کر دے گا اور ہاں...... تیار رہنا، میں تمہیں کسی بھی وقت خصوصی مشن پر روانہ کر سکتی ہوں۔''

میں نے سرِ تسلیم خم کیا۔ وہ بجائے دراز ہونے کے، بیڈ سے اُتری اور کمرے کی عقبی دیوار کی سمت بڑھی۔ دیوار گیر الماری کو کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ ایسے ہی وقت میں الماری خودکار انداز میں بغیر کوئی آواز پیدا کیے دائیں طرف کھسک گئی۔ دیوار میں دو فٹ چوڑا خلا پیدا ہو گیا جس کے پار سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آیا۔ میں ٹی ٹو کا

جادوئی ماحول دیکھ چکا تھا اس لیے اس میکنزم کو دیکھ کر زیادہ حیران نہیں ہوا۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا، ہاتھ لہرا کر 'بائے' کہا اور خلا میں داخل ہو گئی۔ چند ہی لمحوں بعد الماری اپنی پہلی جگہ پر پہنچ گئی اور خلا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ طلسمی اپسرا بھی چھپ گئی۔

میں غیر ارادی طور پر اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے کمرے سے نکل کر گراؤنڈ فلور پر آیا۔ ظاہر شاہ نے میرے کہنے پر انٹر کام پر کسی ڈرائیور کو بلایا جس نے مجھے کار میں بٹھا کر گھر پہنچا دیا۔ شہر بیدار ہو چکا تھا اور علی الصباح کھلنے والی دکانیں کھلنے لگی تھیں۔ سڑکیں خاموش تھیں مگر کچھ ہی دیر بعد بے ہنگام ٹریفک سے پُر ہونے کی خبریں دے رہی تھیں۔

چونکہ میں خاصا تھکا ہوا تھا اس لیے بیڈ پر گرتے ہی نیند میں غرق ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ میں نے غسل کیا، لباس بدلا اور ٹی وی آن کر دیا۔ نیوز چینل پر فارم ہاؤس، ڈاکوؤں کی لاشیں، ان کے سابقہ کارناموں کی تفصیل اور پولیس رپورٹ ڈاکومنٹری پیش کی جا رہی تھی۔ وقفے وقفے سے مخصوص انداز میں ٹیلی کاسٹ کی جانے والی نیوز رپورٹ کو ملاحظہ کرتے ہوئے میرا دل فاتحانہ جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ مجھے اپنی دلیری اور مہارت سے حاصل کی جانے والی فتح پر ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنی طاقت اور ذہانت کے بل پر نہ صرف میڈم کو موت کے منہ سے زندہ نکال لیا تھا بلکہ قانون کو کئی انتہائی مطلوب اشتہاری ڈاکوؤں کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ میں نے عملی طور پر اس سے پہلے سردار حیدر خان کی بیلے والی حویلی اور نور پور پر دو مشن سرانجام دیے تھے جن میں جزوی ناکامی میرا مقدر بنی تھی۔ یہ ایک ہی رات میں سرانجام دیے جانے والے دو مشن تھے جن میں دو مرتبہ کامیابی نے میرے قدم چومے تھے اور مجھے میڈم کی نظروں میں معتبر کر دیا تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ میرو شاہ نے حیدر خان کے مقابلے میں جاندار اسکرپٹ اور مضبوط اسٹیج پلے پیش کیا۔ انسپکٹر اظہر کو تُلے تُلے انداز میں ترقی کی جانب دھکیلتے ہوئے اس نے اپنی اور دشمنوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے اور فارم ہاؤس کی صفائی ستھرائی کے فضول کام سے نجات حاصل کر لی تھی۔ چونکہ وقت کم تھا اس لیے میرو شاہ اور انسپکٹر اظہر کے تیار کردہ ڈرامے میں ایک دو جھول پر سقم موجود تھے مگر وہ اتنے خفیف تھے کہ اُن پر صرف میری توجہ ہی مرکوز ہو سکتی تھی، کسی اور ناظر کی نہیں۔

☆☆☆

فوجی اختر بہت کارآمد شخص تھا۔ وہ چند دنوں میں ہی بچوں کے ساتھ گھل مل گیا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہماری ہی فیملی کا فرد ہو۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہر قسم کے اسلحے کے استعمال پر دسترس رکھتا تھا۔ میرو شاہ نے مجھے اُس کے بارے میں بتا رکھا تھا کہ وہ عام نوعیت کا ملازم نہیں تھا بلکہ اسے بطورِ خاص میرے گھر کی حفاظت اور میری اعانت پر مامور کیا گیا تھا۔

دونوں لڑکیاں اور موجو اُس سے مانوس ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں رات بھر گھر سے باہر رہا تھا اور کسی نے بھی میری عدم موجودگی میں خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ میں نے اس صورتِ حال پر اطمینان کی سانس لی کیونکہ مجھے اپنے چشمِ تصور میں نظر آتے ہوئے تاریک مستقبل کی ان گنت راتوں کی فکر لاحق تھی جن میں مجھے گھر سے باہر رہنا تھا۔

میڈم شکیلہ نے مجھے کہا تھا کہ عشق دوستی کی انتہائی شکل کا نام ہے۔ دوستی اپنے خون سے اس کی پرورش کرتی ہے اور عشق اپنی بڑھوتری کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دوستی کے حقوق اور مطالبات کو ملحوظ نہیں رکھتا اور بے دردی سے پیروں تلے مسلتا جاتا ہے۔

پیا جی نے مجھے کہا تھا کہ ہماری لائن میں عشق و محبت کو نہایت فضول جذبہ قرار دیا جاتا ہے۔ میرے سامنے ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ جب بھی کوئی ماسٹر مائنڈ ہلاک ہوا، اس کے پیچھے کسی نہ کسی عورت سے عشق کا جذبہ کارفرما تھا۔

میں نے دونوں کی مختلف آرا سنی تھیں۔ ایسی باتیں ذہن نشین کرنے کی ہوتی ہیں۔ میں نے انہیں دل نشین کرنا چاہا تو دل نے مزاحمت کر دی۔ وہ اپنے معاملات میں ایسے کسی بھی پرہیز کو ملحوظ رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ آج جب میرے سامنے میرا جگری یار کھالا بیٹھ کر اپنے یک طرفہ عشق کا راگ الاپ رہا تھا تو مجھے یکے بعد دیگرے میڈم شکیلہ اور پیا جی کی باتیں یاد آئیں۔ میں نے کھالے کے سنولائے ہوئے برہم چہرے کو ایک نظر غور سے دیکھا اور کہا۔ ''کھالے! تمہارا کہنا بجا ہے، مگر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں یہاں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ میری حیثیت محض ایک نو وارد ملازم کی سی ہے۔''

اس کے جبڑے بھنچ گئے، لہجے میں ازحد درشتی گھل گئی، بولا۔ ''شہرے! مجھے چکر نہ دو، سیدھی بات کرو۔ بتاؤ، کیا یہ ممکن ہے کہ تم کہو اور تمہاری میڈم یا میرو شاہ نہ مانیں؟ نہیں میرے یار! ایسا نہیں ہے بلکہ تمہارے اپنے دل میں

چور ہے۔"

میں یک ٹک اُس احمق کھالے کو دیکھ رہا تھا جو گزشتہ نصف گھنٹے سے میری بات ماننے سے گریزاں تھا۔ میں نے کہا۔ "وہ میری محسنہ ہے، میرو شاہ نے مجھے پناہ دی ہے اور میری خاطر سردار حیدر خان جیسے اڑیل سیاست دان سے پنگا لیا ہے جو میری سمجھ کے مطابق اب ہمارے گلے پڑ چکا ہے۔ تم خود سوچو! میں نے میڈم یا میرو شاہ کے لیے کیا ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ وہ میری نامعقول بات کو ماننے پر تیار ہو جائیں؟"

وہ زچ ہو کر بولا۔ "یہ نامعقول بات نہیں ہوگی۔ دیکھو شہرے! جب یہ طے ہو گیا ہے کہ پروین اَب سردار حیدر خان کے پاس نہیں ہے، نہ امیر نواز یا وہ تمہاری عاشی...... تو پھر تمہارے پاس یا میڈم کے پاس اسما کو چھپا کر رکھنے کا کیا جواز بنتا ہے؟"

"کیا حیدر خان نے جذبۂ خیر سگالی کے طور پر پروین کو رہا کیا ہے؟" میرا پارہ چڑھنے لگا۔

"نہیں مگر اہمیت اس بات کی ہے کہ اب پروین اس کی قید میں نہیں ہے۔" اس نے اپنے موقف پر زور دیا۔

"کیا اس نے میرے چاچا چراغ اور چاچی کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے؟" میرے لہجے میں نفرت گھل گئی۔

اس کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ قدرے توقف کے بعد بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ تمہارے گھر کو آگ بڑے خان نے نہ لگوائی ہو؟"

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میرے کانوں نے سنا تھا اور میں نے سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی کہ خان کے پلّے نے مرنے سے پہلے اُسی کا نام لیا تھا۔ یقین نہیں آتا تو جا کر پیا جی سے پوچھ لو۔"

شانو نے اس دوران ہمارے لیے چائے سرو کر دی۔ کھالے نے حسبِ روایت اس کے سر پر ہاتھ رکھا، خیریت دریافت کی اور کپ اُٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

اس کے جانے کے بعد سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "مگر کیا بڑے خان کے جرم کی سزا اس کی بیٹی کو دی جا سکتی ہے؟ اس نے تو نہیں چاہا تھا کہ اس کا باپ تمہاری بہن کو اغوا کرے یا اس کے اغوا کا بدلہ لینے کے لیے وہ تمہارے گھر کو آگ لگائے۔ تمہی نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر منور شاہ جی پر ہونے والے حملے کی پیشگی اطلاع دینے والی اصل ہستی وہی تھی......"

میں نے کہا۔ "کھالے! تم بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے ہو تو میں تمہیں کیسے سمجھا سکتا ہوں۔ بھلے آدمی! میڈم میرے کہنے پر اُسے آزاد نہیں کرے گی۔ میری معلومات کے مطابق اُسے......"

میں روانی میں وہ کچھ کہنے والا تھا جو مجھے کھالے کے سامنے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ عین وقت پر مجھے خیال آ گیا اور میری روانی سے چلتی ہوئی سوئی رُک گئی۔ میں کہنے چلا تھا کہ 'اُسے دو کروڑ روپے کی خطیر رقم کی آفر ہو چکی ہے۔' شکر ہوا کہ کہا نہیں۔ وہ تشکیک آمیز انداز میں مجھے گھورنے لگا۔ میں نے فوراً بات بنائی۔ "میری معلومات کے مطابق میڈم نے اُسے سی ٹو سے نکال کر اپنے کسی اور خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے۔ وہ اس سے کیا مفاد حاصل کرنا چاہتی ہے، میں نہیں جانتا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ اپنی مرضی کرتی ہے۔ نہ ماننے پر آئے تو میرو شاہ کی بات کو بھی رَد کر دیتی ہے۔"

اس نے ایک طویل سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔ میں اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ بھانپ رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں تھا۔ کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا۔ "کیا تم اب ہمیشہ میڈم کی چاپلوسی کرو گے؟"

مجھے اس کے سوال پر تاؤ آیا، بہ مشکل خود کو سنبھال کر بولا۔ "فی الحال تو یہی ارادہ ہے۔ کل کیا ہوگا، یہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"ٹھیک ہے شہرے خان!" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "میں سمجھ چکا ہوں کہ تم پر اس حرافہ کا رنگ چڑھنے لگا ہے۔ تم وہ نہیں رہے جو نور پور میں ہوا کرتے تھے۔ تمہارے اندر کا غیرت مند شخص مر چکا ہے۔ بس! میں اَب تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں واپس نور پور جا رہا ہوں۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا، یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

مجھے اس کی گفتگو کے آغاز سے ہی اِس اختتامیے کا اندازہ ہو چکا تھا، تبھی زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

"سنا تم نے، جو میں نے کہا ہے؟" وہ تلخی سے بولا۔

میں نے کندھے اُچکائے۔ "یہ اگر تمہارا فیصلہ ہے تو میں یہ سروچشم تسلیم کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ قیامت مجھ پر ٹوٹی ہے اور مجھے ہی اِس کا اَپاہ (مداوا) کرنا ہے۔ رہی بات نور پور جانے کی، تو میرا مشورہ ہے کہ دیکھ بھال کر جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ میری وجہ سے کسی مصیبت میں پڑ جاؤ۔"

وہ شاکی لہجے میں بولا۔ "مصیبت میں تو پڑ ہی چکا ہوں۔"

"میری وجہ سے نہیں، اپنی وجہ سے۔" میں نے جلدی سے اُس کی تصحیح کی۔ "یہ سارا گورکھ دھندا موبی کے قتل کی وجہ سے پیدا ہوا اور وہ پنگا تم نے لیا تھا۔ نہ خان زادی سے ملنے کے لیے ملتان آتے، نہ یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا۔"

وہ تپ کر بولا۔ "میں نے تمہیں ساتھ آنے سے روکا تھا۔ نہ آتے......"

اس نے واقعی مجھے روکا تھا مگر میں دوستی کے جنون میں اُس کے ساتھ یہاں چلا آیا۔

میں نے کہا۔ "پولیس اور خان کے گرگے مجھے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ تمہیں نور پور میں دیکھیں گے تو پکڑ لیں گے اور میرا اتا پتا ٹھکانا پوچھیں گے، پھر؟"

وہ بولا۔ "یہ میرا دردِ سر ہے، تمہارا نہیں۔ تم بے فکر رہو۔ میں کسی کو بھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس کے لہجے سے پختہ تیقن آشکار تھا۔ "شہرے! مجھے میڈم اور میرو شاہ سے کوئی دلچسپی ہے، نہ کبھی تھی...... میں تو پروین کی وجہ سے تم لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ ہماری بدقسمتی تھی کہ جتن کے باوجود بھی نہیں ملی۔ اب میرے نزدیک ٹامک ٹوئیاں مارنے اور اپنے گھر والوں کو خان کے رحم وکرم پر چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں کسی دن منظرِ عام پر آ گیا تو بڑا خان میرے گھر والوں سے وہی سلوک کرے گا جو اس نے تمہارے خاندان کے ساتھ کیا ہے۔ دل میلا نہ کرنا شہرے! میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ میں اب تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

میں اسے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ اس کی سوئی اسما کی رہائی پر اٹکی ہوئی تھی۔ اسما کو میڈم کسی بھی صورت میں رہا نہیں کرے گی، یہ مجھے علم تھا۔ میں نے کہا۔ "کیا تم مجھ سے رابطہ رکھو گے؟"

وہ بولا۔ "اگر ضروری ہوا تو اپنے یار کی مدد کروں گا۔"

میرے لیے یہی بہت تھا۔ وہ اُٹھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے اجازت لے کر گھر کے اندر گیا اور چند منٹوں کے بعد واپس آ کر، بانہیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ "شہرے! سینے سے تو لگ جاؤ یار...... پھر پتا نہیں زندگی ہمیں اتنی سی مہلت بھی دے گی یا نہیں...... آ ؤ ناں!"

ہم دونوں بغل گیر ہوئے، ایک دوسرے کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے اور پھر میں نے اُسے دروازے پر آ کر رخصت کر دیا۔ میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر رہی تھی۔ اس کی جدائی بہرحال میرے لیے کسی سانحے سے کم

ہری مرچیں

پہلا۔ "تمہارے دادا جان کے انتقال کی وجہ؟"

دوسرا۔ "یادداشت! ان کی یادداشت کے وولٹیج بہت کم ہو گئے تھے، ایک دن سانس لینا بھول گئے۔"

☆......☆☆......☆

ماں۔ "بیٹا! اگر تم نے صابرہ سے شادی کی تو میں تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔"

بیٹا۔ "لیکن ماں! میں تو ڈبے کا دودھ پی کر بڑا ہوا ہوں۔"

☆......☆☆......☆

میاں۔ "تم اتنی اچھی روٹیاں نہیں پکاتی ہو جتنی اچھی میری والدہ پکاتی تھیں۔"

بیوی۔ "اور تم بھی تو آٹا اتنا اچھا نہیں گوندھتے ہو، جتنا اچھا میرے والد گوندھتے تھے۔"

☆......☆☆......☆

تین دوست ایک ریسٹوران میں کھانا کھانے گئے۔ "چکن سینڈوچ۔" پہلے نے آرڈر دیا۔

"چکن سینڈوچ کے بجائے آپ مٹن چانپ منگائیں۔" بیرے نے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے، مٹن چانپ ہی لے آؤ۔"

دوسرے دوست نے بیرے سے کہا۔ "میرے لیے دو آملیٹ لے آؤ۔"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔" بیرے نے لقمہ دیا۔ "اتنی گرمی پڑ رہی ہے اور آپ انڈا کھائیں گے، آپ بھی چانپ ہی منگوا لیں۔"

"تمہاری مرضی۔"

تیسرے شخص نے کوئی آرڈر دینے کے بجائے بیرے سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا منگواؤں۔ تمہی مشورہ دو کہ مجھے کیا منگوانا چاہیے؟"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی!" بیرے نے جھنجلا کر کہا۔ "میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ گاہکوں کو مشورے دیتا پھروں۔"

مرسلہ: سلیم قادر، منڈی بہاؤالدین

نہیں تھی۔
مجھے یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ نور پور میں اُس کے لیے فضا سازگار نہیں ہوگی۔ اسے گھر پہنچتے ہی سردار حیات خان، دریام خان اور پھر بڑے خان کی عدالتوں میں پیشیاں بھگتنا پڑیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ اسے سرکاری مہمان بنا کر خوب آؤ بھگت کی جائے......

وہ چلا گیا تو شانو نے مجھ سے اُس کی ناراضی کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ شاید کان لگا کر ہماری باتیں سنتی رہی تھی۔ میں نے اُسے ٹرخانا چاہا تو وہ بولی۔ "نہیں بھائی! میں نے سن لیا ہے کہ وہ آئندہ یہاں نہیں آئے گا۔"

"ہاں شاید! مگر تم فکر نہ کرو۔ یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے۔"

"اچھا چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ کہ اسکول میں داخلے کا بندوبست ہوا؟" اس نے اچانک موضوع بدل دیا۔

"میں نے ابھی تک کسی اسکول سے رجوع نہیں کیا۔"

"تو کرو ناں......" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "ہماری تو خیر ہے مگر موجو کو اب اسکول میں جانا چاہیے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ موجو کو بہ آسانی داخلہ مل سکتا تھا مگر شانو اور فرزانہ کے سرٹیفکیٹ نہیں تھے جو داخلے کے لیے ضروری تھے۔ ان کے حصول کے لیے نور پور میں جانا پڑتا جو خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ میرو شاہ یا پیاجی سے اِس موضوع پر بات کروں گا اور ان کی مدد سے کوئی راستہ نکالوں گا۔

میں نے کھالے سے ہونے والی گفتگو موبائل فون پر میرو شاہ کے گوش گزار دی۔ اس نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ "کچھ بھی نہیں بگڑت بابا! تم فکر نہ کرت ہے...... ایسے لونڈے جانے کے لیے ہی تو آوت ہیں ملتان شریف میں......"

میں نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ "وہ کوئی گڑبڑ نہ کروے جا کر؟"

"کیسے کوئی گڑبڑی کر سکت ہے وہ؟" اس کا لہجہ استعجاب سے معمور ہوگیا۔

"اُس نے میڈم کی کوٹھی، ہی ٹو اور پیا کا کوارٹر دیکھ رکھا ہے۔"

"اوئے غنچے! کاہے کو فکر کرت ہے پھوکٹ میں...... یہ مہارانی کی راجواڑی ہوت، میرو شاہ کا شہر ہووت، یہاں وہ سالا کالا ٹیٹ مخبری کرکے ماڑا کیا بگاڑ لیوت ہے...... ہیں؟" میرو شاہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ایک دنیا جانے ہے ماڑے کو، وہ بھی آخر کو ماڑے ہاتھوں کو جان لیوت ہے۔ ماڑے کو پتا ہووے کہ وہ استاد ببلو کے چرنوں میں جا کر بیٹھنے کو باندر پھرتیاں دکھاوت ہے، بس! لاڈے میاں...... وہ چلا جاوت ہے، جان چھوٹ جاوت ہے ماڑی بھی۔"

مجھے تسلی ہوئی۔ ماقبل مجھے یہ ڈر بھی لاحق تھا کہ کہیں میرو شاہ خالد کے یوں اچانک یہاں سے جانے پر خفا نہ ہو یا اس کا دل میری طرف سے میلا نہ ہو اس لیے میں نے رپورٹ پیش کر دی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اُس کے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔

اس نے مجھ سے پوچھا۔ "ماڑے غنچے کو کوئی پریشانی ہووت ہے تو بول دیوت ہے۔"

میں نے اسکول کے داخلے میں درپیش ممکنہ پریشانیاں ظاہر کیں۔ وہ ان جھمیلوں سے کبھی نہیں گزرا تھا، تبھی سمجھ نہیں پایا اور جھٹ سے بولا۔ "ماڑی رانیوں کو، ننھے گلگلے سے راجاجی کو کان سے پکڑے اور اسکول لے جا کر چھوڑ دیوت ہے...... اس میں گھبرانے کی کیا بات ہووے لاڈے میاں؟"

میں نے اُسے سمجھایا کہ اسکول میں داخلے کے لیے پیدائش اور مدرسہ چھوڑنے کے تصدیقی سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر جل چکا ہے۔ اس میں موجود تمام کاغذات، بشمول میری اسناد و دستاویزات جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔ نئے بنوانے کے لیے نور پور کے نواحی گرلز اسکول میں میرا جانا ضروری تھا اور میں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

میں نے بڑی مشکل سے اُسے معاملے کی نوعیت اور سنگینی سے آگاہ کیا۔ وہ بولا۔ "اڑے ماڑے غنچے! یہاں تو سب کچھ مل جاوت ہے، بنا بنایا بندہ بھی ہاتھ لگ جاوے ہے...... پھر کاگج (کاغذ) کیوں نہ ملت ہیں۔ ماڑا امور کھ پیا کس دن کام آوت ہے، تم اُس پیدا گیر کو ماڑا نام لے کر بول دیوے ناں...... اور ہاں لاڈے میاں! مہارانی کو کھالے کی واپسی کی خبر بھی دیوت ہے...... اِسی ٹائم......"

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور رابطہ منقطع کر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میڈم شکیلہ سے فون پر رابطہ کیا اور چاہا کہ اُسے کھالے کے بارے میں مطلع کر دوں۔ اس نے میری بات آغاز ہی میں اُچک لی اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ "شہریار! تم اپنی توانائیاں اس کے بارے میں سوچنے اور مجھے رپورٹ دینے پر ضائع نہ کرو۔ اسے جانا تھا، چلا گیا۔ اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں مصروف ہوں ورنہ تمہیں زیادہ وقت دیتی مگر...... او کے! سی یو!"

اس نے میرا جملہ 'جی میڈم' سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ میں نے عافیت کی سانس سینے میں اُتاری اور بے دھیانی کے عالم میں فون کی ڈسپلے اسکرین کو گھورنے لگا۔ اپنی یادداشت کو کنگھالنے لگا مبادا کہ میں نے کھالے سے ہونے والی گفتگو کے دوران میڈم کے مفاد کے خلاف کوئی بات کر دی ہو۔" تسلی ہوئی کہ مجھ سے یہ کوتاہی سرزد نہیں ہوئی تھی۔

میں نے پیاجی کو کال کی۔ اُسے سمجھانے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ اس نے نام، ولدیت اور عمروں سمیت کئی معلومات حاصل کیں، انہیں کسی کاغذ پر لکھا اور دو چار دنوں میں ہی یہ کام نمٹا دینے کا وعدہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر دکھانے میں کامیاب ہوجائے گا اور میرا مسئلہ حل کر دے گا۔

مجھے کھالے کے ردِعمل اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کی سنگینی کی فکر لاحق تھی، وہ نہیں رہا اور نور پور سدھار گیا تھا۔ ایک امید بندھ چلی تھی کہ وہ نور پور میں رہ کر پروین کا کوئی سراغ نکالنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

مجھے بچوں کے داخلے کی فکر دامن گیر تھی، جو نہیں رہی مگر نئے مسائل جنم لے چکے تھے۔ مجھے قسمت نے قانون کی نظروں میں مجرم بنا دیا تھا اور مجھ پر نور پور کے راستے بند کر دیے تھے۔ پروین کی کوئی خبر نہیں تھی اور سردار حیدر خان میرے خون کا پیاسا بن چکا تھا۔ میرے والدین کے قاتل مجھے نہیں ملے تھے بلکہ چاچا اور چاچی بھی نہایت بے بسی کی موت کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے قاتل میرے اور پیاجی کے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے مگر ان کی ڈوریں ہلانے والا اصل قاتل زندہ و سلامت میری نظروں کے سامنے تھا جس سے انتقام لینا میری ترجیحی خواہش بن چکی تھی۔ میں گھر سے نکل کر بہ ظاہر تعیش کی زندگی بسر کرنے لگا تھا مگر مجھے ایک پل کو بھی چین نصیب ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میڈم شکیلہ کے سجائے ہوئے کرائے امتحان سے سرخرو نکلا تھا مگر اس نے مجھے نئے مشن پر بھیجنے کا ارادہ ظاہر کر کے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ اب مجھے اس کے احسانات کے عوض اسے اپنی خدمات پیش کرنا تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عادی اور مفرور مجرم بنتا تھا۔ میں نے خود کو اس بھیانک گرداب سے دور رکھنے کی اَن گنت ترکیبیں سوچیں مگر سبھی کو ناقابلِ عمل قرار دے کر رد کر دیا۔ میں میڈم کے آہنی شکنجے میں بری طرح جکڑا جا چکا تھا اور اس کی مرضی کے مطابق مستقبل کی راہیں متعین کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں مشن پر جانے سے انکار کر دوں...... پھر خیال آیا کہ انکار کے بعد کیا کروں گا؟ میں بزدل نہیں تھا کہ اُس سے یا اُس کے کارندوں سے ڈر جاتا مگر میرے پاس مستقبل کا کوئی لائحہ عمل بھی تو نہیں تھا۔ میڈم کی سلطنت کو چھوڑ کر کہاں جاتا؟ کہاں چھت میسر آتی جس کے نیچے اپنے باقی ماندہ خاندان کو زمانے کے گرم و سرد سے چھپا کر رکھتا...... کہاں اتنی طاقت اور اسلحہ میسر آتا جس کے بل پر حیدر خان کے محل کو خاکستر کرنے کا خواب دیکھتا...... کہاں سے اتنی دولت ہاتھ لگتی کہ میں جو چاہتا، کر لیتا اور قانون ہاتھ میں لے کر دندناتا پھرتا......

ذہن نے فوراً ہی اصلاح کر دی کہ محض بازوؤں کی طاقت پر بھروسا کرتے ہوئے، میڈم شکیلہ کو انکار کرنے کے بعد، میں اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ میں اس کے ماہر لڑاکوں اور جانباز غنڈوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا جو انکار کے بعد میری تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے کسی کو اغوا کرنے، کہیں منشیات کی کھیپ اور اسلحہ پہنچانے یا لینے کے لیے بھیجنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہی اُس کا بزنس تھا جس کا ہن اُس پر شب و روز برستا تھا اور میں اس کی بچھائی ہوئی بساط پر محض ایک مہرہ تھا۔

میں نے جب دیانتداری سے سوچا کہ کیا میرے پاس واپسی کا راستہ ہے؟ تو مجھے ذہن کے نہاں خانوں سے یہی جواب موصول ہوا۔ "نہیں شہریار! تم آگے بڑھ سکتے ہو مگر پیچھے دیکھ کر عبرت پکڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ابھی تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو اور میڈم کے احکامات کی تعمیل میں عافیت کی راہیں تلاش کرو...... کسی مناسب وقت پر ایسا دلیرانہ فیصلہ کرنا۔"

مجھے میڈم نے اپنے قریب کیا تھا مگر ایک حد تک...... کہ ابھی تک میں اُس کے گروپ کی بنت اور انتظام و انصرام سے واقف نہیں ہوا تھا۔ مجھے گروپ کے چند ایک لوگوں سے ہی متعارف ہونے کا موقع میسر آیا تھا۔ صحیح معنوں میں سوائے میرو شاہ، پیاجی اور عقیل کے، میں نے کسی کو ایکشن میں نہیں دیکھا تھا۔ میرو شاہ نے مجھے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ پیاجی سے کہیں بڑے پیداگیر انسان میڈم کے تلوے چاٹتے ہیں۔ پیاجی کو دیکھ رکھا تھا، وہ بہت دلیر اور کائیاں انسان تھا۔ اس سے بھی تیز طرار اور پیداگیر لوگ اگر میرو شاہ اور میڈم کی مٹھیوں میں بند تھے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے یہاں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میری بے احتیاطی بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔

پیاجی سے پتا چلا تھا کہ میرو شاہ لڑائی بھڑائی کا بندہ

نہیں تھا۔ وہ اس گینگ کا ماسٹر مائنڈ پلانر تھا، پلان بنا کر کارندوں کو روانہ کرتا تھا۔ اسی وجہ سے میڈم کے ہاں اس کا مقام 'کمانڈر' کا سا تھا۔ بیاجی کے لیے 'پیدا گیر' کی اصطلاح میروشاہ سے ہی سن رکھی تھی۔

اسما کی طرف میرا دل کھنچتا تھا۔ اس کا انجام بہت برا ہونے والا تھا مگر میں چاہتے ہوئے بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ زندگی کے کسی بھی لمحے میں کھالے کو شریک حیات بنانے کا سوچے گی، تو بھی شاید میڈم کے مقابلے میں اس کی اعانت کرنا حماقت ہوتی۔

دو تین دن فراغت کے جھولے میں جھولتے ہوئے گزر گئے۔ بیاجی کی طرف سے ہنوز کوئی رپورٹ نہیں ملی تھی مگر میں متفکر نہیں تھا۔ شام ڈھلی تو میروشاہ کا فون موصول ہو گیا۔ اُس نے میڈم کی کوٹھی پر فوراً پہنچنے کا حکم صادر کیا۔ میں نے فوجی اختر کو گھر کا خیال رکھنے کا حکم دیتے ہوئے یہ باور کرا دیا کہ میری واپسی میں غیر معمولی تاخیر ہو سکتی تھی۔ اس نے مضبوط لہجے میں ڈھارس دی۔ ''فکر نہ کرو شہر یار! یہ میرا گھر ہے اور میرے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ میلی نظر سے دیکھنے والے کی آنکھیں نکال پھینکوں۔ یہ میری بیٹیاں ہیں۔ موجو میرا بیٹا ہے۔ جب تک جی چاہے، باہر رہو، جب فارغ ہو جاؤ، تب واپس آ جاؤ۔''

میروشاہ نے بتایا نہیں تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ مجھے کسی مشن پر روانہ کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔

میں رکشا میں میڈم کی کوٹھی پر پہنچا۔ ظاہر شاہ کو میرے آنے کی پیشگی خبر مل چکی تھی۔ اس نے رسمی علیک سلیک کے بعد مجھے گیسٹ روم میں پہنچا دیا جہاں ایک ناٹے قد کا نیم گنجا شخص صوفہ نشین تھا۔ میں نے اُس سے ہاتھ ملایا تو اُس نے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ''شہر یار؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بولا۔ ''میرا نام سخی محمد ہے۔ ہم دونوں مال پہنچانے کے لیے یہاں سے تھوڑی دیر بعد نکلنے والے ہیں۔''

اس کے لہجے میں عجیب سی سرسراہٹ تھی جسے کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا تھا۔ چونکہ مجھے آنے والا غیر معینہ وقت اُس کے ساتھ گزارنا تھا اور حسبِ سابق اس کی رہنمائی میں مشن سرانجام دینا تھا اس لیے اُسے دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ فربہی مائل کسرتی بدن اور سنولائی ہوئی رنگت والا شخص تھا۔ سامنے کا آدھا سر خالی تھا اِس لیے ماتھا بہت کشادہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں عیاری کا بھرپور تاثر لیے ہوئے تھیں۔

شبو چائے سرو کر کے چلا گیا تو میں نے سخی محمد سے دریافت کیا۔ ''ہم یہاں کسی کا انتظار کر رہے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''جی ہاں!''

''کس کا؟''

''شاہ جی، یعنی میروشاہ کا......'' وہ بہت اختصار پسند فطرت کا مالک محسوس ہوا۔

''وہ کب تک آ جائے گا؟''

''میں نہیں جانتا......''

''مال کس قسم کا ہے؟''

اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا، کچھ سوچا اور ہلکی سی بیزاری سے بولا۔ ''میں نہیں جانتا......''

اس کی اختصار پسندی درحقیقت محتاط روی بھی ہو سکتی تھی۔ اِس لیے میں ہنکارا بھر کر خاموشی سے چائے پینے لگا۔ میں نے از خود محسوس کیا کہ میرے سوالات غیر ضروری تھے۔

ایسے ہی وقت میں میروشاہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنی عادت کے برعکس بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم دونوں سے غیر معمولی سرد مہری سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گیا، بولا۔ ''ماڑے غنچے! سمجھ لیوت ہے کہ تم پائلٹ ہووے اور یہ تمہاری اجمائشی (آزمائشی) فلائٹ ہووے ہے...... اگر ماڑا غنچہ، میروشاہ کا لاڈا جیت کر آوت ہے تو گلے میں مالا دیکھت ہے، ہار کر آوت ہے تو پھر اس کو جگ میں کوئی بھی نہ دیکھت ہے...... جرا (ذرا) غور سے ماڑی بات سن لیوت ہے...... ماڑے سخی جانی! تیرے کانوں میں بھی ڈالت ہوں...... نئے مشن کے بارے میں چند جروری (ضروری) باتیں کرنا ہووت ہیں......''

میروشاہ نے اپنے مخصوص انداز میں مشن کی تفصیل بتانا شروع کر دی۔ میں اور سخی محمد غور سے سن رہے تھے۔

میری توقع کے برعکس مجھے منشیات یا اسلحہ کی ترسیل نہیں کرنا تھی بلکہ خانزادی اسما کو دوآبہ کے خطرناک علاقے میں موجود میاں دلبر حسین کے فارم ہاؤس پر پہنچانا تھا۔ میاں دلبر حسین کو میں غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ وہ بہت بڑا جاگیردار تھا۔ لاہور کے کسی مضافاتی علاقے سے سردار حیدر خان کے پاس آیا کرتا تھا۔ بڑی سیاسی پارٹی کا اہم ستون ہونے کے وجہ سے سیاسی گٹھ جوڑ کے تمام امور اُس کے ذمے تھے اس لیے یہاں کے بھی سیاسی کھلاڑی اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ چونکہ مجھے میروشاہ نے پہلے بتا رکھا تھا کہ وہ اسما کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس نے بہت بڑی رقم کی آفر بھی کر رکھی ہے، اس لیے مجھے حیرت نہیں ہوئی۔

میں نے خانزادی کو دوآبے میں موجود میاں دلبر حسین کے ایک خاص کارندے رنگ علی عرف رنگو قسائی تک پہنچانا تھا جسے دو کروڑ روپے کی خطیر رقم میرے حوالے کرنا تھی۔ میڈم شکیلہ اور میاں دلبر حسین کے درمیان سودا طے پا چکا تھا۔ اس نے میڈم پر واضح کیا تھا کہ وہ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے خاص سیاسی مہرے سردار حیدر خان کے لیے اس ڈیل کا تردد کر رہا تھا۔ چونکہ میڈم کو سردار حیدر خان پر اعتماد نہیں تھا اور نہ حیدر خان کو اُس پر بھروسا تھا اِس لیے خان کی طرف سے میاں دلبر حسین کو بیچ میں ڈالا گیا تھا۔ میڈم نے میاں دلبر حسین پر واضح کر دیا تھا کہ گڑبڑ کرنے کی صورت میں وہ اور حیدر خان اسما سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور میاں دلبر نے اُسے گارنٹی بھی دے دی تھی مگر آنکھیں بند کر کے دوآبے میں جانا بہت بڑی حماقت تھی۔

میں نے تشویش ظاہر کی۔ ''کیا تبادلے کا یہ طریقہ نامناسب نہیں ہے؟''

''ماڑے کو سمجھ نہ آوت ہے لاڈے میاں؟ تم کیا کہووے ہے؟''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس سے بہتر تھا کہ پہلے رقم لی جاتی، پھر خانزادی کو کسی مقررہ جگہ پر پہنچا دیا جاتا۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرح تو گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ جونہی اسما رنگو قسائی کی تحویل میں چلی جائے گی، رنگو قسائی اور اس کے ساتھی مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گے۔ وہ مجھ سے دو کروڑ روپے کی رقم چھیننے کے لیے سامنے آ جائیں گے۔ علاقہ ان کا ہے اور وہ لوکیشن کو ہم سے بہتر جانتے ہیں اس لیے وہ ہم دونوں کو بہ آسانی دوآبے میں کسی بھی جگہ پر گھیر لیں گے اور گولی مار کر دی ہوئی رقم واپس لے لیں گے۔ میڈم دو کروڑ روپوں سے جائے گی، ہم جان سے جائیں گے۔''

میری بات سن کر میروشاہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ بڑی دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''اڑے واہ لاڈے میاں! تم تو غجب (غضب) کے عقل مند ہووت ہو...... بڑے بولت ہیں کہ کاگا جی نے ایک دفعہ اپنے پوت (بیٹے) کو نصیحت کرت کہ جونہی مورکھ انسان پتھر اُٹھانے کو جھکت، تم اُڑ جاوت...... کاگے کا پوت بولت کہ باپو! اگر اُس مورکھ نے پہلے ہی پتھر ہاتھ میں رکھا ہووت تو...... کاگا جھوم کر اپنے پوت کا ماتھا چوم لیوت اور کہوت کہ جا میرے سیانے پوت! تیرے کو کوئی بھی نشانہ نہ مار سکت ہے...... تو اب آپ سیانا ہو جاوت ہے...... جا، اُڑ جا...... ماڑے لاڈے! تو بھی اُڑ جا!''

میروشاہ قہقہہ مار کے ہنسا اور میرا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ ''ماڑے غنچے! ماڑی دنیا میں رسک لینا پڑت...... جندگی کا، نقصان کا، بھول کا...... تیرے کو معلوم ہووت کہ وہ بغدے مار کا بچہ رنگو قسائی تیرے کو دوآبے میں گھیرنا مانگت ہے تو پھر تو کاہے کو اُس کے گھیرے میں آوت ہے؟ کوئی توڑ کر لیوت ناں...... ماڑی مہارانی جی اُس خان زادی کو وہاں پہنچانے کا پرامس کر لیوت ہے، بس! اب تم اس کا پرامس پورا کرت ہے لاڈے میاں!''

''کیا یہ بھی میرے امتحان کی کڑی ہے؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

اس نے کندھے اُچکائے، بولا۔ ''یہ تو مہارانی ہی جانت ہے، ماڑے کو علم نہ ہووت ہے......''

بہ ظاہر آسان دکھائی دینے والا مشن درحقیقت آسان نہیں تھا۔ یہ تو صریحاً شامت کو دعوت دینے والی بات تھی۔ میرے چہرے پر تشویش اور کشمکش کے آثار دیکھ کر میروشاہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ماڑی ٹیم مہارانی کے حکم پر کچھ بھی نہ سوچے ہووت...... بس فوجیوں کی طرح 'ٹھاہ' کر دیوت ہے جبکہ میں دیکھت ہوں کہ تو سوچ میں پڑ جاوت ہے۔ ہے ناں غنچے؟''

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ پیاجی نے بھی مجھے یہی کہا تھا۔ سامنے کھڑی موت کی آنکھوں سے زندگی کی مہلت چرانا آسان نہیں ہوتا مگر میڈم کے گروپ کا ہر فرد ایسا ہی جی دار واقع ہوا تھا۔ میں نے خودکشی کے پروانے پر دستخط کرتے ہوئے سر جھکا دیا۔ ہامی بھر لی۔

حیدر خان کے گرگے استاد ببلو کی طرف سے تمام متوقع خطرات سے آگاہ کرنے کے بعد اس نے غیر متوقع طور پر مجھے اِس مشن کا انچارج مقرر کر دیا۔ میں نے پس و پیش کیا تو اُس نے درشتی سے ڈانٹ دیا۔ اپنی زنبیل نما جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا اور اسے میز پر پھیلا دیا۔ وہ ہاتھ کا بنا ہوا ایک تفصیلی نقشہ تھا جس پر دوآبے کے وسیع اور خطرناک علاقے کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اس نے ٹارگٹ لوکیشن کو نشان زدہ کیا اور کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ ''لاڈے میاں! یہ بہت بڑا مشن ہووت ہے...... ہے ناں؟ دو کروڑ کے نوٹوں کی گنتی میں شام سے فجر ہو جاوت ہے...... اور غلطی...... ناں بابا ناں...... غلطی کی گنجائش؟ نشتہ...... اب تم اپنے موبائل شوبائل اِدھر ڈال دیوت اور تیاری کر لیوت......''

اس کا لہجہ خوفناک حد تک سرد ہو گیا۔ میرے رگ و پے

میں سنسنی دوڑنے لگی۔ خانزادی کو وہاں تک پہنچانا بہت مشکل کام تھا۔ اس سے کہیں زیادہ جان لیوا کام دو کروڑ روپے کی خطیر رقم بہ حفاظت کوٹھی تک لانا تھا۔ میروشاہ کے ہاتھ کے مخصوص اشارے پر ہم دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے پارکنگ میں آئے جہاں ایک ڈارک گرے کلر کی نسان ڈبل ڈور ہائی لکس ہماری منتظر تھی۔ اس کا عقبی کھلا حصہ پودوں سے بھرا ہوا تھا۔ میروشاہ نے ہائی لکس کے بمپر پر پاؤں رکھا اور خنک لہجے میں کہا۔ "لاڈے میاں! پودوں سے لدے پھندے ڈالے دوآبے میں آوت جاوت ہیں۔ ماڑے کو پتا ہووت ہے اس لیے ہریالی لادرکھی ہووے۔ پچھلی سیٹ کے نیچے کھلونے چھپا رکھے ہووت ہیں...... جرورت کے سے نکال لیوت...... ٹھیک؟ تم ادھر گڈی (گاڑی) کو دیکھت، ماڑا انجی جانی مال اندر سے اٹھا لاوت ہے......"

اس نے پہلو کی جیب سے ہائی لکس کی چابی نکالی، میری ہتھیلی پر رکھی اور سخی محمد کا بازو پکڑ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوٹھی میں گھس گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد سخی محمد خانزادی کے بے ہوش وجود کو کاندھے پر لادے کوٹھی سے برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ میروشاہ نہیں تھا۔ میں اس دوران ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ہائی لکس کا بہ نظرِ احتیاط جائزہ لے چکا تھا۔ وہ نئے ماڈل کی گاڑی تھی جسے یقینی طور پر کہیں سے ایسے ہی موقعے کے لیے چرایا گیا تھا۔ پیا جی نے فارم ہاؤس میں مجھے بتایا تھا کہ ہمارے زیرِ استعمال آنے والی گاڑیاں عمومی طور پر چوری شدہ ہوتی ہیں جنہیں ایک دو موقعوں پر استعمال کر کے علاقۂ غیر روانہ کر دیا جاتا تھا جہاں وہ اونے پونے میں فروخت کر دی جاتی تھیں۔ یہ بھی ایک طرح کا میڈم کے کاروبار کا حصہ تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ہائی لکس کا عقبی دروازہ غیر مقفل کیا۔ سخی محمد نے دروازہ کھول کر اسما کو سیٹوں کے درمیان فرش پر لٹا دیا اور کہا۔ "یہ بے ہوش ہے اور کسی بھی وقت ہوش میں آسکتی ہے۔"

میں نے بے پروائی سے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا تم ڈرائیونگ کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "میں نے راستہ نہیں دیکھ رکھا۔ اگر تم نے دیکھ رکھا ہے تو تم اِدھر آجاؤ۔"

"میں کئی مرتبہ دوآبہ جا چکا ہوں۔ میاں دلبر کا اڈا تو نہیں دیکھا مگر لوکیشن سے آگاہ ہوں۔"

"تو پھر تم ہی ڈرائیونگ کرو۔"

اس نے کندھے اُچکائے اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آگیا۔ بیٹھنا چاہتا تھا کہ اسلحے کا خیال آگیا، بولا۔ "ایک نظر اسلحے پر ڈال لو۔"

میں نے پائیدان پر پاؤں ٹکا کر سیٹ اُٹھائی اور موجود اسلحے کا جائزہ لیا۔ جدید طرز کی شارٹ گنیں، ایک سلور کلر کا جرمن ساختہ ماؤزر، دو پستول اور کئی لوڈڈ میگزین دیکھ کر مجھے تقویت ملی۔ میں نے سخی محمد سے پوچھا۔ "کیا تم کوئی ہتھیار لو گے؟"

اس نے کہا۔ "پستول یا ریوالور ہے تو نکال دو۔ سنگل میگزین...... ویسے تو دریا کے پار تک کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"لیکن ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔" میں نے ایک پستول نکال کر اُسے تھما دیا، دوسرا اپنے لیے اُٹھا لیا اور سیٹ کو اپنی جگہ پر ایڈجسٹ کر دیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے اگنیشن میں چابی گھما دی۔ انجن گھرگھرا کر بیدار ہوا اور ہائی لکس ایک جھٹکے سے کوٹھی کے جہازی سائز گیٹ کی طرف بڑھی۔ میں نے ڈیش بورڈ میں روشن سبز ہندسوں والی گھڑی پر وقت دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ ابھی شہر جاگ رہا تھا مگر ہم جہاں جا رہے تھے، وہاں کی زندگی اس وقت تک آدھی نیند کا خمار اوڑھ چکی ہوتی تھی۔ دیہاتوں میں صبح اور شام بہت جلد کچے منڈیروں پر اُتر آتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ "سخی محمد! ہمارا سفر کتنی دیر کا ہے؟"

"اگر شہر سے نکلنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو صرف ایک گھنٹے کا......"

"یعنی ہم ساڑھے بارہ بجے ٹارگٹ پر ہوں گے؟"

"ہاں!" اس نے ہائی لکس کارپٹڈ روڈ پر چڑھا کر بریک پر پاؤں رکھے بغیر دائیں ہاتھ ٹرن لیتے ہوئے کہا۔

"ہم موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔" میں نے ازراہِ کلام کہا۔

"کیا تم ڈر رہے ہو؟" اس نے عقب نما کا رُخ بدلا۔ اَب اس کی آنکھیں مجھے دکھائی دینے لگی تھیں۔

"ڈر میری سرشت میں شامل نہیں ہے۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"احتیاط ہر کام میں لازم ہے، خواہ موت کا خطرہ ہو یا نہ ہو۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "تم اس مشن کے ماسٹر ہو، جیسا کہو گے، ویسا کروں گا۔ اگر چاہو گے تو ضرورت پڑنے پر مشورہ دوں گا، نہیں چاہو گے تو ہر حکم مانتا جاؤں گا۔ میں نے یہی اصول بڑھ رکھا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے ایک نوے درجے کا موڑ تیزی سے کاٹا۔ ایک سائڈ کے دونوں ٹائر بہ یک وقت چرچرائے۔ میں پہلو کے بل سیٹ پر گرا مگر فوراً ہی سنبھل کر اُٹھ بیٹھا۔

وہ بولا۔ "لڑکی کو رنگو قسائی کے حوالے کرنا ہمارا مشن نہیں ہے بلکہ رنگو سے پیسے وصول کرنے کے بعد دوآبے سے زندہ سلامت نکلنا ہمارا مشن ہے۔ رہی بات موت کی تو وہ کہاں منتظر نہیں ہے؟" اس نے سامنے سے آنے والے ایک ٹرک کی طرف اشارہ کیا جو اپنی ہیڈ لائٹس ڈم کر کے کراسنگ کے عمل کو آسان بنا رہا تھا۔ "دیکھو! وہ سامنے سے آنے والے منی ٹرک کا اسٹیئرنگ محض ایک انچ دائیں جانب کھسک جائے تو ہم کٹ پھٹ کر مر جائیں گے...... تمہیں اور مجھے کسی بھی لمحے دل کا دورہ پڑ سکتا ہے، موت کا تو کوئی بھی بہانہ بن سکتا ہے...... موت میدانِ جنگ میں بھی منہ کھولے کھڑی ہے، بیڈروم میں بھی...... پھر کاہے کو ڈرنا؟"

میں نے ایک طویل سانس لی اور خاموشی اختیار کر لی۔ یہ اور موت کے بارے میں ایسی کئی فلسفیانہ باتیں میں نے پیا جی کے منہ سے سن رکھی تھیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میڈم کے گینگ کے ہر رکن کے ذہنوں کی تیاری پیا جی اور اس کے مرحوم استاد نے کی تھی۔

میرے پیروں تلے خانزادی اسما کا بے حس و حرکت وجود پڑا تھا جو سخی محمد کے بقول کسی بھی وقت متحرک ہو سکتا تھا۔ وقت بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ وہ نازوں پلی خان زادی جس کے ابروؤں کے اشاروں پر نوکروں کی فوج حرکت میں آجاتی تھی، اس وقت نہایت کسمپرسی کی حالت میں میرے پیروں تلے پڑی تھی۔ یہی شہر تھا جب پولیس مجھے گرفتار کر کے تھانے لے جا رہی تھی اور میرا بدن ملک ارشد اور بڑی مونچھوں والے فرید خان کے سرکاری بوٹوں تلے پڑا تھا جبکہ آج میرے پیروں تلے ایک فرعون صفت وڈیرے کی بیٹی لاوارثوں کی طرح پڑی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ میرے پاؤں اس کے بدن کو نہ چھوئیں مگر محدود جگہ میں اس احتیاط کی گنجائش نہیں تھی۔ ناچار مجھے ایک پاؤں اس کے گھٹنے پر رکھنا پڑا جبکہ میں نے دوسری ٹانگ دُہری کرتے ہوئے سیٹ پر رکھ لی۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے میروشاہ اور میڈم پر غصہ بھی آیا کہ انہوں نے خواہ مخواہ مجھے اس مصیبت میں ڈال دیا۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ پہلے رقم حاصل کرتے، پھر اسما کو کسی جگہ پر پہنچا کر فون پر رنگو قسائی کو پیغام دے دیتے کہ فلاں جگہ پر جا کر اسما کو اُٹھا لے۔ یہ بہت محفوظ طریقہ تھا۔ اب جو طریقہ اپنایا جا رہا تھا، یہ نہایت سنگین اور احمقانہ تھا۔ اس سے قبل میڈم نے فارم ہاؤس میں مجھ پر حملہ کرتے ہوئے بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ تب قسمت نے ساتھ دیا تھا ورنہ ہم دونوں بن موت مارے جاتے اور آزمائش کی خونیں قیمت چکانا پڑتی۔

اچانک، میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ مجھ پر میڈم شکیلہ کی سفاک اور بے رحم فطرت آشکار ہو گئی۔ وہ مجھے موت کے مقابل میں کھڑا کر کے میری صلاحیتوں کا مشاہدہ کرنا چاہتی تھی۔ جیت گیا تو الیگزینڈر دی گریٹ کی طرح رکسونا کے پاس زندہ و سلامت پہنچ جاؤں گا ورنہ ہزیمت سے دوچار ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کی بازی بھی ہار جاؤں گا۔ میرے ہونٹ بھنچ گئے۔

میری فرمائش پر سخی محمد ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ مجھے علاقے کے بارے میں بھی بتاتا جاتا تھا۔ یہ فلاں روڈ ہے، یہ فلاں چوک ہے، وغیرہ۔ جونہی ہم شہر سے نکل کر مضافات کے اندھیرے میں پہنچے، وہ بولا۔ "کچھ دیر بعد ہم چناب کا سپر بند عبور کر کے دریائی علاقے میں داخل ہو جائیں گے جہاں ملتان کی حد ختم ہو گی اور ضلع مظفر گڑھ کا علاقہ شروع ہو جائے گا، سمجھنا کہ دوآبہ شروع ہو گیا ہے۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کی جانب، جدھر سے پانی آرہا ہے، چند کلومیٹر جائیں گے۔ پھر دریا عبور کر کے منزل کی طرف بڑھ جائیں گے۔"

ہائی لکس ایک بل وار لنک روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ اس علاقے میں دریا پر ایک ہی پل بنا ہوا ہے؟"

"ہاں!" وہ بولا۔ "پل تو ایک ہی ہے...... وہ شیر شاہ بائی پاس والا...... مگر اس طرف کشتیوں کا ایک پل بنا ہوا ہے جس پر سے بھتا دے کر گزرا جا سکتا ہے۔"

جن دنوں میں امیر نواز کے ساتھ شکار پر جایا کرتا تھا، ان دنوں میں نے دریائے سندھ پر غازی گھاٹ کے قریب پتن پر کشتیوں کا بنا ہوا ایک پل دیکھا تھا۔ سوچا کہ ویسا ہی پل یہاں بھی ہو گا۔

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور شیشے کے پار دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرے کی وجہ سے کچھ واضح دکھائی نہیں دیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک اور اس کے اطراف کا مختصر علاقہ دکھائی دیتا تھا۔

سخی محمد سے ملنے والی معلومات کو میں ذہن نشین کرتا جاتا تھا۔ دو دریاؤں کے بیچ حائل خشکی کے ٹکڑے کے لیے

دوآبہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے مگر یہاں دریائے چناب کے متصل علاقے کو لوگوں نے دوآبہ کا نام دے رکھا تھا۔ چونکہ یہاں سے بہنے والے دریائے چناب میں اوپر کی جانب تریموں ہیڈ پر دریائے جہلم کا پانی بھی شامل ہو جاتا تھا، یعنی اس مقام پر دونوں دریاؤں کا پانی بہتا تھا، اس لیے دو دریاؤں کی وجہ سے دوآبہ کا نام دیا جاتا تھا یا دریا کئی نالوں کی صورت میں بہتے ہیں۔ ہر نالے کو دریا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ دو نالوں کے درمیان خشک جگہ کو بھی دوآبہ کہا جاسکتا ہے۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو، یہ طے تھا کہ یہ علاقہ بہت خطرناک اور کم آبادی پر مشتمل تھا۔

فصلوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ آدھے چاند نے بدلیوں کی اوٹ سے طلوع ہو کر اندھیرے کا تسلط توڑ دیا۔ دھندلی چاندنی میں تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا سرکنڈوں، جھاڑیوں، اونچے نیچے ٹیلوں اور جھیل نما گڑھوں پر مشتمل ویران اور غیر آباد علاقہ دکھائی دینے لگا۔ دریا سے چند میل دور پختہ سڑک ختم ہو گئی اور ناہموار کچا راستہ سرکنڈوں میں بل کھا کر گم ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ چونکہ اُب تک کسی بھی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اس لیے نصف گھنٹے میں ہم دریا پر پہنچ گئے تھے۔ سخی محمد نے ایک جگہ ہائی لکس روک کر پوچھا۔ ”ماسٹر! کیا میں کچھ کہوں؟“

میں نے کہا۔ ”یار سخی محمد! اس تکلف میں نہ پڑو، میں کوئی ماسٹر واسٹر نہیں ہوں تمہارا...... ہم دونوں ساتھی ہیں اور بس...... جو کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔ ہمیں مل کر اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں ان خیالات پر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر اصول تو اصول ہی ہوتا ہے۔ بہر حال! میرا خیال ہے کہ ہمیں ساڑھے بارہ بجے ٹارگٹ پر نہیں پہنچنا چاہیے۔ ڈیڑھ تا دو بجے کا وقت زیادہ مناسب رہے گا۔ تم کیا کہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”تم درست سوچ رہے ہو۔ جہاں بھی ممکن ہو، وہاں ہم کچھ دیر کے لیے رک جائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”یہاں رکا جاسکتا ہے یا پھر کشتیوں کا پل کراس کرنے کے بعد ایک جگہ پر قیام کیا جاسکتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، چلو، دریا پار کرتے ہیں۔“ میں نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے گاڑی بڑھا لی۔ کچھ دیر بعد سرکنڈوں اور جھاڑیوں کا خود رو جنگل ختم ہو گیا اور دریائی ریت پر بل کھاتا ہوا راستہ شروع ہوگیا۔ چاندی کی ایک زگ زیگ لائن کچھ فاصلے پر زمین کے سینے پر کھنچی دکھائی دی۔ یہ دریائے چناب تھا جس کا دامن محض ایک رابطہ نہر کے پانی کا محتاج تھا۔ یہی پانی ہیڈ پنجند پر جا کر پھر اپنے اصل میں ضم ہو جاتا تھا۔ ہچکولے لیتی ہوئی ہائی لکس میں خاموشی طاری تھی۔ سخی محمد فطرتاً کم گو تھا۔ میں ذہنی ادھیڑ بن میں غرقاں تھا جبکہ اسما میرے پیروں تلے بے ہوش پڑی تھی۔

پانچ منٹ کے بعد ہم کشتیوں کے دو اڑھائی سو فٹ لمبے پل کو عبور کر رہے تھے۔ گاڑی کے وزن سے پل کے تختوں سے عجیب قسم کی آوازیں برآمد ہوئیں۔ دیہاتی طرز کے ٹول پلازے کی سالخوردہ میز کے عقب میں پڑی خالی کرسی کو دیکھ کر میں نے کہا۔ ”یہاں تو کوئی موجود نہیں ہے۔“

”رات کو ادھر کوئی نہیں آتا، اس لیے ٹیکس کلرک بھی گہری نیند سوتا ہے۔“ سخی محمد نے کہا۔

رات کو پل پر سے گزرنے والوں سے پیسے وصول کرنے اور پرچی دینے والا موجود ہی نہیں تھا، اگر کوئی تھا بھی تو وہ اِس وقت ترپال والے کیمپ نما ٹول پلازے میں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر ریتیلے راستے پر سفر جاری ہوگیا۔ کچھ آگے جا کر ایک ٹیلے کے دامن میں سرکنڈوں کے بیچ محفوظ جگہ پر گاڑی روک کر سخی محمد نے مجھے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ میں اُتر آیا اور ہائی لکس کی باڈی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سخی محمد گھوم کر میری طرف آیا اور دونوں بانہیں فضا میں پھیلا کر بولا۔ ”سردی کے باوجود فضا خوشگوار ہے۔ نہ جانے کیوں لوگ ایسی پرفضا جگہوں کو چھوڑ کر شہروں کا رُخ کرتے ہیں اور باقی زندگی کھانس کھانس کر گزار دیتے ہیں۔“

میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور پوچھا۔ ”کیا ہم دوآبے میں کھڑے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”ہاں! ہم ملتان کے شمال میں کھڑے ہیں۔ کچھ ہی دوری پر میاں دلبر حسین کا فارم ہاؤس واقع ہے جہاں ہمیں پہنچنا ہے۔“ اس نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور کہا۔ ”اس سیدھ میں جائیں تو محمد والا ہیڈ کے مقام پر رابطہ نہر پر پہنچ جائیں گے۔ اس کی داہنی پٹڑی پر پختہ سڑک بنی ہوئی ہے جو دس بیس کلومیٹر دور واقع پشاور کراچی روڈ پر جا چڑھتی ہے۔“ وہ اس علاقے کے بارے مجھے معلومات بہم پہنچا رہا تھا۔ ”یہ تمام علاقہ پہلے ریگستانی تھا۔ اس نہر کے آنے پر اطراف کا میلوں رقبہ سیم ہوگیا۔“

میں نے پوچھا۔ ”میاں دلبر حسین کا یہاں کتنا رقبہ ہے؟“

”ایگزیکٹ فگرز تو میرے پاس نہیں ہیں البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی بہت بڑی جاگیر یہاں واقع ہے۔ شکار

کے لیے ادھر آیا کرتا ہے، کبھی کبھار۔ جاگیر کے تمام معاملات رنجو قسائی سنبھالتا ہے۔ وہ اس کا خاص کارندہ ہے۔ ایک نمبر کا بدمعاش اور ڈھیٹ انسان ہے۔ سنا ہے کہ اس نے اپر پنجاب میں وارداتوں سے اَت مچا رکھا تھا۔ پولیس کو مطلوب تھا۔ گھیرا تنگ ہوا تو میاں دلبر حسین نے اسے ادھر نکال دیا۔“

میں نے خاموش اور خنک ماحول میں سرسراتی ہوئی دریائی ہوا کے تھپیڑوں کو اپنے رگ و پے میں اُترتے ہوئے محسوس کیا۔ ایڑیوں پر گھوم کر چہار جانب نظر دوڑائی۔ اردگرد کہیں بھی آبادی کے آثار دکھائی نہیں دیے اور نہ ہی ریت پر چاندنی کے سوا کہیں روشنی کا احساس پایا۔ سخی محمد سے استفسار کیا۔ ”یہاں، قریب میں کوئی گاؤں نہیں ہے؟“

وہ بولا۔ ”ایک نہیں کئی دیہات ہیں، مگر خاصے فاصلے پر واقع ہیں۔ اس علاقے پر چھوٹی سطح کے جرائم پیشہ لوگوں کی ان گنت پناہ گاہیں ہیں، جن کے ڈر سے عام لوگ دن میں بھی کم ہی اس طرف نکلتے ہیں۔“ سنجیدگی اُس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، بولتے بولتے ایک ذرا ٹھہرا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”ماسٹر! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”نور پور سے آیا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

میں نے اُسے نور پور کے محلِ وقوع کے بارے میں بتایا۔ وہ بولا۔ ”میرا گاؤں بورے والا میں ہے، دریائے ستلج کے کنارے پر...... سالدیرا ہیٹھ، ہیٹھ کا مطلب ہے نیچے والا۔ کچھ فاصلے پر سالدیرا اُتر بھی واقع ہے، یعنی اوپر والا...... میرے باپ دادا ستلج کو دریا کا نام دیتے تھے۔ ہم نے ستلج کو دیکھا مگر دریا کو نہیں دیکھا۔ اس کی جگہ پر بس ویرانہ دیکھ رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ دریا روکے سے نہیں رکتا، مگر سرحد پار والوں نے اُسے روک کر بتا دیا کہ انسان دریاؤں کا رُخ موڑ سکتا ہے۔ اب یہ دریا بھی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ کل کلاں تمہارا دریا، دریائے سندھ بھی اپنا پانی لے جائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ کیا یہ ساری زمینیں بنجر نہیں ہو جائیں گی؟“

وہ اپنی گفتگو سے خاصا پڑھا لکھا دکھائی دیا، میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم پڑھے لکھے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں گریجویٹ ہوں۔ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے آیا تھا۔ ماں باپ مجھے بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے، میں بڑا آدمی تو نہیں بنا، بڑا شیطان بن گیا۔“ اس کے لہجے میں عجیب نوع کی نفرت گھل گئی۔ ”مگر مجھے کسی سے، حتیٰ کہ اپنے حالات سے بھی گلہ نہیں کیونکہ میں نے اس راہ کا انتخاب خود کیا ہے۔“

میرا جی چاہا کہ میں ریت کے ٹیلے پر چڑھ کر کچھ دیر بیٹھوں تو میں نے اُسے وہیں چھوڑا اور سرکنڈوں کے بیچ سے گزر کر ٹیلے پر آگیا۔ یہاں ہوا کی رفتار تیز تھی۔ کپڑے پھڑ پھڑانے لگے۔ خیال آیا کہ اس مشن پر مجھے خصوصی لباس پہننے کو نہیں دیا گیا تھا۔ عام لباس میں، میں خود کو کافی سہل پا رہا تھا۔ بار بار عجیب سی ذہنی بے کلی میرا خیال میڈم کی طرف مبذول کر دیتی تھی کہ اُس شاطر عورت نے میرے لیے کتنا احمقانہ مشن ترتیب دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ میاں دلبر حسین کے ساتھ اُس کی ڈیل ہوئی تھی، مجھے میاں دلبر حسین پر اعتماد نہیں تھا۔ ہولناک خدشہ میرا دل دہلا رہا تھا کہ اسما کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد میں اور سخی محمد چوہوں کی طرح گھیر لیے جائیں گے۔ ہم نہ صرف میڈم کی خطیر رقم بلکہ زندگی بھی گنوا بیٹھیں گے۔ میں نے غیر اختیاری طور پر جیب میں ہاتھ ڈالا اور چاہا کہ موبائل فون پر میرو شاہ سے رابطہ کر کے اپنے خدشے کا ایک مرتبہ پھر اظہار کر دوں مگر مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ میں اپنا موبائل ریسٹ ہاؤس میں رکھ آیا تھا۔ سخی محمد کا فون بھی میرو شاہ نے کمرے میں رکھوا دیا تھا۔

میں کافی دیر، کم و بیش نصف گھنٹا تک ٹیلے پر ٹانگیں پسارے بیٹھا رہا اور اپنے دفاع کی حکمتِ عملی تیار کرتا رہا پھر سر جھٹک کر ہائی لکس کے پاس آگیا۔ سخی محمد سگریٹ سے دل بہلانے میں مشغول تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”چلیں؟“

”ابھی؟“

”ہاں!“

”کیا دو بج گئے ہیں؟“ مجھے حیرت ہوئی۔

”نہیں...... ہم ڈیڑھ بجے ٹارگٹ پر پہنچیں گے۔“

وہ بولا۔ ”اب ہمیں اسلحہ نکال لینا چاہیے۔ کسی بھی وقت ضرورت پیش آسکتی ہے۔“

میں نے کندھے اُچکائے، میگزینیں اور گنیں نکالیں اور سرسری انداز میں ان کا جائزہ لیا۔ پھر ایک اپنے پاس رکھ لی جبکہ دوسری گن سخی محمد کو تھما دی۔ دو لوڈڈ میگزینز بھی تھما دیں اور ہائی لکس میں بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ کو زمین پر پھینک کر، پاؤں سے مسل کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

سفر ایک مرتبہ پھر شروع ہوگیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اَب بے حد چوکنا ہوگیا تھا۔ میرے اپنے اعصاب بھی خودکار انداز میں تن گئے تھے اور میں اپنے آپ کو نامساعد

واقعات کے لیے پیشگی تیار کرنے لگا تھا۔

اس نے عقابی نظروں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہ ظاہر تو سارا علاقہ خالی ہے۔ کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا مگر مجھے توقع ہے کہ واپسی پر یہاں بہت بڑا دنگل ہوگا۔“

”کیا ہم واپسی پر کوئی اور راستہ نہیں لے سکتے؟“

وہ چونکا۔ ”ایک نہیں دو ایسے راستے ہیں جن پر گاڑی ڈالی جاسکتی ہے۔ مغربی سمت والا راستہ ہمیں لنگر سرائے پہنچائے گا۔ راستہ بہتر حالت میں ہے۔ جنوبی سمت نکلیں تو کھنگن اور مراد آباد سے ہوتے ہوئے جھنگ روڈ پر چڑھ سکتے ہیں۔ وہاں سے مظفر گڑھ بہ مشکل نصف گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ راستہ طویل اور دشوار ہے۔“

”محفوظ راستہ کون سا ہے؟“

”ہونہہ...... محفوظ راستہ!“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ”آج کی رات ہمارے لیے کوئی راستہ بھی محفوظ نہیں ہوگا۔“

میں نے اس کا جملہ لوٹایا۔ ”کیا ڈر رہے ہو؟“

اس کی زہریلی آواز گاڑی میں گونجی۔ ”ڈر؟ نہیں تو...... موت کا کھیل ہے، جو جیتا، سانسیں اُسی کی اور جس کی رات آج قبر کے اندر لکھی گئی ہے، وہ باہر نہیں گزار سکتا۔“

پونے دو کا عمل تھا جب اُس نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس اور سیلنگ لائٹ آف کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں خبردار کیا۔ ”ماسٹر! اسلحہ سنبھال لو، ہم چند منٹوں بعد میاں دلبر کے ڈیرے پر ہوں گے۔“

میں نے سیٹ پر رکھی ہوئی گن تھامی، پیروں تلے پڑی ہوئی اسما کا سرسری جائزہ لیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ناہموار راستہ دکھائی دے رہا تھا جس کے اطراف میں سرکنڈوں کی قدِ آدم دیواریں ایستادہ تھیں۔ نصف میل کے بعد سخی محمد نے دائیں ہاتھ ٹرن لیا تو میرے اعصاب ایک دم تن گئے۔ لگ بھگ سو گز کے فاصلے پر، عین نظروں کے سامنے، دیہاتی طرز کا ایک ڈیرا دکھائی دیا۔ شاید یہاں بجلی کی سہولت میسر نہیں تھی۔ اس لیے کوئی بلب دکھائی نہیں دیا۔

گوبر کے دو بڑے ڈھیروں کے درمیان سے گزر کر ہم ڈیرے کی حدود میں پہنچ کر رُک گئے۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر ایک پرانے ماڈل کا فورڈ ٹریکٹر کھڑا تھا جس کے عقب میں ٹرالی نتھی تھی۔ بائیں ہاتھ کھیت میں بھوسے کے دو گول ٹیلے تھے جن کا چاندی کی جانب والا پہلو روشن تھا۔

سخی محمد نے اطراف کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند منٹوں کے بعد ڈیرے کے ... سے چوبی پھاٹک میں سفید کپڑوں والا ایک غیر معمولی ... قد کا شخص دکھائی دیا۔ وہ بجائے قریب آنے کے، وہیں ... گیا اور بلند آواز میں بولا۔ ”کون ہو؟“

سخی محمد نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا۔ میں اُس ... مقصد بھانپ گیا اور شیشہ اُتار کر بولا۔ ”رنگو قسائی سے ... آیا ہوں۔“

”میں رنگو قسائی ہوں۔ تم کون ہو؟“ اس کی آواز خاصی بھاری اور دہشت انگیز تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اس آواز کو پہلے کہیں سن رکھا تھا۔ میں نے یادداشت پر زور دیا مگر یاد نہ آیا کہ کہاں سنا تھا۔

”مجھے میڈم نے بھیجا ہے۔ میرا مال مجھے دو اور اپنا وصول کرو۔“ میں نے بھی اپنی آواز میں درشتی اور استحکام شامل کرلیا۔

”ملتان سے آئے ہو؟“

”ہاں......“

وہ بولا۔ ”میرا مال کہاں ہے؟“

”تم بتاؤ، میرا مال کہاں ہے؟“

وہ پلٹا اور پھاٹک میں گھس کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی شکل دکھائی دی۔ سخی محمد نے ہیڈ لائٹس روشن کردیں۔ رنگو قسائی روشنی میں نہا گیا اور اس نے فوراً اپنا ایک ہاتھ آنکھوں پر چھجا بنا کر رکھ لیا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گہرے رنگ کا بریف کیس نظر آ گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”رقم پوری ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہاں...... تسلی کرسکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے...... میرا ساتھی تمہاری طرف آرہا ہے، اسے دے دو۔ میں چیک کرلیتا ہوں۔ پھر تمہارا مال نیچے اُتار دوں گا۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ”کوئی چالاکی کرو گے تو یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاسکو گے۔ یہ ذہن میں رکھ کر اپنے آدمی کو میری طرف بھیج دو۔“

اس کا دعویٰ بجا تھا۔ وہ جس اعتماد سے ہمارے مقابل تنہا کھڑا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ہمارے استقبال اور درپیش آنے والی کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے کا اپنی دانست میں معقول بندوبست کر رکھا تھا۔

سخی محمد میرا اشارہ پا کر گاڑی سے اُترا اور ایک ہاتھ میں گن جبکہ دوسرے میں پستول تھامے رنگو قسائی کی طرف بڑھا۔ اس کی چال میں چیتے کی سی مستعدی اور لپک تھی۔

... آنکھیں گرد و پیش کا تواتر سے جائزہ لے رہی تھیں اور ... گن کے ٹرائیگر پر لرز رہی تھی۔ سخی محمد، رنگو قسائی سے چند ... کے فاصلے پر رُک گیا۔ رنگو نے بریف کیس اچھال ... جو اس کے پیروں کے قریب زمین پر 'دھپ' کی آواز کے ساتھ گرا۔ سخی محمد نے بریف کیس اُٹھا لیا اور تیز تیز ... سے چلتا ہوا ہائی لکس میں آ گیا۔ اس نے سیلنگ ... آن کی اور بریف کیس جھولی میں رکھ کر کھول دیا۔ وہ ... وار رکھی گئی بڑے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے دو تین جگہوں سے نچلی گڈیاں نکالیں، ٹارچ کی مدد سے نوٹ چیک کیے، پھر گڈیوں کا عدد شمار کیا...... بڑبڑا کر حساب کیا۔ ”پنج پانجے پنجی...... تے پنجی آٹھے دو سو...... لاکھ یعنی دو کروڑ......“

سچ کہتے ہیں کہ انسان کسی کو گالی دیتے ہوئے اور گنتی کرتے ہوئے لاشعوری طور پر مادری زبان میں بولتا ہے۔ اس نے بھی گنتی پنجابی زبان میں کی تھی پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”ماسٹر! نوٹ اصلی ہیں، رقم بھی پوری ہے...... اب کیا حکم ہے؟“

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پیا جی نے کہا تھا کہ فیصلہ کرنے میں تاخیر موت کا سبب بنتی ہے۔ میں دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً طے کرلیا کہ اسما کو یہاں اُتارنا خود کو رنگو قسائی کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے مترادف ہوگا۔

میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”اپنا ایک آدمی بھیج دو، ہم اُسے کچھ دور تک اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ جہاں خود کو محفوظ سمجھیں گے، اُسے مال سمیت اُتار دیں گے۔“

ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی اور مدھم چاندنی کے باوجود اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے اس کا ردِ عمل بھی دکھائی نہیں دیا مگر اس کی آواز نے اُس کی گھبراہٹ کو مجھ پر آشکار کردیا۔ ”کیا مطلب؟ ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ ہم یہیں مال کا تبادلہ کریں گے۔“

”اپنی حفاظت کے خیال سے ہم نے طے شدہ پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے۔ اگر تمہیں قبول نہیں ہے تو تمہارا مال نیچے پھینک کر ہم واپس چلے جاتے ہیں۔“ میں نے دھمکی دی۔ ”جلدی فیصلہ کرو، ہمارے ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“

اپنی پوزیشن کو مستحکم ظاہر کرنے کے لیے میں نے اس پر ایک اور پہلو سے وار کیا تھا۔

وہ بولا۔ ”میرے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں جسے تمہارے ساتھ بھیج سکوں۔ مال یہیں اُتار دو۔“

میں نے کہا۔ ”یہ نہیں ہوسکتا...... جیسا کہا جا رہا ہے، ویسا کرو ورنہ میں سودا منسوخ کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ مجھ پر حملہ کرو گے تو خان زادی کو گولیوں سے چھلنی کردوں گا۔“

اس نے رُخ پھیر لیا۔ اندازہ ہوا کہ پھاٹک کے اندر کوئی موجود تھا جس سے وہ دھیمے لہجے میں مشاورت کرنے لگا تھا۔ چند لمحوں بعد پھاٹک میں دکھائی دینے والے ایک عام جسامت والے شخص نے میرے اندازے کی تائید کردی۔

وہ وہیں تھم گیا جبکہ رنگو قسائی نپے تلے انداز میں چلتا ہوا، ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی سے بچ کر چلتا ہوا ہماری جانب آیا۔ نزدیک آیا تو پتا چلا کہ اس نے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا پستول اور ٹارچ تھام رکھی تھی۔

سخی محمد کے پاس رُک کر بولا۔ ”تم نے مال چیک کر لیا، اب میں اپنا مال چیک کروں گا۔“

میں نے اُس کی زود فہم سرشت کو دل ہی دل میں سراہا۔ اگر میں اُس پر اعتماد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا تو اُسے بھی حق تھا کہ وہ اپنا مطلوبہ مال جانچنے یعنی اسما کو دیکھنے کے لیے چلا آتا۔ سخی محمد نے میری طرف دیکھا۔ اجازت پا کر اُس نے گاڑی کی اندر والی بتی روشن کی اور رنگو کو مخاطب کر کے کہا۔ ”پچھلا دروازہ کھول کر دیکھ لو۔“

میں نے اسما کے پیٹ پر گن کی نال اور ٹرائیگر پر انگلی رکھ دی۔ رنگو قسائی نے دروازہ کھولا اور جھک کر اندر دیکھنے لگا۔ میری نگاہ اُس پر پڑی۔ ایسے میں میرے وجود کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اچانک جیسے میری آنکھوں کے سامنے پانچ سو واٹ کا بلب روشن ہو گیا تھا۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے رنگو قسائی کو دیکھے جا رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے بدن کی تمام تر توانائی جیسے آنکھوں میں مجتمع ہو گئی تھی۔

برس ہا برس سے آنکھوں کے پردوں پر ٹھہرے ہوئے اس انسانی چہرے نے مجھے کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہا تھا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے لانبے قد والے رنگو قسائی کا جھکا ہوا، مگر سخی محمد کی طرف تھوڑا سا اُٹھا ہوا بڑی مونچھوں والا خونخوار چہرہ، غیر معمولی حد تک پھیلی ہوئی دہشت ناک آنکھیں اور چہرے کے تاریک پسِ منظر میں خون کی سرخ آمیزش...... اِسے تو میں گزشتہ دس بارہ سالوں سے بلاناغہ دیکھتا چلا آیا تھا۔ میں نے پوری سختی سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ دانتوں کی کڑکڑاہٹ ذہن کے پردوں پر دھمکنے لگی۔ یاد آیا کہ اس کی کھردری اور پاٹ دار آواز میرے لیے ناشناسا کیوں نہیں تھی۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے بھڑولے کے اندر کھڑے

ہو کر انگوٹھے بھر کے سوراخ میں سے دیکھا تھا، جب وہ چارپائی پر جھولتے ہوئے میرے زخمی باپ، سوہنے خان پر جھک کر غرا رہا تھا۔

قسمت نے میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کر دی تھی۔ وہ میری زیر و زبر ہوتی ہوئی دنیا سے بے خبر ٹارچ کی تیز روشنی اسما کے چہرے پر ڈال رہا تھا اور مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ”یہ زندہ تو ہے ناں؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو سخی محمد بولا۔ ”زندہ ہے مگر بے ہوش پڑی ہے۔ اچھی طرح دیکھ بھال لو۔“

سخی محمد کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ رنگو نے اپنی سینے والی جیب سے ایک تصویر نکالی، ٹارچ کی روشنی اُس پر ڈالی، پھر ایک نظر اسما کو دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔ ”مال تو ایک نمبر ہے مگر......“

اُس سے مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ میں کہاں سے چلا تھا، یہاں کیوں آیا تھا، کیا ارادہ رکھتا تھا اور میری ترجیحات کیا تھیں۔ یکبارگی میرا جی چاہا کہ میں اُس کا گریبان پکڑ لوں اور چیخ چیخ کر پوری دُنیا کو بتا دوں کہ یہی ظالم شخص میرے ماں باپ کا قاتل ہے...... اُسے مار مار کر لہولہان کر دوں اور اپنا بدلہ چکا کر حساب بے باق کر دوں۔ میرے اعصاب میں برق سی کوندی مگر اچانک ہی میں نے خود کو سنبھال لیا اور گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لینے لگا مبادا کہ میں غلطی کر بیٹھوں مگر میں نے اُسے پہچاننے میں یقیناً کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

اس دوران اس نے قدرے جھک کر اسما کا ایک بازو نکال لیا تھا اور کلائی تھام کر نبض محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُسے میں نے زندگی میں دوسری مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے میں کچھ تبدیلیاں رُونما ہو چکی تھیں۔ رنگ نکھر گیا تھا مگر بڑی بڑی مونچھیں، آنکھوں کی سرخی اور ناک پر تل کی موجودگی اُس کی شناخت کا مضبوط جواز تھے۔ اُس نے بہ اہتمام ہیئر ڈائی کر رکھا تھا جس کی وجہ سے شیو زدہ گالوں پر سفید ذرات کے علاوہ کہیں سے بھی بالوں کی سپیدی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ خود کو یقین دلایا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے مگر قسمت مہربان ہو کر انسان کو کسی نہ کسی موڑ پر اپنے مقصود سے ملا دیتی ہے۔ وہ سخی محمد سے محوِ کلام تھا۔ شاید یہیں پر ہی اپنا مال وصول کرنے کی ضد کر رہا تھا مگر سخی محمد نے اس کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔ وہ مال کی تسلی و تشفی کر کے لوٹ گیا اور جاتے ہی اس نے اپنے ساتھی کو ہماری جانب بھیج دیا۔

اس کا ساتھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہماری طرف آیا۔ قریب آنے پر اُس کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ بڑی مونچھوں والا نہایت سیاہ فام شخص تھا۔ اس کے دانت خاصے بڑے اور باہر کو نکلے ہوئے تھے جو ہیڈ لائٹس کی روشنی میں بڑے عجیب اور خوف ناک لگ رہے تھے۔ میری ٹھہری ہوئی پتلیاں حرکت میں آ گئیں۔ خود کو سنبھالنے میں، میں نے چند لمحے صرف کیے اور اپنی لرزتی ہوئی گن کا رُخ پھر اسما کی طرف کر دیا۔ سخت لہجے میں کہا۔ ”فرنٹ سیٹ پر آ جاؤ......“

وہ آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنائے قریب آیا اور فرنٹ گیٹ کھول کر بیٹھ گیا۔ سخی محمد کے پستول کا رُخ اس کی طرف تھا۔ وہ مقامی زبان میں درشت لہجے میں بولا۔ ”کھلونا ہٹاؤ، میری زندگی انہی سے کھیلنے میں گزری ہے۔“

وہ نہتا تھا۔ اگر اس کے پاس کچھ تھا بھی تو لباس میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں زیادہ دور نہیں لے جاؤں گا۔ اگر کوئی چالاکی دکھاؤ گے تو پھر رعایت نہیں کروں گا۔“

اس نے سیٹوں کے درمیان سے مجھے دیکھا، پھر گن کے رُخ کو بھانپ کر فرش پر لیٹی ہوئی اسما کو دیکھا اور بولا۔ ”تم اتنا ڈر کیوں رہے ہو؟ میاں صاحب اور تمہاری میڈم کے درمیان ہونے والی ڈیلنگ کے بعد مال کا عام سا تبادلہ ہو رہا ہے۔ تم ایسے ظاہر کر رہے ہو جیسے تم کسی بہت بڑی واردات پر نکلے ہو۔“

میں نے غرا کر کہا۔ ”بکو مت...... خاموشی سے بیٹھے رہو۔“

اس نے ہنکارا بھرا اور گردن موڑ کر سامنے دیکھنے لگا۔ سخی محمد نے گاڑی ریورس کی، موزوں جگہ دیکھ کر ٹرن لیا اور ایکسی لریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ میں نے بے ساختہ ڈیرے کے پھاٹک کو دیکھا۔ میری توقع کے برعکس رنگو قسائی وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے حلق سے ایک طویل سانس نکلی اور میں اپنے دل کی غیر معتدل دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

سخی محمد نے ڈیرے کی حدود سے نکلتے ہی بجائے بائیں ہاتھ مڑنے کے، دائیں ہاتھ گاڑی ڈال دی۔

سیاہ فام شخص نے بے ساختہ چلا کر کہا۔ ”یہ تم کہاں جا رہے ہو؟ ملتان تو اُس طرف ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ خاموش بیٹھے رہو۔“

وہ گردن موڑ کر غرایا۔ ”تم جہنم میں جاؤ مگر مجھے اور خان زادی کو یہیں اُتار دو۔ میں کہہ رہا......“

میں نے ڈانٹا۔ ”خاموش......ورنہ......“

وہ دانت پیس کر خاموش ہو گیا۔ اس کی گھبراہٹ نے میرے اندیشوں کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ پہلو بدل بدل کر مجھے، سخی محمد کو اور اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ سخی محمد نے گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھائی تو ہچکولوں اور جھٹکوں نے چند ہی لمحوں میں ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ ہم نے بہ مشکل ایک کلومیٹر یا اس سے بھی کم فاصلہ طے کیا تھا کہ ناپختہ راستہ مسدود ہو گیا۔ سخی محمد اگر اچانک بریک نہ لگا لیتا تو ہائی لکس کے ٹائر دو فٹ چوڑے اور چھ سات فٹ لمبے گڑھے میں جا گرتے جو سڑک میں بنایا گیا تھا۔ اس نے گاڑی روکنے سے قبل بجلی کی سی تیزی سے اپنا پستول سیاہ فام کی پسلیوں سے لگا دیا تھا۔ سنگین لہجے میں بولا۔ ”یہ کیا ڈراما ہے؟“

اس نے کندھے اُچکائے اور مصنوعی بے نیازی سے بولا۔ ”تمہیں دکھائی دے تو رہا ہے کہ یہ گڑھا ہے۔“

میں نے ڈانٹا۔ ”بکواس نہ کرو، یہ بتاؤ کہ یہ گڑھا کس نے کھود رکھا ہے؟“

”میں نے نہیں کھودا۔“ وہ بہ دستور بے خوف بیٹھا تھا۔

میرا یکبارگی جی چاہا کہ اس کی بتیسی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دوں مگر حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے غصے پر بہ وقت تمام قابو پایا اور تیز نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سرکنڈوں کی دیوار کے پار اگر کوئی موجود تھا تو وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سخی محمد نے ریورس گیئر لگا کر ہائی لکس کو پیچھے لے جانا چاہا تو میں نے روک دیا۔ ”نہیں سخی محمد! ہم آگے جائیں گے۔“

اس نے اپنا ارادہ موقوف کر دیا اور عقب نما میں سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اعصاب شکن انتظار کا مرحلہ درپیش تھا۔ کوئی سامنے نہیں آ رہا تھا اور ہم میں سے بھی کوئی نیچے اُترنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے سیاہ فام کو مخاطب کیا۔ ”نیچے اُتر کر دیکھو کہ ہمارا راستہ کن لوگوں نے روکا ہے؟“

وہ ہچکچایا۔ ”یہ میرا مسئلہ نہیں، تمہارا ہے۔ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ معاہدے کے مطابق لڑکی میرے حوالے کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔“

”تم لوگوں نے مال کی وصولی کے بعد ہماری آؤ بھگت کا کیا انتظام کر رکھا ہے۔ جلدی بتاؤ ورنہ تم دونوں کو گولی مار کر ٹھنڈا اشار کر دوں گا، سمجھے؟“ میرے لہجے میں موت کی سنگینی شامل ہو گئی۔

مجھے خان زادی کی زندگی کی قیمت کا علم تھا۔ وہ دو کروڑ روپے کے عوض حاصل کی گئی تھی۔ میاں دلبر حسین، جس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ سردار حیدر خان کے ایما پر یہ سودا کر رہا تھا، وہ کبھی بھی اس کی موت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے حکم کے غلام لوگ تھے، اس کے اشاروں پر ناچنے والے موت کے ہرکارے تھے، کبھی بھی اُس کے مفاد کے خلاف کام نہیں کر سکتے تھے۔

”میرا نام ظہور ہے۔ قانون مجھے جورا لادی کے نام سے یاد کر کے کانپ اٹھتا ہے۔“ وہ جواباً اپنی چھاتی تھپتھپاتے ہوئے دبنگ انداز میں بولا۔ ”میں نے کچھ کیا ہے اور نہ میں کچھ جانتا ہوں۔ تمہیں رقم مل گئی ہے۔ اب خان زادی میرے حوالے کرو اور چلتے بنو۔ یہ علاقہ ہمارا ہے۔ یہاں چڑیا بھی استاد رنگو کی اجازت کے بغیر پر نہیں مارتی مگر ہمیں تم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ ہم تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتے کیونکہ ہمارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے۔ ہاں! زیادہ طرم خان بنو گے تو......“

وہ رنگو قسائی کا خاص کارندہ تھا۔ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر یا موت کا ڈراوا دے کر کام نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ میں نے اس پر ایک غصیلی نگاہ ڈالی اور اپنی توجہ ہائی لکس کے باہر ہوا میں لہلہاتے ہوئے گھنے سرکنڈوں پر مرکوز کر دی۔ کوئی موہوم سی نقل و حرکت بھی محسوس نہیں ہوئی تو میں نے سخی محمد سے کہا۔ ”گاڑی ریورس کرو۔ کھیل شروع ہو چکا ہے۔ جو بھی سامنے آئے، اُسے موقع دیے بغیر گولی مار دینا۔ یہ لادی ہمارے ساتھ ملتان تک جائے گا۔“

میرا لہجہ بے حد سرد تھا۔ پہلا موقع تھا جب سیاہ فام کی بے چینی عیاں ہوئی، بولا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”دیکھ بے لونڈے! کیا نام تم نے بتایا تھا، ہاں! ظہور لادی...... ہمارے دھندے میں معاہدے میں خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔ میں گاڑی میں لڑکی لاد کر ملتان سے یہاں تک آ گیا ہوں تو تمہیں میری طاقت کا اندازہ بھی ہو جانا چاہیے۔ ایک فائر کی آواز پر تمہارا علاقہ میرے آدمیوں کو یوں اگلنا شروع کر دے گا جیسے بارش کے بعد یہاں کھمبیاں اگنے لگتی ہیں۔ خان زادی اور بریف کیس کو تم لوگ بھول جاؤ گے، تمہیں جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ سخی محمد! پستول ہٹا لو، میں نے ظہور لادی کو کور کر رکھا ہے۔ تم اپنی توجہ ڈرائیونگ اور راستہ روکنے والوں پر مرکوز رکھو۔“

ظہور لادی جلدی سے بولا۔ ”گاڑی روکو، میں نیچے اُتر کر دیکھتا ہوں۔“

وہ مفاہمت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ سخی محمد نے گاڑی روک دی۔ وہ نیچے اُتر کر گڑھے کی جانب تیز قدموں سے بڑھ گیا۔

سخی محمد بولا۔ ”ماسٹر! تم بڑے کام کے آدمی ہو۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ظہور لادی گڑھے کے پاس پہنچ کر مغرب کی سمت منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ نہایت دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ گڑھا اور گڑھے سے نکالی جانے والی مٹی کے ڈھیر نے راستہ اس طرح مسدود کر دیا تھا کہ گاڑی گزرنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ سخی محمد نے تشویش آمیز انداز میں کہا۔ ”ماسٹر! یہ آخری جنگل نہیں بلکہ اسے پہلا خونی پھاٹک سمجھو۔ یہ سوچو کہ ہم ظہور لادی کو کہاں تک اپنے ساتھ لے جائیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میرا ارادہ تھا کہ میں لنگر سرائے سے براستہ خان پور، مظفر گڑھ نکل جاؤں گا۔ اب سوچ رہا ہوں خان پور تک کا راستہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اس لیے ہمیں ایک لمبا چکر کاٹنا ہو گا۔ لنگر سرائے سے عین مغرب کی سمت نکلنے والا لنک روڈ سلطان کالونی کی طرف جاتا ہے جو بڑی سڑک پر چڑھ جاتا ہے۔ یہ سفر لمبا تو ہے مگر نسبتاً محفوظ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”لنگر سرائے یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”یہی کوئی آٹھ دس کلومیٹر......“

ایسے ہی وقت میں دو آدمی سرکنڈوں سے نکل کر ظہور لادی کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ ان کے کندھوں سے دیسی ساخت کی رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ تینوں کچھ دیر تک محوِ گفتگو رہے۔ ایک شخص سرکنڈوں میں گھسا اور چند لمحوں بعد دو عدد مقامی طرز کے بیلچے تھامے برآمد ہوا۔ یہ خاص قسم کا اوزار دیہاتوں میں بکثرت ملتا تھا۔ اس کا پھل کسی سے قدرے چھوٹا جبکہ دستہ خاصا لمبا ہوتا ہے۔ اسے مقامی زبان میں ’وہولا‘ کہا جاتا ہے۔ دونوں اشخاص وہولوں کی مدد سے گڑھا بھرنے لگے جبکہ ظہور لادی ہائی لکس میں آ بیٹھا اور از خود بولا۔ ”یہاں پلی نہیں ہے، اس لیے فصلوں کا پانی گزارنے کے لیے راستہ کاٹنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ پانی لگا رہے تھے۔“

وہ جھوٹ بول رہا تھا مگر میں نے بہ ظاہر اُس کی بات پر یقین کر لیا۔ پانچ سات منٹوں میں ہائی لکس کے گزرنے کی جگہ بن گئی اور دونوں وہولا بردار بائیں ہاتھ سرکنڈوں میں گھس کر غائب ہو گئے۔ ظہور لادی نے گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔

گڑھا عبور کرتے ہوئے میں نے شیشے کے پار سرکنڈوں میں دونوں چھپے ہوئے افراد کو دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ظہور لادی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”او بھئی مجھے تو اُتار دو۔ مجھے پیدل واپس جانا ہے۔“

سخی محمد نے کہا۔ ”تمہارے پاس موبائل فون ہے؟“

”ہے تو سہی مگر یہاں سگنلز نہیں ہیں۔“ اس کا لہجہ سچ کا غماز تھا۔

سخی محمد نے کندھے اُچکائے۔ ”ہم تمہیں لنگر سرائے کے قرب و جوار میں اُتار دیں گے۔ واپسی کا کوئی بندوبست کر لینا۔“

وہ غصے سے پھٹ پڑا اور گالی دے کر بولا۔ ”تمہاری ایسی کی تیسی ...... تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا کہیں...... میں اتنی سردی میں آٹھ میل پیدل چلوں گا؟ وہ بھی اس مردے کو اُٹھا کر......“ اس نے ہاتھ کا اشارہ اسما کی طرف کیا۔ ”گاڑی روکو ورنہ......“

سخی محمد نے جھڑکا۔ ”کیا ورنہ؟ زیادہ بک بک کرو گے تو گولی مار کر یہیں پھینک دوں گا۔“

میں ظہور عرف جورے لادی کے مزاج کو سمجھ رہا تھا۔ وہ مار دھاڑ والا بندہ تھا۔ اسما کی وجہ سے اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے ورنہ وہ نچلے نہ بیٹھتا اور ہم پر ہاتھ ڈال دیتا۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”دیکھو یار! تم میری پریشانی کو سمجھ نہیں رہے ہو۔ میں اتنا لمبا سفر پیدل کس طرح کر سکوں گا۔ پولیس گشت پر نکلی ہو گی۔ میں پولیس والوں کی نظر میں آ گیا تو مارا جاؤں گا۔ نہیں...... مجھے یہیں اُتار دو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ہم لوگ تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔“

سخی محمد نے اچانک گاڑی روک دی۔ جلدی سے دروازہ کھول کر اُتر گیا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ماسٹر! ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔“

میں اور جورا لادی یکبارگی چونکے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟ پیچھے کوئی گاڑی آ رہی ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہاں...... مگر نظر نہیں آ رہی۔ ہیڈ لائٹس آف ہیں۔ محض آواز سنائی دے رہی ہے۔“

جورا لادی جھٹ سے بولا۔ ”کسی ٹریکٹر کی آواز ہو گی۔“

سخی محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں...... ٹریکٹر اور کار یا جیپ کی آوازوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔“

میرے اندیشے اپنی حتمی شکل اختیار کرنے لگے تھے۔ میں نے طنزیہ لہجے میں جورے کو مخاطب کیا۔ ”اوئے

لادی! اب تم کیا کہتے ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ گہری نظروں سے بیک مرر کو گھورنے لگا جس میں سوائے اندھیرے کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عقب میں آتی ہوئی گاڑی نظر نہیں آئی مگر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں لنگر سرائے کی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ زگ زیگ کچے راستے کی غیر معمولی دشواری مسلسل سخی محمد کی ماہرانہ ڈرائیونگ سے ہزیمت بار ہو رہی تھی۔

ہم جونہی پکی سڑک پر چڑھے، سخی محمد نے گاڑی روک دی اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ماسٹر! ان دونوں کو یہیں اُتار پھینکو۔ ہم سیدھا مظفر گڑھ جائیں گے۔ پیچھے سے آنے والی گاڑی ہم تک نہیں پہنچ پائے گی۔ ہری اَپ پلیز!''

میں اس لمحے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے گیٹ کھولا اور برق رفتاری سے ہائی لکس سے چند قدم دور جا کھڑا ہوا۔ ظہور لادی کو اپنے نشانے کی زد پر رکھتے ہوئے نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ وہ اُترا تو میں نے اُسے سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹی ہوئی اسما کو اُٹھانے کا اشارہ کیا۔ اس نے اردگرد دیکھا اور بے حد برہمی سے کہا۔ ''خدا دی مار پوے تہاکوں...... پالے وچ مار گھتا ہوے میکوں......''

(تم لوگوں پر خدا کی مار ہو، تم نے مجھے سردی میں مار ڈالا ہے)

اس کے فطری ردِعمل پر میرے لبوں پر مسکراہٹ اُبھری جسے اندھیرے کے سبب وہ غالباً دیکھ نہیں پایا تھا۔ اس نے جھک کر خان زادی کو احتیاط سے باہر کھینچا، زمین پر لٹایا اور پھر بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اُٹھا لیا۔ وہ جرائم کے سفر کا پرانا مسافر تھا۔ اس نے اپنے طور پر اسما کو زمین پر لٹانے کے دوران یہ جائزہ لے لیا تھا کہ وہ زندہ تھی یا مردہ......

اچانک سخی محمد نے گاڑی چلا دی اور مجھے بھاگ کر سوار ہونا پڑا۔ میں نے جونہی دروازہ بند کیا، اس نے ایکسی لریٹر پر پاؤں کا دباؤ مزید بڑھا دیا جس کی وجہ سے چند ہی لمحوں میں طاقت ور انجن والی ہائی لکس ہوا سے باتیں کرنے لگی، وہ بولا۔ ''اگلی سیٹ پر آ جاؤ ماسٹر! موت کا کھیل شروع ہونے والا ہے۔''

اس کے لہجے سے ہویدا ہونے والی سنگینی نے میرے وجود میں بجلی بھر دی۔ میں فوراً اگلی سیٹ پر آ گیا۔ ایسے میں ہم لنگر سرائے کی خوابیدہ آبادی میں داخل ہوئے۔ سخی محمد نے بریک لگائے بغیر دائیں ہاتھ گاڑی موڑ دی۔ ٹائر چرچرائے مگر شکر ہوا کہ ہائی لکس اُلٹنے سے بچ گئی۔ میں نے کہا۔ ''ہم کس سمت جا رہے ہیں؟''

''ہم سلطان کالونی جا کر مین روڈ پر چڑھ جائیں گے۔ میں نے ڈاج دینے کے لیے ظہور لادی کو سیدھا مظفر گڑھ جانے کا کہا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''ہم کب تک ملتان پہنچیں گے؟''

اس نے ڈیش بورڈ کے کلاک میں وقت دیکھا۔ تین بجنے والے تھے۔ ''چار تو بج ہی جائیں گے۔''

اس دوران بار بار رنگو قسائی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے لہرا جاتا اور میں اپنا سر جھٹک کر بہ مشکل اس کے تصور سے چھٹکارا حاصل کرتا۔ اس وقت میرا خیالات میں کھو جانا ہم دونوں کی بھیانک موت کا سبب بن سکتا تھا۔ سخی محمد بار بار بیک مرر میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنا چاہا مگر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ہائی لکس کی عقبی کھلی باڈی بوروں سے بھری ہوئی تھی جن کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ بیک مرر میں بھی کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

سڑک کے دونوں اطراف میں تاحدِ نگاہ ریگستانی ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں درخت اور جنگلی جھاڑیاں دکھائی دے جاتی تھیں۔ سڑک شاید نئی بنائی گئی تھی اس لیے بہت اچھی حالت میں تھی۔ ہائی لکس کی رفتار ظاہر کرنے والے میٹر کی سوئی ایک سو دس اور بیس کے درمیان تھرک رہی تھی جبکہ رفتار بتدریج بڑھ رہی تھی۔

میں سخی محمد سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ اچانک فضا ایک خوفناک دھماکے سے گونج اُٹھی۔ ساتھ ہی ہائی لکس بری طرح لہرا گئی۔ سخی محمد نے اسے سنبھالنے میں کسی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کیا تھا مگر وہ آنکھ جھپکنے کی دیر میں پختہ سڑک سے اُتر کر ٹیلے پر چڑھ گئی۔ ٹیلہ زیادہ بلند نہیں تھا مگر عین وسط میں جا کر وہ کسی چٹان کی طرح فضا میں بلند ہو گیا تھا۔ ہائی لکس دھماکے کی خوف ناک آواز کے ساتھ اس ابھرے ہوئے حصے سے جا ٹکرائی۔ میرا سر ڈیش بورڈ پر لگا۔ چند لمحوں تک مجھے کچھ سجھائی نہیں دیا۔ خوف کی حادثاتی دھند چھٹی تو میں نے سخی محمد کو سر جھٹکتے اور دونوں ہاتھوں سے چھاتی کو دیوانہ وار مسلتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسٹیئرنگ ویل سے ٹکرایا تھا اور اُسے شدید چوٹ آئی تھی۔

ہائی لکس کا آدھے سے زیادہ بونٹ ریت میں دھنس چکا تھا۔ میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو پتا چلا کہ وہ ٹکراؤ کے نتیجے میں چوپٹ کھل چکا تھا۔ میری دائیں آنکھ پر بوجھ سا پڑا۔ میں نے غیر اختیاری طور پر پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ خون

بہنے کا انکشاف ہوا۔ ڈیش بورڈ سے ٹکرانے پر میری پیشانی کی جلد پھٹ گئی تھی۔ میں نیچے اُترا۔ پچھلے ٹائر پر نظر پڑی تو ہائی لکس کے لہرانے اور ٹیلے سے ٹکرانے کا سبب معلوم ہو گیا۔ ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ میں ٹائر پر جھکنے ہی لگا تھا کہ میرے کانوں میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز پڑی۔

ایسے ہی وقت میں سخی محمد کی تیز آواز سنائی دی۔ ''ماسٹر! ہوشیار...... ٹائر میں فائر لگا ہے۔''

میں نے فوری طور پر کندھے پر سے گن اُتاری، ماؤزر سنبھالا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے درست کہا تھا۔ مجھے پہلی نظر میں ہی گہرے رنگ کی ایک پک اَپ سڑک پر دکھائی دی۔ اس کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ میں زمین پر گرا اور کروٹیں لیتا ہوا اپنی ہائی لکس سے دور ہٹ گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں ننھے سے قدرتی گڑھے میں جا گرا تھا اور وقتی طور پر محفوظ ہو گیا تھا۔ ریت بہت ٹھنڈی تھی۔ بدن کے ننگے حصوں پر برف کی طرح یخ بستہ محسوس ہوئی مگر میں خود کو فوری طور پر حملہ آوروں کی نظر سے چھپانے کے لیے ریتلی زمین سے چپک گیا اور محتاط نظروں سے سڑک پر رُکنے والی پک اَپ کو دیکھنے لگا۔ سخی محمد چونکہ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا اس لیے اب اسے ہائی لکس کی اوٹ میسر تھی۔

پک اَپ کا اگلا دروازہ کھلا۔ ایک پستہ قامت شخص نیچے اُترا۔ اندھیرے کے سبب معلوم نہ ہو سکا کہ وہ نہتا تھا یا اسلحے سے لیس تھا۔ وہ ہائی لکس کی جانب بڑھنے کے بجائے وہیں رک کر دیکھنے لگا۔ میرے کانوں میں اس کی آواز پڑی۔ ''کوئی ہے؟ کیا ہوا گاڑی کو؟''

کوئی جواب نہ پا کر اُس نے اپنے ساتھی یا ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ''لگتا ہے ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔''

وہ شاید ہمیں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ ریت میں دھنسی ہوئی ہائی لکس کو دیکھ کر رُکے تھے۔ اگر ہم نامساعد حالات کی زد پر نہ ہوتے تو شاید اُس کے چکر میں آ جاتے۔ میں نے بہ احتیاط اُسے اور پک اَپ کو دیکھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ پھر پکارا۔ کوئی ردِعمل نہ پا کر اس کے دو ساتھی بھی گاڑی سے اُتر آئے۔ ہمارے درمیان محض دس پندرہ قدموں کا فاصلہ تھا مگر چاند کی ناکافی روشنی کے سبب وہ ہیولوں کی صورت دکھائی دیتے تھے۔ مجھے کوشش کے باوجود ان کے مسلح یا غیر مسلح ہونے کا پتا نہ چل سکا۔

ایک بیٹھی بیٹھی آواز سنائی دی۔ ''میرا خیال ہے کہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہاں! ورنہ کوئی سن رہا ہوتا تو جواب ضرور دیتا۔''

ایک آدمی وہیں ٹھہر گیا جبکہ دو افراد نے ہائی لکس کی طرف قدم بڑھائے۔ اس وقت وہ تینوں میرے نشانے کی زد پر تھے مگر جب تک ان کی حیثیت کا تعین نہ ہوتا، میں اُن پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ واقعتاً غیر متعلق لوگ ہوں اور کسی وجہ سے ہیڈ لائٹس بجھا کر گاڑی چلا رہے تھے۔ ممکن تھا کہ ان کی ہیڈ لائٹس خراب ہو گئی ہوں، وہ رنگو قسائی کے بھیجے ہوئے غنڈے نہ ہوں بلکہ محض جرائم پیشہ لوگ ہوں جو کسی واردات پر نکلے تھے۔ یہی سوچ کر میں نے ان پر فائر نہیں کیا۔

اپنی ہائی لکس کے سڑک پر لہرانے سے پیشتر میں نے دھماکے کی خوفناک آواز سنی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹائر پھٹنے کی آواز میں فائر کی آواز بھی شامل تھی یا نہیں۔ سخی محمد کو غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔

وہ دونوں برابر چلتے ہوئے ہائی لکس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میری جانب والے پستہ قامت شخص کے کاندھے پر رائفل لٹک رہی تھی جبکہ دوسرے نے ہاتھ میں پستول تھام رکھا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ ان میں سے کسی کی نگاہ کسی وقت مجھ پر یا سخی محمد پر پڑ سکتی تھی جو بہت خطرناک نتیجہ کشید کرتی۔ ان دونوں نے عقبی حصے میں جھانکا، پھر کھلے دروازے کی طرف بڑھے۔ ایک کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے...... لگتا ہے، گاڑی سے نکل کر چھپ گئے ہیں۔''

''تم بریف کیس اُٹھاؤ، میں انہیں دیکھتا ہوں۔''

دوسری آواز میرے کانوں میں پڑی تو رہی سہی گنجائش بھی پوری ہو گئی۔ وہ ہمدرد مزاج مسافر نہیں تھے بلکہ ہمارے خون کے پیاسے اور نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس کے متمنی تھے۔

مزید صبر کا یارا نہیں تھا۔ میں نے آنِ واحد میں اپنی پوزیشن کا جائزہ لیا۔ وہ دونوں مجھے شوٹ کر سکتے تھے جبکہ ان کا ساتھی جو اپنی گاڑی کے قریب کھڑا تھا، مجھے نشانے پر نہیں لے سکتا تھا۔ ان خطرناک لوگوں کی طرف سے مجھے کوئی خوش فہمی لاحق نہیں تھی۔ انہوں نے چلتی ہوئی ہائی لکس کے ٹائر کو ایک فائر سے برسٹ کیا تھا جو نشانہ بازی کی غیر معمولی مہارت کا ثبوت تھا۔

میری رائی بھر کوتاہی میری موت کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے بڑی احتیاط سے پستہ قد والے

شخص، جو اس وقت کندھے سے گن اُتارنے میں مصروف تھا، کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور فائر کردیا۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا بلکہ فائر کی خوفناک آواز کے ساتھ ہی وہ ہائی لکس کی باڈی سے ٹکرایا اور گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے چیخ تک نہیں نکلی تھی۔

میں نے اس کے پستول بردار ساتھی کو سنبھلنے کی مہلت نہیں دی اور اس پر فائر کردیا۔ میرا نشانہ خطا گیا جس کا خمیازہ مجھے جوابی فائر کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ پستول کی نال سے نکلنے والی گولی نے میرے کندھے سے بالشت بھر کے فاصلے پر ریت اُڑادی۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ ایک گولی نے اُسے زمین بوس کردیا جب وہ ہائی لکس کے ڈالے کی اوٹ لینے کی کوشش کررہا تھا۔

پک اَپ کے پاس کھڑا ہوا شخص میری نظر سے اوجھل ہوگیا تھا۔ اس کے پاس بھی رائفل تھی۔ اس نے مجھ پر کئی گولیاں برسائیں جو میرے اوپر سے گزر گئیں۔ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ کوشش کے باوجود میرا نشانہ نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے پستول بردار کے جسم میں دو گولیاں اُتاریں تاکہ وہ کسی قسم کی کارروائی نہ کرسکے۔ نہیں معلوم کہ اُس کے جسم کے کس حصے میں لگیں مگر وہ چند لمحوں میں ہی ساکت ہوگیا۔ اس کے پستہ قامت ساتھی کی روح تو شاید سر میں لگنے والی اکلوتی گولی سے ہی جسدِ عنصری سے نکل کر عالمِ بالا کی طرف پرواز کرگئی تھی کیونکہ وہ کھلے ہوئے دروازے کے قریب اوندھے منہ ریت پر بے حس وحرکت پڑا تھا۔

ان دونوں کی طرف سے تسلی ہونے کے بعد میں نے پک اَپ کی طرف توجہ دی۔ ادھر موجود دشمن نے مجھ پر ان گنت فائر داغے تھے جو رائگاں گئے تھے۔ مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں چھپا تھا۔ یہ اندازہ تھا کہ وہ گاڑی کے اندر بیٹھنے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔ گاڑی کے نیچے اندھیرا تھا۔ شاید وہاں مورچہ زن تھا۔ میں نے پوزیشن بدلی اور اندازے کے مطابق گاڑی کے نیچے دو فائر کیے مگر متوقع نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ وہ گاڑی کے نیچے نہیں تھا۔

سخی محمد کی طرف سے اب تک کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ وہ دُبکا بیٹھا تھا یا پھر تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ بعید نہیں تھا کہ اسٹیئرنگ ویل سے ٹکرانے پر اُس کی ایک یا زیادہ پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں۔

میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ اپنی طرف آتی ہوئی گولیوں کے دہانے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کوشش میں کوئی گولی میرے دماغ میں گھس سکتی تھی۔ میں نے اپنا سر تھوڑا سا اُٹھایا مگر فوراً ہی نیچے کرلیا۔ ایک گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میرا تمام بدن اکڑ گیا۔ میں نے چھ سات گولیاں اوپر تلے نشانہ لیے بغیر چلائیں، میگزین خالی ہوگئی۔ میں نے پہلو کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ شکر تھا کہ میں نے ایک فالتو میگزین جیب میں رکھ چھوڑی تھی ورنہ اس وقت نہتا ہو چکا ہوتا۔

میگزین بدلنے تک میرے اوپر سے تین گولیاں ریت اُڑاتے ہوئے گزریں۔ میری مجبوری یہ تھی میں اس چھوٹے سے گڑھے سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ چھپے ہوئے دشمن کو میری لوکیشن کا اچھی طرح علم ہوچکا تھا۔ جونہی میں باہر نکلتا، وہ مجھے موقع دیے بغیر شوٹ کردیتا۔ میرے پاس اندھا دھند فائرنگ کی سہولت نہیں رہی تھی۔ آخری میگزین لوڈ ہوچکی تھی۔

پانچ منٹ کی ناکام جدوجہد نے مجھ پر شدید نوعیت کی جھنجلاہٹ طاری کردی۔ عین ممکن تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی مگر اچانک سخی محمد کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سناٹے کا سینہ چھلنی کرگئی۔ ”خبردار! تم میرے نشانے پر ہو۔ ہتھیار پھینک دو ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔“

سخی محمد کی آواز کس سمت سے آئی تھی، یہ اندازہ نہ ہو سکا مگر چند لمحوں بعد جب اس نے اپنی دھمکی کا اعادہ کیا، تب ’دھپ‘ کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ رائفل بردار نے اپنی رائفل زمین پر پھینک دی تھی۔

”ہاتھ سر سے بلند کرلو۔“ سخی محمد کی آواز پھر سنائی دی۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کسی طرح سڑک عبور کرکے مجھ پر فائر کرنے والے دشمن کے عین عقب میں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

سخی محمد نے درشت لہجے میں کہا۔ ”سڑک کے درمیان کھڑے ہوجاؤ۔“

وہ جونہی سڑک پر آیا، مجھے دکھائی دے گیا۔ میں اَب تک یکسر غلط سمت میں فائرنگ کرتا رہا تھا۔ وہ پک اَپ سے چند قدم آگے سڑک پر کھڑا تھا اور سڑک کی دوسری طرف قدِ آدم سرکنڈوں سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے گڑھے سے نکل کر لمبی زقند بھری اور پک اَپ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں نے چند لمحوں میں ہی اُس کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے جائزہ لے لیا۔ گاڑی میں ان تینوں کے علاوہ کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ اسی اثنا میں سخی محمد اس چاق وچوبند شخص کے عقب میں پہنچ چکا تھا اور پھر اسے گن کی نال سے دھکیلتا ہوا میرے پاس لے آیا۔

میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”اسے اُڑا دو، اچار ڈالنا ہے کیا اِس کا؟“

وہ شکست تسلیم کرچکا تھا۔ اس نے جونہی میرا جملہ سنا، وہ گھگیا کر بولا۔ ”مجھے کچھ نہ کہو...... خدا کے لیے......“

سخی محمد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر زندگی چاہتے ہو تو جو پوچھتا جاؤں، سچ سچ بتاتے جاؤ۔ جہاں جھوٹ بولو گے یا خاموش ہوجاؤ گے، گولی ماردوں گا۔“

”مم...... میں بتاتا ہوں مگر...... گگ...... گولی نہ مارو مجھے۔“ اس کی آواز خوف کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”راجا اسلم......“

”کیا تم بریف کیس چھیننے کے لیے ہمارے پیچھے آئے تھے؟“ سخی محمد کی آواز میں موت کی خنکی شامل تھی۔

”ہاں...... مم...... ہاں۔“

”کس نے بھیجا تھا؟“

”استاد رنگو نے بھیجا تھا۔“

میں نے سخی محمد کو باور کرایا۔ ”جلدی کرو، فائرنگ کی آواز بہت دور تک گئی ہوگی۔“

سخی محمد نے پوچھا۔ ”رنگو کا پورا منصوبہ بتاؤ۔ جلدی جلدی!“

”اسے میاں صاحب نے کہا تھا کہ لڑکی وصول کرکے اپنی رقم چھین لینا۔ اس نے کشتیوں والے پل کے ادھر اور اُدھر دونوں طرف اپنے بندے چھپا رکھے تھے جبکہ اس طرف ہمیں تعینات کیا تھا اور رقم چھیننے کا حکم دیا تھا۔“ اس کی زبان ٹیپ پلیئر کی طرح چل پڑی۔ ”اگر تم جورے لاوی کو ساتھ لے کر نہ آتے تو لنگر سرائے سے اُدھر ہی ہم تم پر حملہ کردیتے۔“

”اس طرف کوئی اور پارٹی موجود ہے؟“

”نہیں...... ہمارا اندازہ تھا کہ تم دریا کی طرف سے واپس جاؤ گے۔“ اس کی آواز میں شکست خوردگی کا عنصر غالب تھا۔ ”مجھے چھوڑ دو، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”رنگو قسائی اسی ڈیرے پر رہتا ہے؟ مستقل طور پر یا آتا جاتا رہتا ہے؟“

وہ بولا۔ ”یہیں رہتا ہے۔“

”میاں دلبر اس وقت کہاں ہے؟ کیا ڈیرے پر موجود ہے؟“

”نہیں...... وہ لاہور والی کوٹھی پر ہے۔“

”میاں دلبر حسین نے اس لڑکی کو کہاں پہنچانے کا حکم دے رکھا ہے رنگو قسائی کو؟“ سخی محمد نے پوچھا۔ اس کے

چہرے کے تاثرات اندھیرے کے سبب نہیں بھانپے جاسکتے تھے مگراس کے لہجے کے تغیر نے مجھ پر عیاں کر دیا تھا کہ وہ راجا اسلم کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

''لاہور میں...... میاں صاحب کی کوٹھی پر۔''

''کیا مطلب؟ کیا اس لڑکی کو حیدر خان کے حوالے نہیں کیا جانا تھا۔'' میں چونکا۔

اس نے کندھے اُچکائے اور نیم مردہ آواز میں کہا۔ ''مجھے اس بات کا علم نہیں ہے۔''

''ڈیرے پر کتنے آدمی رہتے ہیں؟''

''چار...... استاد رنگو، جورالادی، مرید حسین اور میں......''

''باقی لوگ کہاں سے منگوائے گئے ہیں؟''

''عمر پور سے۔''

''عمر پور؟ یہ عمر پور کہاں واقع ہے؟''

''عمر پور، بورے والا میں ہے۔'' وہ گھگیایا۔

شاید سخی محمد کو کچھ اور نہیں پوچھنا تھا اس لیے اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ماسٹر! کچھ پوچھنا ہے یا......''

مجھے اُس سے رنگو قسائی کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا تھا مگر موقعے کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ ''نہیں...... جانے دو۔''

راجا اسلم میرے جملے کی معنویت کو بھانپ گیا اور ایک جھٹکے سے میرے پیروں میں گر گیا اور بڑی مضبوطی سے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ ایسے ہی وقت میں سخی محمد نے اس کی کمر پر، عین دل کے عقبی مقام پر نال رکھی اور گن کی لبلبی دبا دی۔ فائر کے ساتھ ہی راجا اسلم کی دلدوز چیخ فضا میں گونجی اور وہ میرے پیروں میں اوندھے منہ گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے منہ سے خرخراہٹ برآمد ہو رہی تھی۔

میں اچھل کر پیچھے ہٹا تاکہ میرا لباس اس کے خون کے ابلتے فوارے سے محفوظ ہو جائے۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔

''ماسٹر! اسے گھسیٹ کر سرکنڈوں میں ڈال دو۔ ہری اَپ!'' سخی محمد نے کہا اور ریت میں دھنسی ہوئی ہائی لکس کی طرف بھاگ پڑا۔ اس نے کھلے گیٹ میں جھک کر نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس اُٹھایا، اپنا اسلحہ نکالا اور بھاگتے ہوئے واپس آیا۔ قدرے پھولی ہوئی سانس میں بولا۔ ''ہری اَپ! اب ہمیں اس گاڑی میں سفر کرنا ہوگا۔ ہائی لکس کو چیک کرنے کا وقت نہیں ہے۔''

ہم دونوں بجلی کی سی تیزی سے رنگو قسائی کے گینگ کی پک اَپ میں سوار ہوئے۔ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ سخی محمد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی انجن اسٹارٹ کیا، لائٹس آن کیں اور جھٹکے سے ایکسیلریٹر دبا دیا۔ میں نے سیلنگ بلب کی دودھیا روشنی میں ایک مرتبہ پھر پک اپ کی عقبی نشست کا تنقیدی جائزہ لیا۔ گاڑی خالی تھی۔ راجا اسلم اور اس کے ساتھیوں کے پاس اگر زیرِ استعمال اسلحے کے علاوہ کچھ اور تھا بھی تو وہ پچھلی سیٹ کے نیچے چھپا کر رکھا گیا ہوگا، سامنے کچھ نہیں تھا جو دکھائی دیتا۔

راجا اسلم کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کے مطابق اب میدان صاف تھا۔ میں نے عقب نما کا رُخ اپنی جانب کیا۔ پیشانی کا جائزہ لیا۔ ہاتھ اور چہرے کا کچھ حصہ خون سے سرخ تھا۔ پیشانی کے زخم سے خون رِسنا بند ہو چکا تھا۔ میں نے دونوں سیٹوں کے درمیان پڑا ہوا تولیا نما کپڑا جسے عموی طور پر ڈرائیور 'سابر' کا نام دیتے ہیں، اُٹھایا اور اس کے صاف حصے سے اپنا بہتا ہوا خون صاف کیا۔ پھر اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ چند ننھے ننھے دھبے لگے تھے جو سرسری طور پر دیکھنے سے نظر نہیں آتے تھے۔

سخی محمد نے اپنی چھاتی سہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا سینہ بہت دکھ رہا ہے۔ شکر ہے کہ پسلیاں بچ گئی ہیں۔''

اس کی پیشانی پر ایک بڑا سا گومڑ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یار تم نے بڑی ہمت کی جو راجا اسلم کی پشت پر پہنچ گئے اور اسے ہینڈز اَپ کرا لیا ورنہ وہ میرے قابو آنے والا نہیں تھا کیونکہ مجھے اُس کی لوکیشن کی سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔''

وہ بولا۔ ''مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا، تبھی میں نے ٹیلے کا چکر کاٹا اور اس کے عین عقب میں جا پہنچا۔ اور ہاں ماسٹر! تم نے دیکھا، ان لوگوں نے کیسا عمدہ نشانہ لیا تھا ٹائر کا...... تینوں میں سے کوئی ایک بڑا غضب کا نشانچی تھا۔ چلتی گاڑی کے عقبی ٹائر کو سنگل فائر میں برسٹ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''کیا تم راجا اسلم کو غائبانہ جانتے تھے؟''

''نہیں...... آج پہلی مرتبہ اس خبیث کا نام سنا اور اُس کی مکروہ شکل دیکھی۔'' وہ بولا۔

میں نے تناؤ کم کرنے کی غرض سے کہا۔ ''سخی محمد! آج تو غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔''

وہ بولا۔ ''سردی تو معمول کے مطابق ہی ہے۔ دراصل آج کی رات ہم نے دریائی اور کھلے علاقے میں گزاری ہے، اس لیے سردی کا احساس زیادہ ہو رہا ہے۔ ویسے بھی شہر کی نسبت یہاں شدید سردی ہوتی ہے۔''

پھر، یکبارگی میری آنکھوں کے سامنے رنگو قسائی کا منحوس چہرہ ابھر آیا۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت واپس جاؤں اور اس کی گردن دبوچ لوں۔ اسی خواہش کے زیرِ اثر بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''یار سخی محمد! رنگو قسائی نے ہمیں مارنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ فیئر ڈیلنگ کے باوجود...... کیا خیال ہے، واپس جا کر اُس سے دو دو ہاتھ نہ کر لیے جائیں؟''

وہ مسکرایا۔ ''کیا تم اپنی جیت کو ہار میں بدلنا چاہتے ہو؟''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''ماسٹر! آج قسمت نے تمہارے ماتھے پر فتح کا سہرا باندھا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، تم نے پہلی کامیابی حاصل کی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہمارے دھندے میں جذبات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ فرض کیا، ہم واپس جا کر رنگو قسائی پر دھاوا بول دیتے ہیں اور اس پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ چونکہ وہ پہلے ہی اپنا لہو چاٹ رہا ہے، اس لیے ہمیں سامنے پا کر آپے سے باہر ہو جائے گا اور ہماری تکا بوٹی کر دے گا۔ ہم نہ صرف جان سے جائیں گے بلکہ دو کروڑ روپے کی رقم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ تم نے اس پہلو کو مدنظر رکھا ہے؟''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''مگر......''

اس نے میری بات کاٹ دی، بولا۔ ''ماسٹر! میں تمہارا حکم ماننے پر مجبور ہوں کیونکہ تم اس وقت میرے لیڈر ہو۔ اگر واپس چلنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر جذباتی ہونا غلط ہے۔ کیونکہ ہم نے رنگو کو اس کی وعدہ خلافی کی سزا دے دی ہے۔ تین بندوں کو خون میں نہلا دیا ہے۔ کوئی اور سامنے آئے گا تو اس سے بھی رعایت نہیں برتی جائے گی۔ کیا یہ کم ہے؟''

چونکہ وہ میری قلبی حالت سے آگاہ نہیں تھا اس لیے اس نے بالکل درست تجزیہ کیا تھا۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دے چکے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ رنگو قسائی کے ذمے کچھ اور حساب بھی نکل آیا تھا۔ میں نے سر جھکا اور دل میں کہا۔ ''ہاں سخی محمد! یہ میڈم کا نہیں، میرا معاملہ ہے۔ مجھے ایک بار نہیں، نجانے کتنی مرتبہ اس علاقے میں آنا پڑے گا۔ شاید تب تک، جب تک میرا رنگو قسائی سے حساب چکتا نہیں ہو جاتا۔''

مین روڈ پر خلافِ معمول ٹریفک کم تھی۔ اکا دکا گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید سردی اور دبیز دھند کے سبب ڈرائیور حضرات نے گاڑیاں لائن کے ہوٹلوں پر

کھڑی کر دی تھیں اور صبح کا انتظار کرنے لگے تھے۔ تمام راستے کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ رات جب اپنی زلفوں کو سمیٹ کر صبح کے قدموں تلے بچھانے میں مصروف تھی، ہم میڈم کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ظاہر خان نے رسمی چیکنگ کے بعد ہمیں داخلے کی اجازت دے دی۔

سخی محمد نے پارکنگ کے باہر ہی گاڑی روک دی اور مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "ماسٹر! سامان نکال کر اندر لے جاؤ، میں گاڑی کو ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پک اپ سے سامان نکالنے لگا۔ اپنے اسلحے کے علاوہ عقبی سیٹ کے نیچے پڑی ہوئی ایک گن اور خاصی مقدار میں گولیاں بھی نکال لیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ گاڑی میں اور کوئی بھی کارآمد شے نہیں رہی تھی، میں نے ہاتھ لہرا کر سخی محمد کو جانے کا اشارہ کر دیا۔

ایسے میں طویل قامت ظاہر خان بھی کاندھے پر مخصوص انداز میں گن لٹکائے ہمارے پاس آ گیا اور بولا۔ "تم نے بڑا دیر لگا دیا اے شیرا خان! میڈم صاب نے دو بار انٹرکام پر اَم سے تمہارا پوچا (پوچھا) اے۔"

وہ مجھے عموماً طور پر 'شیرا خان' کہہ کر پکارتا تھا اور اس کے پشتو لب و لہجے کے پیش نظر مجھے اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

"دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے ظاہر خان!" میں نے کہا۔ "میروشاہ یہیں ہے؟"

"آہا! وہ چڑی مار کہ بدمعاش...... وہ بڑا چالاک بندہ اے۔ آج اُس کا بڑا بے عزتی کیا میڈم صاب نے۔ ایک دم مزہ آ گیا اَم کو......" اس نے ہنستے ہوئے انگلی اور انگوٹھے کو خاص ترتیب دے کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "اتنا سا منہ بنا ہوا تھا چڑی مار کے بچے میروشاہ کا جب وہ اوپر سے اُتر کر نیچے آیا تھا......"

میروشاہ کی پذیرائی پر اُس کا دل باغ باغ ہوا تھا۔ تبھی مزہ لے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "مگر میڈم نے اُس کے بے عزتی کیوں کی؟"

"یہ اَم کو پتا نئیں اے۔ پَر بڑا مزہ آیا اے۔ اِدھر ہاتھ نکالو......"

میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرے ہاتھ پر زوردار ہاتھ مارا اور فرطِ مسرت سے جھومنے لگا۔ اسی دوران اُس کی نگاہ میری پیشانی پر پڑی۔ ہنستے ہنستے رُک کر مستفسر ہوا۔ "اِدھر کیا ہوا؟"

میں نے بتایا۔ "چوٹ آ گئی ہے۔"

اس دوران سخی محمد گاڑی کو ریورس کرنے لگا تو ظاہر خان نے اُسے روک دیا، بولا۔ "اے تم کدھر جاتا اے؟ میڈم صاب کا حکم اے کہ تم اپنا پون (فون) لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ لو اپنا پون اور اب اِدھر واپس نہ آنا۔"

اس نے موبائل فون اپنے کوٹ کی بڑی سی جیب سے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس کا اب یہاں کوئی کام نہیں تھا۔ میڈم کو مشن کی رپورٹ مجھے دینا تھی کیونکہ میروشاہ نے مجھے مشن لیڈر مقرر کیا تھا۔ سخی محمد نے 'بائی' کہا اور گیٹ سے نکلتا چلا گیا۔

ظاہر خان نے سامان اندر پہنچانے میں میری اعانت کی پھر شبو کو آوازیں دیتا ہوا وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا، زخم کی عمومی ڈریسنگ کی اور بال سنوار کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ میرے پہلو میں نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس پڑا تھا جبکہ اسلحہ ظاہر خان نے گیسٹ ہاؤس کے لاؤنج میں رکھ چھوڑا تھا تاکہ اُسے اسٹور میں محفوظ کر سکے۔

میری توقع کے مطابق وہ اسٹور سے نکل کر شبو کی طرف گیا تھا کیونکہ جب تھوڑی دیر بعد اُس کی واپسی ہوئی تو اُس نے ہاتھ میں چائے کا بڑا سا مگ پکڑا ہوا تھا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے انٹرکام پر سیکنڈ فلور پر میرے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔ پھر مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے کر اپنے کیبن میں چلا گیا تو میں چائے سے لطف اندوز ہونے لگا۔

شبِ گزشتہ کی خنکی میرے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔ میں نے چائے پی کر گرم کمبل بدن پر لپیٹا اور بیڈ پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میں اپنے مشکل ترین مشن میں کامیابی حاصل کر کے لوٹا تھا۔ قسمت نے میری یاوری کی تھی اور میری زندگی کی بہت بڑی خواہش پوری کرتے ہوئے مجھے رنگو قسائی سے بھی ملا دیا تھا۔ چونکہ دونوں ملاقاتوں کے درمیان بہت طویل عرصہ حائل تھا اِس لیے مجھے ایک طرح سے ناامیدی ہو چکی تھی مگر میں سوچا کرتا تھا کہ وہ زندگی میں جب کبھی ملے گا، میں اُس کا کام تمام کر دوں گا۔ رات کو وہ غیر متوقع طور پر نظر آیا تو میرے حواس مختل سے ہو کر رہ گئے تھے۔ ویسے بھی مشن سے ہٹ کر کچھ نہ کر پانے کی پوزیشن میں تھا۔ اگر میں اُس پر ہاتھ ڈالتا تو مشن میرے ہاتھوں سے نکل جاتا جو نہایت اہم تھا۔

ایسے میں میرے دل نے مجھے بزدلی کا طعنہ دیا مگر دماغ نے ڈھارس دی اور سمجھایا۔ "شہریار! تم نے کوئی بزدلی نہیں کی۔ حماقت کرتے تو نہ صرف اپنی جان گنوا بیٹھتے بلکہ میڈم کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچاتے۔ زندگی باقی، جب

اِس...... پہلے تم اُس سے آشنا نہیں تھے۔ آج تمہیں ...ئی کی دولت مل گئی ہے۔ اِسی پر اکتفا کرو اور اس پر ...ہاتھ ڈالنے کی فکر کرو۔"

میری مضطرب سوچوں کا ارتکاز رنگو کی خونیں شخصیت تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں اُس چہرے کو دوسری مرتبہ دیکھنے کی شدید خواہش کی تھی۔ دُنیا انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اتنی بڑی دُنیا میں کسی بھی اجنبی شخص کا یوں مل جانا قسمت کا بہت بڑا احسان ہوتا ہے۔

یہ طے تھا کہ مجھے اپنے والدین کے بہیمانہ قتل کا بدلہ اس سے لینا تھا۔ اس انتقام کی ہر قیمت ادا کرنے کے لیے میں تیار تھا۔ پولیس، جیل، قانون اور خون آلود ردِعمل کی مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ بھڑولے کے سوراخ سے جھانکنے والی میری بچپنے کی آنکھ میں ایک رنگو قسائی کا چہرہ ہی محفوظ تھا جسے میں نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اُس کے ساتھیوں کے چہرے دکھائی نہیں دیے تھے کیونکہ وہ ڈھاٹوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس ظالم کا چہرہ بھی چند لمحوں کے لیے برہنہ ہوا تھا جسے میری آنکھوں نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ محض اسے قتل کرنے سے میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ بجھنے والی نہیں تھی۔ مجھے اُس سے اُس کے ساتھیوں اور اُسے بھیجنے والے کے بارے میں پوچھنا تھا۔ یہ بھی پوچھنا تھا کہ میرے ماں باپ کو کس گناہ یا جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔ میں نے بہت سوچا مگر اپنے باپ سوہنے خان سے، اِس علاقے سے رنگو قسائی کا تعلق میری فہم سے بالاتر رہا۔ جس حد تک مجھے علم تھا، رنگو نور پور سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی اُس کی میرے خاندان سے کوئی دُشمنی تھی۔

مجھے ہی کیا، نور پور کے کسی بھی شخص کو، بہ شمول پھوپی اور چاچا چراغ کے، اِس دہرے قتل کی خون آشام واردات کے پس منظر سے آگہی نہیں تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میرے والدین کو کیوں اور کس نے قتل کیا تھا۔ پھوپی کبری کہتی تھی کہ اُس کے بھائی کا کسی سے زمین، رقم کے لین دین یا کاروباری تنازعہ نہیں تھا۔ چاچا چراغ کہتا تھا کہ میرا ابڑا بھائی روتوں کو ہنسانے والا شخص تھا مگر جاتے ہوئے مجھے اشکوں کے سمندر میں پھینک گیا۔ حیات خان کہتا تھا کہ اگر سوہنے خان کے قاتلوں کا پتا چل جاتا تو پورا نور پور اسلحہ اُٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ ایسے اَن گنت سوالات تھے جن کے جواب ایک وہی...... رنگو قسائی کا...... ناک پر دور سے دکھائی دینے والے سیاہ تل اور بڑی بڑی مونچھوں والا چہرہ ہی دے سکتا تھا جسے میں نے اتفاقاً دوسری مرتبہ بھی دیکھ لیا تھا۔ آگے کیا کرنا تھا، یہ طے کرنا باقی تھا۔ ایسے وقت میں مجھے کھالے کی عدم موجودگی بُری طرح کھلنے لگی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہوتا تو چٹکی بجاتے میں منصوبہ سازی کر لیتا۔

میں نے دانت کچکچائے، بیڈ کے فوم پر مکے مارے اور بڑبڑایا۔ "دُشمن! میرا انتظار کر...... میں تجھ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں کروں گا۔ تیرے بدن کو خون میں نہلا کر سرخرو ہوں گا۔"

مجھے علم تھا کہ اس تک پہنچنا، اُسے جواب دہی پر مجبور کرنا یا اسے ٹھکانے سے نکال لانا آسان نہیں تھا مگر میں جوئے شیر لانے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ مجھے میروشاہ اور میڈم کی اعانت کی ضرورت تھی اور یقین تھا کہ وہ میری مدد ضرور کریں گے۔ کھالے کی کمی پیا جی اور سخی محمد پوری کر سکتے تھے کیونکہ دونوں اُس سے کہیں زیادہ طاقتور اور خونخوار شکاری تھے۔

مجھے یقین تھا کہ میڈم اور میروشاہ کے عدم تعاون کی صورت میں بھی میں رنگو قسائی کے سر سے ٹلنے والا نہیں تھا۔

میں نے بے دھیانی میں بریف کیس گھسیٹ کر اپنے سامنے رکھا اور کھول دیا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں ترتیب وار پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں نوٹوں کی مانوس سی خوشبو پھیل گئی جس نے مجھے رنگو قسائی کے تصور سے نکال لیا۔ میڈم نجانے کتنے عرصے سے نوٹوں میں کھیل رہی تھی۔ اُس گھڑی میں نوٹوں سے کھیلتے ہوئے اُس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے بدن سے پھوٹنے والی بھینی بھینی مہک نوٹوں کی خوشبو سے کہیں زیادہ دل کشا تھی۔ نوٹ سامنے تھے تو ذہن میڈم شکیلہ کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ جب وہ نظروں کے سامنے ہوتی تھی تب ذہن میں کوئی اور خیال نہیں ہوتا تھا۔ یہی اُس کے حسنِ کرشمہ ساز کا دل فریب حصار تھا جو ایک پل کو باہر نکلنے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔

نوٹوں کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا کیونکہ میں نے کبھی اتنے نوٹ ایک جگہ نہیں دیکھے تھے۔ چوک قریشی والے بینک میں بھی شاید اتنی رقم نہیں ہوتی ہو گی جتنی میرے سامنے پڑی ہوئی تھی۔

دس بجے کے قریب مجھے انٹرکام پر سونیا نے میڈم کا حکم سنایا۔ اس نے مجھے 'مال' سمیت اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ میں نے بریف کیس اُٹھایا اور زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد میں میڈم کے سامنے کھڑا تھا جبکہ وہ صوفے پر اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھی۔ اس نے

گہرے نیلے رنگ کی جینز پینٹ، سرخ شرٹ اور پینٹ کا ہم رنگ لیدر کوٹ پہن رکھا تھا۔ پیشانی پر جھک کر پیچھے ہٹتے ہوئے بال سنہرے رنگ کے ہیئر کلپ میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں اُسے یک ٹک دیکھنے لگا۔ ہر لباس اس کے وجود پر آ کر سجنے لگتا تھا۔

اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''رپورٹ دو' مشن کیسا رہا؟''

مجھے میڈم کو رپورٹ دینے کا سلیقہ پیا جی نے سکھایا تھا۔ کوٹھی چھوڑنے سے لے کر واپس پہنچنے تک میں نے شب کہانی تمام تر جزئیات سمیت اُس کے گوش گزار کی۔ وہ ہمہ تن گوش سنتی رہی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے تالی بجائی اور مسکرا کر کہا۔ ''ویل ڈن مسٹر شہریار! تمہاری پہلی کامیابی نے میرا دعویٰ سچ ثابت کر دیا کہ تم لاکھوں میں ایک ہو...... جس پر شکیلہ کی آنکھیں مطمئن ہوئی ہیں...... آئی لو یو!''

اس کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں اور لبوں پر بڑی دل آویز ستائشی مسکراہٹ چسپاں تھی۔

میں نے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔ ''اِسے کہاں رکھوں میڈم؟''

اس نے کہا۔ ''ادھر...... ٹیبل پر رکھ کر کھول دو۔''

میں نے بریف کیس کو شیشے کی میز پر رکھا اور کھول کر اُس کی طرف گھما دیا۔ اس نے ایک نظر بے نیاز اُس کی طرف دیکھا، پھر بولی۔ ''رقم پوری ہے؟''

''جی میڈم...... سخی محمد نے گنی تھی۔''

''نوٹ اصلی ہیں؟''

''یس میڈم!'' میں نے یقین سے کہا۔

''تم موت کے منہ سے مایا نکال کر لائے ہو۔ اس میں سے اپنا حصہ نکال لو۔ اپنے حصے کا تعین بھی تم کرو گے جتنا جی چاہے......''

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں!''

''میں کہہ رہی ہوں کہ تم جتنے چاہو، پیکٹ اُٹھا لو۔ یہی تمہارا انعام ہے۔''

میں نے ایک نظر میڈم کو دیکھا۔ پھر نوٹوں پر نگاہ دوڑائی۔ میں کتنے نوٹ اُٹھا سکتا تھا؟ دو، تین، پانچ پیکٹ...... اس نے مجھے پورا اختیار دیا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا، پھر بریف کیس بند کر دیا۔ وہ تعجب سے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے انعام چاہیے، خیرات نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ٹھٹکی۔ ''میں تمہیں انعام دے رہی ہوں، خیرات تو نہیں...... کہا تو ہے کہ جتنی رقم چاہو، اُٹھا لو...... کیا میں اپنے ہاتھ سے دوں؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... مجھے رقم کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو پھر کس چیز کی ضرورت ہے تمہیں؟'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ حیرت اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات اُس کی آنکھوں سے مترشح ہونے لگے تھے۔

میں نے سر جھکا لیا۔ جو کہنا چاہتا تھا، کہنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ فارم ہاؤس پر ہونے والی ملاقات کے بعد میرے اور اس کے درمیان تکلفات کی فضا میں تبدیلی رونما ہوئی تھی مگر ابھی تکلف باقی تھا۔ اس نے اپنا سوال دُہرایا۔ جواب نہ پا کر اُٹھی اور میرے سامنے آن کھڑی ہوئی، بولی۔ ''کیا بات ہے؟ تمہارے دل میں ایسا کیا ہے جس کو لبوں پر لاتے ہوئے گھبرانے لگے ہو؟''

میں نے نظر اُٹھا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایسے میں دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ اس کی شخصیت کے مضبوط تاثر میں رخنہ ڈالنے کی ہمت کرتے ہوئے میں نے بہ دقت تمام ہونٹوں کو مخصوص انداز میں ایک دوسرے سے مس کرتے ہوئے مانگ لیا...... جو دل مانگ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں عجیب چمک پیدا ہوئی اور لب تھوڑا کھل گئے، بولی۔ ''بس؟''

''بس!'' میرے دل کی دھڑکن غیر معتدل ہو گئی۔

وہ چند لمحے یک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر دل آویز انداز میں مسکرائی، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوجے میں پھنسا کر ٹھوڑی تلے رکھیں اور بازو کھول کر لہرائی، بولی۔ ''سچ کہو...... کیا دل سے یہ انعام مانگ رہے ہو؟''

''جی...... میں نے کہا ناں کہ مجھے انعام چاہیے۔ نوٹوں کی ضرورت ہوتی تو واپس نہ آتا۔ بہترین زندگی گزارنے کے لیے یہ بریف کیس کافی ہوتا۔'' میں نے کہا۔

اس نے اچانک دونوں بانہیں کھول کر میری گردن میں ڈال دیں اور میرے بدن میں انعام کی تمام تر حدت اُتار دی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ کا بوسہ چاہا تھا اور اس نے جواب میں میری عقیدت کے ننھے سے چراغ کو محبت کا سورج بنا کر میری ہستی کے آسمان پر سجا دیا تھا اور پھر شاید اُس کے پاس باقی کچھ نہیں رہا تھا۔ اس لیے چند ہی لمحوں میں تھک کر میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ ایک دم ساکت اور بے حس و حرکت مجھ سے لپٹی کھڑی تھی جبکہ اس کی دھڑکن مجھے اپنی روح میں اُترتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

ایسے میں اس کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''کم آن...... مجھے بانہوں میں لے لو ناں......''

میں وہاں تھا اور میرا وجود کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا یا شاید اس کے برعکس تھا۔ میں نے اُس کے وجود کو اپنی ذات کے حصار میں لیا تو میرا پورا جسم لرزنے لگا تھا۔ اُس گھڑی میں نے انجام سے بے خطر ہو کر کہہ دیا۔ ''میڈم! مجھے آپ کی محبت چاہیے...... میں جانتا ہوں کہ مجھ میں اور آپ میں زمین و آسمان کا سا فرق حائل ہے مگر میرے سینے میں بھی جیتا جاگتا ایک دل ہے...... ویسا ہی، جیسا آپ کے پاس ہے۔ میں آپ کو دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''کچھ نہ بولو...... تم جو کچھ نہیں کہہ سکتے، میں وہ کچھ سن رہی ہوں۔''

اس کے بالوں کا ملائم لمس میرے لبوں کو تابِ زندگی، زندہ مہک، ذہن کو احساسِ فرحت اور چمک، آنکھوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ میرے شانے سے رگڑتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی اور اس کا بولتا ہوا غیر متحرک بدن مجھے بے جان کیے جا رہا تھا۔ وہ اچانک سر اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''تم کہا تھا ناں کہ تم دوسروں سے مختلف ہو...... ہو ناں؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ بولی۔ ''تھوڑا کس دو مجھے...... تھوڑا سا!''

میں نے اُسے تھوڑا سا بھینچا، وہ بولی۔ ''تھوڑا اور......''

میں نے فرمائش پوری کی۔ میں شاید اپنے حواس میں نہیں تھا۔ میں نے بے دھیانی میں اس کے بدن کو کچھ زیادہ ہی بھینچ لیا تھا۔ وہ عجیب تھی۔ وہ بجلی کی طرح مجھ پر کڑکی تھی تو آنِ واحد میں میرے اوسان خطا کر گئی۔ اَب گلاب کے گداز میں سرایت کر کے جذبات کے آسمان پر جلوہ افروز ہوئی تھی تو سانسوں پر سے اختیار چھیننے لگی تھی۔ میں نے اُس کی بانہہ کو سہلایا تو وہ تعجب سے بولی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''یقین نہیں آتا کہ یہی وہ بازو ہیں جنہوں نے مجھے پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔''

''وہی ہیں، ہے ناں؟'' اس نے ایڑیاں اُٹھائیں، میرے لبوں پر یکبارگی جام لگایا پھر تڑپ کر علیحدہ ہو گئی۔

وہ لہرا کر میری طرف آئی تھی۔ بل کھا کر دور ہو گئی۔ صوفے کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔ اس کی ہر ادا یکتا تھی۔ میں سنسناتے ہوئے وجود کو سنبھالتے ہوئے اُسے وفورِ شوق سے دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحوں تک میری طرف پشت کیے کھڑی رہی، پھر پلٹ کر شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ''ہر مرتبہ ایسا ہی انعام مانگو گے تو پیٹ کی آگ کیسے بجھاؤ گے؟''

میں نے کہا۔ ''پیسا کمانے سے مل جاتا ہے، محبت نہیں......''

''پیسا محبت کو خرید لیتا ہے۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''شہریار! دیکھو، ہمارے بزنس کی بنیاد عین سائنسی خطوط پر استوار ہے۔ یہاں جذبات کی آنکھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہاں دل کی نہیں، دماغ کی بات سنی جاتی ہے۔'' اس نے اچانک اپنا انداز بدل لیا۔ جیسی چند لمحے قبل دکھائی دی تھی، ویسی نہیں رہی تھی، بولی۔ ''مجھے خوشی ہوئی کہ تم میں اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بھی میرے لیے مسرت کی بات ہے کہ پیسا تمہاری کمزوری نہیں ہے مگر ایک بات دماغ میں نقش کر لو۔ ہونٹوں کا لمس زندگی بھر کا ساتھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسا نامکمل کیف ہے جس کی عمر محض ایک لمحہ ہوتی ہے اور بدن کے لمس کی عمر فقط چند لمحات...... میں خوب صورت ہوں، جوان ہوں اور تمہیں قریب آنے کا موقع دیتی ہوں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تم اگر چاہو تو میں سونیا، زرمینا یا اپنی کسی بھی لڑکی کو تمہارے پاس بھیج دیتی ہوں، رات بھر یا ہمیشہ کے لیے۔ وہ پہلو سے لگ کر پہلو کے اندر کسک بن کر چھپی ہوئی شکیلہ یا غزالہ یا ان کی یاد تک کو نوچ پھینکے گی۔ اگر زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو زندگی بھر عورت کو اپنے حواس پر سوار نہ ہونے دینا۔ جوانی سراب ہے۔ اسے دیکھو مگر ایسے، جیسے میں تمہیں قریب لاتی ہوں، دور کرتی ہوں مگر ایک حد سے آگے نہیں جانے دیتی۔''

میں اس کی باتوں کو بہ غور سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے بیان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ تمتماتے ہوئے گال، آنکھوں کی شکست خوردگی اور ہونٹوں پر رقص کرتی غیر معمولی چمک اس کے اندرونی انتشار اور جذباتی بہکاؤ کو ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! میں آپ کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کر سکتا۔ مگر آپ جو کہہ رہی ہیں، یہ سب پروفیشنل ازم ہے۔ میں جو کچھ سن رہا ہوں، اُس کا تعلق دل سے ہے اور دل جھوٹ نہیں بولتا۔''

وہ ایک ذرا مسکرائی، پھر کندھے اُچکا کر بولی۔ ''ابھی تم نے زندگی کے حقیقی رنگوں کو نہیں دیکھا۔ تھوڑے عرصے میں دیکھ لو گے۔''

اس نے انٹرکام پر سونیا کو طلب کیا۔ میں گھبرا گیا۔ خدشہ جاگا کہ کچھ دیر پہلے اُس نے جو دعویٰ کیا تھا، کہیں اُسے آزمانے پر کمربستہ نہ ہو گئی ہو۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ اُسے کیوں بلا رہی ہیں؟''

اس نے میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے

ہوئے کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ تمہیں امتحان میں نہیں ڈالوں گی۔''

سونیا کے دستک دینے تک ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ سونیا کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''مے آئی کم اِن میڈم؟''

میڈم نے 'یس' کہا پھر سونیا کو دیکھ کر بریف کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اِسے لے جاؤ۔''

وہ میرے قریب سے گزری۔ خوشبو کا ایک جھونکا میرے اطراف میں چکرایا۔ میں نے کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ بھول گیا کہ میڈم کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

سونیا بریف کیس اُٹھا کر چلی گئی تو وہ بولی۔ ''شہریار! سونیا خوب صورت ہے، ہے ناں؟''

میں نے کہا۔ ''جی میڈم! خدا نے اپنی تخلیق کو ہمیشہ خوب صورت نقش و نگار دیے ہیں۔''

وہ مسکرائی پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''تمہیں اور کچھ کہنا ہے؟''

میں چونکا، پھر سوچ کر بولا۔ ''میڈم! مجھے ایک بات کہنی تھی۔''

''کہو!''

''میں نے آپ کو اپنے والدین کے بارے میں بتایا تھا کہ انہیں کسی جرم کے بغیر کسی ظالم درندے نے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ یاد ہے ناں؟'' میں نے کہا۔ ''قسمت نے مجھے رات کو اس کی شکل دوسری مرتبہ دکھا دی ہے۔ میرے ماں باپ کو مارنے والا رنگو قسائی ہے۔''

وہ ایک ذرا ٹھٹکی اور حیرت سے بولی۔ ''واقعی؟ تم پہچاننے میں غلطی بھی کر سکتے ہو۔''

میں نے سختی سے تردید کی۔ ''نہیں میڈم! میں نے اس ظالم شخص کی صورت کو آج تک ذہن سے محو نہیں ہونے دیا۔ یوں سمجھ لیں کہ رنگو قسائی کی شکل میرے ذہن کے پردوں پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔''

اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہوں...... مجھے تمہاری سنائی ہوئی کہانی یاد تو ہے مگر ایک مرتبہ دُہرا دو۔''

میرے پاس بتانے کے لیے محض وہی منظر تھا جو میں نے مٹی کے بھڑولے کے اندر کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ وہ خوفناک منظر مجھے لحظہ بہ لحظہ یاد تھا۔ میں نے میڈم کے گوش گزار کیا۔ وہ ستائش بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی۔ ''تم واقعی مختلف ہو، تبھی سے...... تم نے اتنی پرانی بات کو یوں جزئیات سمیت یاد رکھا، حیران کن ہے۔ اب کہو، کیا کہنا چاہتے تھے؟''

''میں اُس سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... جاؤ اور اُسے گولی مار دو۔'' وہ قدرے بے پروائی سے بولی۔

''مگر میڈم!'' میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ''میں اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں معلومات لینا چاہتا ہوں جس نے اُسے بھیجا تھا اور اس کے ساتھیوں کے نام پتے بھی پوچھنا چاہتا ہوں...... اس کام کی تکمیل کے لیے مجھے محفوظ تنہائی درکار ہے۔ میں اُسے دو آبے سے اغوا کر کے کسی محفوظ جگہ پر لے جانا چاہتا ہوں جہاں اس سے تفصیلی پوچھ گچھ کر سکوں۔ وہ مجھے آسانی سے بتانے والا نہیں لگتا۔''

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے براہِ راست سوال کیا۔

''مدد!'' میرا لہجہ ازخود ملتجیانہ ہو گیا۔ ''ساتھی، اسلحہ اور محفوظ جگہ...... میں آپ کی مدد کے بغیر اسے اغوا نہیں کر سکتا۔''

اس کی پیشانی پر لکیروں کا باریک جال تن گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''وہ بڑا کتا شخص ہے۔ آسانی سے پلو نہیں پکڑائے گا مگر میں تمہیں اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع دوں گی۔ ابھی حالات خراب ہیں۔ وہ چوٹ کھا کر زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا ہو گا۔ ایسے میں اُس پر ہاتھ ڈالنا خطرناک ہو گا۔ تم چند دن صبر کرو۔ جونہی حیدر خان اور میاں دلبر حسین کا معاملہ ٹھنڈا پڑے گا، تمہیں نفری دے کر دو آبے روانہ کر دوں گی۔ اِز اٹ او کے مائی ڈیئر؟''

میں نے ممنون نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ ''یس میڈم! آپ بہتر جانتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... اَب تم اپنے گھر جاؤ اور آرام کرو۔'' اس نے کہا اور صوفے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ میں نے اس پر الوداعی نظر ڈالی اور سلام کر کے اس دریچۂ حسن سے نکل آیا۔

میں نے ظاہر خان سے کہا کہ وہ مجھے گلگشت پہنچانے کا بندوبست کر دے۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''ایدھر گاڑی تو اے پر ڈرائیور نہیں اے۔ تم اس طرف کو سیدھا جاؤ اور مین چوک پر جا کر آٹو رکشا پکڑ لو۔''

میری جیب خالی تھی مگر یہ سوچ کر کہ رکشا والے کو گھر سے پیسے دے دوں گا، میں نے کوٹھی سے کوئی سو گز کے فاصلے پر واقع بڑے چوک کا رُخ کیا۔ وہاں سے رکشا پکڑا ڈرائیور کو اپنے گھر کا پتا سمجھایا اور تن آسان ہو کر بیٹھ گیا۔

اس نے وقت اور پیٹرول بچانے کی غرض سے شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا اور گھنٹا گھر چوک کی طرف چل دیا۔ میں نے یہ راستہ دیکھ رکھا تھا اس لیے متفکر نہ ہوا۔ اس نے رکشا گھنٹا گھر چوک سے نکالا اور نونمبر چونگی والی سڑک پر ڈال دیا۔ شہر کے اس علاقے میں رش قدرے زیادہ ہوتا تھا۔ میں چونکہ اپنے خیالات میں گم تھا اس لیے اس ڈارک بلوکلر کی نئی کار کو نہیں دیکھ سکا تھا جو گھنٹا گھر چوک سے رکشا کے برابر چلتی آئی تھی اور اس نے ڈریم لینڈ سینما کے عین سامنے سائڈ دبا کر رکشا ڈرائیور کو ہنگامی طور پر رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ رکشا ڈرائیور نے زوردار گالی دی۔ ''ابے تیری...... سالا اندھا ہوگیا ہے کیا؟''

میں نے چونک کر جھک کر رکشا کی فرنٹ اسکرین کے پار عجیب انداز میں راستہ روکے کھڑی کار کو دیکھا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجا دیا۔ مجھے فوری طور پر یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ کیا ہونے والا ہے مگر میں نے رکشا سے اُترنے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر دیر ہوگئی تھی۔ رکشا کا ریگزین کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا، ایک سفید کپڑوں والے شخص نے رکشا میں جھانکا اور اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کی دہری نال میری پسلیوں سے آ لگی۔ میں نے گن کی طرف دیکھا۔ ایسی عجیب الوضع گن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بہ مشکل ایک فٹ لمبی جسامت، دو نالوں اور چوڑی پٹی کی میگزین والی گن دیکھنے میں ہی بڑی خطرناک لگ رہی تھی۔

میں نے استعجاب اور خوف کے ملے جلے احساس سے مغلوب ہوکر پوچھا۔ ''کون ہو تم اور یہ کیا حرکت ہے؟''

وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''کوئی خرمستی کیے بغیر نیچے اُتر آؤ۔''

میں نے کن اکھیوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ ایک جانب وہ کھڑا تھا جبکہ رکشا کی دوسری جانب دکان کا تھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اُس طرف سے فوری طور پر نکل نہیں سکتا تھا۔ سفید پوش نے گن کی نال میری پسلیوں میں چبھوئی اور غرا کر کہا۔ ''جلدی کرو ورنہ یہیں کام تمام کردوں گا۔''

میرے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا چارۂ کار نہیں تھا۔ رکشا ڈرائیور سہمی ہوئی نظروں سے غیر متوقع طور پر پیش آنے والی صورت حال کو دیکھ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میری مدد کر کے جان کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں کھسک کر رکشا سے نکلا تو اُس نے گن کی نال سے گاڑی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا جو محض تین چار قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کار رکشا کی سمت والا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔

قوی الجثہ شخص مجھ سے تقریباً چپٹ کر کھڑا تھا اور اس کی گن مجھ سمیت کسی بھی گزرتے ہوئے شخص کو دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر میرے پہلو میں اپنی موجودگی کا مکمل احساس دے رہی تھی۔ آنے جانے والے لوگوں کو مطلق خبر نہیں ہوئی تھی کہ دن دیہاڑے سڑک پر مجھے اغوا کیا جارہا تھا۔ میں نے طویل سانس خارج کی اور ڈارک بلوکلر کی کار کی طرف قدم بڑھا دیا۔ اس نے دھیمے مگر درشت لہجے میں کہا۔ ''گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ جلدی کرو۔''

میں نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اطراف کا یک نظری جائزہ لیا کہ میرے نکل بھاگنے کا کوئی امکان موجود تھا یا نہیں مگر اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر مجھے شوٹ کرسکتا تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مقابل دروازے کی جانب سیٹ پر گرے کلر کا ٹریک سوٹ پہنے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جو بڑی محویت سے شیشے کے پار دیکھ رہا تھا۔ مجھے فوری طور پر اس کے گھٹنوں کے بیچ سیاہ رنگ کا پستول دکھائی دے گیا جس کا بولٹ چڑھا ہوا اور لاک پن ہٹی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک منحنی سے وجود والا شخص بیٹھا ہوا تھا جو اس ساری مارا ماری سے قطعی طور پر بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔

میرے بیٹھتے ہی مجھے گن کی نال چبھونے والا قوی الجثہ شخص بھی کار میں بیٹھ گیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا کام ہوگیا ہے، اب فوراً یہاں سے نکل چلو۔''

کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ میں عقبی سیٹ پر دونوں اسلحہ برداروں کے درمیان میں پھنسا بیٹھا تھا جبکہ میرے بائیں پہلو میں عجیب ساخت کی گن کی نال چبھ رہی تھی۔ نونمبر چونگی والے مین چوک پر پہنچ کر ڈرائیور نے بائیں ہاتھ ٹرن لیا اور آٹھ نمبر چونگی کی طرف تیز رفتاری سے روانہ ہوگیا۔ ایسے ہی وقت میں میری داہنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنا رُخ میری جانب کیا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا حال ہے مسٹر شہریار؟ امید ہے تمہیں یہ پروٹوکول پسند آیا ہوگا۔''

یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ یکبارگی مجھے جھٹکا سا لگا اور میرے بدن کا خون میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

مفلسی میں ملفوف دبلی پتلی، سانولی سلونی، تیکھے نقوش والی نسیمہ حالات کا کوڑا کھا کر گھر کی چار دیواری سے باہر نکلی تو اس کا دل کانپ رہا تھا۔ ابا یوں تو کئی برسوں سے خون تھوک رہے تھے لیکن گزشتہ ڈیڑھ برس سے تو وہ پلنگ سے لگ کر رہ گئے تھے، یہ ڈیڑھ برس ان کے لیے ایسی ڈیڑھ صدیاں تھیں جن کا گزرنا ناممکن نظر آتا تھا، تمام راہیں مسدود ہوگئیں تو مجبوراً نسیمہ کو گھر سے باہر نکلنا پڑا۔

میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ وہ دھکے کھاتی پھری۔

انتخاب

جلتی چھائوں

ناہید سلطانہ اختر

چھائوں جلتی ہوئی ہو یا ٹھنڈی... جو وقت پر میسر آجائے قبول تو کرنا پڑتا ہے... کہنے کو اس کے پاس بھی ایک سائبان موجود تھا لیکن کڑی دھوپ اس کے تعاقب میں سرگرداں کسی صورت اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھی... بقول شاعر ''سفر تھا دھوپ کا اور راستہ بھی شیشے کا... بدن تھا موم کا سو مختصر گزار آئی'' بالآخر اسے بھی اپنے دکھوں اور گردشوں سے سمجھوتا کرنا پڑا... کیوں کہ مقدر کے ستاروں کا چال چلن شاید اس کی سمجھ آگیا تھا۔

لمحاتی محبتوں کی اسیر ایک حسینہ کی سادگی

کا تکلیف دہ احوال

پاؤں دھول میں اٹ گئے۔ کئی چھالے پڑے اور پھوٹے، اکلوتی چپل کی ساری چولیں ہل گئیں مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ یہ بات نہیں کہ وہ فولاد کی بنی تھی۔ ہمت تو شاید وہ اول روز ہی ہار دیتی جب وہ دُہری نقاب گرائے سڑک پار کر رہی تھی اور ایک شہدہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کہنی مار کر منمناہٹ میں یہ کہتا گزر گیا تھا۔

”چل رہی ہو میری جان لیے۔“

یہ رکیک جملہ میدانِ عمل میں نووارد نسیمہ کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا، وہ اس امر سے ناآشنا تھی کہ ایسے موقعوں پر کیا کرنا چاہیے۔ سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گئی آنسو نقاب کے اندر ہی اٹک کر رہ گئے۔ سہم کر گھر واپس لوٹنے کا ارادہ کیا مگر اس کے تصور میں مُنو کا چہرہ ابھر آیا۔ یوں چٹنی روٹی تو معمول بن ہی گئی تھی مگر گزری شام مکمل فاقہ رہا تھا۔

اماں، منو کو تھپک تھپک کر عاجز آ گئیں، مگر پیٹ کی بھٹی تپ رہی ہو تو نیند بھی آنکھوں میں آتے ہوئے ایڑیاں رگڑتی ہے۔ پہلے اس نے آنسو بہا کر اماں کو ڈرانے کی کوشش کی مگر آنسوؤں کے بدلے بھی چھ برس کی جان کو روٹی نہ ملی تو اس نے مچلنا شروع کر دیا۔ یہ حیلہ بھی کارگر نہ ہوا تو اس نے منہ بسورتے ہوئے التجا کی۔

”اماں بس ایک روٹی دے دو، دو نہیں مانگوں گا۔“

اس کی اس التجا پر اماں کے ساتھ نسیمہ بھی ماہی بے آب کے مانند تڑپ کر رہ گئی۔ کیسا ستم تھا قسمت کا! تین بہنوں کا وہ اکلوتا بھائی جو نہ جانے کتنی منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا، ایک روکھی روٹی کو ترس رہا تھا اور اس سے بڑی دونوں بہنیں گھٹنوں میں منہ دبائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ نسیمہ ان تینوں سے خاصی بڑی تھی اس میں اور اس سے چھوٹی شمیمہ میں ایک نہ دو پورے گیارہ برس کا فرق تھا اور اس وقت جبکہ اس کا دُلارا بھائی ایک روٹی کے لیے بلک رہا تھا، وہ کھلے آنگن میں پڑے جھلنگے پلنگ میں دھنسی اونچے آسمان پر نگاہیں جمائے سوچتی رہی...... روٹی کہاں سے لائے؟ اس وقت اسے ان گداگروں پر رشک آ رہا تھا جو شرافت و نجابت کی قید و بند سے یکسر بے پروا اور آزاد ہوتے ہیں۔ ابا اگرچہ معمولی کلرک تھے لیکن کتنی خواہش تھی انہیں کہ ان کی لاڈلی نسیمہ بی اے پاس کر لے مگر اس وقت ابا کی وہ چہیتی بیٹی جسے میٹرک کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے گھر بیٹھنا پڑا تھا، اپنے دُلارے بھائی کے ایک روٹی کے لیے بلکنے پر انتہائی دل گرفتہ ہو کر سوچ رہی تھی کہ ایک روٹی کہاں سے آئے؟

روٹی تو خیر نہ آ سکی البتہ منو کی آنکھوں میں نیند اتر آئی شمیمہ اور نعیمہ جو مُنو کا انجام دیکھ چکی تھیں۔ خود بھی کونوں، کھدروں میں دبک کر پڑی رہیں، نسیمہ نے طے کر لیا، خالہ کچھ کہیں، ممانیاں کتنی ہی باتیں بنائیں، اماں کتنا ہی منع کریں کل وہ نوکری کی تلاش میں نکلے گی۔

اماں نے سنا تو انہیں یہ بات بڑی عجیب سی لگی، انہیں پتا تھا اپنے پرایوں کی زبانیں روکنی مشکل ہو جائیں گی۔ مگر نسیمہ پچھلی رات مُنو کی حالت یاد کر کے روئی تو اماں بھی بے بس ہو گئیں۔

نسیمہ گھر سے نکلی تو اس کے پاس میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے سوا اور کچھ بھی تو نہ تھا۔ پہلے ہی دن اسے باہر نکل کر اندازہ ہوا کہ عورت کا گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا اتنا آسان نہیں پہلے ہی رکیک جملے نے اس کی ہمت اور حوصلے کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کرنا چاہا لیکن اوّلین ارضی مسئلہ بھوک پوری شدّومد کے ساتھ اس کے سامنے آ موجود ہوا اور پھر منو کی بھوک تو اس سے شاید بھیک بھی منگوا لیتی۔ صبح سے شام تک وہ ماری ماری پھرتی رہی۔ ٹانگیں شل ہو گئیں۔ کمر درد سے پھٹنے لگی، ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں، ناکام و نا شاد جب وہ گھر واپس آئی تو ہنوز فاقے کا ڈیرا تھا۔

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو نسیمہ کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے مانند کوندا جس میں اماں بھی اختلاف نہ کر سکیں۔ وہ اٹھی بُرقعہ اوڑھا تب تک اماں کورے لٹھے کے بڑے تھیلے میں تانبے کی دو دیگچیاں اور ایک مراد آبادی لوٹا ڈال چکی تھیں۔ شمیمہ کو ساتھ لے کر نسیمہ بازار گئی اور اونے پونے برتن بیچ کر واپسی پر اسی تھیلے میں آٹا لیتی آئی۔ یوں اگلے چند روز کا آسرا ہو گیا مگر نسیمہ نے اس عارضی آسرے پر قناعت کر کے بیٹھ جانے کے بجائے تگ و دو جاری رکھی۔ کئی ہفتے گھر کے برتن بیچ کر گزر بسر کرتے رہے اور نسیمہ نوکری کی تلاش میں چل چل کر تھک گئی۔

بالآخر اسے ایک فیکٹری میں جہاں بہت سی عورتیں یومیہ اجرت پر ملازم تھیں، نوکری مل گئی۔ نسیمہ کو یوں لگا جیسے دو جہاں کا خزانہ مل گیا ہو۔ اماں نے، جو اس کے پاؤں کے چھالے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتی تھیں، چین کا سانس لیا۔ ابا نے سنا تو یوں کراہے جیسے اتنی شدید تکلیف انہیں اس سے پہلے کبھی نہ پہنچی ہو۔

روز و شب کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ محنت کشی اور مشقت کا یہ دور نسیمہ کے لیے قدرے طمانیت کا دور تھا۔ ابا بہ دستور بیمار تھے لیکن روٹی کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا تھا۔ پانچ چھ ماہ گزر گئے۔

چھ ماہ بعد اس کی اطمینان بخش کارکردگی اور تعلیم کے پیشِ نظر اسے سپروائزر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ تنخواہ میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی وہ پندرہ دن پہلی شفٹ اور پندرہ دن رات کی شفٹ میں کام کرنے کی بھی پابند ہو گئی۔ ابا کی طبیعت دن بہ دن خراب تر ہوتی گئی۔ نسیمہ فیکٹری سے واپس ہوتی تو اماں یوں اس کی منتظر ملتیں جیسے وہ کبھی ابا کی ہوا کرتی تھیں۔ مُنو آتے ہی آپا آپا کر کے چمٹ جاتا اور وہ اپنے تھیلے سے مُنو کو وہ چھوٹی سی کاغذی تھیلی نکال کر تھما دیتی جس میں اس کے لیے راستے سے خریدی ہوئی کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز موجود ہوتی تھی۔ اماں نسیمہ کی ایک ایک چیز کا خیال رکھتیں۔ چھٹی والے دن جب بچے صبح ہی صبح اٹھ کر شور مچانے کی کوشش کرتے تو اماں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شی شی کر کے انہیں گھڑکی لگا کر یوں خاموش ہو جانے کی ہدایت کرتیں جیسے گھر کے مرد کی نیند میں خلل پڑ جانے کا خوف ہو، بلاشبہ وہ اس چھوٹے سے گھر کا وہ ستون بن گئی تھی جس پر اس کی بقا کا انحصار تھا۔

حسبِ روایت اپنے پرایوں سب ہی نے نسیمہ کے نوکری کرنے پر باتیں بنائیں ناکیں سکیڑیں لیکن نسیمہ کو اب کسی بات کی پروا نہ تھی بلکہ اماں کو وہ اکثر سمجھاتی کہ کسی عزیز رشتہ دار یا ملنے جلنے والوں کی باتوں پر کڑھنے اور دل جلانے کی ضرورت نہیں۔ دھیرے دھیرے اماں بھی عیب جویوں کی باتیں سننے اور سن کر ٹال دینے کی عادی ہو گئیں۔

موسمِ سرما گزرا اور گرمیاں آئیں تو فیکٹری میں کام بڑھ گیا۔ عید قریب تھی بیشتر کام کرنے والی عورتوں نے بہ خوشی اوور ٹائم کرنا شروع کر دیا۔ خود نسیمہ کی سب سے بڑی ضرورت پیسا تھا چنانچہ وہ بھی اکثر و بیشتر اوور ٹائم کرنے لگی۔

ایک رات جب چھ گھنٹے اوور ٹائم لگانے کے بعد وہ فیکٹری سے باہر نکلی تو اس نے محسوس کیا، خاصی رات ہو چکی تھی جن دنوں نائٹ شفٹ ہوتی وہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے چھ بجے تک فیکٹری پہنچ جایا کرتی تھی اور پھر پوری رات فیکٹری ہی میں گزارتی تھی لیکن اتنی رات گئے سنسان اور نیم تاریک راستوں پر نکلنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ کچے راستے سے نکل کر وہ سڑک پر پہنچی تو اس نے محسوس کیا۔ سڑک کے دونوں اطراف لیمپ پوسٹ روشن تھے مگر سڑک ہیبت ناک حد تک خاموش تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتی دھڑکنوں کو قابو کرتی وہ بس اسٹاپ کی جانب رواں تھی کہ اچانک عقب سے آواز آئی۔

”سنیے!“

اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ نقاب اس نے پلٹ رکھی تھی مگر اتنی ہمت نہ ہوئی کہ پیچھے پلٹ کر دیکھ سکتی۔ گھبراہٹ کے عالم میں اس نے اور بھی لمبے ڈگ بھرنا شروع کر دیے۔

”گھبرائیں نہیں، میں آپ کی برابر والی فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔“ ایک آواز اسے اپنے بہت ہی قریب سنائی دی۔

وہ جہاں کی تہاں تھم گئی۔ قریبی لیمپ پوسٹ کی دودھیا روشنی میں اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بڑی بڑی آنکھوں اور گھنی مونچھوں والا ایک نوجوان اس کے روبرو تھا۔

”کافی دیر ہو چکی ہے۔ آپ مناسب سمجھیں تو اسٹاپ تک میرے ہمراہ چلیں، میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“

نسیمہ کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے، کیا کرے۔ اس کا دل اس ناگہانی افتاد سے بری طرح کانپ رہا تھا بالآخر اس نے خود ہی نسیمہ کی مشکل آسان کر دی اور بولا۔

”آئیے چلیں۔“

نسیمہ نے سہمی ہوئی آنکھوں سے مشکوک انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

”آپ اطمینان رکھیں، میں شریف آدمی ہوں دراصل آج کل زمانہ بڑا خراب ہے، میں نہیں چاہتا رات کے وقت آپ کو تنہا دیکھ کر کوئی شہدہ الٹی سیدھی حرکت کرے۔“

یہ بات اس نے کچھ اس طرح کہی کہ نسیمہ کو اس کی شرافت کا اعتبار کرنا ہی پڑا اور دھیرے سے بولی۔

”بڑی مہربانی آپ کی۔“

دونوں ساتھ چلنے لگے مگر درمیان میں مناسب فاصلہ حائل رہا۔

”آپ تو غالباً گولیمار جائیں گی؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”آپ کو کیسے معلوم؟“ نسیمہ کا لہجہ اس کی گھبراہٹ کو پنہاں نہ رکھ سکا۔

لیکن اگلے ہی لمحے اس جواب نے اس کی تشفی کر دی کہ ”میں نے آپ کو اکثر گولیمار کے اسٹاپ سے بس میں سوار ہوتے دیکھا ہے۔“

”آپ...... آپ کہاں رہتے ہیں؟“ نسیمہ نے سوال کیا۔

”لالوکھیت، سندھی ہوٹل!“ جواب ملا۔

بس اسٹاپ تک پہنچتے پہنچتے نسیمہ اس کے بارے میں اتنا جان چکی تھی کہ اس کا نام اصغر تھا اور وہ نان میٹرک تھا۔ اس کی بیوہ ماں اور دو بہنیں پنجاب کے کسی دور افتادہ گاؤں میں مقیم تھیں اور وہ ملازمت کی تلاش میں شہر آنے کے

بعد گزشتہ تین ماہ سے نسیمہ کی فیکٹری سے ملحق اسپننگ مل میں کام کر رہا تھا۔ راستے بھر اس نے نسیمہ سے جس انداز میں باتیں کیں ان سے نسیمہ خاصی متاثر ہوئی تھی اور فیکٹری سے بس اسٹاپ تک کا وہ طویل فاصلہ جو اسے ہراساں کیے دے رہا تھا، بڑے اطمینان سے کٹ گیا۔ اپنی گفتگو کے دوران وہ بار بار کہتا رہا زمانہ بڑا خراب ہے اور لڑکیوں کے لیے گھر سے باہر نکل کر تلاشِ معاش میں سرگرداں رہنا بڑا کٹھن کام ہے۔ پھر بس اسٹاپ آگیا۔ وہ دونوں خاصی دیر ساتھ کھڑے بس کا انتظار کرتے رہے۔ بس اسٹاپ پر چند لوگ اور بھی تھے لیکن سب کے سب مرد، ایسے میں نسیمہ کو اصغر کا ساتھ بڑا غنیمت محسوس ہوا۔ وہ بار بار سوچتی رہی کہ اس وقت اصغر ساتھ نہ ہوتا تو اس بس اسٹاپ پر اس کے لیے تنہا اتنے مردوں کے ساتھ کھڑے رہنا کیسی کٹھن آزمائش ہوتی۔ دور سے بس آتی نظر آئی تو اصغر نے سرگوشی میں کہا۔

"آپ ذرا سویرے فیکٹری سے نکلنے کی کوشش کیا کریں؟"

"کام زیادہ ہے اس لیے......"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر......" اس نے دبی دبی آواز میں کہا۔ مگر نسیمہ کی طرح اس کی بات بھی ادھوری رہ گئی اور بس اسٹاپ پر آ پہنچی۔

"شکریہ۔" نسیمہ نے دھیرے سے کہا اور بس میں چڑھ گئی۔ زنانہ حصے میں ایک مسافر عورت بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ نسیمہ زنانہ اور مردانہ حصوں کو علیحدہ کرنے والی جالی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

بس چل پڑی۔

تین چار اسٹاپ گزرنے کے بعد کنڈیکٹر نے زنانہ حصے کی طرف جالیوں کے اوپر سے ہاتھ بڑھایا تو نسیمہ نے ٹکٹ کے پیسے نکال کر کنڈیکٹر کی جانب بڑھا دیے۔

"ٹکٹ ہو گیا ہے ان کا۔" اس کے عقب سے جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ بلاشبہ وہ اصغر ہی تھا۔ کنڈیکٹر اونگھتی ہوئی عورت کی جانب متوجہ ہو گیا۔

بقیہ راستہ نسیمہ نے اصغر کے [illegible] رویے کی بابت سوچتے ہوئے گزارا۔ بس جانے کتنے اسٹاپ پیچھے چھوڑ آئی یہاں تک کہ گولیمار کا اسٹاپ آگیا۔ بس رکی اور وہ نیچے اتری تو چند ثانیوں بعد ہی اصغر اس کے سامنے آ موجود ہوا۔

"آپ......؟"

"چلیے آپ کو آپ کے دروازے تک چھوڑ آؤں۔"

"میں...... میں چلی جاؤں گی۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں، رات کافی تاریک ہے، آپ کہاں تاریک گلیوں سے گزریں گی؟"

سوچنے سمجھنے کی مہلت ہوتی تو شاید وہ اصغر سے پوچھتی، تمہیں کیسے معلوم کہ مجھے تاریک گلیوں سے گزرنا ہوگا مگر فوری طور پر وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"شکریہ! میں چلی جاؤں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ مصر رہا۔

"بڑی مہربانی آپ کی، اب میں خود چلی جاؤں گی یہ گلیاں میری اپنی ہیں۔"

"گویا آپ کی گلیوں میں غیروں کا داخلہ ممنوع ہے!"

اصغر کا لہجہ اسے پہلی بار شوخ محسوس ہوا، اس کے اصرار پر اسے کہنا پڑا۔

"محلے والوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو...... اور پھر اماں یقیناً میرا انتظار کر رہی ہوں گی انہوں نے دیکھ لیا تو وہ کیا سوچیں گی......؟"

"ٹھیک...... اچھی بات تو پھر خدا حافظ!"

"شکریہ!" نسیمہ نے پھر کہا۔

وہ بس اسٹاپ کی طرف چلا گیا اور نسیمہ ان جانے پہچانے راستوں پر چل پڑی جو اس کے اپنے تھے لیکن نیم تاریک اور تاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ ایک پل کو بھی اس کا خیال ذہن سے نہ جھٹک سکی گھر پہنچی تو اماں اس کی منتظر تھیں۔

"آج اتنی دیر......؟"

"اماں کام زیادہ تھا اس لیے دیر ہو گئی۔" اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا اور برقعے کے بٹن کھولتی صحن سے کمرے میں آگئی۔ کھانا کھا کر وہ بستر پر لیٹی تو بدن تکان سے چور تھا۔ اماں سوچتی رہیں، میری بچی پر کیسا وقت پڑ گیا اور نسیمہ کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا۔

"کیسا شریف آدمی تھا؟"

اس سے اپنی پہلی ملاقات کو ابھی وہ ذہن سے پوری طرح محو بھی نہ کر پائی تھی کہ وہ ایک بار پھر ٹکرا گیا۔ اس بار رات کی تاریکی کے بجائے دن کے اجالے ہر سو بکھرے پڑے تھے۔ نسیمہ فیکٹری سے گھر نہیں بلکہ گھر سے فیکٹری جا رہی تھی۔ جوں ہی وہ سڑک عبور کر کے فیکٹری کی جانب جانے والے راستے پر مڑی، عقب سے آواز سنائی دی۔

"السلام علیکم!"

"نسیمہ نے کن انکھیوں سے دیکھا اور چونک گئی، یہ تو وہی تھا۔ بلا ارادہ نسیمہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"خدا کا شکر ہے!"

"بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی۔"

"جی ہاں......" یہ کہتے ہوئے نسیمہ نے نقاب گرا لی، وہ کسی صورت یہ نہیں چاہتی تھی کہ دن کے اجالوں میں کسی نوجوان کے ہمراہ چلتے اور اس سے باتیں کرتے اس کا کوئی شناسا دیکھ لے۔

"ایک بات بتائیں گی۔ نوکری آپ کی مجبوری ہے یا فیشن سمجھ کر کر رہی ہیں؟" اصغر نے بڑا عجیب سا سوال کیا۔

"مجبوری!" وہ بلا تردد بولی۔

"فیکٹری والے دیتے کیا ہیں؟"

"گزارا ہو جاتا ہے۔"

"معاف کیجیے! ذاتی سا سوال ہے، والد صاحب حیات ہیں آپ کے؟"

"بہت عرصے سے بیمار ہیں۔"

"کوئی بڑا بھائی؟"

"جی نہیں...... بہت چھوٹا ہے۔"

اصغر نے ایک گہری سانس لی، ڈیڑھ دو منٹ کا بقیہ راستہ خاموشی سے کٹا۔ اپنی فیکٹری کا رخ کرنے سے قبل اس نے آہستہ سے کہا۔

"کبھی آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

نسیمہ کچھ نہیں بولی۔ اصغر اپنی فیکٹری کے صدر دروازے کی طرف چلا گیا اور نسیمہ کے کانوں میں گھنٹیاں بجتی رہیں۔

کبھی آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے!

کبھی آپ سے بہت سی......! کبھی آپ سے......!

کیسا سرور تھا اس جملے میں؟

پھر بہت سے دن گزر گئے!

اور پھر اچانک دونوں ٹکرا گئے۔ ساتھ قدم اٹھتے رہے، باتیں ہوتی رہیں پھر اپنی اپنی راہ پر چل پڑے۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز نسیمہ نے کنڈیکٹر کو ٹکٹ کے پیسے دیے تو کنڈیکٹر نے کہا، پیچھے ٹکٹ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد یہ آئے دن کا معمول بن گیا۔ بس اسٹاپ سے فیکٹری تک اور فیکٹری سے بس اسٹاپ تک راستہ اکٹھے طے ہوتا رہا۔ نسیمہ نے بارہا اسے ٹکٹ لینے سے منع کیا اور ہر بار اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، کیا فرق پڑتا ہے!"

نسیمہ فیکٹری سے نکلتی تو وہ یوں اس سے آ ملتا جیسے اسی کا منتظر تھا...... خود نسیمہ نے بھی فیکٹری سے واپسی پر اس کا راستے میں مل جانا ایک معمول سمجھ لیا اور جس روز وہ نظر نہ آتا، نسیمہ کی نگاہیں نقاب کے پیچھے سے اسے ڈھونڈتی رہتیں۔ نسیمہ کے ساتھیوں میں چرچا ہونے لگا مگر نسیمہ ان چرچوں سے بے نیاز اصغر کے ساتھ آتی جاتی اور باتیں کرتی رہی۔

دو ڈھائی ماہ کے مختصر عرصے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی قریبی دوستوں کی طرح بہت کچھ جان چکے تھے۔ نسیمہ اس سے بلا تکلف فیکٹری کے واقعات سے لے کر ابا کی بیماری اور منو کی شرارتوں تک کا احوال بیان کرتی اور وہ اسے اپنی دور بیٹھی ماں اور بہنوں سے اس حد تک...... متعارف کرا چکا تھا کہ شاہدہ، رشیدہ اور ماں جی اسے اپنے ہی کنبے کے افراد محسوس ہوتے۔ اصغر اسے ماں کی طرف سے آنے والے خطوں کی تفصیل سناتا اور نسیمہ گھر میں ہونے والی ہر چھوٹی بڑی بات اصغر کو سنانے کے لیے سنبھال کر رکھتی۔ اسے یوں لگتا جیسے جہان بھر میں اس کا سب سے بڑا ہمدرد اور غم گسار اصغر ہی تو ہے جو ابا کی دن بہ دن بگڑتی ہوئی حالت کا سن کر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا تو منو کی شرارتوں کے قصے سن کر مسکرائے جاتا۔

رفتہ رفتہ اصغر اس سے ایسی باتیں بھی کرنے لگا جن کا محور صرف اور صرف وہی ہوتی۔ فاصلے گھٹے، قربتیں بڑھیں اور قربتوں نے اس لطیف جذبے کا روپ دھار لیا جسے محبت کہتے ہیں۔

نسیمہ حالات کی ماری مصائب کا مقابلہ کرتی ہوئی ایک کمزور سی لڑکی تھی لیکن محبت نے دل میں گھر کیا تو اسے اپنے کمزور جسم میں انوکھی توانائیاں محسوس ہونے لگیں، ایسی توانائیاں جن پر نہ اس کی ساتھیوں کی عجیب نگاہوں کا کوئی اثر تھا، نہ زمانے کا خوف۔ بے خطر، نڈر اور بے باک ہو کر وہ اصغر کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ اب وہ وقت جو گھر میں کتنا گراں گزرتا۔ چھٹی کا دن پہاڑ بن کر گزرتا۔ غیر شعوری طور پر اس کے چہرے پر بکھری مدقوق زردی نے گلابوں کی گلابی سی رنگت چرا لی۔ لبوں پر بکھری موت کی سی خاموشی اور چہرے پر چھائے حزن و ملال نے خمار آلود مسکان کا روپ دھار لیا۔ اپنا وجود اسے ہواؤں کے دوش پر اڑتا محسوس ہونے لگا۔ رات آتی تو ان گنت سہانے سپنے اس کی آنکھوں میں سمٹ آتے، صبح بیدار ہوتی تو انگ انگ سرشار ہوتا۔ اصغر نے بارہا اس سے اس کے گھر چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن وہ ہر بار ٹال گئی تھی۔ ایک روز جب وہ سرِ شام واپس لوٹ رہے تھے تو اصغر نے کسی قدر خفگی سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے تم چاہتی ہی نہیں کہ میں تمہارے

والدین سے کوئی بات کروں۔''

''یہ بات نہیں ہے اصغر، تمہیں معلوم ہے میرے گھر کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ ابا بستر پر پڑے ہیں، چھوٹے چھوٹے بہن بھائی اور اماں کا کوئی سہارا نہیں سوائے اللہ کے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کٹھن منزل میں...... اماں کو کسی طرح بھی یہ احساس ہو کہ مجھے ان سے زیادہ اپنی شادی کی فکر ہے۔''

''تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت؟ بات تو میں کروں گا۔''

''بے شک...... مگر بات تم کرو یا کسی کی وساطت سے کروائی جائے، اماں بچی تو نہیں کہ اصل قصہ نہ سمجھ سکیں گی۔''

''پھر؟'' اصغر نے بے تاب سے کہا۔

''پھر کیا...... بس مناسب وقت کا انتظار کرو۔''

''ناممکن...... اب انتظار قیامت ہے بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ ایک لڑکی جسے میں اپنی روح کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہوں اسی شہر میں ہر روز مجھ سے ملے اور اس کے باوجود جب میں گھر واپس لوٹوں تو اندھیرا میرا استقبال کرے...... نسیمہ اب خواہش ہونے لگی ہے کہ جب میں گھر واپس لوٹوں تو تم ہنستی مسکراتی میرے گھر میں روشنیوں کے ساتھ میرا استقبال کرو۔''

''حالات ذرا سازگار ہوجائیں......'' نسیمہ نے رسانیت سے کہا۔

''حالات کبھی سازگار نہیں ہوں گے، تم کیا سمجھتی ہو تمہارے ابا صحت یاب ہوجائیں گے؟''

''اصغر......!'' نسیمہ نے خفگی سے کہا۔

''معاف کرنا مجھے افسوس ہے مگر تم نہیں جانتیں نسیمہ محبت بڑی خودغرض ہوتی ہے۔''

☆☆☆

نومبر میں پھر فیکٹری میں کام بڑھ گیا۔ لڑکیاں اور عورتیں اوور ٹائم کرنے لگیں۔ اب نسیمہ کو کتنی بھی دیر ہوجاتی اسے قطعاً کوئی فکر نہ ہوتی بلکہ اس کی پوری کوشش ہوتی کہ رات خوب پھیل جائے۔ اصغر فیکٹری سے باہر اس کا منتظر ہوتا۔ اب رات کی تاریکی میں جب وہ اکٹھے بس اسٹاپ کی طرف رواں ہوتے تو اصغر چپکے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتا اور نسیمہ خود کو ہواؤں میں ڈولتا محسوس کرتی۔

انہی دنوں ایک رات جب نسیمہ اصغر کے ساتھ فیکٹری سے بس اسٹاپ کی طرف جارہی تھی اس نے پھر اپنا مطالبہ دہرایا، نسیمہ نے انتظار کرنے کا مشورہ دیا تو وہ جھنجلا کر بولا۔

''خدا کی قسم، اب تو گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ جاتا ہوں تو تاریکی منتظر ہوتی ہے اور جب روشنی کرتا ہوں تو ہر سمت تم ہی تم نظر آتی ہو۔''

''اس لیے آپ ڈر جاتے ہیں۔'' نسیمہ نے ہنس کر کہا۔

''مذاق میں مت ٹالو! یقین کرو ساری رات تمہارے تصور کے پیچھے لپکتا رہتا ہوں اور تم ہو کہ میرے قریب پہنچ کر آگے بھاگ جاتی ہو۔''

''خوب!'' نسیمہ ہنس دی۔

اگلی رات نسیمہ کو فیکٹری سے قدرے جلدی فراغت ہوگئی، باہر نکلی تو اصغر حسبِ معمول اسے اپنا منتظر ملا۔ اس نے راستہ طے کرتے ہوئے پھر اپنا مطالبہ دُہرایا اور اور جب نسیمہ نے ٹالنے کی کوشش کی تو وہ بولا۔

''اچھا سنو! تم اپنے گھر تو مجھے لے کر جاتی نہیں ہو، مگر میرے گھر چل کر وہاں کی بدحالی تو دیکھ سکتی ہو؟''

''نہیں بھئی!'' نسیمہ نے بلاتردد کہا۔

''کیوں......؟''

''کسی نے دیکھ لیا تو......؟''

''تو کیا ہوا......؟ اور اگر دنیا والوں کا مجھ سے زیادہ ہی خیال ہے تو رات کے وقت چلو۔''

''اونہوں۔'' نسیمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''گویا میرے گھر چلنا پسند نہیں تم کو؟''

''ایسے نہیں......'' نسیمہ ذومعنی بات کہہ کر مسکرائی۔

''اعتماد نہیں مجھ پر؟''

''ہے بہت زیادہ۔''

''تو پھر......؟''

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اصغر کا اصرار اتنا بڑھا کہ اسے بادل نخواستہ ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ لرزتی ٹانگوں سے وہ اصغر کے ساتھ رکشا میں بیٹھ گئی۔

رکشا سرپٹ دوڑتا رہا تھا اور نسیمہ اس شخص کے پہلو میں بیٹھی جس کی [illegible]فت کی وہ آنکھیں بن کر کے قسم کھا سکتی تھی، جس کے سپنوں سے اس کی راتیں سجی تھیں، انجانا خوف محسوس کررہی تھی۔ اس کے ذہن میں اب عجیب عجیب خدشے سر اٹھا رہے تھے مگر ہر خدشے کا سر اس جواز کے تحت کہ گزشتہ کئی ماہ سے وہ اس کے ساتھ آجا رہا تھا اور رات کی تاریکی میں اسے سنسان راستوں پر ملتا رہا تھا، ایک بار بھی اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کی تھی، وہ آپ ہی آپ کچلتی جارہی تھی۔ بالآخر ایک جگہ رکشا دھچکے سے رک گیا۔ رات ہورہی تھی۔ پہلے اصغر اترا پھر نسیمہ، رکشے والے کو اصغر نے ادائیگی

کی اور نسیمہ سے بولا۔

''آؤ......''

اصغر آگے اور نسیمہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک تاریک سی گلی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے نسیمہ کا ہاتھ تھام لیا اور پھر اچانک ہی چونک کر بولا۔

''ارے! تمہارے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہورہے ہیں؟''

''اماں پریشان ہوں گی۔'' نسیمہ نے دبی دبی آواز میں کہا۔

''باتیں مت بناؤ کل تم ساڑھے گیارہ بجے فیکٹری سے نکلی تھیں جبکہ ابھی شاید آٹھ ہی بجے ہوں گے۔''

دلیل معقول تھی نسیمہ احتجاج نہ کرسکی۔ چھوٹی سی گلی سے گزرتے ہوئے وہ ایک دروازے کے آگے رکے۔ اصغر نے جلدی سے قفل کھولا اور نسیمہ کا ہاتھ تھام کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر ہو کا عالم تھا۔

''دیکھا یہ تاریکی استقبال کرتی ہے تمہارے نام لیوا کا۔''

نسیمہ کا حلق خشک ہورہا تھا۔ وہ اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے اصغر کے ساتھ یہاں آنے کی ہامی بھرلی تھی۔ تاریکی میں پہلے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر چند ثانیوں کے توقف سے ماچس کی ڈبیا کے اندر تیلیوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی آواز ابھری۔ اصغر نے ایک تیلی سلگائی اور مدھم روشنی میں کمرے کا جائزہ لے کر سمت کا تعین کرنے کے بعد وہ ایک کونے میں بڑی میز پر رکھے لیمپ کے نزدیک جا پہنچا۔ بجھتی ہوئی تیلی زمین پر پھینک کر اس نے دوسری تیلی سلگائی اور لیمپ روشن کردیا۔ تاریک کمرے میں ملگجی روشنی بکھر گئی۔

''بیٹھو!'' اصغر نے نسیمہ سے کہا۔

''بس دیکھ لیا گھر آپ کا، اب واپس جاؤں گی۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے آئی ہو جانے ہی کے لیے، مگر کچھ دیر تو ٹھہرو!''

''اماں......'' لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی اصغر آگے بڑھا، اس کے برقعے کے اوپری حصے کا بند کھولا اور پھر نچلے حصے کے بٹن ایک ایک کرکے کھول دیے اور پھر برقعہ پلنگ کی جانب اچھالتے ہوئے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر پلنگ پر بٹھایا۔ نسیمہ کا دل ہی نہیں ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔ اب اسے احساس ہورہا تھا کہ رات کے وقت اصغر کے ساتھ تنہا آکر اس نے اچھا نہیں کیا تھا لیکن ذرا ہی دیر بعد اسے اصغر کی نیک نیتی پر یقین کرنا پڑا جب اس نے نسیمہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''گھبراؤ مت...... میں کوئی خراب آدمی نہیں۔ خدانخواستہ تمہیں اغوا کرکے نہیں لایا۔ تمہاری مرضی سے لایا ہوں۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں، اپنے آپ کو تمہاری نظروں میں رسوا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''کھانا کھاؤ گی؟''

نسیمہ نے نفی میں سر ہلایا مگر اصغر یہ کہتے ہوئے۔ ''الٹا سیدھا بدمزہ کھانا ہوگا دراصل میں صبح ہی پکا لیتا ہوں، دونوں وقت کا۔'' اپنی جگہ سے اٹھا اور اس تنگ کوٹھری نما کمرے کے ایک کونے میں پڑی چھوٹی سی چوکی پر سے روٹی کی چنگیر اور دیگچی میں سے ایک پلیٹ میں سالن نکال لایا اور بہت اصرار کرکے اسے اپنے ہی ہاتھوں سے کھلانا شروع کردیا۔

کھانے کے دوران ہی اصغر اچانک اٹھا اور ایک کونے میں موجود طاق کے نزدیک جاکر نسیمہ کے قریب واپس آیا تو نسیمہ نے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں قرآن مجید تھا۔ یہ صورت حال نسیمہ کے لیے انتہائی حیران کن تھی اتنی کہ وہ نوالہ چبانا بھول گئی۔ سوالیہ نگاہوں سے اس نے اصغر کی طرف دیکھا تو وہ بے حد سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اس نے جزدان کھولا، قرآن مجید نکالا اور اسے چوم کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے نسیمہ کے قریب بیٹھ کر بولا۔

''خدا کی اس پاک کتاب کے سامنے اقرار کرو کہ تم میری ہو۔''

اس غیر متوقع صورتِ حال سے ہچکچا کر وہ پیچھے ہٹی تو اس نے دائیں ہاتھ سے قرآن مجید بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے سینے سے لگاتے ہوئے نسیمہ کا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

''خدا کے حضور اقرار کرو کہ تم میری ہو۔''

''اصغر......'' وہ ہراساں ہورہی تھی۔

''دیکھو نسیمہ، یہ شادی بیاہ، نکاح، رخصتی سب دنیا دکھاوے کی باتیں ہیں۔ اصل اہمیت فریقین کے اقرار کی ہے میں خدا کے حضور دل و جان سے تمہیں اپنا بنانے کا اقرار کرتا ہوں، تم بھی اقرار کرو کہ......''

''اس طرح کیسے اصغر......؟'' نسیمہ جھجکی۔

''اس کا مطلب ہے تمہارا دل صاف نہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''یہ بات نہیں......'' نسیمہ نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"تو پھر اس کلام پاک کے روبرو اقرار کرو کہ تم دل وجان سے میری ہو۔"

"میں ...... میں ...... اقرار کرتی ہوں۔" نسیمہ نے اٹک اٹک کر کہا۔

اصغر نے قرآن مجید کو جزدان میں لپیٹا پھر چوم کر نسیمہ کی جانب بڑھا دیا۔ دل کی تمام صداقتوں سمیت نسیمہ نے اپنا سر جھکاتے ہوئے خدا کو حاضر وناظر جان کر اقرار کرتے ہوئے ...... قرآن مجید کو آنکھوں سے بوسہ دیا۔

"ایک بار پھر ......" اصغر نے کہا۔

"میں اقرار کرتی ہوں ......" نسیمہ نے پھر کہا۔

اصغر آگے بڑھا قرآن مجید کو بڑی احتیاط سے اس نے طاق میں رکھا اور پھر نسیمہ کے نزدیک آکر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"اب کوئی رسم ہو یا نہ ہو، خدا کی نظر میں ہم دونوں ایک ہو چکے ہیں، اب تم میری بیوی ہو۔"

نسیمہ نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا وہ جھکا، روشنی گل ہوئی اور نسیمہ انگور سے لدی شاخ کے مانند جھکتی چلی گئی۔

جو کچھ ہو گیا وہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا مگر یہ یقین تھا کہ جو کچھ ہوا وہ گناہ نہ تھا۔ خدا کے حضور ایک مقدس اقرار کا نتیجہ تھا، اسے حوصلہ دلا رہا تھا۔

رات گئے جب وہ چوروں کی طرح گھر واپس ہوئی تو اماں بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ گھر کا دروازہ یوں کھلا تھا جیسے اسی کا منتظر ہو۔ اصغر اسے ہزاروں تسلیاں اور دلاسے دینے کے بعد اس کی گلی کے نکڑ تک چھوڑ گیا تھا۔ نسیمہ کے گھر میں داخل ہوتے ہی اماں بے تابانہ اس کی طرف لپک آئیں۔

"بیٹی! آج تو بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں اماں، کام بہت زیادہ تھا۔" اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ یہ کھلا جھوٹ وہ اماں کے چہرے کی طرف دیکھ کر بول سکتی۔

"واہ میرے مولا! لوگوں کی بیٹیاں اس عمر میں ٹھاٹ کی نیند سوتی ہیں اور میری بچی ......" اماں کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا، غالباً انہیں یقین تھا مولا بن کہے ان کی ادھوری بات سمجھ گیا ہوگا۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے برقعہ اتارا ہی تھا کہ اماں پیچھے پیچھے آگئیں۔

"کھانا لاؤں؟" انہوں نے بے پناہ شفقت سے پوچھا۔

"بھوک نہیں ہے۔" اس نے اماں کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"ہاں دن بھر کی خشک آنتوں کو اب بھوک کہاں لگے گی مگر بیٹی زبردستی کھالو۔"

"بالکل نہیں۔" اس نے کروٹ سے لیٹتے ہوئے کہا۔

اماں نے بہت اصرار کیا مگر وہ بہ دستور کروٹ لیے پڑی انکار کرتی رہی۔ بالآخر اماں کو ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے لوٹنا پڑا۔

باقی رات نسیمہ نے جاگتی آنکھوں سے گزاری، جو ہو گیا تھا اس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہ ہو چکنے والی بات دل گداز بھی تھی اور روح فرسا بھی۔

اگلے دن جب اصغر سے ملاقات ہوئی تو نسیمہ کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ سہمی ہوئی تھی مگر اصغر اسے تسلیاں دیتا رہا۔ قسمیں کھا کھا کر کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑنے کے وعدے کرتا رہا۔

اگلے چند روز اس نے خاصے شش وپنج میں گزارے۔ اصغر اس دوران اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ دونوں اس قسم کے فیصلے کا پورا اختیار رکھتے تھے اور انہوں نے صحیح فیصلہ کیا ہے اور اگلے ہی ہفتے ایک شام فیکٹری سے واپسی پر برقعے کی دونوں نقابیں گرائے وہ پھر اصغر کے گھر جا رہی تھی۔ اصغر اسے یہ باور کرا چکا تھا کہ وہ گھر اب اسی کا ہے اور وہ دونوں اب راستی پر ہیں۔

تیسری بار اصغر نے اسے پھر گھر چلنے کی دعوت دی تو وہ سہم کر بولی۔ "کسی نے دیکھ لیا تو ......؟"

"تو کیا ......؟ میں مرد ہوں، تمہاری طرح کمزور اور بزدل نہیں۔ میں نے تمہیں اپنا کہا ہے اور مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکوں کہ نسیمہ میری ہے۔"

"نسیمہ میری ہے!" ان لفظوں میں جانے کیسا سحر تھا کہ نسیمہ کشاں کشاں چپ چاپ، بغیر کسی حیل وحجت کے پھر اس کے ساتھ ہولی۔

حسب سابق رات کی تاریکی میں اصغر اسے اس کی گلی تک چھوڑ آیا۔ اس بار گھر میں داخل ہوتے ہوئے نسیمہ ہراساں اور خائف نہ تھی اور اماں سمجھ رہی تھیں آج پھر اوور ٹائم لگا کر آئی ہے۔

پھر تو یہ آئے دن کا معمول بن گیا۔

اب اصغر نے نسیمہ سے اس کے گھر آنے اور اس کے والدین سے بات کرنے کا اصرار کرنا چھوڑ دیا تھا، نسیمہ اکثر ہول کر کہتی۔

"ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔"

"غلطی کیا، ہم خدا کے حضور ایک دوسرے کو اپنا چکے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اب کیا ہوگا؟ میرا مطلب ہے اس طرح کب تک ....؟" اس کا چہرہ فکروں میں ڈوب جاتا۔

"بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہم نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہے۔"

"ہاں ...... واقعی ......" نسیمہ سوچتی "ہم نے کوئی جرم تو نہیں کیا۔"

لیکن جو کچھ ہوا وہ کس قدر غیر دانش مندانہ تھا اس کا اندازہ نسیمہ کو اس وقت ہوا جب اصغر کئی دنوں تک اس سے نہ ملا اور جب وہ پریشان ہو کر ایک روز خود ہی اس کے گھر پہنچی، تو کوٹھری کے دروازے پر بڑا سا تالا پڑا تھا اور دروازے پر چاک سے لکھا تھا۔

"کرائے کے لیے خالی ہے!"

نسیمہ سن رہ گئی، اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کیا کرے ...... قرب وجوار میں بسنے والوں سے کسی قسم کا استفسار اسے مشکوک بنا دینے کو کافی ہوتا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے ...... نقاب گرائے وہ اس گلی سے سر جھکائے اس جواری کی طرح نکلی جو ساری پونجی ہار کر جا رہا ہو۔

اگلے چند روز قیامت بن کر گزرے اصغر کا کچھ پتا نہ تھا۔ دو تین بار وہ فیکٹری سے واپسی پر سندھی ہوٹل بھی گئی مگر کوٹھری کے دروازے پر تالا پڑا پایا۔ چاک سے لکھے جانے والے "کرائے کے لیے خالی ہے" کے الفاظ دھندلانے لگے تھے۔ تیسری مرتبہ اس نے جرأت کر کے گلی میں کھیلنے والے لڑکوں سے اصغر کی بابت پوچھ ہی لیا۔

"پتا نہیں جی، چلے گئے ہیں اصغر بھائی، اب تو یہ کمرا کرائے کے لیے خالی ہے۔" جواب ملا۔

اور اس جواب نے اسے تاریکیوں میں دھکیل دیا۔

فیکٹری سے اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے وہ اصغر کی تلاش میں نقاب کے پیچھے سے ہر مرد کو گھورتی چلتی۔ بس میں سوار ہوتی تو اس کی آنکھیں نقاب کے پیچھے سے مردانے حصے پر ٹکی رہتیں، اس کے کان ٹکٹ ہو گیا ہے ان کا، کی صدا کے منتظر رہتے۔ مگر یہ ساری تگ ودو، تلاش اور جستجو ناکام رہی، اسے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اسے ملنا ہوتا تو ماضی کی طرح گم کیوں ہوتا۔ کبھی جی ہی جی میں وہ اسے برا بھلا کہنے لگتی اور کبھی وہ اسے اس قدر ٹوٹ کر یاد آتا کہ وہ مضطرب ہو جاتی۔ رات کے کسی سمے آنکھ کھل جاتی تو بقیہ رات کاٹنی مشکل ہو جاتی۔ وہ بے وفا جب یاد آتا تو نسیمہ اس باوفا عورت کی طرح جو ایک مرد کی خاطر ساری رسوائیاں اور بدنامیاں مول لینے پر تیار نظر آتی ہے، سوچتی ......

"خدا نہ کرے کچھ ہو نہ گیا ہو! ایسے بے مروت تو وہ ہو نہیں سکتے۔" اسے اصغر کی قسمیں اور وعدے یاد آتے۔

"خدایا! وہ جہاں بھی ہوں اپنی امان میں رکھنا ......" وہ صدق دل سے کسی سہاگن کی طرح اپنے سہاگ کی سلامتی کے لیے دعا گو ہو جاتی۔ اسے یقین تھا ایک روز وہ پھر اسے فیکٹری سے بس اسٹاپ کو جانے والے راستے پر اسی کھمبے کے نزدیک کھڑا مسکراتا ہوا نظر آجائے گا۔ وہ شکر کرے گی اور وہ مسکرا کر کہے گا۔

"ماں بہنوں سے ملنے چلا گیا تھا۔"

تصور ہی تصور میں اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں۔

"پگلی! میں نے تمہیں اپنا کہا ہے اور مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکوں، نسیمہ میری ہے۔"

کانوں میں جلترنگ سی بجتی۔

دنوں خوش فہمیوں میں مبتلا وہ داسی بن کر اس کے خیال کی پوجا کرتی رہی، اسے اپنی روح وتن کا مالک، اپنے جسم وروح کو اس کی امانت سمجھتی رہی لیکن اسے نہ آنا تھا نہ آیا۔

یوں جانے والے بھی بھلا آیا کرتے ہیں۔

خام خیالیوں اور خوش فہمیوں نے اسے کچھ نہ دیا سوائے اس کے کہ اس کی طبیعت مضمحل رہنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کرے۔ اس نئی زندگی کے استقبال کو تیار ہو جائے یا اس کا وہیں سر کچل ڈالے۔ خودکشی کا ارادہ وہ ضرور کر سکتی تھی مگر اسے عملی جامہ پہنانے سے یکسر قاصر تھی۔ موت سے اسے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ وہ تو کسی کے مرنے کی خبر سن کر ہی زرد پڑ جایا کرتی تھی۔ کجا اپنے ہاتھوں اپنا خاتمہ!

تمام راہیں مسدود پا کر ایک روز ڈرتے ڈرتے اس نے ایک خستہ حال مطب میں بیٹھنے والی لیڈی ڈاکٹر کا رخ کیا۔ مگر دروازے تک جا کر لوٹ آئی۔ بدنامی کے خوف نے اسے سر تا پا پسینے میں نہلا دیا۔

یوں طبیعت تو اس کی گری گری رہتی ہی تھی مگر ایک روز شام کے وقت جب وہ گھر پہنچی تو اس بری طرح طبیعت بگڑی کہ اماں اس کے ہزار انکار کے باوجود زبردستی ڈاکٹر کے ہاں کھینچ لے گئیں۔ معائنے کے بعد جب ڈاکٹر نے اماں کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ماں بننے والی ہے!"

تو ماں کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ نسیمہ غیرت اور شرم کے مارے اماں سے نظریں نہ ملا سکی۔ غنیمت ہوا کہ ڈاکٹر نسخہ لکھنے میں مصروف تھا ورنہ ان دونوں کے چہروں کے تاثرات اس کے لیے خاصے معنی خیز ہوتے۔ نسیمہ کا جی چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اسی وقت اس میں گڑ جائے۔ اب اسے یہ کون بتاتا کہ زمین بھی آسانی سے نہیں پھٹتی۔ دونوں نقابیں گرائے وہ اماں کے ساتھ مطب سے باہر نکلی تو اماں کسی پتھر کی طرح خاموش تھیں۔

گھر پہنچتے ہی نسیمہ نے چھوٹے کمرے کے ایک کونے میں منہ دبکایا اور دم سادھ کر پڑ گئی۔ اماں سے نظریں ملانے کی تاب تھی نہ جرأت۔ رات گہری پڑ جانے کے بعد جب سب سو گئے تو اماں کمرے میں آئیں اور دبی دبی آواز میں بولیں۔

"غربت میں یہ کیسا کلنک کا ٹیکا لگایا ہے تو نے ہمارے منہ پر؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"کم سے کم بیمار باپ کا ہی خیال کیا ہوتا۔" اماں کی آواز میں لرزش بھی تھی، بے بسی بھی۔ یوں لگتا تھا وہ رو دینے کو تھیں۔

"دنیا کیا تھوکے گی ہمارے جنم میں؟" وہ اپنی آواز کو حلق میں گھونٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"نوکری تو نے ہی تو نہیں کی سیکڑوں لڑکیاں کر رہی ہیں۔ سب یہ گل کھلانے لگیں تو ماں باپ ...."

اماں کی بات ادھوری رہ گئی اور ان کی سسکیاں کمرے کی خاموش فضا کو بوجھل کرتی چلی گئیں۔ وہ گٹھری بنی پڑی رہی، اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ بے بسی سے روتی ہوئی ماں کو دلاسا دے یا جرأتِ رندانہ سے کام لے کر انہیں بتا دے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا قرآن مجید میرا گواہ ہے۔

اماں دیر تک گھٹی گھٹی سسکیاں لیتی رہیں، اسے کوستی رہیں۔ دبی دبی آواز میں اس کے مر جانے کی دعائیں مانگتی رہیں اور وہ کسی مجرم کی طرح لب بر مہر کیے پڑی رہی۔

وہ رات اماں اور نسیمہ کے درمیان وہ خلیج حائل کر گئی جو پھر کبھی نہ ہٹ سکی۔ اس رات کے بعد سے اماں اس سے یوں اجنبی اجنبی اور اکھڑی اکھڑی سی نظر آتیں جیسے اپنی کوکھ سے اس کا نشان اور اپنے دل سے اس کا نام کھرچ پھینکا ہو۔

☆☆☆

چند دن بعد ہی ممانی دلہن نے مسکراتے ہوئے نسیمہ کو یہ خبر سنائی کہ اس کے ہاں کوئی ننھا بھائی بہن آنے والا تھا۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر جلد ہی اپنے پرایوں میں پھیلتی چلی گئی، اسے حیرت ہوئی کہ اماں خود اس خبر کے چرچے میں پیش پیش تھیں۔ گھر میں کوئی عزیز رشتہ دار خواتین آتیں یا کوئی محلے والی۔ اماں یہ خبر ہر آنے جانے والی کو یوں سناتیں جیسے وہ برس بھر کی بیاہی دلہن ہوں جو پہلی بار ماں بننے والی ہو۔ نسیمہ کے لیے یہ صورتِ حال خاصی حیرت افزا تھی۔

یہ بھی قدرت کا کرم ہوا کہ اس کی جسمانی ہیئت کچھ زیادہ بگڑتی نظر نہیں آئی۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ خود کو طرار نگاہوں کی زد میں آنے سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتی۔ جاڑے شروع ہو چکے تھے۔ وہ بڑی سی شال میں اپنا جسم لپیٹے رہتی۔ اماں پر بھید کھلنے کے بعد وہ اپنے ہی گھر میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کونوں کھدروں میں دبکی پھرتی۔ فیکٹری سے واپسی کے بعد اور چھٹی والے دن اس کا زیادہ تر وقت کمرے ہی میں گزرتا۔ گھر آئے مہمانوں کے سامنے وہ شاذ و نادر ہی آتی۔ فیکٹری جاتی تو ڈھیلے ڈھالے برقعے میں اور برقعہ اتارتے ہی جلدی سے شال لپیٹ لیتی۔

پانچویں ماہ اچانک ہی اماں نے ابا کے معالج کی اس ہدایت پر عمل کرنے کی تیاری شروع کر دی جو وہ گزشتہ ڈیڑھ برس سے دیتا آ رہا تھا۔ نسیمہ کو پتا ہوتا کہ اس کی ان پڑھ ماں کا ذہن کسی منصوبے پر عمل کر رہا تھا تو وہ یقیناً ششدر رہ جاتی فی الحال تو یہ سارے کام فطری انداز میں ہوتے نظر آ رہے تھے ماسوائے اس کے کہ اماں کے بارے میں جو خبر گرم تھی بہ ظاہر تو اس کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔

ابا کی تبدیلی آب و ہوا کے لیے اماں نے رختِ سفر باندھا۔ شمیمہ اور نعیمہ کو خالہ اماں کی عاجزانہ درخواست پر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اپنے پاس رکھنے پر رضامند ہو گئیں۔ نسیمہ اس مختصر قافلے میں کیوں شامل تھی اس کا جواز اماں کے پاس انتہائی معقول تھا۔ جوان بیٹوں والی بہن یا بھاوجوں کے پاس بھلا وہ جوان بیٹی کو کیسے چھوڑ جاتیں۔

کھانستے، کراہتے، دق کے مارے ابا، اماں اور پتھر کے مانند خاموش، کسی سہمی ہوئی چڑیا کے مانند جس کے پر صیاد نے کاٹ دیے ہوں، نسیمہ اور منو پر مشتمل یہ کارواں کوئٹہ کی جانب رواں ہو گیا جہاں ایک پسماندہ علاقے میں نسیمہ کی نانی رہتی تھیں جن کی آنکھوں میں برسوں پہلے موتیا بند اتر آیا تھا۔

کوئٹہ پہنچتے ہی ابا نے پلنگ سنبھالا۔ اماں نے اپنی

بوڑھی ماں کو گزرے دنوں کی داستان اور دیگر عزیز رشتہ داروں کا احوال بتانا شروع کر دیا۔ کوئٹہ میں دور پار کے رشتہ داروں کے سوا قریبی عزیز کوئی بھی نہ تھا۔ نسیمہ کے ماموؤں، خالہ اور خود اماں نے ماں کو کسی زمانے میں کوئٹہ سے کراچی لے جانے کی بڑی کوشش کی تھی مگر پرانے وقتوں کی اس باوفا عورت نے زمین کے اس ٹکڑے سے دور جانے سے صاف انکار کر دیا تھا جہاں اس شخص کی قبر تھی جو کبھی اس کی مانگ کی افشاں بن کر رہا تھا۔

نانی نے، جن کی آنکھوں کے دیے بجھ چکے تھے، اپنی بیٹی اور نواسی کے جسموں پر ہاتھ پھیر پھیر کر آنکھوں کی پیاس بجھائی۔ بوڑھے جھریوں بھرے ہاتھ کپکپاتے ہوئے نسیمہ کے بدن پر رینگتے چلے جاتے، اسے یوں لگتا جیسے نانی اپنی انگلیوں کی پوروں سے کسی روز وہ راز دریافت کر لیں گی چنانچہ وہ ان سے دور دور رہنے کی کوشش کرتی۔ نانی کے آس پڑوس کی کئی ملنے والیاں ان لوگوں کے آنے کی خبر سن کر ملنے آئیں تو نسیمہ گارے مٹی کے بنے تین کمروں والے اس مکان کی اس کوٹھری میں دبک گئی جو کسی زمانے میں اسٹور کا کام دیتا ہوگا۔ ان ملنے والیوں سے اماں اس رکھائی سے پیش آئیں کہ جو ایک بار آیا وہ پلٹ کر نہ آیا اور بہت جلد یہ سلسلہ رک گیا۔ نسیمہ کو اماں نے اشاروں کنایوں سے بتا دیا تھا کہ اسے زیادہ وقت کوٹھری ہی میں گزارنا ہوگا۔

مہینا بھر بعد ہی خالہ کی طرف سے خط آنے لگے جن میں خیر و عافیت کم اور شمیمہ اور نعیمہ کی بدتمیزیوں اور شکایتوں کا احوال زیادہ ہوتا۔ حالات نے نسیمہ اور اماں کے درمیان خلیج حائل نہ کر دی ہوتی تو وہ ایسا پہلا خط ملتے ہی اماں کو واپس چلنے پر مجبور کر دیتی۔ اسے ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی اس کے بھائی بہنوں میں عیب جوئی کرے۔

یوں ہی خط آتے رہے، نسیمہ آپ ہی آپ جلتی رہی اور اماں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی رہیں۔ انہیں پتا تھا اس نازک موقعے پر ان کی ذرا سی لغزش ان سب کو بدنامی کی عمیق کھائیوں میں دھکیل سکتی تھی۔ عزت کی خاطر انسان کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے، کیسے سوانگ رچاتا ہے، کاش کوئی اماں سے پوچھتا۔

بالآخر وہ نازک گھڑی بھی آ پہنچی۔ یوں طبیعت تو اس کی صبح ہی سے خراب تھی اور وہ کوٹھری میں دم سادھے پڑی تھی مگر شام تک طبیعت ان کہی ہو گئی۔ اماں ہراساں تھیں، بار بار آتیں چوروں کی طرح بند کوٹھری کا دروازہ کھولتیں ایک نظر اس پر ڈالتیں اور چلی جاتیں۔ بڑے کمرے میں جو

شرط

دو آدمی چارپائی پر بیٹھے گپیں لگا رہے تھے۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی لنگڑاتا ہوا آ رہا ہے۔ ان آدمیوں کو شرط لگانے کا بہت شوق تھا۔ ایک بولا۔ "میرے خیال میں اس آدمی کے پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔"

دوسرا بولا۔ "لگ گئی پانچ پانچ سو کی۔ اس آدمی کو کبھی گولی لگی تھی۔ گولی تو نکل گئی ہوگی لیکن لنگڑاہٹ باقی رہ گئی ہے۔"

"لگ گئی۔" پہلے نے دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ جب وہ آدمی قریب آیا۔ تو انہوں نے اس سے لنگڑا کر چلنے کی وجہ پوچھی اور ساتھ ہی اپنی شرط کے متعلق بھی بتا دیا۔

وہ آدمی ہنس کر بولا۔ "لاؤ ہزار روپے مجھے دے دو، تم دونوں شرط ہار گئے ہو۔" پھر اس نے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو، میری تو جوتی ہی ٹوٹی ہوئی ہے۔"

***

انتظار

ایک بے وقوف کا جوتا کسی نے مسجد سے چرا لیا، وہ سیدھا قبرستان پہنچا اور وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں اس کا ایک دوست ادھر سے گزرا۔ اس نے بے وقوف سے پوچھا۔ "یار خیریت ہے، یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

بے وقوف بولا۔ "یار میرا جوتا کسی نے مسجد سے چرا لیا ہے۔"

دوست بولا۔ "تو جا کر چور کو تلاش کرو۔"

بے وقوف نے کہا۔ "اب میں اس کمبخت کو کہاں کہاں ڈھونڈوں آخر ایک نہ ایک دن اسے ادھر ہی آنا ہے۔"

***

میکہ

ایک خاتون دوسری سے۔ "میں بہت پریشان ہوں، کاش میرا میکہ اس شہر میں نہ ہوتا یا یہ شہر ہی بڑا ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" دوسری خاتون نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں جب بھی اپنے شوہر کو میکے جانے کی دھمکی دیتی ہوں، تو وہ رکشے کا کرایہ میرے ہاتھ پہ رکھ دیتے ہیں۔"

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

کوٹھری سے کافی فاصلے پر تھا، ابا، اماں اور نانی کی چارپائیاں بچھی تھیں۔ نانی بڑے فخر سے بتایا کرتی تھیں یہ چارپائیاں اور گھر کا سارا سامان نانا کے زمانے کا ہے۔ اب تو بے چاری ان دو دکانوں کے کرائے پر بسر کرتی تھیں جو نانا چھوڑ کر مرے تھے۔

اماں نے جو اس نازک گھڑی کی قربت سے ہراساں ہو رہی تھیں، سرِشام ہی نانی کو کھانا کھلا کر ان کا بستر بچھا دیا تھا۔ پلنگ پر لیٹنے سے قبل نانی نے جو صبح سے کئی بار نسیمہ کی بابت پوچھ چکی تھیں، ایک بار پھر استفسار کیا۔ ان کے استفسار پر اماں نے وہ بہانہ تراشا جو خود ان کی آنکھوں کے گوشے بھی نم کر گیا۔ انہوں نے کہا تھا۔

"وہ دن بھر اپنے جہیز کی چادر کاڑھتی رہی ہے، اب تھک کر لیٹ گئی ہے۔"

پھر انہوں نے دکھے دل سے سوچا کاش ایسا ہی ہوتا۔

کوٹھری کی خاموش فضا، نسیمہ کی گھٹی گھٹی سسکیوں اور حلق میں ہی گھٹ کر رہ جانے والی آہوں سے بوجھل تھی۔ یہ کوٹھریاں بھی کیسے کیسے رازوں کی امین ہوتی ہیں!

دھند لکا چھایا، اماں نے شکر ادا کیا اور کڑوے تیل کا ایک چراغ جلا کر کوٹھری میں رکھ آئیں۔ اماں کی بے رخی اور اجنبیت پر اس کا جی کٹ کے رہ گیا۔ کٹھن لمحوں میں جبکہ وہ تسلی کے دو بولوں کو ترس رہی تھی، کوئی نہ تھا جو اس کا ہاتھ تھام کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مشکل گھڑیاں آسان ہو جانے کا دلاسا دیتا۔

تاریکی بڑھی۔

رات گہری ہوئی اور اماں کی جان میں جان آئی۔ زندگی کے اب تک کے سفر میں بیسیوں کٹھنائیاں آئی تھیں، کتنے ہی آزمائشی مقام آئے تھے مگر یہ واحد آزمائش تھی جو اماں کو خون کے آنسو رلا رہی تھی۔ شرافت بڑی ظالم شے ہے جو غربت سے مل جائے تو بڑا ستم ڈھاتی ہے۔

اس رات کوئٹہ کی اس بستی میں جب شرافت اور مفلسی نے سر جوڑا تو ایسی سازش کی کہ رات کی تاریکی میں اماں کی مامتا کو پچھاڑ ڈالا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس وقت وہ نسیمہ جس کی ذرا سی تکلیف انہیں مضطرب کر دیا کرتی تھی، نیم تاریک کوٹھری میں تنہا ماہیِ بے آب کے مانند تڑپ رہی ہے، رات گہری پڑتے ہی وہ کوٹھری کے دروازے کی زنگ آلود کنڈی چڑھا کر اسے مقفل کر کے برقعہ سر پر لیے دبے پاؤں اس اندھی دایہ کی جھونپڑی کی سمت روانہ ہو گئیں جو سڑک پار خانہ بدوشوں کے ڈیرے کے پیچھے رہتی تھی اور جس کے بارے میں انہوں نے نہ صرف خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں بلکہ ایک بار جا کر اس کا گھر بھی باہر سے دیکھ آئی تھیں تاکہ وقت پڑنے پر دوڑ سکیں۔ اس وقت لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ سرتاپا پسینے میں نہائے جا رہی تھیں۔ نسیمہ کی جان اور سلامتی سے زیادہ انہیں یہ فکر تھی کہ عزت بچ جائے۔ خاندان کے دامن پر کوئی دھبّا نہ لگے۔ آزمائش کی جس بھٹی میں وہ کئی ماہ سے تپ رہی تھیں بخیر و خوبی ٹھنڈی پڑ جائے اور وہ پیچیدہ منصوبہ جو عزت بچانے کی خاطر ان کے ذہن نے بنایا تھا، کامیاب ہو جائے۔

یقیناً خدا کو عزت بچانا منظور ہی تھا تب ہی تو ٹاٹ کے بھاری پردے کے پیچھے بوڑھی دایہ جاگتی ہوئی ملی۔ اس کا بیٹا کام پر سے واپس نہ آیا تھا اور وہ رات کے وقت کسی صورت جانے کو تیار نہ تھی مگر اماں نے ہاتھ پاؤں جوڑے، واسطے دیے تو وہ ان کا ہاتھ تھامے چل دی۔ آہستگی سے قفل کھول کر اماں نے دروازہ کھولا اور دایہ کے اندھی ہونے پر صد شکر ادا کیا پھر اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہو گئیں۔ انہیں دیکھ کر نسیمہ کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں امید کی ...... روشنیاں لہرائیں۔ تخلیق کا یہ تجربہ، نسیمہ کے لیے جاں گداز بھی تھا اور کرب انگیز بھی۔

رات کے پچھلے پہر اس کوٹھری میں اپنی تخلیق کی پہلی صدا نسیمہ کے کانوں میں پڑی تو اس کے دل کے سارے تاریک وقت جھنجنا اٹھے۔ یہ کیسی ان کہی کیفیت تھی، کیسا گداز اور سحر تھا اس دبی دبی صدا میں کہ وہ سرتاپا اس نشے میں ڈوب کر رہ گئی۔ ساری تکلیف، تمام آلام و مصائب بھول گئی۔ عورت بھی دیوانی ہوتی ہے، ماں بن جائے تو ماضی کے دکھ، حال اور مستقبل کے خدشوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

"مبارک ہو بیٹا ہے۔" بڑھیا نے ہاتھوں سے ٹٹول کر کہا تو نسیمہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کانوں میں جلترنگ سی بج اٹھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری کائنات اسے مبارک باد دے رہی ہو، مسرت کا پیغام سنا رہی ہو۔

کوٹھری ہی میں اسے نہلا دھلا کر ایک پرانے کپڑے میں لپیٹنے کے بعد بڑی بی نے ...... پلنگ ٹٹول کر اسے نسیمہ کی آغوش میں لا کر لٹا دیا۔

بڑی بی کو اجرت کی رقم کے ساتھ اماں واپس چھوڑنے گئیں تو جاتے جاتے کوٹھری کو پھر باہر سے مقفل کر گئیں۔ اب نسیمہ کو کوئی فکر نہ تھی۔ شاید ہر طرح کے احساسات ہمارے اپنے اندر سے جنم لیتے ہیں۔ اب اس کے ارد گرد، اندر باہر ایک گداز سا احساس تھا۔ روح ایک نئے جذبے سے سرشار تھی۔

کوٹھری کا دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے اپنے پہلو میں لیٹے اس گوشت پوست کے گڈے کو دیکھا جو آنکھیں میچے پڑا تھا۔ آپ ہی آپ نسیمہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ چور نگاہوں سے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دھیرے سے ہاتھ کو خم دے کر اس کے گلابی گالوں کو چھوا تو اسے یوں لگا جیسے وہ آسمان کو چھو آئی ہو۔ پھر اس نے ننھی ننھی سی سیاہ آنکھیں کھولیں تو نسیمہ کو یوں لگا جیسے تاریک راستوں میں چراغ جل اٹھے ہوں۔

تقریباً پون گھنٹے بعد کوٹھری کا دروازہ کھلا، اماں اندر داخل ہوئیں۔ بہ دستور اسی اجنبیت اور غیریت کے جذبات کے ساتھ صبح ہونے میں اب ذرا ہی دیر باقی تھی۔ ان کے چہرے پر اب ٹھہراؤ اور سکون کی سی کیفیت تھی مگر نسیمہ سے وہ اب بھی خفا نظر آتی تھیں۔ اس کے پلنگ کے نزدیک آ کر انہوں نے نسیمہ کی جانب دیکھے بغیر اس کے پہلو میں لیٹے جیتے جاگتے گڈے کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اس کا دل ہول اٹھا اس خوف سے کہ کہیں اماں اس کی زندگی کو اس کی اس اوّلین تخلیق کو عزت کی بھینٹ نہ چڑھا دیں۔ وہ کانپ اٹھی اس سے پہلے کہ اس کے لب وا ہوتے اماں تلخ لہجے میں بولیں۔

"سب کو یہی بتانا ہے کہ بھائی ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

وہ آنکھیں پھاڑے، ٹکر ٹکر اماں کو دیکھتی رہ گئی۔ زباں بے صدا رہی مگر رواں رواں پکارا، دل کی ہر دھڑکن نے التجا کی۔

"خدا کے واسطے اسے مجھ سے نہ چھینو، میری آغوش تو گرم ہو لینے دو......"

اب اس کی سمجھ میں سب کچھ آ چکا تھا، اپنی آنکھوں پر بازو پھیلا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آنسو قطار اندر قطار اس کے تکیے بھگوتے چلے گئے۔

پو پھٹنے تک وہ انگاروں پر کروٹیں لیتی رہی۔

پھر نانی راستہ ٹٹولتی، اسے آوازیں دیتی کوٹھری تک آ پہنچیں۔

"اری بچی! رات کو تو اکیلی لینے گئی دائی کو، مجھ کو اٹھا لیا ہوتا۔ اے مجھ دیدوں پھوٹی کی ایسی نیند کہ سرہانے ڈھول بجیں اور آنکھ ہی نہ کھلے، خیر بھائی مبارک ہو۔"

وہ صورتِ حال بخوبی سمجھ گئی۔ کلیجا کٹ کر رہ گیا۔ نانی بینا ہوتیں تو چہرے پر بکھری زردیاں گواہی دیتیں کہ وہ اس نئی زندگی کی بہن نہیں، ماں تھی۔

بڑی ہمت کر کے وہ اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی نانی کے ہمراہ کوٹھری سے ملحق کمرے میں آ گئی اور جو کچھ اس نے دیکھا اسے دیکھ کر دل میں قیامت سی مچ گئی۔ کمرے میں پڑے نواڑی پلنگ پر اماں لیٹی تھیں۔ ان کے پہلو میں اس کا جگر گوشہ سو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا اس ننھے منے نرم نرم وجود کو اپنی آغوش میں بھینچ کر خوب پیار کرے، سینے میں چھپا لے۔ چور نگاہوں سے اس نے اماں کی طرف دیکھا تو وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

پندرہویں دن اماں کو طوفان بلا ٹل جانے کا یقین ہو گیا اور نسیمہ کی حالت نسبتاً بہتر ہو گئی تو انہوں نے واپسی کے لیے سامان باندھنا شروع کر دیا...... ان کے اصرار کے باوجود نانی کسی صورت ان کے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئیں۔ یہ

کون کہاں رہتا ہے؟

لقمان نے کہا۔ "جب پہلی بار عقل میرے پاس آئی تو میں نے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا۔ "عقل" میں نے پوچھا "کہاں رہتی ہو" جواب ملا۔ "سر میں" پھر شرم آئی پوچھا "کہاں رہتی ہو۔" جواب ملا "آنکھوں میں" شرم کے بعد محبت آئی پوچھا۔ "کہاں رہتی ہو۔" جواب ملا۔ "دل میں۔" پھر تقدیر سے پوچھا۔ کہاں رہتی ہو۔ تقدیر نے جواب دیا۔ "سر میں۔" میں نے حیرت سے کہا، وہاں تو عقل قیام پذیر ہے۔ تقدیر نے جواب دیا۔ "جب میں آتی ہوں تو عقل رخصت ہو جاتی ہے۔" اس کے ہٹتے ہی عشق آیا۔ کہاں رہتے ہو؟ جواب میں اس نے کہا۔ "آنکھوں میں" میں نے حیرت سے کہا کہ وہاں تو شرم کا مقام ہے۔ کہنے لگا ٹھیک کہا "آپ نے لیکن جب میں آتا ہوں تو شرم رخصت ہو جاتی ہے۔" سب سے آخر میں طمع یعنی لالچ آئی، پوچھا۔ "جناب آپ کہاں رہتی ہو؟" کہنے لگی۔ "دل میں۔" گھبرا کر پوچھا۔ "وہاں تو محبت رہتی ہے۔" ہنس کر بولی۔ "میں آتی ہوں تو محبت رخصت ہو جاتی ہے۔"

مرسلہ: جنید احمد ملک، گلستان جوہر، کراچی

پندرہ دن نسیمہ پر پندرہ صدیاں بن کے گزرے تھے۔
رات کے وقت جب اس کے رونے کی آواز نسیمہ کے کانوں سے ٹکراتی تو اس کا جی چاہتا ساری حیاداری تمام رکاوٹیں توڑ تاڑ کر اماں کے پلنگ کے نزدیک پہنچ کر اسے اپنے بازوؤں میں چھپالے سینے میں دبکالے۔ لیکن ایک بے نام احساس جرم اس کا احاطہ کرلیتا، زمین اس کے قدم پکڑ لیتی اور وہ بے بس ہو کر سوچتی، اس سے تو بہتر تھا وہ سچ مچ اماں کی کوکھ سے پیدا ہوا ہوتا، وہ واقعی اس کا بھائی ہوتا، تاکہ وہ اسے اپنے سینے سے تو لگا سکتی، اس کی پیشانی، اس کے گال اور ننھے منے ہاتھ تو چوم سکتی۔ کیسا المیہ تھا!

واپسی پر دوران سفر ابا سارے رشتے ناتے توڑ چپ چاپ چلے گئے۔ اماں بیوہ ہوگئیں۔ کراچی پہنچنے پر شمیمہ اور نعیمہ جہاں ابا کی موت پر افسردہ ہوئیں وہیں ننھے منے بھائی کو دیکھ کر حیران بھی ہوئیں اور خوش بھی۔ ابا کی تدفین میں شرکت کرنے والے اپنے پرایوں نے اماں کی گود میں ایک ننھا بچہ دیکھا تو انہیں قطعی حیرت نہ ہوئی اس لیے کہ اماں پہلے ہی ننھے مہمان کی آمد کا چرچا کر کے گئی تھیں اور اب اماں مطمئن تھیں کہ عزت بچ گئی تھی ورنہ کیسی جگ ہنسائی ہوتی۔

ابا کے دسویں کے بعد نسیمہ فیکٹری گئی تو بغیر اطلاع کیے پانچ ماہ غائب رہنے کی پاداش میں وہ برطرف کی جاچکی تھی۔ اسے نئے سرے سے ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرنا پڑی لیکن اس بار اس نے پچھلی مرتبہ کی طرح دھکے نہیں کھائے۔ بہت جلد وہ دوائیوں کی ایک کمپنی میں پیکنگ کے کام پر لگ گئی۔ کام نسبتاً کم محنت طلب اور تنخواہ نسبتاً بہتر تھی۔
نئی ملازمت کا آغاز اس نے اس عزم کے ساتھ کیا کہ اب اسے بھائی بہنوں کے ساتھ اپنے دل کے ٹکڑے کے لیے بھی محنت کرنی ہے جس کا نام ممانی دلہن نے آفاق تجویز کیا تھا، اس کے دل کا یہ ٹکڑا اس دنیا میں بلاشبہ ایک ایسی کٹھن آزمائش کی صورت میں آیا تھا جو دن بھر اسے آزردہ رکھتی تو راتوں کو خون کے آنسو رلاتی۔

اماں بڑی محتاط نظر آتی تھیں۔ شروع شروع میں ان کی حتی الامکان کوشش یہی رہی کہ وہ آفاق کے قریب رہیں اور اسے تنہا نہ چھوڑیں، شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ نسیمہ اس کی قربت سے پگھل کر لوگوں کے سامنے بکھر جائے لیکن دھیرے دھیرے اس احتیاط کی شدت میں کمی آتی گئی۔ پہلے اماں انتہائی ضرورت کے عالم ہی میں اس کے قریب سے ہٹتی تھیں، اب اکثر اسے کمرے میں چھوڑ کر باورچی خانے یا گھر کے کسی اور کام میں مصروف ہوجاتیں۔ یہ لمحے نسیمہ کے لیے آب حیات سے بڑھ کر حیات بخش اور لعل و جواہر سے زیادہ قیمتی ہوتے۔ اماں شاذ و نادر ہی اسے کمرے سے باہر نکالتیں۔ شمیمہ، نعیمہ اور منو بلا تکلف اماں کے کمرے میں گھس کر اسے چومتے، اس کی ننھی ننھی ہتھیلیوں کو بوسے دیتے اور وہ لمحوں کا عذاب سہتی، اندر ہی اندر کسی مومی شمع کے مانند پگھلتی رہتی، اس صورت حال نے اسے ایسے ذہنی انتشار اور چڑچڑے پن میں مبتلا کردیا کہ بہن بھائیوں سے بھی اس کی بات چیت برائے نام ہی رہ گئی۔

لیکن آخر کب تک؟

ایک شام پیاس بہت بڑھی تو وہ جو فیکٹری سے آنے کے بعد اپنا زیادہ تر وقت کمرے ہی میں گزارتی تھی۔ اماں کے کمرے کی طرف لپک گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا وہ بے تابانہ اندر داخل ہوگئی۔ اس کا نور العین گدیلے پر پڑا سو رہا تھا۔ چوروں کی طرح سے اس نے دروازے کی طرف دیکھا پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ دھیرے سے اس نے گال چھوا اور اپنی انگلیاں چوم لیں۔ آپ ہی آپ ......وہ کسی داسی کی طرح نیم خم ہوتی چلی گئی۔ سر جھکا اور آنکھیں برس اٹھیں۔ وہ سو رہا تھا، کبھی اس کے لب مسکرانے لگتے اور کبھی وہ منہ بسورنے لگتا۔ وہ مسکراتا تو نسیمہ کی روتی ہوئی آنکھیں بھی مسکرانے لگتیں لیکن ابھی جام قربت لبوں تک پہنچا ہی تھا، ابھی اس نے ایک گھونٹ بھی نہ لیا تھا کہ نیم وا دروازہ کھلا اور ماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ پیاسی گھبرا کر خجل سی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ہوتا تو دیکھتی اماں کے چہرے پر کیسا حزن و ملال تھا۔ مائیں بھی خوب ہوتی ہیں۔

وہ رات نہ صرف نسیمہ پر کٹھن گزری بلکہ اماں بھی اپنے پلنگ پر لیٹی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہیں...... کتنی ہی مرتبہ ان کا جی چاہا اپنے پہلو میں لیٹے بچے کو اٹھائیں اور اس ماں کے پہلو میں ڈال آئیں جو خود ان کی جان جگر تھی۔ مگر اتنی جرأت وہ نہ کرسکیں، انہیں ڈر تھا کہیں قربت ممتا کو زنجیریں توڑنے پر مجبور نہ کردے۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ اسے اس حقیقت کو قبول کرنا پڑا کہ آفاق اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں تھا۔ تاہم دل کے معبد میں یہ یقین جاگزیں تھا کہ ایک دن وہ ضرور آئے گا جب وہ اسے اپنا کہہ سکے گی، جی بھر کر پیار کرسکے گی، اپنی پیاسی ممتا کی تشنگی کم کرسکے گی۔ امید ہی تھی جو اسے کئی بار کشاں کشاں سندھی ہوٹل کی ایک گلی میں واقع اس چھوٹی سی کوٹھری کے دروازے

لے گئی جہاں کبھی اس نے جاگتی آنکھوں سہانے سپنے بنے تھے۔ وقت نے اس میں اتنی جرأت پیدا کردی تھی کہ وہ اس دروازے پر دستک دے کر اس کوٹھری کے پرانے مکین کی بابت استفسار کرسکتی مگر جب اس نے نقاب کے پیچھے سے سوال کیا تو جواب میں مایوسی سے سر ہلا کر پرانے مکین کے بارے میں قطعی لاعلمی اور لاتعلقی کا اظہار کیا گیا۔ گویا جو ہونا تھا اسی کو سہنا تھا۔
لیکن جو کچھ سہنا تھا وہ کس قدر آزمائش طلب تھا۔
ہر ہر لمحہ آفاق کا تصور، وہ جاں گداز تصور جو اسے جینے کی امنگ دلاتا، اس کے ساتھ رہتا۔ مشینیں چلتی رہتیں۔ دواؤں کی شیشیاں آگے سرکتی جاتیں، ہر مشین، ہر شیشی، ہر ذرہ، ہر شے پر نسیمہ کو اس کا معصوم چہرہ رقصاں نظر آتا۔ سڑکوں پر، بس اسٹاپوں پر، بازاروں میں ماؤں کی گودوں میں بچے دیکھ کر دل میں ہوک سی اٹھتی۔

دھیرے دھیرے اماں نے اس سے خاموش مصالحت کرلی۔ ایک دوسرے کو مخاطب کیے بغیر کبھی کبھی نظریں جھکائے جھکائے رسمی بات چیت بھی ہوجاتی۔ کچھ اس طرح جیسے سرراہ چلتے دو اجنبی ایک دوسرے سے مخاطب ہوں۔ اکثر تنہائی میں نسیمہ سوچتی، اماں کو سب کچھ بتانے کی بڑی مشکلوں سے وہ خود کو تیار کرتی مگر اماں کا سامنا ہوتے ہی اس کی آنکھیں جھک جاتیں۔ لب دغا کر جاتے، گویائی بے وفائی کرجاتی۔ اب اکثر آفاق کو اماں کمرے سے باہر لے آتیں۔ شمیمہ اور نعیمہ اسے آنگن میں چھوٹی چوکی پر لا بٹھاتیں۔ ......وہ ہمکنار رہتا۔ نسیمہ دل پر جبر کیے جذبوں پر پہرے بٹھائے انجان بنی رہتی۔

وہ وقت بھی آیا جب غوں غاں سے بڑھ کر اماں تک بات آپہنچی، کن انکھیوں سے اس نے بارہا اسے ہمک کر اماں کی جانب ہاتھ بڑھا کر "اماں" کہتے سنا اور دیکھا تھا پہلی بار جب یہ لفظ اس کی سماعت سے ٹکرایا تو وہ چونک پڑی۔ وہ فیکٹری سے لوٹی ہی تھی، اماں شاید کسی کام میں مصروف تھیں نعیمہ آنگن میں ٹہلتے ہوئے اسے شانے سے لگائے تھپکتے ہوئے بہلانے کی کوشش کررہی تھی۔ اسے روتا دیکھ کر وہ بے کل سی تو ہوگئی۔ بادل ناخواستہ وہ چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ اماں کی صدا اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے، ماہی بے آب کے مانند اس نے تڑپ کر دیکھا۔
"اماں......" وہ روتے روتے دوبارہ بولا۔
"کیا بات ہے میرے لعل...... میری جان......" اس کے اندر چھپی سہمی ہوئی ماں بے تابانہ بولی مگر بہ ظاہر لب پتھر کی طرح خاموش ہی رہے۔

کامیابی

ایک صاحب دوستوں میں بیٹھے کہہ رہے تھے، "آدمی شادی کے بعد انسان بن جاتا ہے۔ میں بھی شادی سے پہلے ایک آوارہ اور ناکارہ آدمی تھا مگر اب دفتر کے علاوہ میں اپنا سارا وقت گھر پر گزارتا ہوں اور مجھے ہر کام نہایت سلیقے سے کرنا آگیا ہے۔ مثلاً گھر کی جھاڑو دینا، صفائی کرنا، کپڑے دھونا، بچوں کو چپ کرانا، کھانا پکانا اور سارے برتن دھونا۔"

مرسلہ: محمد اقبال، کورنگی، کراچی

اماں کے بعد اگلا لفظ جو اس نے کہنا سیکھا، آپا تھا۔
شمیمہ، نعیمہ اور منو کی زبانی آپا کی تکرار سن کر وہ اکثر آپا کی رٹ لگاتا۔ نسیمہ تو بزدل تھی جرأت نہ کرسکی اس کی طرف بڑھنے کی مگر وہ خود اس کی طرف آنے لگا۔ ابتدا مسکرانے سے ہوئی، شمیمہ یا نعیمہ کی گود میں چڑھے ہوئے وہ اس کی جانب دیکھ کر مسکراتا تو نسیمہ کی رگ و پے میں ٹھنڈک سی سرایت کر جاتی، آنکھیں چمک اٹھتیں۔
"آ...... آ...... پا۔" وہ حوصلہ پا کر کہتا۔
نسیمہ اس کے آپا کہنے پر آزردہ ہوجاتی۔
مگر یہی کیا کم تھا کہ اس کے بطن سے جنم لینے والا وہ بچہ جس کی جائز قانونی اور معاشرتی حیثیت کی کوئی سند، کوئی گواہی اس کے پاس نہ تھی، اماں کی گود میں بڑے دلار سے پروان چڑھ رہا تھا۔
جس دن اس نے پہلی بار اپنے لخت جگر کو قدم اٹھاتے دیکھا اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی، اس کے بس میں ہوتا، معاشرتی اقدار اجازت دیتیں تو وہ کسی اونچی سی جگہ پر کھڑی ہو کر ایک ایک کو مخاطب کر کے اپنے بیٹے کے پاؤں پاؤں چلنے کی نوید سناتی۔
اب اس کے سپنے آفاق کے دم سے سجنے لگے۔ وہ تصور ہی تصور میں اسے بہت بڑا آدمی بنانے کے خواب دیکھتی۔ ان خوابوں کو وہ سینت سینت کر رکھتی۔ اب وہ ان مختلف امکانات پر غور کرتی جن کے ذریعے آمدنی میں اضافہ ممکن ہو۔ بڑی سوچ بچار اور اپنی ایک ساتھی کے مشورے پر وہ موسم سرما میں قسطوں پر سلائی کی ایک مشین خرید لائی۔ بہت جلد کمپنی کی اکثر لڑکیاں اور عورتیں اپنے اپنے بچوں اور

ملنے جلنے والیوں کے کپڑے اسے اجرت پر سلائی کے لیے دینے لگیں۔ دن بھر وہ کمپنی میں کام کرتی اور رات گئے تک مشین پر جھکی رہتی۔ بیٹھے بیٹھے کمر کے ٹکڑے ہوتے محسوس ہوتے۔ نیند اسے اپنی آغوش میں لینے کو بے قرار ہوتی مگر آفاق کو بڑا آدمی بنانے اور اسے آسائشیں فراہم کرنے کا عزم اس کے بدن کی ساری تکان چوس لیتا۔

ایک، دو، تین برس گزر گئے۔ لیکن آدمی کے اندر کوئی چور چھپا ہو تو وہ تین صدیاں بھی سہم کر گزار دیتا ہے۔ نسیمہ ان حدود کو پھلانگنے کی جرأت نہ کرسکی، اس کے ذہن کے چور گوشوں میں ہر لحہ یہ احساس رہتا کہ آفاق کو پیار کرنے سے وہ رسوا ہوسکتی ہے۔ زندگی کی راہ پر آفاق کے معاملے میں وہ دم سادھے، چوروں کی طرح دبے پاؤں چل رہی تھی، اس محتاط روی نے اسے باطن ہی نہیں بہ ظاہر بھی سہما دیا تھا۔

چوتھے برس جب عید آئی تو شمیمہ اور نعیمہ نے دبی زبان سے نسیمہ سے چاندرات کو چوڑیاں پہننے کے لیے بازار چلنے کی فرمائش کی۔ شمیمہ اور نعیمہ کے بارے میں اماں جس قدر محتاط اور سخت گیر ہوگئی تھیں اس کے پیش نظر اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ اماں انہیں جانے کی جازت دیں گی لیکن شمیمہ نے جس طرح ڈرتے ڈرتے فرمائش کی تھی نسیمہ کے لیے اس کا ٹالنا دشوار تھا، اسے یاد تھا چند ہی برس پیشتر تک وہ خود بھی ایسی ہی ننھی ننھی خواہشوں کے پورے ہوجانے کی تمنا کرتی تھی، اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ اپنی سہیلیوں کی طرح وہ بھی چاندرات کو چوڑیاں پہننے جائے، مہندی لگائے۔ رات بھر جاگ کر صبح عید کا انتظار کرے، جب تک گھر کے حالات بہتر رہے اس کی خواہشیں پوری ہوتی رہیں مگر جب حالات بگڑے تو دو تین عیدیں بالکل ہی خاموش اور سونی گزری تھیں، چنانچہ جب شمیمہ نے فرمائش کی تو اس نے کہا۔

''جاؤ اماں سے پوچھ لو، وہ اجازت دیں تو میں لے چلوں گی۔''

شمیمہ نے یہ ذمّے داری نعیمہ اور نعیمہ نے منو پر ڈال دی۔ منو گیا اور اماں سے بولا۔

''آپا کہہ رہی ہیں منجھلی آپا اور باجی کو چوڑیاں پہنا لائیں؟''

اماں چاہنے کے باوجود انکار نہ کرسکیں۔ اس لیے کہ اس ایک لغزش سے قطع نظر نسیمہ نے جس طور اس گرتی عمارت کو سہارا دیا تھا اس کا انہیں بہ خوبی احساس تھا۔ اس کنبے کو وہ بلاشبہ مرد بن کر پال رہی تھی۔ منو کی بات پر وہ ذرا دیر کو خاموش ہو رہیں، پھر بولیں۔ ''کہنا دیر نہ ہو جلدی آجانا۔''

آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ نسیمہ دونوں بہنوں اور منو کو لے کر گھر سے باہر نکلنے لگی تو ننھا آفاق بھی مچل گیا۔

''آپا میں بھی......''

نسیمہ نے یکبارگی پلٹ کر دیکھا وہ سوال کی صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''لے لیں آپا اسے بھی۔'' شمیمہ نے سفارش کی۔

''ہاں آپا۔'' نعیمہ نے بڑی گرمجوشی سے شمیمہ کی رائے سے اتفاق کیا۔

''لے چلیں آپا؟'' شمیمہ نے اس بار سوال کیا تھا۔

مگر اس سوال کا جواب نسیمہ کے پاس کب تھا!

''آپا......'' آفاق منمنایا۔

بالآخر اماں نے اس کی مشکل آسان کردی۔

''نسیمہ، لے جا اسے بھی۔'' انہوں نے کہا۔

گھر کے دروازے سے نکلنا محال ہوگیا۔ دل کی دھڑکنیں...... بے لگام تھیں۔ پہلی بار وہ اسے لے کر کہیں جارہی تھی۔ گلی سے باہر نکلتے ہی اس نے اسے شمیمہ کی گود سے لے لیا۔ وہ سینے سے کیا لگا اسے یوں محسوس ہوا جیسے ٹھنڈک پڑ گئی ہو۔ نیم تاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ بار بار چپکے چپکے اسے باتابانہ چومتی رہی۔ شمیمہ، نعیمہ اور منو عید کی خوشیوں میں مگن اس سے آگے آگے چلتے رہے اور وہ اپنی پیاس بجھاتی رہی۔

بس میں سوار ہو کر وہ سب بازار پہنچے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کا ایک سیلاب تھا جو سڑکوں پر امڈ آیا تھا، ننھے ننھے بچے اپنی ماؤں اور باپوں کی انگلیاں تھامے چل رہے تھے۔ نسیمہ کا جی چاہا اس کا بیٹا بھی اس کی انگلی تھام کر چلے۔ بڑی احتیاط سے اس نے نیم خم ہوتے ہوئے آفاق کو نیچے اتارا اور اپنی معصوم خواہش کی تکمیل کو اپنی انگلی اس کے ننھے منے ہاتھ کے حصار میں دے دی اس نے انگلی اپنی نرم نرم ہتھیلی اور انگلیوں کے بیچ کیا تھامی نسیمہ کو یوں لگا اس ننھے منے ہاتھ سے آب حیات رس رس کر بوند بوند اس کے جسم میں بہتی خون کی ندی میں شامل ہو کر اس کی توانائیوں میں ناقابل بیان اضافہ کررہا ہو۔

آپا یہ کیا ہے؟ آپا وہ کیا ہے؟ آپا میں چیز لوں گا۔

آپا میں بھی چوڑیاں پہنوں گا۔

راستے بھر وہ پیاری پیاری معصوم معصوم باتیں کرتا رہا، اس کی پیاسی روح سیراب ہوتی رہی لیکن جتنی بار اس نے نسیمہ کو آپا کہا اتنی ہی بار گھائل دل پر چوٹ پڑی۔ اس کا جی چاہا اس کے نزدیک جھک کر اسے اپنے سامنے کھڑا کرکے، اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے۔

''میری جان! آپا نہیں امی کہو۔''

مگر کم ہمتی اور بزدلی پھر آڑے آئی۔

جان بوجھ کر اس نے بازار میں خاصا وقت یونہی گھومتے پھرتے فالتو گزارا۔ شمیمہ اور نعیمہ نے چوڑیاں بھی پہن لیں، ہار بُندے بھی خرید لیے۔ منو نے ہیٹ بھی خرید لیا۔ چاروں کو اس نے نافیاں بھی دلوادیں مگر اس کے باجود ابھی واپسی کو جی نہ چاہ رہا تھا بالآخر شمیمہ کو کہنا پڑا۔

''آپا اب چلیں اماں نے پہلے ہی کہا تھا جلدی آجانا آج تو ضرور ڈانٹ پڑے گی۔''

اس رات گھر واپس ہوتے ہوئے شمیمہ نے اس سے بڑا ٹیڑھا سوال کر ڈالا۔

''آپا......'' اس نے کہا پھر قدرے توقف سے ہچکچاتے ہوئے بولی'' اماں...... آپ سے اتنا کم کیوں بولتی ہیں؟''

اس سوال پر لحہ بھر کو تو وہ سن ہوگئی۔ گویا اب وہ منزلیں آرہی تھیں۔ جب اسے اس قسم کے ٹیڑھے سوالوں کا سامنا کرنا تھا۔ تاہم اس نے ذرا سوچ کر بڑی رسانیت سے کہا۔

''نہیں تو شمو، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل میں گھر میں رہتی ہی کم ہوں اور جب کام سے واپس آتی ہوں تو یا تو تھکی ہوتی ہوں یا پھر کچھ سینا ہوتا ہے اس لیے تمہیں ایسا لگتا ہے۔''

شمیمہ کچھ نہیں بولی، لگتا تھا اس کے جواب نے اسے کسی حد تک مطمئن کرہی دیا تھا۔

واپسی پر جب گلی میں داخل ہوتے ہوئے نسیمہ نے اپنے شانے سے لگے ہوئے آفاق کو بڑی احتیاط سے شمیمہ کے حوالے کیا تو کسی طور بھی شمیمہ کے ناپختہ ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اماں اور آپا کے درمیان جو خلیج حائل تھی اس کا سبب وہ ننھا سا معصوم بچہ تھا جو ہر فکر سے بے نیاز بے خبر سو رہا تھا۔

دن ماہ و سال میں بدلے اور ایک خوشگوار سی صبح وہ آفاق کو ایک انگریزی اسکول میں داخل کرآئی۔ داخلے کے وقت جب فارم پر کرتے ہوئے ولدیت کا خانہ پر کرنا پڑا تو خالی خانہ ایک کٹھن سوال کی صورت اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ایک زبردست ذہنی کشمکش اور تناؤ کے بعد بہ دقت تمام وہ خود کو اس بات کے لیے تیار کرپائی کہ اس خانے میں ابا کا نام لکھا جائے۔ کیسی عجیب بات تھی۔ قسمت نے کیسا کھیل کھیلا تھا۔

بہرحال یہ مرحلہ بھی نمٹ ہی گیا۔

لحہ بہ لحہ دن بہ دن وہ ماتا کی بھٹی میں تپ کر کندن ہوتی چلی گئی۔ اس کا ایمان آفاق، اس کا ایقان آفاق، اب اس کی زندگی میں جتنے رنگ تھے آفاق کے دم سے جو کچھ تھا آفاق تھا۔

سوکھے پتے گرتے رہے، نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں۔ بہاریں آتی رہیں، خزاؤں کا روپ دھارتی رہیں۔ خزائیں بہاروں کو جنم دیتی رہیں۔ آفاق بچپن سے گزر کر لڑکپن اور لڑکپن سے نوجوانی کی حدود میں داخل ہوگیا۔ اس وقت تک نسیمہ کمپنی میں سپروائزر کے عہدے تک جا پہنچی تھی۔ اماں نے ماضی کے تلخ تجربے کے پیش نظر شمیمہ اور نعیمہ کو تیرہ چودہ سال کی عمروں کو پہنچتے ہی انہیں گھر بار کا کردیا تھا۔ نسیمہ کی شبانہ مصروفیات میں سلائی کی مشین کے ساتھ موسم سرما میں ننٹنگ مشین کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ منو پولی ٹیکنک سے ڈپلوما کررہا تھا اور آفاق میٹرک میں تھا۔ اپنے پرائے نسیمہ سے شادی کے بارے میں استفسار کرتے، اسے شادی کرنے کا براہ راست مشورہ دیتے۔ جواب میں اس کے لبوں پر ایک زخم خوردہ مسکراہٹ بکھر کر رہ جاتی۔ نسیمہ کی خالہ، ممانیاں اور دوسری رشتہ دار عورتیں اور ملنے جلنے والیاں اماں سے کہتیں۔

''بس اب بہت کرلی نسیمہ نے نوکری، اب تو اس کی شادی کرڈالو۔''

اماں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ ان ٹھنڈی سانسوں اور زخم خوردہ مسکراہٹ کے پیچھے کون سی کہانی چھپی تھی۔ کسی کو بھنک بھی مل جاتی تو وہ بھونچال آتا کہ الاماں۔

اماں آخر کو ماں تھیں۔ شمیمہ اور نعیمہ کی شادیوں کے بعد وہ اکثر اس کی حالت پر چپکے ہی چپکے خون کے آنسو روتیں۔ گھنٹوں اس کی ویران زندگی کے بارے میں سوچتیں، دکھ سا دکھ تھا کہ باوجود چاہنے کے اماں آفاق سے یہ نہ کہہ سکیں، میں تمہاری ماں نہیں تمہاری ماں تو وہ ہے جو وہ تمہیں دیکھ کر جیتی ہے، جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہیں دیکھا کرتی ہے۔ جس کی آغوش ویران ہے جسے میں نے انگاروں پر لوٹتے محسوس کیا ہے۔

دن کیسے بھی ہوں گزر ہی جاتے ہیں۔

گزرے دنوں نے نسیمہ کو جو سوغات دی وہ بلند قامت آفاق کی صورت تھی۔ یہ صورت نسیمہ کے لیے ایسی نہ تھی جسے وہ پہچان نہ پاتی۔ ہوبہو اصغر کا عکس۔ بڑی عجیب بات تھی، نسیمہ کو آج بھی اس مرد کا انتظار تھا، اس سے پیار تھا جس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ شاید آج بھی وہ بے مہر راستہ بھول کر اس کی طرف آنکلتا تو وہ سارے دکھ بھول بھال کر اس کے سینے سے لگ جاتی۔ کبھی کبھی وہ آپ ہی آپ سوچتی، ایسا کیوں ہے؟ میں اس سے نفرت کیوں نہیں کرپاتی؟ یہ ایسی

گتھی تھی جسے وہ کبھی نہ سلجھا پاتی۔

ڈپلوما کورس کے بعد مُنو جرمنی چلا گیا۔ وہ کیا گیا اماں کی نیندیں، ان کا چین اور سکون چرا کر لے گیا۔ برس ڈیڑھ برس میں ہی وہ اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھکی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ یہی وہ راتیں تھیں جن تنہا راتوں میں منو کی خاطر رتجگے نبھاتے ہوئے انہیں نسیمہ کے کرب کا زیادہ شدت سے احساس ہوا۔ ایسے میں گزرے دنوں کی یادا نہیں حد درجہ متاسف کر دیتی، وہ غیر جانبداری سے سوچتیں جو کچھ ہوا اپنی جگہ مگر نسیمہ کی ماںتا کے ساتھ واقعی ستم ہوا۔ اس سلسلے میں وہ متاسف ضرور تھیں مگر خود کو قصوروار اس لیے نہ پاتیں کہ وہ جانتی تھیں، عزت کے خوف اور حد درجہ مجبوری نے یہ سب کچھ کروایا تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا، اس قدر احتیاط نہ برتی جاتی تو شمیمہ اور نعیمہ باعزت گھرانوں میں کب بیاہی جاتیں۔ اماں خاندان میں اٹھنے بیٹھنے اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جاتیں۔ ان کا سر ہمیشہ کے لیے جھک گیا ہوتا۔

وقت بڑا بے رحم، بہت ظالم، حد درجہ سفاک اور جلاد ہے۔ گزرتا ہی جاتا ہے اور جب گزر جائے تو اپنے پیچھے کچھ یادیں، کچھ باتیں، چند لمحے ایسے چھوڑ جاتا ہے جن کی کسک رہ رہ کے تڑپاتی ہے۔ بدقسمتی سے نسیمہ کی زندگی میں ایسے ان گنت لمحے تھے تاہم بے رحم وقت نے اس پر اتنی عنایت ضرور کی تھی کہ اب وہ آفاق کے نزدیک رہ سکتی تھی۔ وقت نے ان دنوں اماں کو نشانۂ ستم بنا رکھا تھا۔ دن رات وہ مُنو کے فراق میں تڑپتیں۔ نسیمہ کو اماں کی حالت پر دل و جان سے افسوس ہوتا۔ اس کے اپنے دل کا بوجھ اب ہلکا تھا۔ کمپنی سے واپسی پر وہ بیشتر وقت آفاق کی سیوا میں گزار دیتی۔ اس کی ایک ایک چیز کا خیال رکھتی۔ راتوں کو اٹھ کر اس کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا کرتی۔ سرما کی یخ بستہ راتوں میں وہ کئی بار اس کی طرف جاتی، گھنٹوں اسے اس فکر میں نیند نہ آتی کہ کہیں اس کا لحاف نہ سرک گیا ہو، کہیں وہ پاؤں کھولے نہ سو رہا ہو۔ اس کی کتابوں، کپڑوں اور جوتوں کا وہ اپنی جان سے بڑھ کر خیال رکھتی۔ آفاق کو پلک جھپکتے ہر چیز تیار ملتی۔

”آپا! آپ نے تو مجھے بالکل ہی نکما بنا دیا ہے۔“ آفاق کہتا۔

نسیمہ کے چہرے پر محبت سے بھرپور مسکراہٹ پھیل جاتی۔

لوگ دونوں کی بے مثال محبت پر رشک کرتے، بڑی بوڑھیاں دونوں بہن بھائی کی محبت کی مثالیں دیتیں۔

اماں کے پاس اب ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا نسیمہ کے ماضی پر حسرت بھری ٹھنڈی سانسیں...... مُنو کی یادیں اور ٹھنڈی سانسیں...... یوں تو مُنو کی واپسی کی آس موئی شمع کی ٹمٹماتی لو بن گئی تھی لیکن جب منو نے ایک جرمن لڑکی سے شادی کے بعد اپنی اور اس کی تصویریں بھیجیں تو اماں یوں پھوٹ پھوٹ کر روئیں جیسے اس کے واپس آنے کی آس ختم ہو گئی ہو۔ نسیمہ اور آفاق نے اپنے ایک نہیں بیسیوں خطوط میں مُنو کو اماں کی گرتی ہوئی صحت کے بارے میں لکھا مگر ہر بار کوئی جواز پیش کرنے کے بعد مُنو اماں کے نام چھوٹی سی رقم کا ایک منی آرڈر بھیج دیتا۔ اسے شاید معلوم نہ تھا مائیں دولت کی نہیں اولاد کی پجاری ہوتی ہیں۔

☆☆☆

بالآخر فشارِ خون اور دل کی بیماری نے اماں کو ایسا چاٹا کہ برکھا کی ایک شام جب بادل روتے روتے تھم گئے تھے، ان کی طبیعت اچانک ہی بگڑ گئی۔ مدتوں بعد نسیمہ نے ان کے بے حد نزدیک ہو کر ان کے سر پڑتے ہاتھ تھام لیے ان کی سانس بگڑ رہی تھی۔

”مجھے ...... ظالم ...... نہ ...... سمجھنا!“ انہوں نے بہ مشکل تمام کہا۔

”اماں ......“ نسیمہ اماں کے سرد پڑتے سینے میں منہ چھپا کر کسی چھوٹی سی بچی کی طرح بلک اٹھی پھر جب اس نے سر اٹھایا تو دیکھا، اماں کی آنکھیں بجھ رہی تھیں۔

”میں ...... میں ...... اپنے ...... سینے پر ...... بہت بڑا ...... بوجھ لے کر ...... جاؤں گی ...... بیٹی۔“

وہ بلبلا کر رو دی۔ مدتوں بعد اماں کی قربت اسے پگھلائے دے رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا آج اماں کے سینے میں منہ چھپا کر اتنا روئے۔ اتنا روئے کہ بادلوں کو مات کر دے۔ ان کے پوچھے بغیر، کوئی سوال کیے بنا انہیں سب کچھ بتا دے، انہیں بتا دے کہ میں نے دھوکا ضرور کھایا مگر مجھے یقین ہے خدا کی نظر میں میں مجرم اور گناہ گار نہیں ہوں۔

مگر کچھ سننے سے پہلے ہی اماں کی آنکھوں کے دیپ بجھ گئے، سانسیں رک گئیں، نبضیں ڈوب گئیں۔ نسیمہ ماہیِ بے آب کے مانند تڑپتی رہ گئی۔

اماں کی موت پر وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے سارے الم آنکھوں کے راستے بہا دینا چاہتی ہو۔ جیسے اگلے پچھلے سارے حساب چکا دینا چاہتی ہو۔ آفاق بے حد اداس تھا جیسے سچ مچ اس کی ماں مر گئی ہو۔

اماں کے بعد بڑے دنوں اس گھر کے در و دیوار اداس رہے۔ وہ آنگن سونا ہو گیا جس کی فضائیں علی الصباح اماں کی خوش الحانی سے مخمور ہو جایا کرتی تھیں۔ منو کو خبر ملی تو اپنی جرمن بیوی اور بیٹے کے ہمراہ وطن آیا مگر اب آنا بے سود تھا۔ اس کی راہ تکنے والی آنکھیں تو خاک کے پردوں میں نہاں ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اسے متاسف اور نادم واپس لوٹنا پڑا۔

☆☆☆

گھر میں نسیمہ تھی اور آفاق، جس کی ایک جھلک کے لیے کبھی نسیمہ کو راتوں تڑپنا پڑتا تھا۔ اب زخموں پر پھائے رکھے تھے اور ٹیسوں میں کمی آچکی تھی۔

ایم، کام کے بعد آفاق ایک مالیاتی ادارے میں ملازم ہو گیا۔ نسیمہ کو لگتا تھا اس کے خواب پورے ہو رہے ہیں۔ احساسِ تشکر سے اس کا سر خدا کے حضور جھک جاتا، آنکھیں چھلک اٹھتیں۔ ماضی کی یادیں بڑی تلخ، بہت دل دکھانے والی تھیں مگر آفاق کی قربت نے مرہم کی طرح ان زخموں کو مندمل کر دیا تھا۔ وہ اکثر سوچتی اصغر کبھی مل جائے تو اسے دکھائے کہ تم تو اسے بے آسرا چھوڑ گئے تھے مگر میں نے بیٹے کو بڑا آدمی بنا دیا۔

آفاق کو ملازمت شروع کیے چند ہی ماہ گزرے تھے کہ اس کی خواہش پر نسیمہ کو ابا کے زمانے کا مکان کرائے پر اٹھا کر آفاق کے ساتھ کرائے کے لیے فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا۔ ملازمت کے بعد سے آفاق مستقل بضد تھا کہ وہ اب نوکری چھوڑ دے۔

”بس آپا بہت کیا آپ نے، اب آپ کے آرام کے دن آ گئے ہیں۔“ وہ اکثر کہتا۔

”بیٹھوں گی، کروں گی آرام، تیری دلہن تو گھر آ جائے۔“ نسیمہ مسکرا کر کہتی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی تھک چکی تھی۔

پھر نسیمہ نے آفاق کے لیے لڑکیاں دیکھنی شروع کر دیں۔ شمیمہ اور نعیمہ کی رائے تھی کہ جب تک آفاق شاندار قسم کا گھر نہ بنا لے، شادی نہ کی جائے مگر نسیمہ کو وقت پر اعتبار نہ رہا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو اپنے حصے کی تمام خوشیاں ایک لمحے میں جھپٹ لیتی۔

کئی لڑکیاں دیکھنے کے بعد بالآخر اسے نعیمہ کی بڑی نند کی بیٹی ارم پسند آئی لیکن ابھی گفت و شنید ابتدائی مراحل میں ہی تھی کہ ایک شام انتہائی غیر متوقع طور پر اونچے ٹھاٹ باٹ والی ایک بیگم اپنے صاحب کے ہمراہ نسیمہ سے ملاقات کا شوق رکھنے کا بہانہ کرتی آفاق کے ساتھ چلی آئیں۔ آفاق نے بڑی سعادت مندی سے سر جھکا رکھا تھا۔ نسیمہ کھٹک کر رہ گئی۔ آفاق نے تعارف کرایا تو اسے پتا چلا کہ صاحب آفاق کے باس تھے اور تین بیٹیوں کے باپ جن میں سے دو کو وہ بیاہ چکے تھے۔ دونوں اپنے شوہروں کے ہمراہ یورپ میں مقیم تھیں۔ اب چھوٹی بیٹی باقی تھی۔ چائے کے دوران بیگم صاحبہ بغیر کسی تمہید کے بڑی خوبصورتی سے اپنے مطلب پر آ گئیں۔ پھر جاتے وقت انہوں نے انتہائی اصرار کے ساتھ نسیمہ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور جب تک نسیمہ نے ان کی دعوت قبول نہ کر لی وہ آگے نہ بڑھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے آفاق کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا دیا اور اپنا سر جھکا لیا، اس مسکراہٹ پر تو وہ دل و جاں نثار کر سکتی تھی۔

”کیوں یہ بات کیا ہے آخر؟“ اس نے آفاق کو گھورا تو وہ ہنس کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولا۔

”بیگ صاحب بہت اچھے آدمی ہیں آپا!“

”کبھی گھر گئے ہو ان کے؟“

”جی ...... کئی بار۔“ وہ شرما رہا تھا۔

”اور مجھ سے چھپائے رکھا۔“ اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

”اوہ ...... آپا ...... میری پیاری آپا......“ اس نے اچانک ہی نسیمہ کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جھلا ڈالا اس سے اسے بخوبی اس کے ارادے کا اندازہ ہو گیا۔ چنانچہ نسیمہ کو آفاق کے ہمراہ بیگ صاحب کے ہاں جانا پڑا۔ ان کی بیٹی شیریں بلاشبہ دلنواز تھی۔

سلسلہ آگے بڑھا اور چند ہی دنوں میں منگنی کی رسم ادا ہونے کے بعد شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ پھر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تن من سے وہ شادی کے انتظامات میں جت گئی اور بڑے گھر کی بیٹی کو بہو بنا کر لانے کے لیے اس کے شایانِ شان استقبال کی تیاریوں میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اور تو اور اس نے شادی کے موقعے پر خود اپنے پہننے کے لیے کسی شاندار اور یادگار جوڑے کی تلاش میں اس مقفل ٹرنک کا منہ بھی کھول دیا جس میں اماں نے برس ہا برس پہلے جب ابا بستر سے نہ لگے تھے اور نسیمہ نوجوانی کی حدود میں داخل ہی ہوئی تھی، اس کے لیے جہیز میں دینے کو کئی جوڑے سی کر اور کئی ان سلے رکھے تھے۔ اس ٹرنک کو اماں نے شمیمہ اور نعیمہ کی شادی کے موقعے پر بھی نہ کھولا تھا۔ شاید انہیں آس تھی کہ ایک نہ ایک دن نسیمہ ضرور دلہن بنے گی اس لیے اس کا حق کسی اور کو نہیں دیا جانا چاہیے۔ نسیمہ تو دلہن نہ بنی البتہ جب اس کے بیٹے کے دولہا بننے کا وقت آیا تو اس نے یہ مقفل ٹرنک کھول ڈالا لیکن جب ٹرنک کھلا تو دس گیارہ جوڑوں میں سے

اکثر گل چکے تھے یا اس کے اپنے ارمانوں کی طرح رنگ روپ کھو چکے تھے!

شمیمہ اور نعیمہ کو اس نے ان کے شوہروں اور بچوں کے ساتھ کئی روز پہلے ہی گھر بلا لیا۔ جس تندہی سے وہ انتظامات کر رہی تھی اسے دیکھ کر دیکھنے والے کہتے۔

"شاباش ہے، بہن ہو تو ایسی، حق ادا کر دیا۔"

ایسے موقعوں پر اس کی آنکھیں خاموشی سے التجا کرتیں۔

"خدا کے واسطے اب تو میرا حق مجھے دے دو، میں آفاق کی بہن نہیں ماں ہوں، آفاق میرا جگر گوشہ ہے، میرا دل ہے، میری آنکھوں کا نور ہے۔"

مگر لب ہمیشہ کی طرح بے صدا ہی رہے۔

شادی کے موقعے پر بڑی چاہت اور ارمانوں سے اس نے ساری رسمیں نبھائیں، برات کی روانگی سے قبل بہنوں کے آنچل دولہا کے سر پر ڈالنے کی رسم کروائی گئی تھی۔ شمیمہ اور نعیمہ کے گوٹے کناری سے مزین آنچل آفاق کے سر پر لہرا رہے تھے۔ دونوں بہنیں بات بات پر کھلی پڑ رہی تھیں۔ نسیمہ مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اچانک کسی نے ہانک لگائی۔ "ارے بھئی، بڑی بہن کا آنچل تو ڈالو۔"

"آئیں نسیمہ آپا۔" شمیمہ کی دیورانی نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"نہیں......" اس نے اپنا آنچل مٹھی میں دبوچ لیا۔

"ائے تم نہ ڈالو گی بھائی کے سر پر آنچل؟"

"ارے شمو اور نمو کے پیارے پیارے آنچلوں کے ساتھ میرا روکھا پھیکا آنچل کیا اچھا لگے گا۔" وہ مسکرائی۔

"ائے ہے رسم بھی تو ادا کرنی ہے۔"

"ہاں ہاں رسم کیوں نہیں ہوگی۔" وہ آگے بڑھی، آفاق کا سہرا ہٹا کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے دیتے ہچکیوں سے رو دی۔

"ہائے ماں ہوتیں تو اس موقع پر نثار ہوتیں۔" کسی بڑی بوڑھی نے کہا۔

شمیمہ اور نعیمہ اماں کو یاد کر کے رو دیں۔ موٹے موٹے آنسو ان کی آنکھوں سے بھی لگاتار لڑھکتے چلے گئے۔ آگے بڑھ کر شمیمہ اور نعیمہ کو گلے سے لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں جو ہوں تمہاری ماں!"

پھر یہی بات کہنے کو وہ آفاق کے نزدیک آئی لیکن ہمیشہ کی طرح بزدلی آڑے آئی۔ الفاظ اس کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئے۔

بڑے ارمانوں سے اس نے شیریں کو دلہن پر اتارا۔ اس کا بس چلتا تو آفاق اور شیریں کو پلکوں کی مسند پر بٹھا لیتی اور پکار پکار کر دنیا والوں سے کہتی، یہ میری ریاضتوں کا ثمر ہیں۔ شادی کے فوری بعد اس نے کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ بھی دے دیا۔ اول روز ہی سے اس نے شیریں کا آفاق کی طرح خیال رکھا۔ اس کے آرام کا وہ ہر طرح خیال رکھتی۔ شیریں بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ شادی کو کئی ماہ گزر گئے لیکن اس کے باوجود اس نے باورچی خانے اور گھر کے دوسرے دھندوں سے کوئی رغبت نہ دکھائی۔ دن چڑھے آفاق کے جانے ...... کے بعد بیدار ہوتی پھر بڑے ٹھسے سے ناشتا کرتی، ناشتے کے بعد اخبار اور رسالوں کا مطالعہ ہوتا۔ پھر یا تو کہیں آنا جانا ہوتا ورنہ مسہری پر پڑی موسیقی سے لطف اندوز ہوتی رہتی۔ نسیمہ کو اس کی یہ ادائیں بھی پیاری لگتیں۔

لیکن اس کے دل کی صداقتوں اور محبتوں سے بے نیاز شیریں کو گھونگٹ پلٹتے ہی جو چیز اس گھر میں سب سے زیادہ گراں گزری وہ نسیمہ کی آفاق سے بے پناہ محبت تھی۔ یہ بات کچھ زیادہ پسند نہ آئی کہ اس کی بڑی نند اس کے شوہر سے ماؤں کا سا پیار کرے۔ جلد ہی اس نے منہ بنا کر آفاق سے بلا تردد کہہ دیا۔

"مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ تمہاری بہن تمہارے ساتھ ماں کا سا رویہ رکھیں۔ بہن اور ماں میں کچھ فرق ہونا چاہیے تاکہ رشتے اپنی اصلیت کھوتے نہ نظر آنے لگیں۔ جو بہنیں ماں بننے کی کوشش کریں، ان کی محبت محض اداکاری رہ جاتی ہے۔"

آفاق نے دبی زبان سے شیریں کو نسیمہ کی بے لوث قربانیوں کا احوال سنانا چاہا تو وہ اس ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے نخوت سے بولی۔

"مجھے یہ گھر بالکل پسند نہیں، یہ تو گھر کم وڑبا زیادہ لگتا ہے۔"

شروع شروع میں آفاق ہاتھ جوڑ کر منتیں سماجتیں کر کے شیریں کو مناتا سمجھاتا رہا۔ بہن کی دل شکنی کرنے کی ہمت نہ رکھنے کے جواز پیش کرتا رہا۔ اس نے اسے یہ باور کرانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ جو کچھ ہے اسی بہن کی بدولت ہے لیکن شیریں کے نزدیک ان تمام جوازوں، محبت اور خلوص کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اسے نسیمہ سے چڑ سی ہونے لگی۔ اسے نسیمہ کی محبت ایک آنکھ نہ بھاتی۔ بہت جلد وہ اس گھر اور اس ماحول سے اکتا گئی جو نسیمہ کی بے لوث ممتا سے

معمور تھا۔ بڑی خود غرضی سے وہ سوچتی۔

"یہ عورت آفاق کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی ہے مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

آفاق ہر روز دفتر جانے سے قبل حسب معمول نسیمہ کے پاس جاتا، اسے خدا حافظ کہتا۔ نسیمہ اس کا ماتھا چومتی اور آیۃ الکرسی کا دم کرتی۔ شیریں اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے جھلا جاتی اس کا دم گھٹنے لگتا۔ صدمے کے بوجھ سے اس کے دماغ کی عجیب کیفیت ہو جاتی، اس کی شریانوں پر دباؤ سا پڑنے لگتا۔ بالآخر ایک روز اس نے انتہائی بدتمیزی سے نسیمہ سے کہہ ہی دیا۔

"میرا خیال ہے آپا، آپ ضرورت سے زیادہ ہی محبت کرتی ہیں ان سے۔"

"ہاں...... اسی سے کیا، میں...... تو تم سے بھی اتنی ہی محبت کرتی ہوں۔"

"معاف کیجیے گا میرا تو اس قسم کی بناوٹی اور زبردستی کی محبت سے دم گھٹتا ہے۔"

نسیمہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

پھر ایک روز اس نے بے حد تنگ مزاجی سے آفاق سے کہا۔

"آپ کے سارے خاندان والے یہی گانا گاتے ہیں کہ آپ کو جو کچھ بنایا آپ کی بہن نے، کیا آپ میں کوئی ذاتی قابلیت نہیں تھی؟"

"اوہ شیریں...... ڈارلنگ...... ذرا آہستہ کہیں آپا نہ سن لیں۔"

"سن لیں......" وہ چلائی۔ "میرے کان پک گئے ہیں یہ سنتے سنتے، اس گھر میں، میری حیثیت ہی کیا ہے جو کچھ ہیں آپا جان...... کیا میرے پاپا نے آپ کو ترقی نہیں دلوائی؟"

اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ جب نسیمہ تک پہنچی تو وہ لرز کر رہ گئی۔

برس بھر گزر گیا۔

دوسرے برس کے وسط میں آفاق ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ نسیمہ کی مسرتوں کا ٹھکانا نہ تھا۔ منا اسے ہو بہو آفاق کی پیدائش کا عکس محسوس ہوتا۔ برسوں سے سلگتی سینے کی آگ کو اس نے اس بچے کو سینے سے لگا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن بہت جلد یہ خوشی بھی نسیمہ کے لیے ایک آزمائش بن گئی۔ کچھ دن تو شیریں برداشت کرتی رہی پھر اس نے منا سو رہا ہے ڈسٹرب ہوگا...... ابھی ابھی سویا ہے، قسم کے بہانے تراشنے شروع کر دیے۔ نسیمہ بچی نہ تھی کہ تیور دیکھ کر سمجھ نہ پاتی مگر دل کی لگی اسے مجبور کر کے شیریں کے کمرے تک لے جاتی۔ شیریں نے اپنے کمرے کا دروازہ زیادہ تر بند رکھنا شروع کر دیا۔ نسیمہ کتنی ہی بار اس بند دروازے کا رخ کرتی اور کتنی ہی بار مایوس لوٹتی اور جب دروازہ کھلا رہنے لگا تو ایک روز شیریں نے بلا لحاظ کہہ دیا۔

"آپ منے کے منہ پر پیار نہ کیا کریں، بچوں کی جلد بڑی حساس ہوتی ہے۔"

منا نسیمہ کے بازوؤں میں رہ گیا۔ وہ بے بسی سے شیریں کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ ایک بار پھر پیاسی کی پیاسی۔

لیکن اس صلیب پر لٹکنے کے باوجود نسیمہ رحمت خداوندی سے مایوس نہیں ہوئی، اسے خدا جانے کیوں یقین تھا کہ اس کی ریاضتیں اکارت نہیں جائیں گی۔ منا بڑا ہونے لگا، اسے دیکھ کر نسیمہ کو آفاق کا بچپن یاد آتا، اس کی نم آنکھوں کے پردوں پر جانے کون کون سی یادیں گھوم جاتیں اور جب بے تابانہ وہ منے کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو شیریں اسے کسی نہ کسی بہانے سے اس کی گود سے چھین لے جاتی۔

یونہی دل دکھانے والی ان گنت باتیں ہوتی رہیں اور

شام نسیم

قاہرہ میں ہر سال آمد بہار پر ایک جشن برپا ہوتا ہے جسے شام نسیم کہا جاتا ہے۔ اس روز قاہرہ کے باشندے روایتی لباس پہن کر دریا کے کنارے جمع ہو جاتے ہیں اور سجی سجائی فلوقہ (کشتیوں) پر سیر کرتے ہیں اور اس موقع پر مہمانوں کی تواضع ایک خاص ڈش سے کی جاتی ہے جس میں دریائے نیل کی مچھلی کو خشک کر کے نمک لگایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ پیاز کا سالن ہوتا ہے۔ یہ خصوصی ڈش فرعونوں کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ قاہرہ تیرہ سو سال سے ایک عرب اور مسلم شہر ہے لیکن یہاں کے لوگ اپنے پانچ ہزار سالہ ماضی کو نہیں بھولے اور خود کو فرعونوں کی اولاد کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

نسیمہ اس آس پر کہ کسی نہ کسی دن تو وہ نصیب ور سورج طلوع ہوگا جس کی کرنیں اس کے لیے مسرتوں کی پیامبر بن کر آئیں گی، سب کچھ برداشت کرتی جارہی تھی۔ ایک سہمی سہمی سی آس جو دبے پاؤں اب تک اس کے ساتھ چلتی رہی تھی۔ اب بھی کڑی آزمائشوں میں اس کا حوصلہ بڑھاتی۔ آنکھوں میں آنسو زندہ مچھلیوں کے مانند تیر رہے ہوتے اور وہ سوچتی۔

''کبھی تو وہ دن آئے گا جب میں آفاق کو بلا خطر اپنا کہہ سکوں گی، کسی دن تو اصغر آکر گواہی دے گا کہ......''

☆☆☆

منے نے چلنا سیکھا ہی تھا کہ بیگ صاحب پر اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ چل بسے۔ ان کے انتقال کے بعد شیریں زیادہ تر میکے ہی میں رہنے لگی۔ آٹھ دس روز بعد وہ ایک دو دن کو آتی، پھر چلی جاتی۔ جن دنوں وہ میکے میں ہوتی، آفاق بھی شام کو دفتر سے واپسی پر سیدھا گھر آتا مگر رات وہیں گزارتا۔ نسیمہ نے شروع شروع دو تین راتیں تو تنہا کاٹ لیں لیکن پھر اس نے دبی زبان سے آفاق سے رات کے وقت گھر آجانے کو کہا تو پہلے وہ ٹال گیا پھر ہنس کر بولا۔

''آپا منے کے بغیر میرا دل نہیں لگتا آپ نہیں جانتیں، اولاد بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔''

''تیرے بغیر میرا بھی تو دل نہیں لگتا۔'' اس کا جی بھر آیا۔

''او ہو آپا...... آپ تو میرے ساتھ ماؤں والا رویہ رکھتی ہیں۔'' وہ جملہ جو شیریں نے خلوتوں میں بیسیوں مرتبہ آفاق کے ذہن میں ٹھونسا تھا اس نے بڑے بھونڈے پن سے نسیمہ کے دل پر دے مارا۔

''یہ...... یہ بات نہیں ہے آفی۔'' اس نے یوں گھبرا کر کہا جیسے راز فشا ہو جانے کا خوف ہو۔

آفاق کے جانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر سسکتی رہی پھر جب جذبات کی شدت میں کمی آئی تو اس نے اپنے آنچل سے آنکھیں...... رگڑتے ہوئے سوچا۔

''میں بھی کتنی ناشکری ہوں......''

''ہیں! ناشکری...... یا بدقسمت!'' وہ کسی سودائی کی طرح بڑبڑائی۔

شیریں آتی رہی جاتی رہی پھر ایک بار جب شیریں کو میکے گئے اٹھارواں دن تھا، منے کی دید کی تڑپ اسے کشاں کشاں شیریں کے میکے لے گئی۔ چھٹی کا دن تھا، آفاق گزشتہ شام ہی سے وہاں تھا۔ آفاق کی پیشانی چومنے اور منے کی بلائیں لینے کے بعد جب وہ شیریں کی طرف بڑھی تو وہ بڑی نزاکت سے اپنے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

''میں نے بڑی مشکل سے بال سیٹ کیے ہیں۔''

نسیمہ جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ اس گھر میں جہاں اس طور پذیرائی ہوئی ہو زیادہ دیر ٹھہرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ چلتے وقت اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر منے کو سینے سے چمٹا کر پیار کیا اور ڈرتے ڈرتے بولی۔

''اگر اجازت دو تو میں منے کو ساتھ لے جاؤں، کل دفتر سے واپسی پر آفی ساتھ لیتا آئے گا۔''

''منا میرے بغیر کہیں نہیں رہتا۔'' شیریں نے بڑے غرور سے کہا۔

''میں بہلا لوں گی اسے۔''

''رات کو کسی صورت نہیں رکے گا یہ۔''

''میں اپنے سینے سے لگا کر سلا لوں گی۔ تم فکر نہ کرو یہ بالکل آرام سے رہے گا۔''

''بچے اپنی ماؤں ہی کے پاس چین سے سوتے ہیں!'' شیریں نے یوں ناک چڑھائی جیسے نسیمہ سے اس کی پشت ہا پشت سے کوئی پرخاش چلی آرہی ہو۔

نسیمہ نے بے حد آزردگی سے سوچا۔ ''ہاں میں ہی بدقسمت تھی جس کی آغوش کبھی گرم نہ ہو سکی۔''

''چلیے آپا، آپ کو چھوڑ آؤں۔'' آفاق یوں اٹھا جیسے وہ جلد از جلد کشیدگی کی اس فضا سے باہر نکلنا چاہتا ہو۔

تنہا، خاموش اور ویران در و دیوار کے بیچ نسیمہ کو چھوڑ کر جاتے ہوئے آفاق نے کہا۔

''آپا! آپ شیریں کی باتوں کا...... خیال نہ کیجیے گا۔''

''اپنے پیاروں کی باتوں کا بھی کبھی برا منایا جاتا ہے'' وہ زبردستی ہنسی پھر اس نے ملتجی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''صبح چلے جاتے تم۔''

''آپا...... آپ شیریں کے مزاج سے تو واقف ہیں ...... اچھا...... خدا حافظ۔'' اس نے آخری الفاظ عجلت میں ادا کیے اور چلا گیا۔

رات نسیمہ نے صبح کے انتظار میں گزاری اور صبح سے شام، آفاق کے انتظار میں کی۔ یونہی جانے کتنی صبحیں کتنی شامیں انتظار کے بوجھ تلے دبتی گئیں۔ شیریں اب زیادہ تر میکے ہی میں رہتی، آفاق البتہ ان دنوں بھی جب شیریں میکے میں ہوتی ہر شام دفتر سے واپسی پر اس کے پاس ہوتا

[illegible] نسیمہ کے لیے جینے کا واحد جواز یہی رہ گیا تھا۔

لیکن ایک روز جب کھانے کی میز پر نسیمہ، شیریں اور آفاق کھانا کھانے میں مصروف تھے اور منا دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ آفاق نے سر جھکائے چمچہ چلاتے ہوئے کہا۔

''آپا! شیریں کا خیال ہے ہم لوگ ممی کے ہاں شفٹ ہو جائیں۔''

''کیوں؟'' اس کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ سرتاپا وہ کانپ کر رہ گئی۔

''دراصل ممی تنہا رہ گئی ہیں، شیریں کو ان کی بڑی فکر رہتی ہے۔'' وہ اٹکتے ہوئے بولا۔

''اور میری تنہائی......؟ میری بے کسی......؟ میری بیکراں ویرانی......؟'' اس کی آنکھوں میں یہ سارے سوال ایک دھندلاہٹ کی مانند تیر گئے۔ ایک دبی دبی سی آہ اس کے لبوں کے بیچ سے کمرے کی فضا میں بڑی آہستگی سے گھل مل گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا، آنکھیں دھندلا گئیں۔ شدت جذبات سے حلق دکھنے لگا تاہم اس نے تھرتھراتی ہوئی ایک کوشش کی۔

''یہ بھی تو...... تمہارا ہی گھر ہے کیا ہرج ہے وہاں بھی رہو اور یہاں بھی......''

لیکن اس سے قبل کہ آفاق کچھ کہتا، شیریں نے رعونت سے کہا۔

''آفاق، مجھے خانہ بدوشوں کی سی یہ طرز بالکل پسند نہیں، مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ آدھا سامان یہاں بکھرا پڑا رہے...... تو آدھا وہاں۔''

نسیمہ کا جھکا ہوا سر اٹھ نہ سکا، شاید نصیب کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے اس نے۔

''آپا ہم آتے رہیں گے یہاں بھی۔ کیوں...... ہے نا شیریں؟'' آفاق نے نسیمہ کی آزردگی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''وقت ملا تو......'' شیریں نے بڑی خود غرضی سے کہا۔

نسیمہ کو اپنے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شکست خوردہ سی وہ کھانے کی میز پر سے اٹھ گئی۔

رات کو انگاروں پر لوٹتے ہوئے اس نے بے بسی سے سوچا۔

''خدایا میرا گناہ کیا ہے؟ شیریں سے تو میں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے وہ بدظن ہو جاتی پھر...... ایسا کیوں ہے؟''

اب یہ اسے کون بتاتا کہ اس کا سب سے بڑا گناہ تو یہی تھا کہ وہ آفاق سے اور آفاق کے حوالے سے شیریں اور

> ## بچے ہمارے عہد کے
>
> ماں اپنے لاڈلے بیٹے کو سمجھا رہی تھی کہ ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔ ماں کی باتیں بیٹا بڑی توجہ اور انہماک سے سنتا رہا۔ آخر میں ماں کی گود میں بیٹھتے ہوئے بولا۔
>
> ''امی۔ آپ بھی تو سچ سچ بتائیں کہ کل ابو جو مٹھائی کا ڈبا لے کر آئے تھے، وہ آپ نے کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟''
>
> ☆☆☆
>
> ایک دوست دوسرے دوست سے۔ ''احمد تم گائے سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟''
>
> دوسرا دوست۔ سر کھجاتے ہوئے۔ ''یار، ماسٹر صاحب جو کہتے ہیں کہ تمہارے سر میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ اگر گائے نے میرے سر میں منہ مار لیا؟''
>
> مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

منے سے بھی ٹوٹ کر بے لوث محبت کرنے کے درپے تھی۔

☆☆☆

اگلے ہی ہفتے سامان باندھا جانے لگا۔ نسیمہ بے کل بے کل سی گھر کے کونے کونے میں پھرتی رہی۔ جدائی کا تصور محال تھا، اس سے پہلے ایسی کڑی آزمائش تو کوئی نہ پڑی تھی۔ آفاق کے لیے اس نے ان گنت راتیں جاگ کر گزاری تھیں۔ اس کی ایک جھلک کی خاطر اس نے دروازوں اور کھڑکیوں میں درزوں اور شگافوں کی تلاش میں کتنی ہی سانسیں روکے رکھی تھیں، کسی ایسے روزن دیوار کی تلاش میں جو اسے اس کے جگر گوشے کی ایک جھلک دکھا سکتا سو وہ اپنے ہی گھر میں راتوں کو چوروں کی طرح دبے پاؤں پھری تھی اس کے رونے کی آواز سن کر اس نے لاکھوں مرتبہ خود کو صلیب پر ٹنگا محسوس کیا تھا مگر جدائی سے قبل وہ ایک رات قیامت بن کر گزر رہی تھی۔ کھلے آنگن میں دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے روتے روتے اور یہ دعا کرتے کرتے کہ یہ رات تمام نہ ہو، جدائی کا لمحہ کبھی نہ آئے اس کی زبان خشک ہوئے جارہی تھی۔

مگر لمحے بڑے جلاد ہیں۔

وہ لمحہ آکر ہی رہا۔

اس کی آنکھیں تپ رہی تھیں، بدن بے جان، روح زخمی، دل کے داغ لالہ کے پھول کو شرمار ہے تھے۔ اداس

چہرہ اور ویران آنکھیں لیے وہ گھائل ہرنی کے مانند بے قرار اور کسی بیوہ کی طرح سوگوار پھر رہی تھی اور شیریں بے حد... سفاکی سے سوچ رہی تھی۔

''بڑھاپا گزارنے کے لیے کسی سہارے کی تلاش میں یہ عورت کس قدر زبردست اداکاری کر رہی ہے، بہت ہی اچھا ہوا...... اگر ممی کے کہنے کے مطابق میں نے آفاق کو قابو نہ کیا ہوتا تو وہ کبھی اس جال سے نہ نکل سکتے تھے۔''

سامان ٹرک پر لد کر جا چکا تھا۔ شیریں کی ممی گاڑی بھیج چکی تھیں۔ نسیمہ برآمدے میں کسی بیوہ کے مانند سوگوار کھڑی تھی۔ شیریں انتہائی بے مروتی سے منے کو گود میں لیے اس سے ملے بغیر باہر نکل چکی تھی۔ منے کی جانب نسیمہ کے بازو پھیلے کے پھیلے رہ گئے تھے۔

اچانک۔ وہ مانوس سی چاپ سنائی دی جس پر وہ ہزار بار جنم لے کر ہزار بار فنا ہو سکتی تھی۔

''آپا......'' وہ اس کے قریب آ کر بولا۔

''آ...... آ......'' اس نے دیوانہ وار دونوں بازو وا کر دیے آفاق کھڑا دیکھتا ہی رہ گیا۔

''آ میرے سینے سے لگ جا ...... میری زندگی ...... میری جان ...... میرے لعل ......'' لب بے صدا تھے مگر رواں رواں ...... مرغ بسمل کے مانند تڑپ کر پکار رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا بھی رہی تھی رو بھی رہی تھی۔ آبدار ہوتی اس کے دامن کو تر کرتے چلے جا رہے تھے۔

وہ قریب آیا ہی تھا۔ نسیمہ پہلی اور آخری بار شاید اسے اپنے سینے سے لگانے ہی کو تھی کہ ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔

''اچھا آپا...... خدا حافظ...... میں آتا رہوں گا آپ کے پاس۔''

وہ ان آخری لمحوں کو کھونا نہیں چاہتی تھی، بجلی کی سی تیزی سے وہ لپکی، کانپتے ہاتھوں کے بیچ اس نے آفاق کا چہرہ تھاما اٹھائیس برس سے اپنی ہی آگ میں تپتی ممتا کی تمام تر شدتیں لبوں میں سمیٹ کر اس نے اپنی سچی محبت کی گواہ ایک مہر محبت اس کی پیشانی پر ثبت کر دی۔

''آپا......'' اس نے متاسف نگاہوں سے نسیمہ کو دیکھا۔ ان نگاہوں میں اداسی تھی، بے بسی تھی، مجبوری تھی، اب وہ بھی دکھی ہو رہا تھا۔

نسیمہ نے تھکی تھکی سی نگاہیں کھلے دروازے کی جانب اٹھا لیں۔

''کوئی تو ہو جو میری گواہی دے!'' اس کا رواں رواں پکار رہا تھا۔ مگر یوں جانے والے بھی کہیں آیا کرتے ہیں۔

''بس ایک بار...... ایک بار...... مجھے......''

مگر ہمیشہ کی طرح بزدلی نے اسے آنکھیں دکھائیں، زمانے کا خوف عود آیا، رسوائیوں کے ڈر نے اس کا دامن تھام لیا لیکن آج اس نے طے کر لیا تھا کہ اس کے منہ سے اپنے لیے صرف اور صرف ایک بار ماں کا لفظ سننے کے لیے وہ اس کے قدموں میں جھکنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

لیکن ابھی اس کے اندر دبکی ہوئی وہ زمانے کے خوف سے سہمی ہوئی ماں اپنی جرأتوں کو مجتمع کر رہی تھی کہ کھلے ہوئے چھوٹے سے دروازے کے بیچ بڑے گھر کی وہ بیٹی آ کھڑی ہوئی جس کے گھر سے آئی ہوئی چمکدار گاڑی نیچے کھڑی تھی۔ آفاق کا چہرہ نسیمہ کے لرزتے ہاتھوں میں تھا اور آنکھوں میں جہان بھر کی محبتیں سمٹ آئی تھیں۔

''اب آ بھی چکو آفاق! لگتا ہے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے لیکن اس منظر کو دیکھ کر دیکھنے والوں کا بہن بھائی کے رشتے کے بارے میں بھی بدگمان ہو جانا یقینی ہے۔''

''خدا حافظ آپا......'' وہ مڑ گیا، اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ امیر باپ کی بیٹی کی اس بات کا کوئی جواب دے سکتا۔

''فی امان اللہ۔'' اس نے ایک اور گھاؤ دل پر کھانے کے بعد بھی قلب کی پنہائیوں سے کہا۔

آفاق جا رہا تھا، جاتے جاتے اس نے اپنے پیچھے کھلے دروازے کے پٹ یوں بند کر دیے جیسے ہمیشہ کے لیے بند کیے جا رہا ہو۔ نسیمہ بے بسی سے بند دروازے کی سمت دیکھتی رہ گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بند دروازہ کھول دیتی، کھولتی بھی تو کس کے لیے؟ آج تو دل کے دروازوں پر ایسی چوٹ پڑی تھی کہ پورا معبد ہل کر رہ گیا تھا۔ اس مظلوم بچے کی طرح جو بے دردی سے کھلونا چھین لیے جانے پر بلک اٹھے، وہ زخم خوردہ ماں جسے رفتارِ زمانہ پامال کرتی ہوئی گزر چکی تھی، جو ماں ہوتے ہوئے بھی ماں کہلانے کا حق نہ رکھتی تھی، بلبلا کر تیسری منزل پر واقع اس فلیٹ کی اس بالکونی کی جانب دوڑی جو سڑک کے رخ پر کھلتی تھی۔ اس بالکونی سے نیچے سڑک کی جانب دیکھتے ہوئے وہ دیوار سے دیوانہ وار سر ٹکرا کر رو رہی تھی چمکیلی کار میں بیٹھا اس کا جگر گوشہ جا رہا تھا۔

''خدایا...... خدایا...... یہ مائیں بیٹوں کے جوان ہونے کی دعائیں کیوں مانگتی ہیں؟...... کیوں مانگتی ہیں......؟''

ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ماں دور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھی اور اس کے اس سوال پر آسمان بھی رو رہا تھا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

کرامتیں ہوں یا معجزے... حکایتیں ہوں یا روایتیں... عقلمندوں کے لیے ہمیشہ راہنمائی اور آگاہی کا ایک معتبر ذریعہ ہیں... یہ اور بات کہ مقدر والے ہی ان ذرائع سے فیضیاب ہو پائے... حضرت زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں اولاد اور بی بی مریم کو بے موسم کے پھل عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے اندھیروں میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو روشنی عطا کی مگر... ہر تقدیر میں اجالا نہیں ہوتا... حضرت یحییٰ علیہ السلام خود کو صحرا میں منادی کرنے والا نبی کہتے تھے... کم عمری میں ہی بچوں کے ساتھ کھیلنے کے بجائے جنگل و بیابان کی طرف نکل جاتے اور خدا کے خوف میں آنسو بہاتے حتیٰ کہ گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں بن گئیں... کیونکہ اللہ اپنے خوف سے رونے والوں اور بندگی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے... اور وہ کوئی عام انسان نہیں بلکہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے...

جنگل و بیابان کی آواز... حضرت یحییٰؑ کی مشکلات کا احوال

حضرت یحییٰؑ نے سب کو مخاطب کیا اور حکم دیا۔ ''تم سب اردن کے اس پار بیت عنیاہ میں آؤ۔ میں وہاں دریائے اردن میں کھڑے ہو کر تمہیں بپتسمہ دوں گا۔ پھر تم گناہوں سے پاک ہو جاؤ گے اور پھر تم اپنی آئندہ زندگی ایمان داری سے گزارنا۔''
اس آواز میں ایسا اثر تھا یا پھر یہ تھا کہ گناہوں سے پاک ہونا کون نہیں چاہتا۔ لوگ دور دور سے کھنچے چلے آ رہے تھے۔ دریائے اردن کے اس پار لوگوں کا میلا سا لگا ہوا تھا۔ صبح سے شام تک قطار آگے بڑھتی رہتی۔ ایک ایک آدمی آپؑ کے پاس

پہنچتا، آپؑ اس سے وعدے لیتے، توبہ کراتے اور پانی کے چند چھینٹے ڈالتے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا۔ دوسرے دن اگلی ہی قطاریں پھر لگ جاتیں۔

یروشلم میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ قافلے کے قافلے دریائے اردن کی طرف جا رہے تھے۔ علمائے یہود اس کارروائی کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں سے باگ ڈور نکلی جا رہی تھی۔ ایک ایسا آدمی سامنے آ گیا تھا جو خود انہیں بھی برا بھلا کہہ رہا تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے معتقد اتنے ہو گئے تھے کہ علما ان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ علما کے کئی اجلاس منعقد ہو چکے تھے۔ ان اجلاسوں میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل تک کی تجاویز زیرِ غور آ چکی تھیں لیکن یہ الزام وہ اپنے سر لینا نہیں چاہتے تھے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ان کی شکایت بادشاہ تک پہنچائی جائے اور اسے بھڑکایا جائے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام شامی علاقے کے شمال مغرب میں تھے جہاں ہیرودیس کی حکومت تھی۔ علما کا یہ وفد اس کے دربار میں پہنچا۔

''زکریا (علیہ السلام) کا بیٹا یحییٰؑ آپ کے علاقے میں نبی بن کر بیٹھ گیا ہے۔ لوگوں کو ورغلا رہا ہے۔ کہتا ہے وہ ان سب کو گناہوں سے پاک کر لے گا۔ لوگ اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں۔ جوق در جوق اس کے پاس چلے آ رہے ہیں۔''

''سنا تو ہم نے بھی ہے لیکن وہ سرکاری کاموں میں مداخلت نہیں کر رہا ہے۔ اس لیے ہم نے بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی اب تک نہیں کی، تمہیں اس سے کیا اندیشہ ہے؟'' ہیرودیس نے کہا۔

''ہمیں تو کوئی اندیشہ نہیں۔ ابھی آپ کو بھی کوئی خطرہ نہیں لیکن آئندہ چل کر وہ آپ کی سلطنت کے لیے بڑا خطرہ بننے والا ہے۔ جب اس کے معتقدین کی تعداد بڑھ جائے گی تو وہ یقیناً بادشاہت کا دعویٰ کرے گا۔ ہم آپ کا دفاع کر سکتے ہیں لیکن وہ ہمیں سانپ کی اولاد کہتا ہے۔ لوگوں میں ہماری اہمیت کم کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہی اس کی چال ہے۔ وہ علما کے طبقے کو کمزور کر کے آپ پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔''

''تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ہم چاہتے ہیں اس شخص کو قید کروا دو قتل کرو کیونکہ یہ بنی اسرائیل میں فتنہ کھڑا کر رہا ہے۔''

ہیرودیس کے دل میں خدا نے ڈال دیا کہ وہ جب تک اچھی طرح تحقیق نہ کر لے، علما کی باتوں میں نہ آئے۔ اس نے علما کے وفد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ پہلے اچھی طرح تحقیق کرے گا، اس کے بعد کوئی قدم اٹھائے گا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح بادشاہ نے کاہنوں اور لادیوں پر مشتمل وفد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی طرف روانہ کیا کہ وہ حقیقتِ حال معلوم کر کے آئیں۔

یہ وفد دریا کے کنارے پہنچا تو اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

''اے سانپ کے بچو! تمہیں کس نے آگاہ کیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو۔ پس توبہ کے مطابق پھل لاؤ اور اپنے دلوں میں یہ کہنا شروع نہ کرو یعنی اس پر فخر نہ کرو کہ ابراہیم (علیہ السلام) ہمارا باپ ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا ان پتھروں سے ابراہیم کے لیے اولاد پیدا کر سکتا ہے اور اب تو درختوں کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہے۔ پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا، وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔''

وفد کے ارکان ایک طرف کھڑے یہ سب باتیں سن رہے تھے۔ آپؑ کی باتیں ختم ہوئیں تو لوگ بہ یک وقت چیخ اٹھے۔

''پھر ہم کیا کریں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''تمہارے پاس جو کچھ تمہاری ضرورتوں سے زیادہ ہے، وہ ضرورت مندوں کو دے دو۔ ننگے کو کپڑے پہناؤ، بھوکے کو کھانا کھلاؤ۔''

چنگی وصول کرنے والے آگے بڑھے تو آپؑ نے فرمایا۔ ''جو تمہارے لیے مقرر ہے وہ لے لو۔ اس سے زیادہ ہرگز نہ لو۔''

سپاہیوں کی قطار آگے بڑھی۔ ''ہم کیا کریں؟''

''کسی پر ظلم نہ کرو اور اپنی تنخواہ پر تکیہ کرو۔ رشوت طلب نہ کرو۔''

یہ لوگ قطار در قطار آگے بڑھتے رہے۔ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے اور آپؑ کی تعلیمات پر چلنے کا عہد کرتے رہے۔

جو شخص توبہ کرتا، آپ دریائے اردن کا پانی اس کے سر پر چھڑک کر اس کے حق میں دعا کرتے۔

انجیل میں اس مقام کی نشاندہی اس طرح کی ہے۔

''اور یوحنا شالیم کے نزدیک عینون میں بپتسمہ دیتا تھا۔''

لوگوں کی بھیڑ تھی کہ چھٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔ وفد کو موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے گفتگو کرتا... بالآخر شام کے وقت کچھ دیر کے لیے وقفہ آیا تو یہ وفد ان کے سامنے پہنچ گیا اور تقریباً وہی سوالات کیے جو علمائے یہود پہلے بھی آپؑ سے پوچھ چکے تھے۔ ہو سکتا ہے اس وفد کے ارکان نے علما سے پوچھ لیا ہو کہ کیا پوچھنا ہے۔

''اے یحییٰؑ! تو کون ہے؟''

''میں نہ انکار کرتا ہوں نہ اقرار بلکہ صرف اتنا کہتا ہوں کہ میں مسیح نہیں ہوں۔''

''پھر کون ہے، کیا تو ایلیا ہے؟''

''میں وہ بھی نہیں ہوں۔''

''کیا تو وہ نبی ہے جس کا ہمیں انتظار ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر تو ہے کون؟''

''میں جیسا یسعیاہ نبی نے کہا ہے بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔''

''اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیا تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟''

''میں تو صرف پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں۔ تمہارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے جسے تم نہیں جانتے یعنی میرے بعد آنے والا۔ میں جس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں۔ وہ تمہیں روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا۔''

اس وفد نے یہ باتیں سنیں اور واپس جا کر بادشاہ کو بتا دیا کہ وہ شخص کسی آنے والے کی خبر دے رہا ہے اور خود کو بیابان کی آواز کہتا ہے۔

بادشاہ نے سر جھکا کر سنا اور حکم دے دیا کہ یحییٰؑ کو کچھ نہ کہا جائے۔ وہ جو کام کر رہا ہے، اسے کرنے دو۔

مرقس کی انجیل میں ہے کہ جس دن یہ ماجرا ہوا کہ وفد حضرت یحییٰ علیہ السلام سے سوال جواب کر کے چلا گیا اس کے دوسرے ہی دن حضرت مسیح علیہ السلام دریا کے کنارے آئے۔

☆☆☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مختلف آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ناصرت میں آئے جہاں انہوں نے پرورش پائی تھی اور اپنے دستور کے مطابق سبت کے دن عبادت خانے میں گئے اور پڑھنے کو کھڑے ہوئے۔ یسعیاہ نبی کی کتاب اس کو دی گئی اور کتاب کھول کر اس نے وہ مقام نکالا جہاں یہ لکھا تھا۔

خداوند کا روح مجھ پر ہے
اس لیے کہ اس نے مجھے غریبوں کو خوش خبری دینے کے
لیے مسح کیا
اس نے مجھے بھیجا ہے کہ قیدیوں کو رہائی دوں
اور اندھوں کو بینائی پانے کی خبر سناؤں
کچلے ہوؤں کو آزاد کر دوں
اور خداوند کے سال مقبول کی منادی کروں۔

پھر وہ کتاب بند کر کے اور خادم کو واپس دے کر بیٹھ گئے اور جتنے عبادت خانے میں تھے سب کی آنکھیں اس پر لگی تھیں۔ پھر ان میں سے ایک بولا۔ ''کیا یہ یوسف کا بیٹا نہیں؟''

یوسف وہ آدمی تھا جس پر بنی اسرائیل نے حضرت مریمؑ سے تعلق رکھنے کی تہمت لگائی تھی۔

اس انکشاف کے بعد دوسروں نے بھی ان کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھا اور آپؑ کو پکڑ کر اس پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے جس پر ان کا شہر آباد تھا تاکہ انہیں پہاڑ سے نیچے گرا دیں۔ آپ کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل گئے۔

اس کے بعد آپؑ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام یاد آئے جن کی شہرت آپ تک پہنچ چکی تھی۔
حضرت یحییٰ علیہ السلام دریائے اردن کے کنارے لوگوں کو بپتسمہ دے رہے تھے۔ حضرت مسیح بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو خود کو گناہوں سے پاک کر رہے تھے۔
حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام انہیں پہچانتے نہیں تھے لیکن اللہ نے انہیں بتادیا کہ وہ کون ہیں۔
''تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟''
''میں بھی دوسروں کی طرح بپتسمہ لینے آیا ہوں۔''
''میں تو خود تمہارا احتاج ہوں تمہیں کیا دے سکتا ہوں؟''
''جس طرح ہو رہا ہے اسی طرح ہونے دے۔'' حضرت یحییٰ علیہ السلام نے بپتسمہ دیا اور حضرت مسیحؑ پانی سے باہر آ گئے۔
حضرت یحییٰ علیہ السلام نے روح کو کبوتر کی طرح آسمان سے اترتے دیکھا۔ وہ روح حضرت مسیح علیہ السلام پر آ کر ٹھہر گئی۔ خدا کا کلام نازل ہوا۔ یہ ایک آواز تھی جو حضرت یحییٰ علیہ السلام سے مخاطب تھی۔
''جس پر تو روح کو اترتے اور ٹھہرتے دیکھے وہی روح القدس سے بپتسمہ دینے والا ہے۔''
حضرت یحییٰؑ کے دو شاگرد قریب کھڑے تھے۔ وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے درمیان کچھ دیر پہلے ہونے والی گفتگو کو سن چکے تھے، انہوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے پوچھا۔
''یہ شخص کون ہے؟''
''یہ وہی ہے جس کی بابت میں نے کہا تھا کہ ایک شخص میرے بعد آتا ہے جو مجھ سے مقدم ٹھہرا ہے۔ میں نے اسے اس لیے بپتسمہ دیا کہ وہ اسرائیل پر ظاہر ہو جائے۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ظاہر کرنا یہ بتا رہا تھا کہ اب یحییٰ علیہ السلام اپنا کام نمٹا چکے۔
حضرت یحییٰ علیہ السلام کے دونوں شاگرد یہ سنتے ہی کہ وہ روح القدس سے بپتسمہ دینے والا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے ہو لیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگے آگے چلے جا رہے تھے پھر انہیں احساس ہوا کہ کوئی ان کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔
انہوں نے پلٹ کر دیکھا اور کہا۔ ''تم کیا ڈھونڈتے ہو؟''
''اے استاد! ہم یہ دیکھنے چلے آتے ہیں کہ تو کہاں رہتا ہے؟''
''میرے پیچھے پیچھے چلتے رہو تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔'' وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے حضرت مسیحؑ کے رہنے کی جگہ پہنچ گئے۔ یہ دونوں ان کے ساتھ دس گھنٹے رہے۔ ان دونوں میں سے ایک شمعون کا بھائی تھا جو بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور حواری بنے۔ وہ اپنے بھائی کے پاس آیا اسے خوش خبری سنائی کہ ہمیں مسیحؑ مل گیا۔ وہ اپنے بھائی کو لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس پر نگاہ کی۔ ''تو یوحنا کا بیٹا شمعون ہے۔ تو کیفا یعنی پطرس کہلائے گا۔''

☆☆☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کچھ عرصہ بعد یہودیہ کے ملک میں آئے اور لوگوں کو بپتسمہ دینے لگے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام بھی دریائے اردن کے کنارے بپتسمہ دے رہے تھے۔
یہودیوں کو موقع مل گیا کہ وہ ان دونوں میں دشمنی پیدا کر کے اپنی سازش مکمل کریں۔ یہودیوں کے ایک فرقے فریکی کے کچھ لوگ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی شکایت ان سے کی۔
''اے ربی! جو شخص تجھ سے بپتسمہ لے کر گیا تھا اب تو وہ خود لوگوں کو بپتسمہ دے رہا ہے اور لوگ اس کے پاس کثرت سے آ رہے ہیں۔''
حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ''انسان کچھ نہیں پا سکتا جب تک اس کو آسمان سے نہ دیا جائے۔''
''تو کیا تمہیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ وہ شخص تمہاری حکومت میں دخل دے رہا ہے۔ ایک دن وہ آئے گا جب تمہارے

سب شاگرد اس کے پاس چلے جائیں گے۔''
''مجھے کیوں تعجب ہونے لگا۔ میں نے تو خود تم سے کہا تھا میں مسیح نہیں مگر اس کے آگے بھیجا گیا ہوں۔ جس کی دلہن ہے وہ دولہا ہے مگر دولہا کا دوست جو کھڑا ہوا ہے۔ دولہا کی آواز سے بہت خوش ہوتا ہے پس میری یہ خوشی پوری ہو گئی۔ مجھے تو خوشی ہو گی کہ وہ بڑھے اور میں گھٹوں۔''
اس بحث کی روداد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی معلوم ہوئی۔ آپؑ نے یہی بہتر سمجھا کہ اس ملک سے چلے جائیں۔ آپؑ اپنے شاگردوں کے ساتھ بیرون کے مغرب میں ایک مقام گلیل کی طرف چلے گئے۔ یہ مقام یہودیوں کے نزدیک گرا پڑا مقام تھا کیونکہ یہاں مختلف قومیں آباد تھیں۔
گلیل تک پہنچنے کے لیے سامریہ سے گزرنا ضروری تھا۔ آپؑ اپنے شاگردوں کو لے کر چلے اور سامریہ کے ایک شہر سوخار میں پہنچ گئے۔ یہ شہر اس قطعہ زمین کے نزدیک تھا جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا کنواں وہیں تھا۔ آپؑ نے اپنے شاگردوں کو شہر کی طرف بھیجا کہ کھانا خرید کر لائیں اور خود کنویں کے منڈیر پر بیٹھ گئے۔ سامریہ کی ایک عورت پانی بھرنے آئی۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا ''مجھے پانی پلا۔''
عورت نے متعجب ہو کر کہا۔ ''تو یہودی ہو کر مجھ سامری عورت سے پانی کیوں مانگتا ہے جبکہ یہودی تو ہم سامریوں سے کسی طرح کا برتاؤ رکھتے ہی نہیں۔''
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔ ''اگر تو خدا کی بخشش کو جانتی اور یہ بھی جانتی کہ وہ کون ہے جو تجھ سے کہتا ہے مجھے پانی پلا تو، تو اس سے مانگتی اور وہ تجھے زندگی کا پانی پلاتا۔''
''تیرے پاس پانی نکالنے تک تو کچھ ہے نہیں پھر زندگی کا پانی تیرے پاس کہاں سے آیا۔ کیا تو ہمارے باپ یعقوبؑ سے بڑا ہے جس نے یہ کنواں ہم کو دیا؟''
''جو کوئی اس پانی میں سے پیے گا وہ پھر پیاسا ہو گا مگر جو کوئی اس پانی میں سے پیے گا جو میں اسے دوں گا وہ ابد تک پیاسا نہ ہو گا۔''
''اگر ایسا ہے تو وہ پانی مجھے دے تاکہ نہ مجھے پیاس لگے نہ پانی بھرنے یہاں تک آؤں۔''
''جا، اپنے شوہر کو یہاں بلا کر لے آ۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا۔
''میں شوہر کو کہاں سے لاؤں، میں تو بے شوہر کی ہوں۔''
''تو نے خوب کہا کہ میں بے شوہر کی ہوں کیونکہ تو پانچ شوہر کر چکی ہے البتہ یہ بات تو نے سچ کہی کیونکہ اب تو جس مرد کے ساتھ رہ رہی ہے وہ تیرا شوہر نہیں۔''
عورت کو سخت تعجب ہوا کہ وہ اس بات کو کیسے جان گیا۔ ہو نہ ہو یہ کوئی نبی ہے۔ اس نے تصدیق کے لیے آپؑ سے پوچھا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ تو نبی ہے؟'' اس عورت نے کہا اور شہر کی طرف بھاگی۔
اتنی دیر میں حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد شہر سے کھانا لے کر آ گئے تھے۔ شاگرد ضد کر رہے تھے کہ آپؑ کچھ کھا لیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اب کھانے سے رغبت نہیں رہی تھی۔ وہ کچھ اور ہی دیکھ رہے تھے۔
اس عورت نے شہر میں جا کر شور مچا دیا۔ لوگوں سے کہنے لگی۔ ''آؤ ایک آدمی کو دیکھو جس نے میرے سب کام مجھے بتا دیے، کیا یہ ممکن ہے مسیح ہی ہو۔''
لوگ اس عورت کی پکار سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جمع ہونے لگے۔ شاگرد اس نئی صورتِ حال سے پریشان تھے۔ ان کے استاد نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ ضد کر رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہلے کھانا کھا لیں لیکن آپؑ انکار کر رہے تھے۔
''میرا کھانا یہ ہے کہ بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں اور اس کا کام پورا کروں۔''
اس شہر کے بہت سے سامری اس عورت کے کہنے سے آپؑ پر ایمان لے آئے اور ضد کرنے لگے کہ وہ اور ان کے شاگرد کچھ دنوں کے لیے یا ہمیشہ کے لیے ان کے پاس رہیں۔ آپؑ نے دو روز تک ان کے پاس قیام کیا اور پھر گلیل کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

علمائے یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی مخالفت کر رہے تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ان سے بچ کر گلیل کی طرف چلے گئے تھے اور وہاں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کا یہ کہنا ٹھیک ثابت ہو رہا تھا کہ نبی کو اپنے وطن میں مقبولیت نہیں ملتی۔ وہ ناصرت سے نکالے گئے تھے لیکن گلیل میں انہیں مقبولیت مل رہی تھی۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام لوگوں کو گناہوں سے پاک کرنے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ان کے ماننے والوں کی تعداد بڑھ گئی تھی کہ یہ علما اتنی آسانی سے ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ اس عرصے میں وہ سازشیں کرتے رہے تھے لیکن کامیابی ان سے دور رہی تھی۔ وہ اس عرصے میں بادشاہ کو بھی ان کے خلاف بھڑکاتے رہے تھے کہ وہ سرکاری سطح پر ان کے خلاف قدم اٹھائے لیکن بادشاہ ان کا عقیدت مند تھا۔ اس نے بپتسمہ نہیں لیا تھا لیکن اس کا کہنا یہ تھا کہ وہ بھلائی کا کام کر رہے ہیں۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ جب وہ میرے کاموں میں دخل نہیں دے رہے ہیں تو میں ان کے کاموں میں کیوں دخل اندازی کروں۔

علما تقریباً مایوس ہو چکے تھے کہ امید کی ایک صورت نکل آئی۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام شامی علاقے کے شمال مغرب میں تھے جہاں ہیرودیس کی حکومت تھی۔ اس کے جنوب میں ہیرودیس کا بھائی فلپ حکومت کر رہا تھا۔ فلپ کی ایک بیٹی سلوم تھی۔ ہیرودیس ایک مرتبہ بھائی سے ملنے گیا اور سلوم پر نظر پڑی تو وہ دل و جان سے اس پر عاشق ہو گیا۔

جب وہ اپنے وطن کی طرف لوٹا تو راستے بھر اسے سلوم کا خیال پریشان کرتا رہا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ توریت کی شریعت کے مطابق سلوم سے اس کا نکاح نہیں ہو سکتا، یہ گناہ ہے اور اس گناہ کی حمایت کوئی بھی نہیں کرے گا لیکن جب اسے اپنے طاقتور بادشاہ ہونے کا خیال آتا تو اسے یہ باتیں بہت چھوٹی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ وہ سوچتا تھا میں کچھ بھی کر لوں، کوئی مجھے روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ کوئی میرے سامنے زبان نہیں کھول سکتا۔ کچھ دیر کو گناہ کا احساس ہوتا بھی تو سلوم کا حسنِ جہاں سوز اس خیال کو باطل کر دیتا تھا۔

محل میں پہنچنے کے بعد بھی وہ اسی کش مکش کا شکار رہا۔ تھوڑی دیر کو اپنے ارادے سے تائب ہوتا مگر دوسرے ہی لمحے سلوم کو حاصل کرنے کی خواہش شور مچانے لگتی۔

ایک روز اس نے اپنے ایک غلام کو طلب کیا۔ وہ حاضر ہو گیا تو بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دو۔ غلام کہتا رہ گیا کہ میرا قصور کیا ہے اور اس کا سر اس کے تن سے جدا ہو گیا۔

کسی نے پوچھا تک نہیں کہ غلام کی خطا کیا تھی۔ اس کا سر کیوں کاٹ دیا گیا۔ ہیرودیس اپنی طاقت پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ میں کچھ بھی کر لوں کوئی مجھ سے پوچھنے والا نہیں۔ میں سلوم سے شادی کر لوں گا تو بھی کوئی مجھ پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ مطالبہ جائز نہیں۔ اس کا بھائی سلوم سے اس کی شادی پر کبھی تیار نہیں ہوگا۔ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فلپ پر حملہ کرے گا اور سلوم کو اٹھا کر لے آئے گا۔ اس نے ایک لشکر ترتیب دیا اور فلپ پر حملہ آور ہو گیا۔

فلپ زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکا اور شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ہیرودیس جس مقصد سے حملہ آور ہوا تھا اس نے پورا کیا۔ سلوم کو اس کی ماں یعنی فلپ کی بیوی سمیت اغوا کیا اور اپنے محل میں لے آیا۔

فلپ کی بیوی اب تک بے خبر تھی کہ اس جنگ میں ہم عورتوں کا کیا قصور۔ ہیرودیس ہمیں کیوں اٹھا کر لے آیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ یہ عقدہ تو اس وقت کھلا جب ہیرودیس نے اپنی بھاوج کو اپنے پاس بلایا۔

''تم نے اب تک یہ نہیں پوچھا کہ میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟''

''بادشاہوں سے کچھ نہ پوچھو جب تک وہ خود نہ بتائیں۔ میں نے تو ایک بادشاہ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے یہ سیکھا ہے۔''

''اب میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میں تمہاری بیٹی سلوم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''شریعت جاننے کے باوجود کہ بھتیجی سے شادی نہیں ہو سکتی۔''

''علما میرے زرخرید ہیں میں ان کے ذریعے ناجائز کو جائز کرا لوں گا۔ رشتہ داری کا پاس کر رہا ہوں کہ تمہاری اجازت

طلب کر رہا ہوں ورنہ میں بادشاہ ہوں، کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیا جائے تاکہ میں اچھی طرح غور کر لوں۔'' فلپ کی بیوی نے اسی روز خاموشی سے چند علما کو اپنے پاس بلایا تاکہ انہیں معاملے سے آگاہ کرے اور ان سے درخواست کرے کہ بادشاہ کو اس ناجائز فعل سے باز رہنے کی تلقین کریں۔

علما تو ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں تھے۔ کوئی ایسی چال چلنا چاہتے تھے کہ ان پر کوئی الزام بھی نہ آئے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام سے نجات بھی مل جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ فلپ کی بیوی اور بیٹی کو ہیرودیس اٹھا کر لے آیا ہے اور اس کے کیا ارادے ہیں۔ اب جو انہیں فلپ کی بیوی نے طلب کیا تو سازشوں کے سب دروازے کھلتے نظر آئے۔ انہوں نے فلپ کی بیوی سے ملاقات کی۔

علما نے فلپ کی بیوی کو مشورہ دیا کہ وہ بادشاہ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پاس بھیجے اور ان سے اس شادی کا فتویٰ لے لے۔ ''بادشاہ ہم علما کی کسی بات کو نہیں مانے گا لیکن یحییٰ کے فتوے کے بعد وہ مجبور ہو جائے گا۔''

''اگر یحییٰ نے فتویٰ دے دیا؟''

''وہ یہ فتویٰ کبھی نہیں دیں گے اور بادشاہ کو اپنی ضد سے باز آنا پڑے گا۔'' فلپ کی بیوی کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس نے علما کو رخصت کیا اور بادشاہ کے پاس پہنچ گئی۔

''بادشاہ سلامت، میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ پہلے آپ لوگوں کی زبانیں بند کریں اس کے بعد سلوم سے شادی کریں۔''

''ایک مرتبہ شادی ہو جائے پھر سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔''

''یہ کام شادی سے پہلے کرنے کا ہے۔''

''تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میں نے سنا ہے یحییٰ اپنے لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ آپ ان کے پاس جائیں اور اس شادی کی اجازت لے لیں۔ اس کے بعد آپ کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکے گا۔ علما بھی ان سے ڈرتے ہیں۔ وہ بھی کوئی فتویٰ جاری نہیں کر سکیں گے۔''

''اگر انہوں نے انکار کر دیا تو جانتی ہو کیا ہوگا۔ میں کبھی شادی نہیں کر سکوں گا۔''

''کمال ہے! آپ بادشاہ ہو کر ایسی بات سوچتے ہیں۔ بادشاہوں کی بات کوئی ٹالتا ہے؟ انہیں اپنی جان کی فکر ہو گی تو آپ کی بات ضرور مانیں گے۔ آپ انہیں لالچ دیں یا جان کا خوف دلائیں۔ ان کی اجازت کے بغیر آپ کا شادی کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ ان کے عقیدت مند آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

یہ مشورہ بادشاہ کے دل میں اتر گیا۔ وہ فوراً آپؑ سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ بادشاہ کس کام کے لیے ان کے پاس آ رہا ہے۔

آپؑ نے اسے دیکھتے ہی فرمایا۔ ''اے بادشاہ! جس گناہ میں تو گرفتار ہے جب تک اس سے توبہ نہیں کر لیتا تجھے مجھ سے ملنے کا کوئی حق نہیں۔''

''میں بپتسمہ لینے نہیں آیا ہوں۔ میں تو صرف اس لیے آیا ہوں کہ جو میرے حق میں ناجائز ہے اسے جائز کر دو۔''

''تم مجھ سے یہ توقع بھی کیسے رکھ سکتے ہو؟''

''اس لیے کہ میں بادشاہ ہوں اور بادشاہوں کی بات کوئی نہیں ٹال سکتا۔''

''آپ سے بھی بڑا ایک بادشاہ ہے جس کا قانون نہ میں توڑ سکتا ہوں نہ آپ۔''

''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ سلوم سے میری شادی کو جائز قرار دے دو ورنہ مجھ میں یہ طاقت بھی ہے کہ میں تمہیں گرفتار کر لوں۔''

''میرا فیصلہ پھر بھی وہی رہے گا۔ میں حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔''

دونوں کے درمیان اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ بادشاہ کو مایوس لوٹنا پڑا۔ محل میں آ کر اس نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ دھمکی سے کام نہیں چل سکتا۔ اب لالچ کا داؤ استعمال کرنا چاہیے۔ وہ اس فیصلے کے وقت یہ بھول گیا تھا کہ حضرت یحییٰ

علیہ السلام کی ضروریات ہی کتنی ہیں۔ دنیاداری ان کے قریب سے ہوکر نہیں گزری۔ دولت کا لالچ انہیں کیسے خرید سکتا ہے۔ بادشاہ نے ان کے عقیدت مندوں میں سے بعض کو اپنے پاس بلایا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ یحییٰ کو سمجھائیں اگر وہ آدھی سلطنت بھی طلب کریں گے تو میں انہیں دے دوں گا۔ انہیں یہ بھی سمجھاؤ کہ میری حکم عدولی سے انہیں نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔

آپؑ کے چاہنے والوں میں زیادہ تر غریب لوگ تھے۔ وہ بادشاہ کا حکم سن کر ڈر گئے۔ وہ اسی وقت حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پاس گئے اور انہیں اونچ نیچ سمجھانے لگے لیکن آپؑ نے انہیں بھی وہی جواب دیا جو وہ بادشاہ سے کہہ چکے تھے۔ بادشاہ کی ہر شرط ٹھکرائی جاتی رہی۔ اس کا غصہ بڑھتا ہی چلا گیا اور بالآخر اس نے حکم دیا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو گرفتار کرلیا جائے۔

وہ قید کرلیے گئے تھے لیکن بادشاہ کے دل میں اب بھی ان کی طرف سے نرم جذبات تھے۔ ان کے بعض شاگردوں کو اجازت تھی کہ وہ قید خانے میں حضرت یحییٰ علیہ السلام سے ملاقات کے لیے جاسکتے ہیں۔ مقصد یہ بھی تھا کہ ان شاگردوں کے ذریعے حضرت یحییٰ علیہ السلام پر دباؤ ڈالا جاتا رہے اور ان سے اپنے مطلب کا فرمان لکھوالیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بادشاہ نے آپؑ کے شاگردوں کو سکھا کر بھیجا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو سمجھائیں۔

آپ نے اس وقت بھی یہی جواب دیا۔ ''میں انسانوں کو بھلائی کا حکم دیتا ہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ کون حاکم ہے اور کون محکوم۔ شریعت کا حکم سب کے لیے برابر ہے۔ بادشاہ کے لیے شریعت کا حکم بدل نہیں سکتا اور نہ میری گرفتاری سے اس میں کوئی فرق پڑے گا۔ جو چیز حرام ہے وہ حرام ہی رہے گی۔''

بادشاہ کی بار بار کوششوں سے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے سمجھ لیا یا انہیں درگاہ الٰہی سے معلوم ہوگیا کہ اب انہیں جیتے جی اس قید سے رہائی ملنے والی نہیں۔ اب انہیں اپنی رہائی نہ ہونے کے بعد کی صورت حال کا انتظام فرمانا تھا۔ اگرچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو تو معلوم تھا لیکن وہ چاہتے تھے شاگرد خود مشاہدہ کریں تاکہ ان کی تسلی ہو۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کو بلایا اور ان سے کہا۔ ''تم دونوں مسیح (علیہ السلام) کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کیا تم وہی شخص ہو جس کا ہم انتظار کررہے ہیں اور میں لوگوں کو بشارت دے رہا ہوں۔''

دونوں شاگردوں نے مزید وضاحت کے لیے کہا۔ ''آپؑ یہ بشارت جس شخص کے بارے میں دیتے رہے ہیں کیا اس سے مراد الیاس علیہ السلام ہیں یا پھر آنے والے شخص سے مراد اس پیغمبر کی تشریف آوری ہے جس کا بنی اسرائیل صدیوں سے انتظار کررہے ہیں۔ اگر مسیح وہی شخص ہیں تو ہم آنے والے کا انتظار نہیں کریں گے اور اگر یہ وہ نہیں ہیں تو ہم سب بہ دستور انتظار کرتے رہیں گے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمیشہ گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ آج اس شہر میں تو کل دوسرے شہر میں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے دونوں قاصدوں کو خبر ملی تھی کہ ان دنوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام شہر نائین میں ہیں۔ وہ دونوں اسی شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب یہ شہر کے پھاٹک کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ کوئی مرگیا ہے۔ بہت سے لوگ مردے کو اٹھا کر باہر لے جارہے ہیں۔ جنازے کے ساتھ ایک عورت بھی گریہ وزاری کرتی چلی جارہی تھی۔ معلوم ہوا مرنے والا اس عورت کا اکلوتا بیٹا تھا اور یہ عورت بیوہ تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ اسی شہر میں تھے۔ انہوں نے عورت کی گریہ وزاری سنی تو سخت متاسف ہوئے۔ آپؑ اس عورت کے پاس گئے اور اس سے کہا۔ ''مت رو۔ تیرا بیٹا ابھی زندہ ہوا جاتا ہے۔'' وہ غریب یہی سمجھی ہوگی کہ جس طرح دوسرے لوگ ڈھارس بندھاتے ہیں یہ بھی تسلی دے رہے ہوں گے۔ وہ اسی طرح روتی پیٹتی رہی۔

آپؑ آگے بڑھے اور جنازے کو چھوکر فرمایا۔ ''اے جوان! میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ۔'' مردہ اٹھ بیٹھا اور بولنے لگا اور دوڑا دوڑا اپنی ماں کے پاس آیا۔

یہ حال دیکھ کر سب پر دہشت چھاگئی اور وہ خدا کی حمد کرنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ایک بڑا نبی ہم میں برپا ہوا اور خدا نے اپنی امت پر توجہ کی ہے۔

یہ دونوں بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ یہ سمجھ گئے کہ یہی وہ مسیح علیہ السلام ہے جس کے پاس ہمیں سوال کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس بھیڑ بھاڑ میں بات نہیں کی جاسکتی تھی لہٰذا حضرت یحییٰ علیہ السلام کے دونوں شاگرد آپؑ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک مقام پر جاکر رک گئے۔ یہ ایک عبادت خانہ تھا جہاں بیماروں کا ہجوم تھا۔ کوئی اندھا تھا، کوئی چل پھر نہیں سکتا تھا، کوئی جذام کے موذی مرض میں مبتلا تھا۔ ایک شخص کو اس کے عزیز رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ معلوم

ہر انسان کے ساتھ 24 گھنٹوں میں 20 فرشتے رہتے ہیں

تفسیر ابن جریر میں وارد ہوا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضور ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ بتایئے بندے کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''ایک تو دائیں جانب نیکیوں کا لکھنے والا جو بائیں جانب والے پر امیر ہے جب تو کوئی نیکی کرتا ہے وہ ایک کے بجائے دس لکھتا ہے۔ جب تو کوئی برائی کرے تو بائیں والا دائیں والے سے اس کے لکھنے کی اجازت طلب کرتا ہے وہ کہتا ہے ذرا ٹھہر جاؤ، شاید توبہ واستغفار کرے۔

تین مرتبہ وہ اجازت مانگتا ہے تب بھی اگر اس نے توبہ نہ کی تو یہ نیکی کا فرشتہ اس سے کہتا ہے، اب لکھ لے اللہ ہمیں اس سے چھڑائے۔ یہ تو بڑا برا ساتھی ہے، اسے خدا کا لحاظ نہیں، یہ اس سے نہیں شرماتا۔ اللہ کا فرمان ہے کہ انسان جو بات زبان پر لاتا ہے اس پر نگہبان متعین اور مہیا ہے اور دو فرشتے تیرے آگے پیچھے ہیں۔ فرمان خدا ہے اور ایک فرشتہ تیرے ماتھے کے بال تھامے ہوئے ہے جب تو خدا کے لیے تواضع کرتا ہے وہ تجھے بلند درجہ عطا کرتا ہے اور جب تو اللہ کے سامنے سرکشی اور تکبر کرتا ہے وہ تجھے پست اور عاجز کردیتا ہے اور دو فرشتے، تیرے ہونٹوں پر ہیں۔ جو درود تو مجھ پر پڑھتا ہے اس کی وہ حفاظت کرتے ہیں، ایک فرشتہ تیرے منہ پر کھڑا ہے کہ کوئی سانپ وغیرہ جیسی چیز تیرے حلق میں نہ چلی جائے اور دو فرشتے تیری آنکھوں پر ہیں، یہ دس فرشتے ہر بنی آدم کے ساتھ ہیں۔ پھر دن کے الگ ہیں اور رات کے الگ ہیں یوں ہر شخص کے ساتھ بیس فرشتے من جانب اللہ موکل ہیں۔''

(تفسیر ابن کثیر جلد 3)

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل بہاولپور

ہوا اس پر کسی بدروح نے قبضہ کرلیا ہے۔ اس سے پہلے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کسی اور کام میں مشغول ہوتے وہ دونوں سامنے آگئے۔

''حضرت یحییٰ علیہ السلام، بپتسمہ دینے والے نے ہمیں یہ پوچھنے کے لیے آپؑ کے پاس بھیجا ہے کہ آنے والا تو ہی ہے یا ہم دوسرے کی راہ دیکھیں؟''

''ایک طرف بیٹھ جاؤ اور دیکھتے رہو۔'' وہ دونوں حیران ہوئے کہ یہ ہمارے سوال کا جواب کب ہے لیکن ادب سے کچھ کہہ نہ سکے، دم سادھ کر بیٹھ گئے۔

ان مریضوں میں سب سے پہلے اس شخص کو لایا گیا جو بدروحوں کے زیر اثر تھا۔ اس نے بڑی مدت سے کپڑے نہیں پہنے تھے اور وہ گھر میں نہیں بلکہ قبروں میں رہا کرتا تھا۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو دیکھ کر چلایا اور ان کے آگے گر کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ ''اے مسیح! مجھے تجھ سے کیا کام۔ تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے عذاب میں مت ڈال۔''

وہ یہ بات اس لیے کہہ رہا تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس ناپاک روح کو حکم دے رہے تھے کہ اس آدمی سے نکل جا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا۔ ''تیرا کیا نام ہے؟''

اس نے کہا۔ ''لشکر۔'' کیونکہ اس میں بہت سی بدروحیں تھیں اور وہ ان سے منت کرنے لگیں کہ ہمیں اتھاہ گڑھے میں جانے کا حکم نہ دے۔

وہاں پہاڑ پر سوروں کا ایک بڑا غول چر رہا تھا۔ ان بدروحوں نے منت کی کہ ہمیں ان سوروں کے اندر جانے دے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں جانے دیا۔ روحیں اس آدمی سے نکل کر سوروں کے اندر گئیں اور غول جھیل میں جا پڑا اور ڈوب مرا۔

اس شخص نے کپڑے پہنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ ضد کررہا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ''اپنے گھر لوٹ کر لوگوں سے بیان کر کہ خدا نے تیرے لیے کیسے بڑے کام کیے۔''

ایک مفلوج کو لایا گیا جو چل پھر نہیں سکتا تھا۔ اس وقت بھی ایک چارپائی پر ڈال کر اسے لایا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے قریب گئے اور فرمایا۔ ”میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ اور اپنا کھٹولا اٹھا کر اپنے گھر جا۔“ وہ شخص چارپائی سے اتر پڑا اور خدا کی حمد کرتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

اسی طرح ایک نابینا کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو اس کی بینائی بحال ہوگئی پھر ایک بہرے کے کانوں پر ہاتھ پھیرا اور اس سے باتیں کیں۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے شاگردوں کے لیے یہ باتیں نئی اور دلچسپ ضرور تھیں لیکن انہیں تو اپنی بات کا جواب لینا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اکتانے لگے تھے۔ آخر ان سے رہا نہیں گیا۔

”آپؑ نے ہماری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”کس سوال کا جواب؟“

”یہی کہ آنے والا تو ہی ہے یا ہم دوسرے کی راہ دیکھیں؟“

”تم نے جو کچھ یہاں دیکھا اور سنا ہے جا کر اپنے استاد سے بیان کردو۔ اسے بتانا کہ اندھے دیکھتے ہیں، لنگڑے چلتے پھرتے ہیں، کوڑھی پاک صاف کیے جاتے ہیں، بہرے سنتے ہیں، مردے زندہ کیے جاتے ہیں، غریبوں کو خوش خبری سنائی جاتی ہے اور مبارک ہے وہ جو میرے سبب سے ٹھوکر نہ کھائے۔“

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے شاگرد روانہ ہوئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں بیان فرمایا۔

”یحییٰ وہی ہے جس کی بابت لکھا ہے کہ دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیرے آگے تیار کرے گا۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یحییٰ بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں لیکن جو خدا کی بادشاہی میں چھوٹا ہے اور اس سے بڑا ہے۔“

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام سے چھ ماہ چھوٹے تھے لیکن مراتب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بڑے تھے۔ یہ اسی طرف اشارہ ہے)

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اپنے قاصدوں کی زبانی یہ احوال سنا تو بے اختیار کہہ اٹھے۔ ”اب شاید میری ضرورت نہ رہے کیونکہ آنے والا آچکا ہے۔ مبارک ہو، انتظار ختم ہوا۔“

☆☆☆

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے بعد ہیرودیس کا شادی کے لیے اصرار بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کی ماں بادشاہ کے تقاضوں سے بے حد خوف زدہ تھی۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام قید میں تھے۔ ان کے پرستاروں نے کوئی شور نہیں مچایا تھا۔ کہیں سے کوئی بغاوت نہیں ہوئی تھی۔ یحییٰؑ پابند سلاسل تھے، وہ بھی کوئی آواز نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اسے علما حضرات پر غصہ آرہا تھا کہ ان کے غلط مشورے سے ہی حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قید خانے کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

دوسری طرف علما تھے جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے تھے۔ ان کا منصوبہ نہایت صحیح سمت میں جارہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر فلپ کی بیوی کے پاس آئے۔

”اب آپ لوگ کس لیے آئے ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی زبان بند ہوچکی۔ وہ بادشاہ کی قید میں ہیں اور بادشاہ شادی کے لیے اصرار کررہا ہے۔“

”وہ تو ہم بتانے کے لیے آئے ہیں۔ اب تو کام بہت آسان ہوگیا ہے۔ یہ شادی ہمیشہ کے لیے رک جائے گی۔“

”یہ کیسے ہوگا؟“

”تو اپنی بیٹی سے کہہ کہ وہ اپنی شادی کے لیے یحییٰؑ کے کٹے ہوئے سر کی شرط رکھ دے۔“

”تمہارا مطلب ہے نبی یحییٰ کا سر؟“

”ہاں، ہاں۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”بادشاہ کے دل میں یحییٰؑ کا احترام ہے۔ اس نے تمہیں دکھانے کے لیے اسے قید میں تو ڈال دیا ہے لیکن وہ اسے قتل

ہرگز نہیں کرائے گا۔ وہ یہ شرط کبھی پوری نہیں کرے گا اور اس طرح تیری بیٹی سے شادی بھی نہیں کرسکے گا۔“

فلپ کی بیوی کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ اس نے اسی وقت سلوم کو پوری بات سمجھادی کہ کسی مناسب موقع پر اپنی شادی کے لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کی شرط رکھ دے۔

اتفاق سے انہی دنوں بادشاہ کی سالگرہ کا موقع آگیا۔ بادشاہ نے پھر اصرار کیا کہ سلوم اس سے شادی کرلے تاکہ وہ سالگرہ کے جشن کے موقعے پر اس شادی کا اعلان بھی کردے۔ اس مرتبہ بادشاہ کا لہجہ ایسا دوٹوک تھا جیسے حکم دے رہا ہو اور اگر انکار سنا تو زبردستی کرے گا۔ موقعے کی نزاکت دیکھتے ہوئے سلوم نے لگاوٹ کی باتیں شروع کردیں۔

”میں تو خود چاہتی ہوں آپ سے شادی کروں لیکن میری ماں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ بس یہ سالگرہ ہونے دیں میں خود شادی کا اعلان کردوں گی۔ آپ کی سالگرہ کے دن میں رقص کروں گی۔ آپ خوش ہوکر مجھ سے کہیں گے مانگو کیا مانگتی ہو، میں انعام میں آپ کو طلب کروں گی۔ یہ بات آپ کے مہمانوں کے سامنے ہوگی اس لیے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہوگی۔ میری ماں کی زبان بھی بند رہے گی۔“

”تمہیں رقص آتا ہے؟“

”میرے رقص کی تعریف تو میری ماں بھی کرتی ہے۔“

”ارے واہ! اس طرح تو سالگرہ کا جشن دوبالا ہوجائے گا۔“

جشن سالگرہ کے دن دربار کو خوب آراستہ کیا گیا... شہر بھر میں چراغاں ہوا۔ دربار میں بادشاہ کے فوجی افسران، وزرا اور بادشاہ کے قریبی ساتھی شریک تھے۔ شراب کا دور چلا۔ اعلان ہوا کہ بادشاہ فلپ کی بیٹی سلوم رقص کرنے آئے گی۔ دشمن کی بیٹی رقص پر آمادہ تھی اور پھر لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ کچھ دنوں میں یا شاید آج ہی بادشاہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔ سب مشتاقِ دید ہوگئے۔

سلوم ایک ہوش ربا لباس پہنے محفل میں داخل ہوئی۔ نشے نے سب کو یونہی بے حال کیا ہوا تھا، سلوم کا حسنِ بے پناہ دیکھ کر رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے۔ اس نے رقص پیش کیا تو سب مسحور ہوگئے۔ ہر طرف سے تعریفوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ سب سے برا حال خود بادشاہ کا تھا کیونکہ سلوم کی ساری توجہ اس کی طرف تھی۔ بادشاہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ابھی کچھ دیر میں وہ کیا مانگنے والی ہے۔

جب قیامت آتے آتے رہ گئی۔ رقص ختم ہوا۔ حاضرین نے کھڑے ہوکر سلوم کے حق میں تالیاں بجائیں۔ بادشاہ نے آگے بڑھ کر سلوم کو آغوش میں کھینچ لیا۔

”سلوم، مانگو کیا مانگتی ہو۔ آج میں اتنا خوش ہوا ہوں کہ آدھی سلطنت بھی مانگو گی تو ملے گی۔“

”سلطنت بادشاہ کو مبارک ہو، میرا تو مطالبہ ہی کچھ اور ہے۔“

بادشاہ کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ اب وہ انعام میں مجھے مانگنے والی ہے جیسا کہ وہ کہہ رہی تھی۔

”شرماتی کیوں ہو۔ جو مانگنا ہے مانگو۔ میں پوری محفل کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ تمہارا کہا پورا کیا جائے گا۔“

”مجھے بپتسمہ دینے والے یحییٰؑ کا سر چاہیے۔“

”یہ تم نے کیا مانگ لیا۔ بھلا ہماری شادی سے یحییٰؑ کے سر کا کیا تعلق؟“

”افسوس کہ اب بادشاہ بھی اپنے وعدوں سے پھرنے لگے۔ آپ نے مجھ سے ابھی وعدہ کیا ہے کہ میں جو مانگوں گی مجھے ملے گا۔“

”میں وعدے سے پھر نہیں رہا ہوں۔ تم کچھ اور مانگ لو۔“

”ہماری شادی میں وہی رکاوٹ ہے۔ مجھے تو اسی کا سر چاہیے۔“

”میں اس رکاوٹ کو کسی اور طرح دور کردوں گا۔“

”آپ نے کہا تھا، میری مرضی کا انعام دیں گے۔ میری مرضی یہ ہے کہ یحییٰؑ کا سر میرے سامنے پیش کیا جائے۔“

بادشاہ کے درباری سب کچھ سن رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بادشاہ وعدہ کرچکا ہے۔ اب بادشاہ کے لیے اپنے قول سے پھرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے بادلِ ناخواستہ سپاہیوں کو حکم دیا کہ یحییٰؑ کا سر کاٹ کر شہزادی کے سامنے پیش کیا جائے۔

آن کی آن میں ہیرودیس سے یہ گناہ سرزد ہوگیا۔ وہ اپنے عہد کے ایک نبی کے قتل کا مرتکب ہوا۔
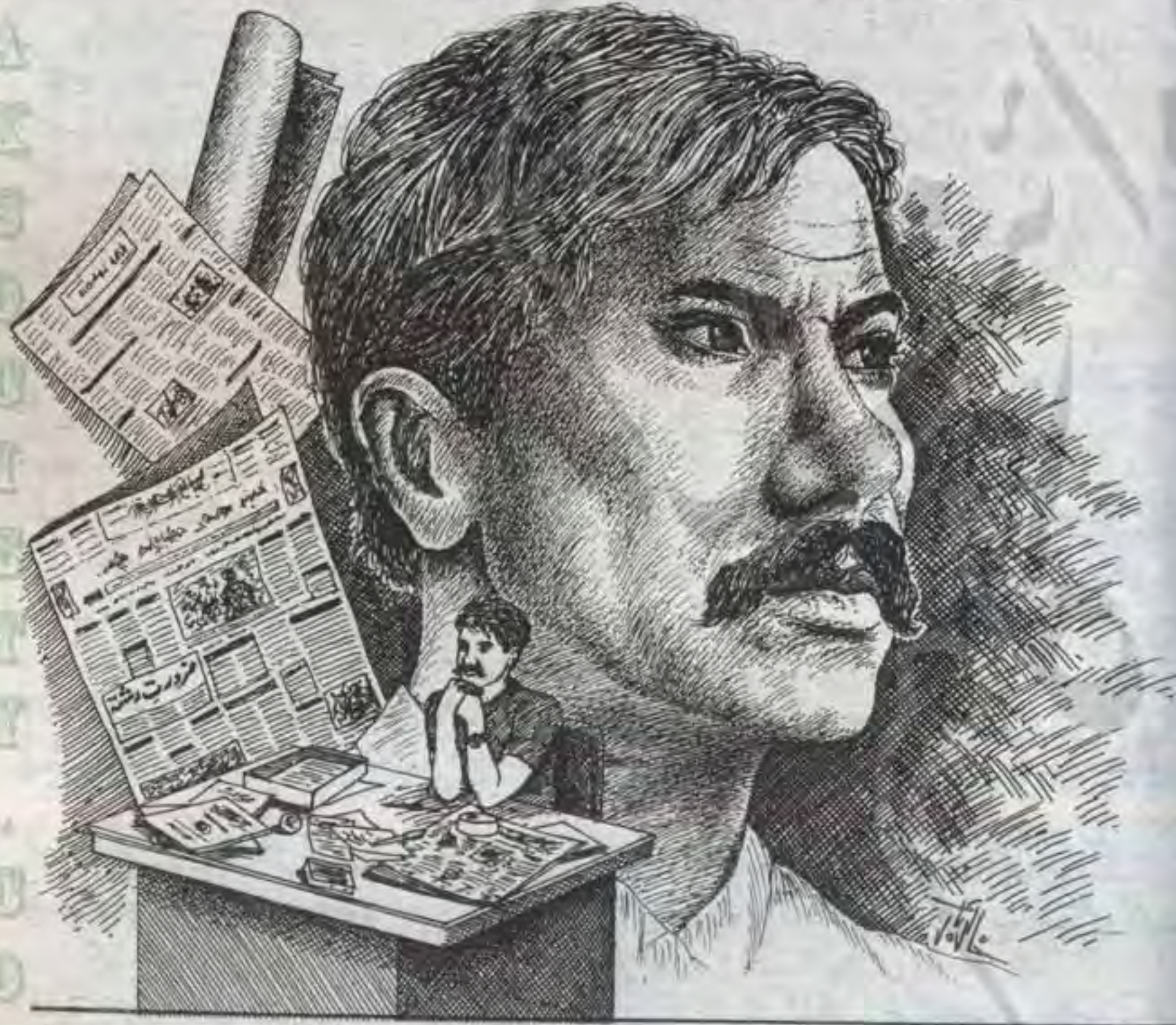
سپاہی چاندی کا ایک طشت اٹھائے ہوئے آئے جس میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا خون آلود سر رکھا ہوا تھا اور سلوم کے قدموں میں رکھ دیا۔

سلوم کو محسوس ہوا جیسے وہ سر کہہ رہا ہو، حرام کو حلال نہیں کیا جاسکتا۔ بادشاہ تجھ سے شادی نہیں کرسکتا۔

علما نے کہا تھا ہیرودیس یہ شرط پوری نہیں کرسکے گا اور یوں سلوم سے اس کی شادی نہیں ہوسکے گی لیکن فلپ کی بیوی اس قتل کے بعد پریشان ہو رہی تھی۔ ہیرودیس نے شرط پوری کردی تھی۔ اب شادی نہ کرنے کا کیا جواز رہ گیا تھا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کا کہا پورا ہونے کو تھا۔ حرام کو حلال نہیں کیا جاسکتا تھا۔

سلوم کے سامنے جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر پیش کیا گیا تو اس پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ بے ہوش ہوگئی اور پھر اسی بے ہوشی میں اس نے دم توڑ دیا۔

☆☆☆

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کے بارے میں کئی اور قول بھی مشہور ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ بادشاہ کی بیوی کو حضرت یحییٰ علیہ السلام سے محبت ہوگئی تھی اور ان کو پھسلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ آپؑ مسلسل انکار کرتے رہے تھے تو جب وہ مایوس ہوگئی تو کسی حیلے سے بادشاہ سے ان کا خون مانگا۔ پہلے تو بادشاہ انکار کرتا رہا لیکن پھر ہتھیار ڈال دیے اور آپؑ کو قتل کرا دیا۔

اسی معنی میں یہ حدیث بھی ملتی ہے۔

''ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جب معراج فرمائی تو آسمان میں حضرت زکریا علیہ السلام کو دیکھا تو آپؐ نے ان پر سلام کیا اور کہا، اے ابو یحییٰ! مجھے اپنے اور یحییٰ کے قتل کی خبر دو، کیسے ہوا؟''

حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا۔ ''اے محمد ﷺ! حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنے زمانے میں سب سے بہتر تھے۔ سب سے زیادہ حسین اور خوب صورت، روشن چہرے والے اور گناہوں سے رکنے والے تھے اور عورتوں کی ان کو بالکل خواہش نہ تھی۔ تو ایک عورت کو ان سے محبت ہوگئی جو بنی اسرائیل کے بادشاہ کی بیوی تھی اور تھی بدکار۔ اس نے آپؑ کی طرف پیغام بھیجا۔ اللہ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی حفاظت رکھی اور وہ باز رہے اور اس عورت کو قطعاً انکار کردیا تو عورت نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کا تہیہ کرلیا۔

ان کی ایک عید ہوتی تھی جس میں ہر سال سب جمع ہوتے تھے اور بادشاہ کی عادت تھی کہ وہ اس دن جو وعدہ کرتا تھا اسے پورا ضرور کرتا تھا لہٰذا جب بادشاہ عید کی طرف نکلا تو وہاں عورت کھڑی ہوگئی اور بادشاہ کو مائل کیا اور بادشاہ ویسے ہی اس سے محبت رکھتا تھا لہٰذا جب عورت نے پھسلایا تو بادشاہ نے کہا مجھ سے کچھ سوال بھی کرلے جو سوال تو کرے گی میں ضرور عطا کروں گا۔ تب عورت بولی، میں یحییٰؑ کا خون مانگتی ہوں۔ بادشاہ نے کہا، کچھ اور سوال کرو، عورت نے کہا بس یہی چاہیے۔ بادشاہ نے کہا، چل وہ تیرے لیے ہوا۔ آپ محراب میں نماز ادا فرما رہے تھے کہ جلاد نے آپؑ کو قتل کردیا اور آپؑ کا سر ایک طشت میں رکھ کر عورت کے پاس لے گیا۔''

اور ایک قول یہ بھی ملتا ہے کہ دمشق شہر کا بادشاہ ہداد بن ہدار تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی شادی اپنی بھتیجی سے کرادی تھی۔ ایک مرتبہ اس کے شوہر نے اس کے بارے میں تین طلاق کا حلف اٹھایا پھر ندامت ہوئی تو واپسی کی کوئی صورت نکالنے کے لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے رجوع کیا تو آپؑ نے فرمایا اب وہ لڑکی تیرے لیے حرام ہوگئی۔ اس پر لڑکی مشتعل ہوگئی اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوئی اور جبکہ وہ مسجد جرون میں نماز میں مشغول تھے ان کو قتل کرا دیا اور چینی کے طشت میں ان کا سر مبارک سامنے منگوایا مگر سر اس حالت میں بھی یہی کہتا رہا کہ تو بادشاہ کے لیے حلال نہیں تاوقتیکہ دوسری شادی نہ کرلے اور اسی حالت میں خدا کا عذاب آیا اور اس عورت کو مع سر مبارک زمین میں دھنسا دیا۔

علمائے سیر و تاریخ کا اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا واقعۂ شہادت کس جگہ پیش آیا بیت المقدس میں یا دمشق میں؟ البتہ یہ مسلمات میں سے ہے کہ یہود نے ان کو شہید کردیا اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو پھر انہوں نے علی الاعلان دعوتِ حق شروع کردی۔

ماخذات: قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت

منظر امام

جنابِ عالی

انسان خواہ کتنا ہی حقیقت پسند کیوں نہ ہو اس کے باوجود بعض معاملات میں وہ حقیقت کا ادراک نہیں کر پاتا... افسروں کی چاپلوسی کہیں مجبوری ہے تو کہیں مزاج کا حصہ... ''جنابِ عالی'' بھی معاشرے کا ایک ایسا ہی کردار ہے جسے کرسی سے غرض ہوتی ہے کرسی پر بیٹھنے والے چہرے چاہے روز بدلتے رہیں، انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

افسران کی نفسیات سے کھیلنے والے ایک ملازم کی چاپلوسی

''جنابِ عالی۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کیوں...... خیریت؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیوں جا رہے ہو، کہاں جا رہے ہو؟''

''جنابِ عالی۔ جب آپ یہاں سے جا رہے ہیں تو پھر میں یہاں رہ کر کیا کروں گا۔'' اس نے کہا۔

''اوہو جمیل میاں۔ میرے جانے یا نہ جانے سے تمہارا کیا تعلق! تم اپنا کام کرتے رہو۔ تمہیں کس نے روکا

ہے۔"

"نہیں جناب عالی۔ یہ اپنے اصول کے خلاف ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "میں ذرا دوسرے مزاج کا آدمی ہوں۔ جس کو ایک بار اپنا سمجھ لوں یا جس سے پیار کرلوں، بس اسی کا ہوکر رہ جاتا ہوں۔"

اس آدمی کا نام جمیل تھا۔

میں جس دفتر میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ اسی دفتر میں وہ ہیڈ کلرک تھا۔ انتہائی ملنسار، مخلص اور دیانت داری سے کام کرنے والا۔ نہ جانے کیوں اس شخص کو مجھ سے بہت محبت اور عقیدت سی تھی۔ وہ میرے ہر حکم کو اس طرح دوڑ کر بجا لاتا جیسے اس کی زندگی کا یہ آخری فریضہ رہ گیا ہو۔ میں اس کے کام سے خوش بھی تھا اور اس کی تعریف بھی کیا کرتا۔

اس میں ایک عادت تھی، ہر بات میں جناب عالی کہنے کی۔ نہ جانے اس نے یہ عادت کہاں سے پائی تھی۔ میں نے ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا تھا۔ "جمیل میاں۔ یہ تم ہر بات میں جناب عالی کیوں کہتے ہو؟"

"جناب عالی! یہ میری عادت ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ابتدا ہی سے میں جناب عالی کہتا چلا آرہا ہوں۔ انتہا یہ ہے کہ اکثر اپنی بیگم کو بھی جناب عالی کہہ کر مخاطب کرنے لگتا ہوں۔"

میں مسکرادیا۔ اس سے یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک سیدھا سادا انسان ہے۔ ہمارے معاشرے میں اب ایسے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔

جمیل کو میں نے اکثر دفتر کے خاکروب کو بھی جناب عالی کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے سنا تھا۔ "جناب عالی۔ آج آپ نے سلیقے سے کچرا نہیں سمیٹا۔ یہ دیکھیں، میری میز کے پاس کتنا جمع ہے۔ جناب عالی، آپ کل نہیں آئے تو بہت پریشانی ہوگئی تھی۔ آجایا کریں، وغیرہ وغیرہ۔

اب مسئلہ یہ ہوگیا تھا کہ میرا ٹرانسفر ہونے والا تھا اور مجھے اس جناب عالی یعنی جمیل کی بہت زیادہ فکر تھی۔ میری جگہ یہاں بٹ صاحب کو لایا جارہا تھا۔

میں نے بٹ صاحب کے بارے میں سنا تھا کہ وہ انتہائی سخت گیر بلکہ بے مروت قسم کے انسان ہیں۔ نہ جانے بے چارے جمیل کے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہو۔ اس لیے مجھے جمیل کی فکر تھی۔

دوسری طرف جمیل نے بھی اعلان کردیا تھا کہ میرے جاتے ہی وہ بھی ملازمت سے استعفیٰ دیدے گا۔

میں نے اسے سمجھایا۔ "جمیل میاں۔ ایسا مت کیجیے گا۔ لگی لگائی ملازمت ہے۔ آپ کی بیوی اور بچے آپ کے ساتھ ہیں۔ آج کے دور میں ایک تو ویسے ہی ملازمت نہیں ملتی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب عالی لیکن وفاداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"وفاداری اپنی جگہ لیکن دفتروں میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ آپ کی وفاداری کا محور دفتر ہونا چاہیے نہ کہ کسی کی ذات۔"

"میرے لیے تو آپ کی ذات ہی پورا دفتر ہے جناب عالی۔"

"نہیں۔ ایسا نہ کریں۔" میں نے اسے پھر سمجھایا۔ "آپ اس طرح کرتے رہے تو خود آپ کو بہت پریشانی ہوجائے گی۔"

مختصر یہ کہ میں بہت مشکلوں سے اسے سمجھانے میں کامیاب ہوا تھا۔ جیسے جیسے میرے جانے کے دن قریب آرہے تھے۔ اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ایک دن دفتر کے اکاؤنٹنٹ جواد صاحب نے کہا۔ "سر۔ جناب عالی نے تو آپ کے ٹرانسفر کے مسئلے کو اپنے دل پر لے لیا ہے۔"

"ہاں بھئی مجھے اندازہ ہے۔ وہ تو ملازمت سے ریزائن کررہا تھا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے روکا ہے۔"

"اسے آپ سے محبت بھی تو بہت ہے سر۔ آپ کے ایک اشارے کا منتظر رہتا ہے۔"

"اب ایسے لوگ کہاں ہیں جواد صاحب۔"

بہرحال وہ دن بھی آگیا جب میں اس شہر سے دوسرے شہر جارہا تھا۔ اس دن پورے اسٹاف نے مل کر میرے اعزاز میں ایک سادہ لیکن پروقار تقریب منعقد کی۔

ہر ایک نے اپنی اپنی تقریر بھی کی۔ سب کی تقریر سے اس بات کا اظہار ہورہا تھا کہ یہ لوگ واقعی مجھے مس کریں گے لیکن سب سے جذباتی تقریر جناب عالی کی تھی اور مجھے اس سے ایسی ہی تقریر کی توقع تھی۔

جناب عالی نے مجھے قیمتی قلموں کا ایک سیٹ تحفے میں دیتے ہوئے کہا تھا۔ "جناب عالی۔ آپ جب بھی انہیں استعمال کریں گے۔ آپ کو میں یاد آجاؤں گا۔"

"اس میں کیا شک ہے جمیل صاحب۔ میں آپ کو ویسے بھی یاد رکھوں گا۔"

میں نے دفتر سے روانہ ہونے سے پہلے اسے اپنے کمرے میں بلا کر ایک لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لیں جمیل میاں، یہ میری طرف سے اپنے بچوں کے لیے"

"اس میں کیا ہے جناب عالی؟"

"کچھ نہیں۔ صرف دس ہزار روپے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ آپ کے بچوں کے لیے ہیں۔ انہیں فوراً رکھ لیں۔"

اس کے بعد میں ان سے گلے ملا اور اس دفتر سے رخصت ہوگیا۔

زندگی اسی کا نام ہے۔ لوگ اسی طرح آتے اور چلے جاتے ہیں۔ یہاں کون کسی کو یاد رکھتا ہے لیکن ایسی نفسا نفسی کے عالم میں بھی وہ لوگ ضرور یاد رکھتے ہیں جن کے نزدیک محبت، دیانت اور شرافت کی اہمیت ہوتی ہے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

میں چونکہ اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر دوسرے شہر آیا تھا۔ اسی لیے میرا یہاں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس پریشانی سے نجات کے دو ہی طریقے تھے۔ یا تو میں اپنے گھر والوں کو یہاں بلالوں یا پھر واپس وہیں چلا جاؤں جہاں سے آیا تھا۔

گھر والوں کے آنے میں دشواریاں تھیں۔

انہیں پورا سیٹ اپ چھوڑ کر آنا پڑتا اور یہ یہ آسانی ہو نہیں سکتا تھا۔ میں نے فرم کے مالکان سے بات کی کہ وہ مجھے واپس بھیج دیں لیکن بورڈ آف ڈائریکٹرز نے میری بات نہیں مانی۔ میرا جھگڑا اتنا بڑھ گیا کہ میں نے استعفیٰ دے دیا۔

استعفیٰ دینے کے بعد میں ایک دو دن بہت پریشان رہا کہ میں نے کیا حماقت کردی تھی۔

اتنا شاندار عہدہ تھا میرے پاس۔ ہر طرح کی سہولیات میسر تھیں پھر میں نے جاب کیوں چھوڑ دی۔ پھر اچانک احساس ہوا کہ ارے اب تو میں شاید آزاد ہوگیا ہوں۔ اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتا ہوں۔ سیاحت کرسکتا ہوں۔ یہاں میں یہ بتادوں کہ میرے ساتھ مالی پریشانیاں نہیں تھیں۔ خدا کے فضل سے سب کچھ تھا میرے پاس۔

میں نے اچھے وقتوں میں بہت پراپرٹیز بنائی تھیں۔ کئی مکانات اور فلیٹس وغیرہ تھے جو کرائے پر دیے ہوئے تھے جس سے ہزاروں روپوں کی آمدنی ہوجایا کرتی تھی۔ اسی لیے اس طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میں آرام سے سیر کرسکتا تھا۔ بہت دنوں سے ہڑپہ اور موہنجودڑو وغیرہ دیکھنے کی خواہش تھی گویا اب وہ دیکھ سکتا تھا۔

میں نے گھر والوں کو فون پر سب کچھ بتاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ بھی یہیں آجاؤ۔ اب ہم یہاں سے پاکستان کی سیر کے لیے روانہ ہوں گے۔"

کچھ دنوں کے بعد وہ لوگ بھی آگئے اور ہم نے خوب جی بھر کر سیر کی۔ گھومتے پھرتے رہے۔ پھر اپنے شہر واپس آگئے۔ میں کئی دنوں تک تھکن اتارتا رہا۔

پھر ایک دن احساس ہوا کہ اس طرح تو سخت بوریت ہوجائے گی۔ آخر کب تک یونہی گھر میں رہوں گا۔ کیوں نہ کوئی بزنس شروع کردیا جائے۔

بزنس کے لیے پیسے تو تھے ہی۔ بس ایک ایماندار اور مخلص آدمی کی ضرورت تھی جو میرا ساتھ دے سکے اور جس پر میں پورا بھروسا کرسکوں۔ اور اس کے لیے جناب عالی سے بہتر اور کون ہوسکتا تھا۔ وہی جو میرا وفادار تھا، جس نے میرا احترام کیا تھا، مجھ سے محبت کی تھی۔

میں نے دفتر فون نہیں کیا بلکہ خود ہی چلا گیا۔ میں دفتر والوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میں جس وقت پہنچا، لائٹ گئی ہوئی تھی۔

دفتر دوسری منزل پر تھا اور سیڑھیوں پر بھی اندھیرا ہورہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اسی وقت میرے کانوں میں کسی کی آواز آئی تھی اور وہ آواز سوائے جناب عالی کے اور کسی کی نہیں تھی۔ وہ کسی آدمی سے کہہ رہا تھا۔ "جناب عالی۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ آپ میرا ہاتھ تھام لیں۔ میں آپ کی آنکھیں بن کر آپ کو دفتر تک پہنچادوں گا۔ آپ کو کیا معلوم جناب عالی کہ میں آپ کا کتنا وفادار ہوں اور آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

"جمیل۔ تم باتیں بہت کرتے ہو۔" دوسری آواز آئی۔

میں نے وہ آواز بھی پہچان لی۔ وہ بٹ صاحب کی تھی۔ دفتر کا نیا باس... اور جناب عالی اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ "جناب عالی، اگر میری ذات سے آپ کو کوئی تکلیف ہو تو آپ میری گردن اڑادیں۔ میں تو خدا سے دعا کیا کرتا تھا کہ خدا آپ کو یہاں بھیج دے۔"

وہ نہ جانے کیا کیا بولتا رہا اور میں سیڑھیاں اترتے ہوئے واپس آگیا۔ اوپر جانے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔

ممنوعہ

محی الدین نواب

بات تعلق کی ہو تو ہزاروں میل کا فاصلہ بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یوں ہوتا ہے کہ نیویارک میں اولاد کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو لاہور میں ماں تڑپ اٹھتی ہے... باپ بے چین ہو جاتا ہے... کسی کو خواب آجاتا ہے... جبکہ ان کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں ہوتا... یہی لاسلکی تعلق جب رشتوں کی قید سے آزاد ہو کر اجنبی مردوزن کے درمیان استوار ہوتا ہے تو عجب ہی گل کھلاتا ہے... نازوں کا پلا بچپن سے اس نادیدہ کی محبت اپنے دل میں پالتا رہا... وہ وہاں پلتی رہی جہاں اسے گالی نہیں سمجھا جا رہا تھا... گناہ دو کرتے ہیں، وبال تیسری کے سر ڈال دیا جاتا ہے... ایدھی کے "پالنا" کے بجائے کوڑے دان پر ڈالے گئے وجود اپنی پیدائش پر کوئی اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ معاشرتی نفرتوں کا نشانہ بن جاتے ہیں... ہر آسمانی مذہب نے اس بگاڑ کو روکنے کے لیے ازدواجی بندھن کے بغیر مرد اور عورت کے آزادانہ میل جول کی سختی سے نفی کی ہے، ایسے کھیل بالکل ممنوع ہیں... ان دونوں پر قسمت کبھی مہربان تھی، کبھی نامہربان... وہ ایک دوسرے کو جانے بوجھے بغیر اپنے خوابوں میں ملتے رہے... جب خوابوں کے حقیقت بننے کا وقت آیا تو وہ دلدل میں اتر گئے جس کا دور تک کوئی خشک کنارہ نہیں تھا... یا شاید تھا مگر ان کی نظروں سے اوجھل تھا... وہ نظر آیا تو یک بیک اس پر دروازہ بند ہو گیا۔

کمزور رشتوں کی دھول میں ممنوعہ حدوں کو پار کرنے والوں کے درمیان پھیلی ایک فکر انگیز داستان

میرا نام فہیم الدین شریف ہے۔ میرا خاندانی شجرہ کہاں سے شروع ہوا، یہ شاید میرے بزرگ بھی نہیں جانتے تھے۔ میں اپنے حالات کے پیش نظر کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا شجرہ لیلیٰ مجنوں' شیریں فرہاد' ہیر رانجھا' سوہنی مہیوال اور سسی پنوں سے شروع ہوا ہوگا۔

تحقیق سے پتا چلا کہ ان عاشقان میں سے کسی نے شادی نہیں کی تھی۔ لہٰذا ان سے اولاد بھی نہیں تھی۔ پھر بھی ان عاشقوں سے میرا گہرا تعلق ضرور ہے۔ خاندانی لہو کا رشتہ نہ سہی' ان میں سے کسی کی روح مجھ میں سرایت کر گئی ہے۔ اسی لیے میں اس دنیا میں تنہا نہیں آیا۔ میرے ساتھ وہ بھی آئی اور بڑی دھوم دھام سے آئی۔

کسی کو شہرت حاصل کرنے میں مدتیں گزر جاتی ہیں۔ اس نے تو پیدا ہوتے ہی نام کما لیا۔ شہر کے سب ہی لوگ اسے دیکھنے کے لیے کچرا گھر کی طرف چلے آرہے تھے۔

کنول کا حسن کہاں کھلا؟ ...... کیچڑ اور دلدل میں۔

وہ کچرے میں پڑی روتے روتے چپ ہو گئی تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ میری عشقیہ آپ بیتی ہے۔ کیا وہ میری منتظر تھی کہ میں آؤں گا اور اسے پیار سے بازوؤں میں سمیٹ کر لے جاؤں گا؟ یہ بچگانا سی بات تھی۔ اس وقت تو میں بھی نوزائیدہ تھا۔ پھر یہ کیسے جان سکتا تھا کہ ہماری دنیا میں کیسی بے حیائی اور کمینگی ہوتی ہے؟ میں بے خبر تھا کہ میری آئیڈیل ہے میری معشوق سے ایسا سلوک کیا گیا تھا۔ کسی ظالم کو اور کوئی جگہ نہیں ملی تھی' اسے کچرے میں پھینک گیا تھا۔

پھینکنے والے اپنی خواہشات کے کچرے کو کچرے ہی میں ڈال کر گئے تھے۔ اس کے بعد وہ گناہ گار نہا دھو کر پاک صاف ہو کر ساری زندگی گزار سکیں گے' وہ بے چاری ساری عمر اپنے وجود سے والدین کا کچرا صاف نہیں کر سکے گی۔

میں نے آٹھ برس کی عمر میں اپنی امی کی زبان سے سنا

کہ جس روز میں پیدا ہوا تھا' اسی روز وہ بھی ایک کچرا گھر میں پائی گئی تھی۔

آٹھ برس کی عمر کیا ہوتی ہے؟ امّی محلے کی عورتوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے لوڈو کھیلتے ہوئے یہ بات ایک کان سے سنی دوسرے کان سے نکال دی۔

مجھے لوڈو میں سانپ اور سیڑھی کے کھیل سے دلچسپی تھی۔ دانہ پھینکنے پر کوئی نمبر ایسا آتا تھا کہ سانپ مجھے نگل لیتا اور میں پستی میں چلا جاتا۔ پھر کوئی نمبر ایسا آتا کہ میں سیڑھی چڑھ کر بلندی کو چھو لیتا تھا۔ اس کھیل میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بعد میں حالات نے سمجھایا کہ زندگی سانپ اور سیڑھی کا ہی کھیل ہے۔

میں نے ایک رات اس لڑکی کو خواب میں دیکھا۔ میں اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں وہی ہوں' ہم دونوں ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔ مجھ سے دوستی کرو گی؟''

''میں دوستی کرنے آئی ہوں۔ دیکھو اس سانپ نے مجھے نگل لیا ہے۔ میں پستی میں پڑی ہوں۔ میرے نام کا دانہ پھینکو۔ ایسا نمبر لاؤ کہ میں سیڑھی چڑھ کر تمہارے پاس آجاؤں۔''

ایسے گہرے مفہوم والا خواب مجھ جیسے بچّے کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ شاید میں لاعلمی میں پیار کی بازی کھیل رہا تھا اور دانے پھینک رہا تھا جس کے نتیجے میں وہ لڑکی میرے اندر آکر بیٹھ گئی تھی۔

جب لیلیٰ اور مجنوں بچے تھے' تب یہ نہیں جانتے تھے کہ ایک دوسرے میں غیر معمولی کشش کیوں محسوس کرتے ہیں۔ ان کا عشق معصوم تھا۔ میں نے اس خواب کے بعد وہی معصوم سی کشش اس لڑکی میں محسوس کی۔

وہ کبھی لکھتے پڑھتے وقت، کبھی باہر کھیلتے وقت بے اختیار یاد آنے لگی۔ جب میں تنہائی میں اس کے بارے میں سوچتا تو وہ سراپا دکھائی دیتی لیکن صورت واضح طور پر دکھائی نہ دیتی۔ اسے صاف طور سے دیکھنے کی آرزو نے مجھے اس کے پیچھے لگا دیا۔ ایک خیالی سی من موہنی سی صورت کبھی کبھی مجھے پکارنے لگی۔

میں نے ایک روز امّی سے پوچھا۔ ''وہ لڑکی کہاں ہوگی؟''

انہوں نے پوچھا۔ ''کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟''

''وہی جو کچرا گھر میں پیدا ہوئی تھی۔''

انہوں نے شدید حیرانی سے مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ ''وہ بیٹھے بٹھائے تمہیں کیوں یاد آرہی ہے؟''

''بس آرہی ہے۔ آپ بتائیں نا' وہ کہاں ہوگی؟''

''جہنم میں ہوگی۔ میں کیا جانوں۔ کیا میں اسے دیکھنے گئی تھی کہ وہ کہاں سے آئی تھی اور کون اسے کچرے سے اٹھا کر لے گیا ہے؟''

''امّی! کوئی تو اسے لے گیا ہوگا؟''

''لے جانے دو۔ پڑھنے لکھنے میں دل لگاؤ۔ فضول باتیں نہ سوچا کرو۔''

انہوں نے لڑکی کے متعلق سوچنے سے منع کر دیا۔ میں نہیں جانتا کہ عشق کیسا منہ زور ہوتا ہے۔ امتحانات کے پرچے حل کرتے وقت بھی وہ کئی بار مجھے یاد آئی۔ جبکہ میرا دھیان اس وقت صرف امتحانی پرچے کی طرف تھا۔

میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا اور اس کے یاد آنے سے کوئی پریشانی یا الجھن بھی نہیں تھی۔ اس کے برعکس میں خیالوں کی دنیا میں رہنے کا عادی ہو رہا تھا۔

میری لگن' میرا پیار دلاسے دیتا کہ وہ ایک دن اچانک ہی سامنے آجائے گی۔

جب تک نہیں آرہی ہے تب تک اس کا کوئی نام تو ہونا چاہیے۔

ان دنوں آپا نے ایک ملائم ریشم جیسے بالوں والی بلّی پالی تھی۔ میں اس پر ہاتھ پھیرتا تو اس کی ملائم حدت بہت اچھی لگتی تھی۔ ہم اسے مانو کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

وہ خیالوں میں آنے والی بھی کچھ ملائم سی' کچھ نرم سی اور کچھ گرم سی لگتی تھی۔ اسے خیالوں میں دیکھ کر مانو یاد آتی اور مانو کو دیکھ کر وہ یاد آنے لگتی تھی۔ آئندہ میں اسے مانو کہا کروں گا۔

جب دس برس کا ہوا تو وہ پھر خواب میں آئی۔ اس نے آتے ہی 'میاؤں' کیا تو میں چونک گیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں تمہاری بلّی ہوں۔ تم نے اچھا نام دیا ہے... مانو... میاؤں...''

وہ پھر ہنسنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''تم نے کیسے جانا کہ میں نے یہ نام دیا ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ غائب ہوگئی۔ وہ خواب میں نے دوپہر کو دیکھا تھا۔ بیٹھک میں پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو میں نے ابّو کو دوستوں کے ساتھ باتیں کرتے سنا۔ باتیں کچھ ایسی تھیں کہ میں نے فوراً آنکھیں بند کرلیں تاکہ وہ بچے کو سوتا ہوا ہی سمجھیں۔

ابّو کہہ رہے تھے۔ ''اگر مرد اور عورت جائز رشتہ قائم کریں تو حرام کے بچے کبھی پیدا نہ ہوں۔''

ان کے ایک دوست نے تائید کی۔ ''بیشک ہمارے دین میں ازدواجی رشتہ قائم کرنے کا نہایت آسان راستہ دکھایا گیا ہے۔ ایک وکیل اور دو گواہوں کی موجودگی میں ایک دوسرے کو قبول کرو۔ ایک تصدیقی نکاح نامہ حاصل کرو اور بس۔''

ایک نے کہا۔ ''اتنی آسانی کے باوجود لوگ چوری چھپے بے حیائی کی لذت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

ابّو نے کہا۔ ''یاد ہے نا' آج سے تقریباً دس برس پہلے ہمارے علاقے کے کچرا گھر میں ایک نوزائیدہ بچّی پائی گئی تھی...؟''

مانو...! میری بند آنکھوں میں دکھائی دینے لگی۔ میں ناجائز تعلقات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کے بارے میں نہ کچھ سمجھتا تھا اور نہ ہی ان معاملات کو سمجھنے کی میری عمر تھی۔ آج ٹی وی' موبائل فون اور کمپیوٹر دس برس کے بچوں کو بڑا کر جوان بنا دیتے ہیں۔ ان دنوں تو عام گھروں میں بجلی بھی نہیں تھی۔ ہم اسّی برس پہلے کے لوگ بجلی کی تیزی سے عشق نہیں کرتے تھے۔ لالٹین کی دھیمی رفتار سے جوان ہوتے تھے۔

لہٰذا میرے جوان ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔

☆☆☆

ہمارے رشتے دار بنگال' مدراس اور مدھیہ پردیش کے صوبوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں کوئی میرے ابّو کے برابر اونچے درجے کا افسر نہیں تھا۔ ہمارا شمار اونچے طبقے میں ہوتا تھا۔ کیونکہ ہمارے گھر میں بجلی کی روشنی اور ہوادار پنکھے تھے۔ ٹرین کے فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں صرف انگریز آقا سفر کرتے تھے۔ لیکن ریلوے ابّو جیسے ہندوستانی افسران کو اپنی بیویوں اور بچوں سمیت ان کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ پورا خاندان ہمارے بابوجی کے افسر ہونے پر فخر کرتا تھا۔

ایک بار ہم کھڑگ پور سے رجواڑے 'سکتی' جانے کے لیے سیکنڈ کلاس کی آرام دہ سیٹوں پر آکر بیٹھے۔ دوسری طرف کی سیٹوں پر ایک انگریز فیملی تھی۔ ٹرین چلنے سے پہلے ایک انگریز نے اپنی فیملی کی ایک خاتون کو بازوؤں میں لے کر گلے سے لگایا پھر دونوں کے چہرے ایک دوسرے سے مل گئے۔

امّی نے فوراً ہی میرا سر پکڑ کر دوسری طرف گھماتے ہوئے کہا۔ ''باہر دیکھو۔ ٹرین چلنے والی ہے۔''

میرا رُخ کھڑکی کی طرف ہوگیا۔ مگر ذہن میں سوال چیخ رہا تھا۔ ''امّی کیوں اُدھر دیکھنے نہیں دیتیں؟''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ انگریز جوڑا کیا غلط کر رہا تھا۔ ماں بیٹے کی پیشانی کا بوسہ لے تو ممتا ہے۔ بچہ اپنی ماں اور بہنوں کی پیشانی کو چومے تو وہ معصوم پیار کی کشش ہے لیکن ہونٹ، ہونٹوں کو چومیں تو ایسا کیا ہو جاتا ہے کہ امی نے میرا سر دوسری طرف گھما دیا تھا۔

میں اس نظارے سے پہلے نہیں جانتا تھا کہ پیار یوں بھی کیا جاتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار دیکھا تو عجیب سا لگا۔

ہم نہیں جانتے' ہم دانستہ یا نادانستہ کیا کچھ دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور لاشعوری طور پر متاثر ہوتے جاتے ہیں۔ یہ نفسیاتی طرزِ عمل بعد میں وقت اور حالات کے مطابق ہمارے اندر تبدیلیاں لاتا رہتا ہے۔

☆☆☆

میرا ننھیال مدھیہ پردیش کے ایک بہت بڑے علاقے ''چھتیس گڑھ'' میں تھا۔ میں وہاں ''سکتی'' نام کے ایک ''رجواڑہ'' میں اپنی اماں کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جایا کرتا تھا۔ اس رجواڑے میں ہندو راجپوتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کی عورتیں اور لڑکیاں رنگ برنگے گھاگھروں' چولیوں اور اوڑھنیوں میں تتلیوں کی طرح اڑتی پھرتی دکھائی دیتی تھیں۔

ان دنوں میں گیارہ برس کا تھا۔ ہوس کیا ہے؟ گناہ کیا ہے؟ نہیں جانتا تھا لیکن حسن کہیں بھی ہو پھولوں میں' عورتوں میں' رنگوں میں یا پتھر سے تراشی ہوئی حسین مورتیوں میں' دل اُدھر بے اختیار فطری طور پر کھنچا جاتا تھا۔

ان عورتوں میں گیارہ برس کی لڑکیاں میری توجہ کا مرکز ہوتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر سوچتا تھا' میری مانو اتنی بڑی ہو گئی ہوگی اور کچھ ایسی ہی دکھائی دیتی ہوگی۔

یہ میری مجبوری تھی کہ میرے پاس اس کا سراغ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ایک دن میں نے اپنے چچا سے پوچھا۔ ''آپ نے اس بچّی کو دیکھا ہوگا' جو کبھی ایک کچرا کنڈی میں پائی گئی تھی؟''

انہوں نے یاد کرنے کے لیے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ میں نے کہا۔ ''جس دن میں پیدا ہوا تھا۔ اسی دن وہ بھی پیدا ہوئی تھی۔''

انہیں یاد آگیا۔ وہ حیرانی سے بولے۔ ''کئی برس گزر گئے ہیں۔ تمہاری عمر کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''گیارہ برس۔''

وہ شدید حیرانی سے بولے۔ ''یا خدا...! گیارہ برس پہلے کی وہ بچّی تمہیں کیسے یاد ہے اور تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو بس یوں ہی پوچھ رہا ہوں۔“

وہ مجھے پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔ پتا نہیں وہ کس تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انہوں نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔

شام کو امّی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ”تم اس بچی کے بارے میں اب تک دو بار سوالات کر چکے ہو۔ آج تم نے چچا سے بھی سوال کیا تھا۔ وہ تمہارے دماغ سے نکلتی کیوں نہیں ہے آخر؟“

میں نے کہا۔ ”بس یونہی ایک ذرا خیال آتا ہے کہ وہ کون تھی؟ اور وہ ابھی کہاں ہوگی؟“

”کہیں مر کھپ گئی ہوگی۔ ایک تو تمہارے چھوٹے چچا نے جان جلائی تھی۔ ایک تم جلا رہے ہو۔“

”میں اکثر سنتا ہوں' میرے ایک چھوٹے چچا تھے۔ وہ کہاں ہیں امّی؟“

”وہ بھی اس کے ساتھ مر کھپ گئے ہوں گے۔“

”کس کے ساتھ...؟ کیا اس بچی کے ساتھ...؟“

انہوں نے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ ”تم سوال جواب بند نہیں کرو گے؟“

”آپ اس بچی سے اور چھوٹے چچا سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟ کیا وہ اچھے نہیں تھے؟“

”ان پر تو سارا خاندان تھو تھو کرتا ہے۔ اب یہ نہ پوچھنا کیوں کرتا ہے؟ جو نفرت کے قابل ہوتے ہیں ان سے نفرت ہی کی جاتی ہے۔ بس اور کوئی سوال نہ کرنا۔“

میں نے پھر کبھی چچا اور مانو کے متعلق ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔

☆☆☆

مانو کو میں نے کبھی دانستہ یاد نہیں کیا۔ وہ آپ ہی میرے خیالوں میں چلی آتی تھی۔ ایک بار وہ آئی تو میں نے اس کی کراہیں سنیں۔ میں بھی تکلیف میں تھا۔ وہ بولی ”مجھے تیز بخار ہے' سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں بھی بخار میں پڑا ہوں۔ میرے سر میں بھی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔“

اس روز میرے ساتھ اس کا بیمار ہونا بہت اچھا لگا۔ میں نے پہلی بار کسی کو دکھ بیماری میں اپنا شریک پایا تھا۔ ایک دوسرے کے لیے گہری لگن اسی وقت پیدا ہوتی ہے' جب وہ ایک دوسرے کے دُکھ درد کو اپنے اندر پا لیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد وہ معمول کے مطابق خیالوں میں آئی تو بہت خوش تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں بہت بڑی خوشی مل رہی ہے؟ یا اللہ! میرے اندر جانے کیسی خوشیاں بھر گئی ہیں...؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ میں بھی بہت خوش ہوں۔ میں نے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ یا خدا...! یہ کیا ہے؟ میں نے بتایا نہیں اور میری خوشیاں تم تک پہنچ گئیں۔ اس روز تم بیمار ہوئی تھیں تو میں بھی بیماری اور تکلیف محسوس کر رہا تھا۔“

ہمیں رفتہ رفتہ معلوم ہو رہا تھا کہ ہمارے درد مشترک ہیں اور ہماری راحتیں نامعلوم فاصلے طے کر کے ہمیں آ کر چھو لیتی ہیں۔

رجواڑے میں ہولی کے دن ایک وسیع و عریض پنڈال سجایا جاتا تھا۔ وہاں ہندو عورتیں' مرد' بوڑھے' بچے ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے تھے۔ ان میں مسلمان بھی ہوتے تھے۔ رنگ برنگے پانی کی پچکاریاں چھوڑی جاتی تھیں۔

میں اپنی ہم عمر لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ رنگ کھیل رہا تھا۔ اچانک ہی گم صم سا ہو کر روپا دیدی کو دیکھنے لگا۔ وہ ململ کی دھوتی اور کرتہ پہنے ہوئے تھی۔ رنگ بھری پچکاریوں نے ایسا بھگویا تھا کہ سب دیکھتے ہی رہ گئے۔ میں جہاں تھا' وہیں تھم گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا میری نگاہیں کیوں اُدھر کی ہو کر رہ گئیں ہیں۔

روپا دیدی کو احساس ہو گیا کہ لوگوں کی نگاہیں اس کے بدن میں چبھ رہی ہیں۔ وہ فوراً ہی اپنے سینے پر دونوں ہاتھوں کی قینچی بناتے ہوئے سر جھکائے' شرماتے ہوئے دوڑتی ہوئی حویلی نما مکان کے اندر چلی گئی۔ میں سحر زدہ سا ہو کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔

یہ پوری سچائی اور دیانتداری سے کہتا ہوں کہ ان لمحات میں میرے اندر جوانی کی کوئی کھینچا تانی نہیں تھی۔ مجھ جیسا بچہ بھلا ہوس اور گناہ کی باتیں کیا سمجھ سکتا تھا۔

میرے اندر شاعر اور مصور کا معصوم سا ذہن تھا۔ میں منہ اندھیرے اٹھ کر طلوع آفتاب کا سحر انگیز منظر دیکھتا تھا۔ شفق کی لالی میں غروب ہوتا ہوا سورج میری نگاہوں کو پکارتا تھا۔ تر و تازہ گلاب کا نکھار اور ست رنگ تتلیوں کے پر مجھے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ حسن قدرتی نظاروں میں ہو یا عورت کے وجود میں... میں انہیں دیکھتا تو ایک جذب کے عالم میں دیکھتا ہی چلا جاتا تھا۔

میرے اندر نہ سمجھ میں آنے والی ایک عجیب سی' انجانی سی ہلچل پیدا ہو گئی۔ روپا دیدی نے حویلی کے اندر غسل خانے کے پاس آ کر مجھے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”تُو میرے پیچھے کیوں آ رہا ہے؟“

میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔ میں نے صاف صاف کہا۔ ”دیدی! تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

اس نے ہنستے ہوئے' میرے گال پر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو تُو بالک کرشن کنہیا ہے۔ اپنی رادھا کے پیچھے آیا ہے...“

ہندو دھرم کے متعلق ایک مختصر سی حقیقت بیان کر دوں کہ یہ دنیا کا واحد مذہب ہے' جس میں دروس و ہدایات عشقیہ واقعات کے ذریعہ دی جاتی ہیں۔ نٹ کھٹ کرشن کنہیا بچپن سے عاشق مزاج تھے اور بھرپور جوان رادھا کو چھیڑتے تھے۔

روپا دیدی نے اپنے دھرم کے مطابق مجھے بالک کرشن کنہیا کہا تھا۔ وہ رنگ آلودہ لباس سے نجات حاصل کرنے کے لیے غسل کرنے آئی تھی۔ ایک بھری ہوئی بالٹی کو اُٹھانا چاہتی تھی۔ وہ بہت وزنی تھی۔ میں نے کہا۔ ”میں اٹھاؤں...؟“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”اتنا سا تو ہے۔ میں نہیں اٹھا سکی۔ تُو کیا اٹھائے گا؟ ہاں میرا ساتھ دے سکتا ہے۔ چل اُدھر سے پکڑ۔ میں اِدھر سے پکڑتی ہوں۔“

میں بچہ تھا اور وہ مجھے بچہ ہی سمجھ رہی تھی۔ ہم دونوں نے وہ بالٹی اٹھائی پھر بڑی مشکل سے ایک ایک قدم بڑھاتے ہوئے اسے غسل خانے میں پہنچا دیا۔ وہ کمرے میں جا کر پہننے کے لیے دوسرا جوڑا لے آئی۔ میں غسل خانے سے باہر آ کر اُکڑوں بیٹھ گیا۔ وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اندر جا کر غسل کرنے لگی۔

مجھے یاد نہیں ہے' میں وہاں کب تک اُکڑوں بیٹھا رہا۔ چشم تصور میں اسے دیکھتا رہا اور اپنی مانو سے اس کا موازنہ کرتا رہا۔

مانو ماچس کی تیلی کا ننھا سا شعلہ تھی اور روپا دیدی شعلہ جوالہ... ویسے مانو کسی طور کسی سے کمتر نہیں تھی۔ اس سے قدرتی لگاؤ تھا۔ یہ لگاوٹ اور اس کی جستجو ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ وقت وقت کی بات ہے۔ اس وقت روپا دیدی کی دوشیزگی آفت ڈھانے والی تھی۔ اگر اس وقت میں جوان اور باشعور ہوتا تو وہیں بیٹھے بیٹھے شاعر بن چکا ہوتا۔

میں خیالات سے چونک گیا۔ دو جوان لڑکیاں تیزی سے چلتی ہوئی آئی تھیں۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر مجھ سے پوچھا۔ ”تم نے روپا کو دیکھا ہے؟“

میں نے غسل خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیدی اشنان کر رہی ہیں۔“

ایک بوڑھی خاتون اپنے بوڑھے پتی کے ساتھ وہاں سے گزر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اے لڑکیو! کہاں مٹکتی پھر رہی ہو؟ تن بدن کا ہوش نہیں ہے۔ مرد بے شرمی سے رنگ کھیل رہے ہیں اور تم بھیگ رہی ہو۔ ذرا آئینہ دیکھو۔ دکھانے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟“

ایک لڑکی نے جھینپ کر کہا۔ ”دادی ماں! ہم اشنان کر کے کپڑے بدلنے آئے ہیں۔ ابھی روپا اندر ہے۔ باہر آئے گی تو...“

بات پوری ہونے سے پہلے ہی دادی نے لڑکی کو ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”تجھے سمجھایا تھا کہ روپا سے دور رہا کر اور تو اس کے ساتھ ابھی پنڈال میں ناچ رہی تھی۔“

”دادی ماں! تہوار کے دن تو روک ٹوک نہ کریں۔ آپ نے دیکھا ہے' وہ کیسا غضب کا ناچتی ہے۔“

دادا نے کہا۔ ”بے حیا ناچنا گانا ہی جانتے ہیں۔ ہم تو مجبور ہیں۔ دور کی رشتہ داری ہے۔ اس لیے ہولی دیوالی میں انہیں آنے دیتے ہیں۔“

دادی نے کہا۔ ”چلو یہاں سے۔ حویلی میں اور بھی غسل خانے ہیں۔ وہاں غسل کرو۔“

وہ بوڑھے اپنی لڑکیوں کو وہاں سے ہانک کر لے گئے۔

مجھے رفتہ رفتہ معلوم ہوا تھا کہ میری امّی' ابّو اور دوسرے تمام رشتے دار مانو سے نفرت کرتے ہیں۔ ابھی ان لڑکیوں کی دادی اور دادا نے روپا دیدی سے نفرت ظاہر کی تو حرام و حلال کو نہ سمجھتے ہوئے بھی روپا دیدی سے اور زیادہ محبت ہو گئی۔ کیونکہ وہ میری مانو جیسی تھیں۔

مانو کچرا گھر میں پائی گئی تھی۔ روپا دیدی کا کیا قصہ تھا؟

مجھے تو مانو ہی کا قصہ معلوم نہیں تھا کہ کون اسے کچرا گھر میں پھینک گیا تھا؟ روپا دیدی سے تو کبھی برس دو برس میں سامنا ہوتا تھا۔ ان کا قصہ کوئی بتانے والا نہیں تھا۔

ویسے وقت بہت کچھ بتا دیتا ہے۔ میں نے باشعور ہوتے ہوتے کھوجی مزاج رکھنے کے باعث معلوم کیا۔ کئی برس بعد دیدی کی ماتا جی نے بتایا۔ ”روپا کی پیدائش جائز ہے۔ میں اس کی ماں ہوں اور اس کے پتا کو تم جانتے ہی ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”پھر رشتے دار آپ لوگوں کو اچھوت کیوں سمجھتے ہیں؟ کیوں آپ لوگوں سے کتراتے ہیں؟“

ماتا جی نے کہا۔ ”میرے پتی' روپا کے پتا لاوارث ہیں۔ ان کے ماں باپ کا آج تک پتا نہ چلا۔ وہ ننھے سے تھے' تب ایک چوراہے پر پائے گئے تھے۔“

وہ سرد آہ بھر کر بولیں۔ ”باپ لاوارث ہے اور سزا صرف روپا ہی کو نہیں' ہمارے تمام بچوں کو مل رہی ہے۔“

پھر وہ بولیں۔ ”غلطی میری ہے۔ میں جوانی میں مہیش کی دیوانی ہو گئی تھی۔ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میرے بڑے اس لاوارث کو داماد بنانا نہیں چاہتے تھے۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولیں۔ ”پیار کرنے سے روکا جائے تو وہی ہوتا ہے‘ جو ہوتا آیا ہے۔ ہم چوری چھپے ملنے لگے۔ مہیش نے کہا‘ ہمیں وہ غلطی نہیں کرنی چاہیے‘ جو میرے ماں باپ نے کی تھی۔ میں نہیں جانتا‘ وہ کون تھے۔ جو بھی تھے‘ خود غرض اور ہوس پرست تھے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ میرے پیدا ہونے پر دنیا مجھ پر تھوکے گی۔

”ہمارے پاس عقل ہے۔ ہم گناہوں سے بچنے کا راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے؟ جبکہ سیدھے اور صاف راستے میں عزت اور نیک نامی ہے۔ میں نے یہی راستہ اختیار کیا۔ گھر والوں سے بغاوت کی اور مہیش سے کورٹ میرج کرلی۔

”مہیش دولتمند ہیں۔ ایک کامیاب بزنس مین ہیں۔ کوئی ان کے خلاف انتقامی کارروائی نہ کرسکا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ کچھ عرصہ بعد میرے بزرگوں سے سمجھوتا ہو گیا۔ مہیش کو داماد قبول کرلیا گیا۔

”ہمیں یہ خوش فہمی تھی کہ ہم نے دنیا والوں سے مہیش کے ناجائز وجود کو منوالیا ہے۔ ہمیں جلد ہی اپنی نادانی کا علم ہوا۔ مہیش سے ہونے والے میرے بچے ہر پہلو سے جائز ہیں لیکن یہ دنیا انہیں ناجائز باپ کی اولاد کہتی ہے۔“

روپا دیدی کی ماں نے بھی یہ دکھڑا مجھے سنایا تھا۔

آج سمجھ رہا ہوں کہ انسان خود کو ہمیشہ برتر اور دوسروں کو کمتر دیکھنے کا عادی ہے۔ اگر کسی سے ایک غلطی ہو جائے تو اس کی آئندہ نسلوں تک اس غلطی کو معاف نہیں کیا جاتا اور یہی لاوارث مہیش کی بیوی اور بچوں کے ساتھ، میری روپا دیدی کے ساتھ ہو رہا تھا۔

مانو میرے خیالوں میں آ گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ چپ تھی۔ اس کا جھکا ہوا سر پوچھ رہا تھا‘ کیا میں دنیا میں سر اُٹھا کر جی سکوں گی؟ ابھی تو میں کہیں گم ہوں۔ جب تمہاری زندگی میں‘ تمہارے معاشرے میں آؤں گی تو کیا ہوگا...؟“

میں نے مانو سے پہلے بھی پوچھا تھا۔ ”کہاں گم ہو؟ آجاؤ... میں تمہاری عزت اور نیک نامی کی خاطر ساری دنیا سے لڑوں گا۔“

وہ چپ تھی سر جھکائے کھڑی تھی۔ میں جب بھی پوچھتا تھا‘ کہاں ہو...؟ اپنا پتا ٹھکانا بتاؤ تو وہ چپ ہو جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ خاموش تھی۔

☆☆☆

ان دنوں شہروں میں سواری کے لیے تانگے اور سائیکل رکشا تھے۔ دیہاتوں میں بیل گاڑیاں تھیں۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانے کے لیے رات کے وقت بیل گاڑیوں میں سفر کرتے تھے۔ دن کی دھوپ اور گرمی سے بچتے تھے۔ یہ خوف نہیں ہوتا تھا کہ ویران جنگلوں سے گزرتے وقت راہزن لوٹنے آئیں گے یا کوئی خونخوار درندہ حملہ کرے گا۔

میں ایک رات اپنی اماں اور نانی کے ساتھ بیل گاڑی میں تھا۔ اسی گاڑی میں ایک ہندو ساس سسر اور ان کی بیوہ بہو بھی تھی۔ بہو کا نام بندیا تھا۔ اس سفر میں میری دلچسپی کی وجہ ان کی ایک بیٹی رتنا تھی۔ وہ گیارہ برس کی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا‘ مانو کہیں سے اچانک آکر میری ہم سفر بن گئی ہے۔ وہ بیل گاڑی کے پچھلے حصے میں میرے ساتھ پاؤں لٹکائے بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ میں اس سے باتیں کرتے ہوئے سوچ رہا تھا‘ کیا مانو ابھی تک اتنی ہی بڑی ہوگی۔ وہ روپا دیدی کی طرح...

میں نے بے اختیار سر گھما کر بندیا کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے سوچ میں گم تھی۔ روپا دیدی سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ میں ان دونوں کا تجزیہ نہیں کرسکتا تھا۔ بس اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ میرا دھیان رتنا کی طرف سے ہٹ گیا تھا۔

بیل گاڑی جنگل کے ایک کچے راستے سے گزر رہی تھی۔ ہر سو چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے وہ ویرانہ اور سناٹا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتی ہوا کی بہت ہی دھیمی سی سرگوشیاں کانوں کو بھلی لگ رہی تھیں۔ ایسے میں گاڑی بان ایک تان اڑاتا ہوا گیت گا رہا تھا۔ بیلوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں یوں ٹن ٹن بج رہی تھیں؛ جیسے گیت کے ساتھ سنگیت ملا رہی ہوں۔ وہ گا رہا تھا۔

ساس سسر نے چونک کر بیوہ بہو کو دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ ساڑھی کے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ سسر نے گاڑی بان کو ڈانٹ کر کہا۔ ”اے! چپ ہو جا... کیا تجھے اور کوئی گیت نہیں آتا؟“

گاڑی بان کا وہ گیت مجھے آج بھی یاد ہے۔

اماں میرے ماموں سے ملنے آئی تھیں۔ اگرچہ وہ دور کے رشتے سے ماموں لگتے تھے مگر اپنوں جیسے تھے۔ وہاں ہم غسل کرنے کے بعد ناشتا کرنے بیٹھے تو اماں اور ماموں بندیا کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ مجھے ان کی باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ بس اتنا یاد ہے‘ ماموں بندیا کو مظلوم کہہ رہے تھے اور اس سے ہمدردی ظاہر کر رہے تھے۔

ایک گھنٹے بعد ہمیں بندیا کے مکان سے لڑنے جھگڑنے

کی آوازیں سنائی دیں۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ان کا مکان تھا۔ اماں اور ماموں جھگڑا نمٹانے کے لیے وہاں جانے لگے۔ دیگر بڑے بوڑھے بھی آ گئے تھے۔ بندیا کے ساس سسر کو سمجھا رہے تھے مگر وہ اپنے سامان کا تھیلا اٹھائے باہر آ گئے تھے۔ وہاں سے جاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”جب بیٹا مر چکا ہے تو بہو سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں رہا ہے۔ اگر یہ ہمارے بیٹے کی اولاد پیدا کرتی تو اسے یہاں نہ لاتے۔ اپنے کلیجے سے لگا کر رکھتے۔“

ساس سسر غصے سے طنطناتے ہوئے چلے گئے۔ اور ایسے معاملات سمجھنے کی میری عمر نہیں تھی۔ میں گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے چلا گیا۔

سریں وَتی گاؤں میں دو تین سو کسان اور زمیندار آباد تھے۔ صبح ہوتے ہی مرد کھیتوں پر چلے جاتے تھے۔ زمیندار گھرانوں کی عورتیں دن کا سارا کام نمٹا کر دوپہر کو کھانے کے بعد سو جاتی تھیں۔ میں نے اپنے ماموں اور بندیا کے گھروں میں یہی دیکھا تھا۔

دوپہر کو سناٹا چھا گیا تھا۔ بندیا کے مکان کے پیچھے ایک بڑی سی چار دیواری تھی‘ جسے کوٹھا کہا جاتا تھا۔ وہاں دھان کا ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ میں نے چلچلاتی دھوپ میں ماموں کو وہاں جاتے دیکھا۔ میرا مٹھائی کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ ماموں سے آنے دو آنے مل سکتے تھے۔ اس زمانے میں مٹھائی اتنی سستی تھی کہ ایک آنے میں دو گلاب جامن مل جاتے تھے۔

میں نے اس کوٹھے کا دروازہ کھولا تو یکبارگی ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ بندیا اور ماموں دھان کے ذخیرے پر پڑے ہوئے تھے۔ ہڑبڑا کر الگ ہو گئے۔ میرا منہ ایسے کھل گیا‘ جیسے آنکھوں سے نہیں‘ منہ سے دیکھ رہا تھا اور جو کچھ بھی دیکھ رہا تھا‘ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

ماموں بری طرح بوکھلا گئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی ایک چونی نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”جا بیٹے! ہریا کی دکان سے کچھ لے کر کھالے۔“

ایسا کہتے ہوئے انہوں نے میرا منہ دوسری طرف گھما دیا۔ میں دروازے کی طرف گھوم گیا۔ چپ چاپ وہاں سے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ میں جو کہہ رہا ہوں‘ وہی نفسیات کے ماہرین بھی کہیں گے۔ آگہی کا ساتواں در کھل چکا تھا۔ ابھی میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ آگہی دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ کہنا چاہیے کہ میرے سامنے ایک گٹھڑی تھی۔ جس پر بندھی ہوئی گرہ ایک ایک کر کے کھلنے والی تھی۔

اگر میں بچہ نہ ہوتا تو بھری جوانی میں بیوہ ہونے والی بندیا کے منہ زور جذبات کو سمجھ لیتا۔ اس وقت کی ایک ایک بات اب سمجھ میں آ رہی ہے۔

ہمارے دین میں حکم ہے کہ بیوہ اور مطلقہ عورت کی جلد سے جلد شادی کر دی جائے۔ اس طرح وہ عورتیں نہ بھٹکیں گی‘ نہ بہکائیں گی۔ گناہ کی لعنت سے محفوظ رہیں گی۔

ان کے ساتھ جو ہوا‘ وہ ہوا۔ سوال یہ ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟

کبھی دروازہ اچانک پوری طرح کھل جاتا ہے اور کبھی بہت آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔ میرے اندر وہ ساتواں در آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔

میں مانو کو بھرپور دوشیزہ بنتے دیکھنا چاہتا تھا۔ کبھی دل کہتا تھا‘ وہ روپا دیدی کے قالب میں ڈھل جائے۔ کبھی جی کرتا تھا‘ وہ بندیا کی طرح ڈھکی چھپی آندھی بن جائے۔

حسن کیا ہوتا ہے؟ نظارے کیا ہوتے ہیں؟ ادائیں کیا ہوتی ہیں؟ اور سمجھتے سمجھتے بھی نا سمجھنے والی بے چینی کیا ہوتی ہے...؟ میں اپنے اندر اس نامعلوم سی بے چینی کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

مانو اکثر میرے پاس آکر بولتی تھی۔ ان لمحات میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اپنی آواز اور دھندلے خاکے کے ساتھ میرے پاس پہنچی ہوئی ہے۔ اسی طرح جب میں اس کے بارے میں سوچتا تھا اور دل ہی دل میں اس سے بولتا تھا تو وہ اپنی تنہائی میں میرا دھندلا خاکہ دیکھتی اور میری آواز سنتی تھی۔

ہمارا رابطہ عجیب تھا۔ وہ اپنے طور پر مجھے دیکھتی تھی۔ میں اپنے طور پر اسے دیکھتا تھا۔ اس قدر شناسائی کے باوجود وہ نہیں جانتی تھی کہ میں کہاں ہوں؟ اور میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں چھپی ہوئی ہے؟

شاید قدرت کو ہماری آنکھ مچولی منظور تھی۔

اس وقت بھی میں تنہائی میں روپا دیدی اور بندیا سے اس کا موازنہ کر رہا تھا تو وہ آ گئی۔ حیرانی سے بولی۔ ”یہ تم کیا بول رہے ہو‘ کیا میں روپا دیدی اور بندیا کی طرح بڑی عورت بن جاؤں؟“

میں نے کہا۔ ”ایک دن تو تمہیں بننا ہی ہے۔“

”وہ تو جو ہوگا‘ قدرتی طور پر ہوگا۔ وقت سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوتا۔“

”مانتا ہوں‘ نہ ایسا ہوتا ہے‘ نہ خلاف قدرت ایسا ہونا چاہیے۔ پتا نہیں ان دونوں نے کیسا سحر طاری کیا ہے کہ الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگا ہوں۔“

”بات سیدھی ہے۔ وقت سے پہلے سوچو تو الٹی ہے‘ گمراہ

کر دیتی ہے۔ ہمیں ابھی سے دین و دنیا کے قوانین کو اخلاق و تہذیب کو اور شرم و حیا کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔"

والدین صحیح تربیت دیں تو بچے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ دانائی کی باتیں کر رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ بچوں کی زبان سے بھی ایسی باتیں بزرگانہ نصیحتیں لگتی ہیں۔ مانو پہلی بار مجھے دادی اماں لگی۔ اس کی نصیحت کے باوجود روپا دیدی اور بندیا کی کشش اپنی جگہ قائم رہی۔

☆☆☆

میں چودہ برس کا ہو گیا۔ پندرھواں سال شروع ہو گیا۔ وہ آئی تو میں نے اس کے دھندلے سے خاکے کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

طبیعت تو بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی اور یہ حقیقت میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ وہ پندرھواں سال لگتے ہی بدل گئی ہے۔ بچپن کی دہلیز کو پار کر کے میرے پاس آ کر یوں شرما رہی تھی جیسے پہلی بار سامنا کر رہی ہو۔

میں نے کہا۔ "تمہاری آواز اور لہجے میں سنجیدگی ہے۔ کیا تم پریشان ہو؟ میں بے چینی اور پریشانی محسوس کر رہا ہوں۔ یقیناً تم کسی الجھن یا تکلیف میں ہو؟"

ہم دونوں ہم عمر تھے۔ اس کی طرح مجھ میں بھی کسی طرح کی تبدیلی آنی چاہیے تھی۔ لیکن مرد حضرات کو تبدیلی کا کوئی خاص سگنل نہیں ملتا۔ اگر غلط تربیت ہو تو وہ بچپن ہی سے تبدیل ہوتا چلا آتا ہے۔ ورنہ میری طرح بچپن کی دہلیز پار کر کے بھی اناڑی ہی رہتا ہے۔

ان دنوں میں گل بکاؤلی اور الف لیلیٰ جیسی کتابیں پڑھنے لگا تھا۔ حسن و شباب، عشق و محبت، فراق و وصال جیسی باتیں سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ ایسے ہی دور میں شادی کی ایک تقریب تھی۔ اس تقریب میں دور دور سے مختلف شہروں سے تمام رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ وہ میری خالہ کا گھر تھا۔ بہت بڑا مکان اور وسیع و عریض آنگن ہونے کے باوجود وہ رشتے داروں کے لیے چھوٹا پڑ رہا تھا۔ لہٰذا دور تک قناتیں لگائی گئی تھیں۔ رات گئے تک ناچ گانا ہوتا رہتا تھا۔ نیند پوری کرنے کے لیے جسے جہاں جگہ ملتی، وہاں سو جاتا تھا۔

گھر کے اندر اور باہر دور دور تک چارپائیاں بچھی رہتی تھیں۔ سب ہی دن چڑھے تک سوتے رہتے تھے۔ رشتے داروں کی اس بھیڑ میں نجو نام کی ایک لڑکی تھی۔ وہ میری ہم عمر ہوگی یا مجھ سے ایک آدھ برس بڑی ہوگی۔ کچھ ایسی تھی جیسے کلی کھلتے کھلتے ٹھہر گئی ہو۔ بہت ہی شوخ اور چنچل تھی۔

ایک شام ہم لڑکے اور لڑکیاں چھپن چھپائی کھیل رہے تھے۔ وہ ایک جگہ چھپنے کے لیے میرے پاس آ گئی۔ مجھ سے بولی۔ "پتا ہے، میرا نام نجمہ ہے۔ سب مجھے نجو کہتے ہیں۔ ہم آج صبح کی گاڑی سے آئے ہیں۔ یہاں دس دنوں تک رہیں گے۔"

میں نے کہا۔ "چپ رہو، وہ ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔ ہم پکڑے جائیں گے۔"

وہ مجھے دونوں بازو کے گھیرے میں لے کر بولی۔ "میں نے تو پکڑ لیا ہے۔ جانتے ہو، جب سے آئی ہوں، تمہیں ہی دیکھتی جا رہی ہوں۔"

"مجھے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"تم بہت اچھے لگتے ہو۔ یہ بتاؤ میں کیسی لگتی ہوں؟"

"جو مجھے اچھا کہتا ہے، میں بھی اسے اچھا یا اچھی کہتا ہوں۔"

"تو پھر کہو نا..."

"میں تنگ ہو رہا ہوں۔ چھوڑو مجھے۔"

وہ گھور کر بولی۔ "عجیب اُلٹی کھوپڑی کے ہو۔"

اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ تب سمجھ میں آیا کہ واقعی اُلٹی کھوپڑی کا لڑکا ہوں۔ ایسے ہی وقت وہ اچانک آ گئی۔

میں نے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مانو...! تم...؟"

نجو نے پوچھا۔ "ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟ کس سے بول رہے ہو؟"

اِدھر مانو نے پوچھا۔ "میرے آنے پر حیران کیوں ہو؟ میں تو روز ہی آتی ہوں۔ دراصل چوری پکڑی گئی ہے۔ اس لیے گھبرا رہے ہو۔"

"نن۔ نہیں۔ ہم تو چھپن چھپائی کھیل رہے ہیں۔ یہ۔ یہ نجو خود ہی یہاں چھپنے آئی ہے۔ میں نے نہیں بلایا ہے۔"

نجو نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم کس سے بول رہے ہو؟ اتنی زور سے بولو گے تو ہم پکڑے جائیں گے۔ میں تو دوسری جگہ چھپنے جاؤں گی۔"

میں نے اسے نہیں روکا۔ وہ وہاں سے دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ مانو نے کہا۔ "میں سو رہی تھی۔ خواب میں دیکھا، کسی نے تمہیں دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا ہے اور تم رہائی نہیں پا رہے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ تم ایسے تو نہیں تھے۔"

میں نے صفائی پیش کی۔ "میں ایسا نہیں ہوں۔ سچ کہتا ہوں، وہ مجھ سے زبردستی دوستی کر رہی تھی۔"

"تم اس سے دور رہو۔ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں، اس سے دوستی نہیں کروں گا۔"

وہ خوش ہو گئی لیکن اسے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ جب تک مجھ سے باتیں کرتی رہی، یہی کہتی رہی کہ یہ سنبھلنے کی عمر ہے۔ اگر کسی لڑکی سے دوستی کرو گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ پھر میں تمہارے پاس کبھی نہیں آؤں گی۔

میں اسے تسلیاں دیتا رہا۔ وہ تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد چلی گئی۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ مانو کا یوں آنا اور آ کر روکنا ٹوکنا اور مجھ پر اپنا حق جتانا اچھا لگ رہا تھا۔ میں جہاں چھپا ہوا تھا، وہیں بیٹھا رہ گیا۔ مانو کے پیار کی سرشاری ایسی تھی کہ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔

وہ شادی کا گھر تھا۔ مختلف رسومات ادا کرنے کے دوران عورتیں رات گئے تک ناچتی گاتی اور ہنستی بولتی رہتی تھیں۔ ایسی تفریح کے وقت نجو بار بار آتی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر کہتی تھی۔ "یہاں سے اُٹھو۔ میرے ساتھ چلو۔ بڑا مزہ آئے گا۔" میں اپنا ہاتھ چھڑا لیتا اور طرح طرح کے بہانوں سے اسے ٹال دیتا تھا۔ میری مانو مجھے عزیز تھی لیکن مجھ پر وہ مثال صادق آئی کہ میں تو کمبل کو چھوڑ رہا ہوں، کمبل مجھے نہیں چھوڑ رہا ہے۔ وہ میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ وہ دوسرے دن میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی۔ "بس تھوڑی دیر کے لیے آؤ۔ پھر میں تمہارے پاس کبھی نہیں آؤں گی۔"

"مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟"

وہ ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی۔ "بس ایک بار... آؤ تو سہی..."

میں نے سوچا صرف ایک بار اس کی بات مان لینا چاہیے۔ کچھ بھی ہو جائے، اس سے دوستی نہیں کروں گا۔ مانو سے کیے ہوئے وعدے پر قائم رہوں گا۔

وہ مجھے ایک اسٹور روم میں لے آئی۔ وہاں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے ایک کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ جو کالی جلد والی کتاب ہے۔ اس کے نیچے ایک کتاب رکھی ہوئی ہے۔ اسے نکال کر پڑھو۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ہے اس میں...؟"

"دیکھو تو سہی... پڑھو گے تو مزہ آئے گا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کالی جلد والی کتاب کے نیچے سے ایک کتاب نکالی۔ اس کا سرورق پھٹا ہوا تھا یا پھاڑ کر الگ کر دیا گیا تھا۔ اس کا پہلا اور دوسرا صفحہ پڑھتے ہی میرے اندر عجیب سی سنسنی پیدا ہو گئی۔

میں نے سر گھما کر دیکھا، نجو نہیں تھی۔ وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ اس وقت وہ کتاب میرے ہاتھوں میں کانپ رہی تھی یا میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں ایک جگہ بیٹھ کر اسے پڑھنے لگا۔

میں پڑھ رہا تھا اور ساتواں در کھل چکا تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ دماغ میں جیسے آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

میں نے سر گھما کر دیکھا، نجو دروازے کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے بھی جیسے نہیں دیکھا۔ اس کی جگہ روپا دیدی جھلک دکھلا رہی تھی۔

میں بڑی دیر تک گم صم بیٹھا خلا میں تکتا رہا۔ پھر میں نے چونک کر سوچا۔ "اگر کوئی یہاں آئے گا اور میرے ہاتھوں میں یہ کتاب دیکھے گا تو شامت آ جائے گی۔"

میں فوراً ہی کتاب کو اس کی جگہ رکھ کر باہر آ گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں چھپی ہوئی تھی؟ دھم سے سامنے آ گئی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیسی تھی...؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "کون...؟"

"وہی جو اسٹور روم میں تھی۔ کیسی لگی...؟"

میں فوراً ہی منہ پھیر کر وہاں سے باہر چلا آیا۔ مجھے اپنے پیچھے اس کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ تیز طرار تھی۔ اس نے اپنی عمر سے آگے جا کر بہت کچھ دیکھا ہوگا۔ بہت کچھ سمجھا ہوگا۔ تب ہی اتنی بے باک تھی۔

برسوں کے مشاہدات اور تجربات سمجھاتے ہیں کہ چھوٹی عمر کے بچے اپنے والدین کو اور دوسرے بزرگوں کو چھپ چھپ کر دیکھتے ہیں اور جوان ہونے سے پہلے ہی جوانی کا سبق پڑھ لیتے ہیں۔

میری حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ بدن سر سے پاؤں تک گرم ہو گیا تھا۔ امی نے مجھے چھو کر کہا۔ "ہائے اللہ! کتنا تیز بخار ہے۔ منع کرتی ہوں کہ دھوپ میں نہ کھیلا کر۔ مگر نصیحت کہاں اثر کرتی ہے۔ اب پڑے رہو بستر پر..."

ماں غصہ کرتی رہی۔ ممتا ڈاکٹر کو بلا کر دوا دارو کرتی رہی۔ میں نے جو غلطی کی اسے سب سے چھپا سکتا تھا لیکن مانو سے چوری چھپنے والی نہیں تھی۔ کیونکہ ہمارا درد مشترک تھا۔ میں بیمار ہوتا تو وہ بھی بیمار ہو جاتی تھی۔

وہ تکلیف سے کراہتی ہوئی آ گئی۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "یا خدا...! تم میری بیماری بھگت رہی ہو؟"

وہ بڑی نقاہت سے بولی۔ "پہلے یہ بتاؤ۔ ہوا کیا ہے۔ تم اچانک بخار میں مبتلا کیسے ہو گئے؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کیا بتاؤں، بس اچانک

ہی بخار نے آ دبوچا ہے۔"

"نہیں۔ کوئی عجیب سی بات ہوئی ہے۔ میرے اندر ایک نامعلوم سا ہیجان بپا ہوا تھا۔"

میں پریشان ہو گیا کہ کیا بولوں؟ وہ اصرار کر رہی تھی۔

"مجھے بتاؤ۔ تم کس عذاب سے گزر رہے تھے؟ مجھے اس ہیجانی کیفیت سے نجات ملی ہے تو بدن گرم ہو گیا ہے۔"

میں ہچکچانے لگا۔ سچ بولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بولی۔ "تم کچھ چھپا رہے ہو؟"

میں نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "بڑی مشکل ہے۔ تمہاری کوئی بات مجھ سے اور میری کوئی بات تم سے چھپ نہیں سکتی۔"

"تو پھر بولو۔ میری پریشانی دور کرو۔ میرے دماغ میں بڑی دیر تک ایسی شرمناک باتیں آتی رہیں کہ میں گھبرا گئی اور رونے لگی تھی۔ اسی وقت سے میرا بدن گرم ہو گیا تھا۔ آخر بات کیا ہے؟"

عجیب عشق تھا ہمارا... ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا۔ لیکن جذبات و احساسات کے حوالے سے ایک دوسرے کے اندر اُتر جاتے تھے۔ اس نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ اگر مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہو تو یہ پیار میں بے ایمانی ہے۔ میرا بھروسا ختم ہو جائے گا۔ پھر میں کبھی تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ آج میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ میں نے ایک ایسی کتاب پڑھی ہے، جسے پڑھنا نہیں چاہیے تھا۔"

میں نے اس کتاب کے بارے میں ایک ہی بات بتائی تو وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔ "چپ ہو جاؤ۔ تم نے اس کتاب کو ہاتھوں میں لیا کیسے؟ اور تم نے اسے پڑھ بھی لیا؟ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی؟ تم کتنے گندے ہو؟ میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گی۔"

"خدا کا واسطہ دیتا ہوں، ایسا ظلم نہ کرنا۔ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گا۔ میری بیماری سے اندازہ لگاؤ کہ میں کس قدر پچھتا رہا ہوں۔"

میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم رُوٹھ جاؤ گی تو میں بستر سے اُتر جاؤں گا۔ بیماری میں ساری رات زمین پر بیٹھا رہوں گا۔ دوا بھی نہیں کھاؤں گا۔"

وہ متاثر ہو کر بولی۔ "تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ ٹھیک ہے، تم سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ وعدہ کرو، ایسی غلطی پھر نہیں کرو گے۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو پکڑا، پھر کبھی ایسی حماقت کرنے سے توبہ کی۔ ایسے ہی وقت نجو دبے قدموں چلتی ہوئی میرے بستر پر آ گئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ تمام لوگ کھلے آسمان کے نیچے سو رہے تھے۔ بیماری کی وجہ سے میرا بستر کمرے میں لگایا گیا تھا۔ وہاں چوری پکڑی نہیں جا سکتی تھی۔ لیکن میں فوراً ہی بستر سے اُتر کر اس سے دور ہو گیا۔

وہ حیران ہوئی۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا۔ چوری کرتے وقت چور منہ سے نہیں بولتے۔ میں نے بھی ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر جانے کو کہا۔ وہ قریب آ کر میری گردن میں بانہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ میں فوراً ہی پلٹ کر دروازے سے گزر کر کمرے کے باہر آ گیا۔

باہر دور تک مرد، عورت، بچے اور بوڑھے چارپائیوں پر سو رہے تھے۔ دروازے کے قریب ہی امی میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ سو رہی تھیں۔ رات کے دو بجے ہوں گے۔ ساری دنیا جیسے خوابِ غفلت میں تھی۔

میں امی کی چارپائی کے پاس آ گیا۔ نجو دروازے کے پٹ سے لگی خود کو چھپا رہی تھی اور ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی تھی۔ میں چارپائی کے سرے پر بیٹھ گیا۔ ایسے وقت امی کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا ہوا فہیم...؟"

انہوں نے مجھے چھو کر دیکھا پھر کہا۔ "بخار نہیں ہے۔ کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟"

وہ دروازے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "اندر گرمی لگ رہی ہے۔ میں آپ کے پاس سوؤں گا۔"

امی نے اُٹھ کر چھوٹے بھائی کو اُٹھا کر ابو کے پاس سلا دیا۔ پھر اپنے بستر پر آ کر بولیں۔ "آؤ میں سر سہلاتی ہوں۔ نیند آ جائے گی۔"

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ دروازے کے پیچھے ذرا ذرا سی جھلک رہی تھی۔ میں لیٹ کر امی سے لپٹ گیا۔ اس کے بعد میں نے منہ گھما کر نہیں دیکھا کہ وہ وہاں کب تک چھپی رہی۔ مجھے مانو کی سرگوشی سنائی دی۔ "تم بہت اچھے ہو۔ مجھے تم پر ناز ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی لڑکپن تھا۔ جوانی اپنے کھیل تماشوں کی ابتدا کر رہی تھی۔ وہ کچرا گھر والی سمجھا رہی تھی کہ گمراہ کن کھیلوں سے بچنا ہی دانشمندی ہے۔ جب ہم ازدواجی رشتہ قائم کر سکتے ہیں تو ہمیں کچرا گھر کی طرف لے جانے والے راستے پر نہیں چلنا چاہیے۔

☆☆☆

میں 1947ء میں سترہ برس کا ہو گیا تھا۔ یہ ہم پاکستانیوں کی تاریخ کا سب سے اہم سال ہے۔ میں اس سال جن حالات سے گزرتا رہا' اس کی مختصر سی روداد قلمبند کر رہا ہوں۔

ہمارے شہر کھڑگ پور میں ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف ہندوؤں کی آبادی تھی۔ ان کی آبادی میں کوئی مسجد نہیں تھی اور ہماری آبادی میں کوئی مندر نہیں تھا۔ ان کے علاقے میں کہیں اذان سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہمارے علاقے میں مندر کی گھنٹیاں اور پوجاپاٹ کی آوازیں نہیں گونجتی تھیں۔

میرے ابّو کو رہائش کے لیے جو سرکاری مکان دیا گیا تھا، اس کے سامنے ایک میدان تھا۔ میدان کے اس پار ہندوؤں کے رہائشی کوارٹر تھے۔ فسادات کے دوران دونوں طرف سے حملے ہوتے تھے۔ مسلمان فسادی ہمارے آنگن سے اور چھت سے ہندوؤں پر فائر کرتے رہتے تھے۔

ابّو دنگے فساد سے گھبراتے تھے۔ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے گھر کو جنگی مورچہ بنایا جائے۔ لیکن وہ غیظ و غضب میں آئے ہوئے مسلمانوں کو گھر میں آنے سے روک نہیں سکتے تھے۔ وہ لوگ حملہ کرنے کے لیے وقت بے وقت چلے آتے تھے۔ اس لیے ابو نے اماں کو اور بہنوں کو وہاں سے دور ماموں کے گھر پہنچا دیا تھا۔

دوسری طرف ہم مسلمان طلبا نے ہندو طلبا کے خلاف ایک ٹیم بنالی تھی۔ ہم جو برسوں سے ایک ہی اسکول میں مسلمان اور ہندو اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے آئے تھے۔ اس تعلیمی اتحاد کو اور آپس کی محبت کو بھول گئے تھے۔ کتابوں کے بستوں میں چاقو چھپا کر رکھتے تھے۔

ایک روز ہمارے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ کوئی مارا تو نہیں گیا مگر دونوں طرف کے طلبا بری طرح زخمی ہو گئے۔ ہمارے اساتذہ نے بیچ بچاؤ کیا۔ ہیڈ ماسٹر نے رو رو کر ہمیں سمجھایا کہ دنیا کے کسی دین اور دھرم میں کسی کا خون بہانے کی اجازت نہیں ہے۔

اساتذہ کے سمجھانے سے ہم مسلمان اور ہندو طلبا نے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کو گلے لگالیا۔ چودہ اگست 1947ء کو پاکستان وجود میں آیا۔ ہم آزادی کی پہلی خوشیاں نہ منا سکے۔ مسلمان لیڈروں نے سمجھایا کہ ہمیں اپنے گھروں پر سبز ہلالی پرچم نہیں بلکہ ترنگا جھنڈا (بھارتی پرچم) لہرانا چاہیے۔ کیونکہ ہم پاکستان میں نہیں' ہندوستان میں ہیں۔

دوسرے دن پندرہ اگست کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اس روز ہندو ناچ رہے تھے' گا رہے تھے۔ ہر گھر کی چھت پر ترنگا لہرا رہا تھا۔ انہوں نے بہت بڑا جلوس نکالا۔ مسلمان بھی جے ہند کہتے ہوئے اس میں شریک ہوئے۔ کچھ ہندوؤں نے طعنے دیے۔ ''تم لوگوں نے تو اپنا الگ ملک پاکستان بنایا ہے۔ وہاں جاؤ' یہاں ہماری دھرتی پر بوجھ کیوں بن رہے ہو؟''

اس بات پر فساد شروع ہو گیا۔ بڑی مشکلوں سے بیچ بچاؤ کیا گیا۔ کتنے ہی مسلمان زخمی ہوئے۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی زمین تنگ ہو گئی ہے۔

کھڑگ پور سے گزرنے والی ریلوے لائنیں بنگال ناگ پور ریلوے کہلاتی تھیں۔ اس ریلوے میں جتنے مسلمان ملازمین تھے۔ ان کی ہجرت کے لیے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہمیں جس اسپیشل ٹرین میں سیٹیں دی گئی تھیں۔ وہ ٹرین ایک ہفتے بعد سہ پہر تین بجے کھڑگ پور سے روانہ ہو کر کلکتہ ہوتی ہوئی مشرقی پاکستان جانے والی تھی۔

ایسے وقت جبکہ نئی منزل کی طرف سفر کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ہمارے گھر کو مسلح سپاہیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ باہر سے میگافون کے ذریعے کہا گیا کہ جو لوگ مکان کے اندر ہیں' وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر باہر آجائیں۔ اگر کسی کے پاس ہتھیار ہوگا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔

اس علاقے کے ہندوؤں نے ہمارے خلاف رپورٹ درج کرائی تھی کہ فسادات کے دوران ہمارا گھر جنگی مورچہ بنا ہوا تھا۔ اس مکان کی چھت اور دیواروں کے پیچھے سے ہندوؤں پر فائرنگ کی جاتی تھی۔ وہاں ہندوستانیوں کا راج تھا۔ ان کی بات سنی جاتی تھی۔ اس لیے رپورٹ کے مطابق مسلح سپاہی ہمیں گرفتار کرنے اور گھر کی تلاشی لینے آئے تھے۔

ان کے ساتھ ایک انگریز افسر بھی تھا۔ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں میگافون کے ذریعے کہہ رہا تھا۔ ''قتل و غارت گری کرنے والے مسلمانوں کے نام ہماری لسٹ میں موجود ہیں۔ اگر ان فسادیوں میں سے کوئی نہیں ہوگا اور یہاں کوئی ہتھیار نہیں پایا جائے گا تو تمہارے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جائے گا۔''

اس وقت اماں اور بہنیں ابو کے ساتھ ماموں کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ میں اپنے چچا اور ان کے بیٹے سعید بھائی جان کے ساتھ اس مکان میں تھا۔ ہم حکم سنتے ہی ہاتھ اٹھا کر باہر آگئے۔ سپاہیوں نے بڑی سختی سے ہمارے بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے' جھنجوڑتے ہوئے ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔

پندرہ فٹ کے فاصلے پر گیارہ سپاہیوں نے اپنی بندوقوں کے سیفٹی کیچ ہٹا کر ہمیں نشانے پر رکھ لیا۔ وہ سب حکم ملتے ہی بیک وقت ہم پر فائر کرنے والے تھے۔ اس وقت میرے چچا خوف سے تھرتھر کانپ رہے تھے۔ سعید بھائی جان رو رہے

تھے اور میں دونوں ہاتھ اٹھائے گم صم کھڑا ان انگریزوں کو دیکھ رہا تھا' جو موت بن کر دھمکیاں دے رہے تھے۔

محلے کے تمام لوگ سہمے ہوئے تھے۔ کوئی قریب نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر ہمیں ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ عورتیں کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔ گلیوں میں آکر ہماری سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ میدان کے دوسری طرف بے شمار ہندو ہماری موت کا تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

چند سپاہی اس انگریز افسر کے ساتھ ہمارے گھر کے اندر تلاشی لے رہے تھے۔ دو ہندو لیڈر بھی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ وہ بھی ہمارے مکان کے اندر جانا چاہتے تھے مگر انہیں اجازت نہیں دی گئی۔ وہ باہر کھڑے دعوے سے کہہ رہے تھے کہ اس مکان میں ہتھیاروں کا ذخیرہ رہتا ہے۔ یہیں سے ہم پر حملے ہوتے ہیں۔

کیا ہندو' کیا مسلمان سب ہی اس انتظار میں تھے کہ ہمارے گھر سے کچھ نہ کچھ برآمد ہونے والا ہے۔ تمام لوگ جانتے تھے' ہمارے مکان سے فائرنگ ہوتی رہتی تھی اور دستی بم پھینکے جاتے تھے۔ وہاں سے کچھ تو برآمد ہونے والا تھا اور ہمیں گولیوں سے چھلنی کیا جانے والا تھا۔

ان کی رپورٹ کے مطابق ہمارے مکان سے ہونے والے حملوں کے نتیجے میں دو ہندو مارے گئے تھے اور اسی رپورٹ کے مطابق ہم قاتل کہلا رہے تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ مسلمان فسادی اپنے ساتھ ہتھیار لے کر آتے تھے۔ ان کے پاس بندوقیں ہوں' کارتوس ہوں یا دستی بم ہوں' وہ انہیں اپنے ساتھ واپس لے جاتے تھے۔ لہٰذا ایک گھنٹے تک تلاشی لینے کے باوجود ہمارے گھر سے ایک کارتوس بھی برآمد نہ ہوا۔

انگریز افسر نے مکان سے باہر آکر رپورٹ درج کرانے والے ہندو لیڈروں سے کہا۔ ''دے آر ناٹ گلٹی... سروس ریکارڈ کے مطابق اس گھر کا رہنے والا محمد شہاب الدین ریلوے کا ایک افسر ہے۔ کوئی فسادی نہیں ہے اور اس گھر سے ہتھیار تو کیا' ایک کارتوس بھی برآمد نہیں ہوا ہے۔''

ہندو لیڈروں نے بھگوان کی اور دیوی دیوتاؤں کی قسمیں کھا کر کہا۔ ''اسی گھر سے حملے ہوتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہتھیار کہیں دوسری جگہ چھپا دیے ہیں۔ ہمارے کتنے ہی ہندو بھائی اس بات کے چشم دید گواہ ہیں۔''

ایک ہندو پولیس افسر نے ان لیڈروں کو سمجھایا کہ ان کی گواہی تسلیم نہیں کی جائے گی اور کوئی مسلمان محمد شہاب الدین ریلوے افسر کے خلاف گواہی نہیں دے گا۔

انگریز افسر نے کہا۔ ''میں آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ہوں۔ مجھے آن دی اسپاٹ فیصلہ سنانے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا میرا فیصلہ ہے' یہاں ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔''

فائرنگ اسکواڈ کو ڈس مس کا آرڈر دیا گیا۔ تمام مسلمان عورتیں' مرد اور بچے خوشی سے ناچنے گانے لگے۔ میں موت کے سامنے پہنچ کر زندگی کی طرف واپس لوٹ آیا تھا۔

میں نے دل کی گہرائیوں سے مانو کو پکارا۔ ''مانو...! مجھے یقین ہو گیا ہے' تم سے ملے بغیر اس دنیا سے نہیں جاؤں گا۔''

مانو سے خیالی اور صوتی رابطہ جاری تھا اور وہی سلسلہ تھا کہ وہ میرے دُکھ میں دُکھی اور سُکھ میں سُکھی رہتی تھی اور جیسے میرے اندر سما کر میرے رنگین اور سنگین جذبات سے دو چار ہوتی رہتی تھی۔ کچھ وقت اور آگے خاموشی سے گزر گیا۔

ایک شام ابّو گھبرائے ہوئے ڈیوٹی سے واپس آئے۔ اماں سے بولے ''اپنے اس صاحبزادے کو کہیں چھپاؤ۔ تمہارے منہ بولے بھائی شرما جی نے بتایا ہے' ہمارے لاڈلے کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری ہونے والا ہے۔ کل تک پولیس آئے گی اور اسے پکڑ کر لے جائے گی۔''

اماں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''میرے بیٹے نے ایسا کیا جرم کیا ہے؟ پولیس والے کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟''

ابّو نے میری طرف دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔ ''اس کم بخت نے اسکول میں جو دنگا فساد کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں دو ہندو لڑکے زخمی ہو گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔ مگر ہمارے درمیان صلح صفائی ہو گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے گلے لگ چکے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی ہماری غلطیوں کو معاف کر دیا تھا۔''

ابّو نے کہا۔ ''مگر ہندو معاف کرنے والے نہیں ہیں۔ ان بچوں کے ماں باپ اور رشتے داروں نے تمہارے خلاف اور تمہارے ساتھیوں کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے۔''

اماں نے مجھے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ میرا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''آج سے چوتھے دن ہماری اسپیشل ٹرین جانے والی ہے۔ اگر یہ گرفتار ہو گیا تو کیا ہوگا؟''

ابّو نے کہا۔ ''یہی ہوگا کہ ہم پاکستان نہیں جا سکیں گے۔ اپنا سامان بیچ چکے ہیں۔ اس گھر کو بھی چھوڑنا ہوگا۔ پتا نہیں' کہاں رہیں گے؟ کہاں جائیں گے؟ اس کے لیے مقدمہ بازی میں کب تک الجھتے رہیں گے؟''

میرا کلاس فیلو طاہر علی بھی فساد کرنے والے مسلمان طلبا کی فہرست میں شامل تھا۔ ابو نے اس کے والد سے مل کر یہ بری خبر سنائی کہ طاہر علی کے خلاف بھی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہونے والا ہے۔ اس کے والد نے پریشان ہوکر فوراً ہی کہا۔ ”میں اپنے بیٹے کو آج رات ہی کھڑگ پور سے سترہ گاچھی بھیج دوں گا۔ آپ بھی یہی کریں۔“

کلکتہ سے دو اسٹیشن پہلے ایک چھوٹا سا شہر سترہ گاچھی ہے۔ وہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”آج سے چوتھے دن اسپیشل ٹرین جانے والی ہے۔ وہ ٹرین سترہ گاچھی سے ہوکر گزرے گی۔ وہاں ہمارے بچے بھی سوار ہوجائیں گے۔“

ہمیں گرفتاری اور مقدمے بازی سے بچانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ اسی رات نو بجے کی ٹرین سے مجھے اور طاہر علی کو سترہ گاچھی روانہ کردیا گیا۔

میں نے چند آوارہ لڑکوں کے ساتھ رہ کر لڑنا جھگڑنا سیکھ لیا تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر دوسروں کو مارنے پیٹنے، انہیں زخم لگانے اور تکلیف پہنچانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ فخر حاصل ہوتا تھا کہ ہم دوسروں سے زیادہ طاقتور ہیں۔

جب میرے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اور رات کی تاریکی میں اپنے دوست طاہر علی کے ساتھ کھڑگ پور سے فرار ہوا تو میرے اندر عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا، میں فلمی ہیرو کی طرح قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے چھپتا چھپاتا نامعلوم منزل کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ اگلی کسی منزل پر اچانک ہی مانو ایک فلمی ہیروئن کی طرح ناچتی گاتی، دوڑتی ہوئی آکر میرے گلے میں بانہیں ڈالے گی۔

میں اور طاہر علی آدھی رات سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے اس کے خالو کے گھر میں رات گزاری۔ میں نے مانو کو تصور میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں بخیریت پہنچ گیا ہوں۔ تین دنوں کے بعد اسپیشل ٹرین میں مشرقی پاکستان جاؤں گا۔ اب تو مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تم کہاں ہو؟ ایسا نہ ہو کہ تم ہندوستان میں رہ جاؤ۔ پھر ہم کبھی نہ مل سکیں۔“

”اس نے کہا۔ ”کل سے میرے امتحانات شروع ہو رہے ہیں۔ دن رات اسٹڈی میں مصروف رہوں گی۔ شاید دو دنوں تک نہ آسکوں۔ کوئی بھی پریشانی کی بات ہو تو مجھ سے ضرور رابطہ کرنا۔“

”وہ تو میں کروں گا۔ تم میری بات کا جواب دو، کہاں ہو؟ اپنا پتا بتاؤ؟“

اس نے جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ چلی گئی۔ میں بری طرح جھنجلا گیا۔ بچپن سے انتظار کر رہا تھا کہ وہ قدرتی طور پر کسی دن اچانک میرے پاس چلی آئے گی یا حالات مجھے اس کے پاس پہنچا دیں گے۔ اب اس سے زیادہ سنگین حالات اور کیا ہوسکتے تھے کہ ہندوستان تقسیم ہوگیا تھا اور مجھے یہ تک معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ملک کے کس حصے میں ہے؟ مجھے جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔ پھر یہ سوچ کر صبر کرلیتا کہ کاتبِ تقدیر کو ہماری ملاقات منظور نہیں ہے۔

اماں نے روتے روتے مجھے رخصت کیا تھا۔ وہ نہیں جان سکتی تھیں کہ میں سترہ گاچھی خیریت سے پہنچ پاؤں گا یا نہیں؟ ان دنوں ٹیلی فون کا نظام بہت ہی محدود تھا۔ صرف اسٹیشن ماسٹر اور انگریز افسروں کے دفاتر میں ٹیلی فون لگا ہوتا تھا۔ تین پیسے کا پوسٹ کارڈ خرید کر اپنی خیریت کا خط لکھا جاتا تھا، جو دو یا تین دنوں میں اپنے کسی رشتے دار تک پہنچتا تھا۔ میں نے اماں کو خط نہیں لکھا۔ کیونکہ تین دن بعد وہ اسپیشل ٹرین میں آنے والی تھیں۔

میری اماں نے کہا تھا، سترہ گاچھی میں ان کے ایک رشتے کے بھائی رہتے ہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد مجھے ان سے ملاقات کرنی چاہیے۔ میں دوسرے دن ان سے ملنے گیا تو انہوں نے خوش ہوکر مجھے گلے لگالیا۔ ممانی نے بڑی اپنایت سے کہا۔ ”بیٹے! تم کل رات سے آئے ہوئے ہو۔ ہمیں خبر ہوتی تو تمہیں دوسروں کے ہاں رہنے نہ دیتے۔ بس ابھی اپنے ماموں کے ساتھ جاؤ اور سامان لے کر یہاں چلے آؤ۔“

میں طاہر علی کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ ماموں کے گھر میں کوئی ہم عمر ساتھی نہیں تھا۔ وہاں رہتا تو بور ہوجاتا۔ میں انکار کرنا ہی چاہتا تھا مگر کچھ بولنے سے پہلے ہی چپ ہوگیا۔

وہ دوپٹا سنبھالتی کمرے سے باہر آئی۔ اسے دیکھتے ہی یوں لگا، جیسے خیالوں کی دھند میں چھپنے اور چھپ چھپ کر جھلکنے والی مانو اچانک ہی دل کی دہلیز پر چھم سے آگئی ہو۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ ممانی نے کہا۔ ”ثمینہ! دیکھو کون آیا ہے؟“

وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ماموں نے کہا۔ ”یہ تمہارے پھوپا شہاب الدین کا بیٹا فہیم ہے۔“

ممانی نے کہا۔ ”اسے سلام کرو۔“

وہ بڑی ادا سے ذرا لچک کر بولی۔ ”کیوں سلام کروں؟ میں تو اس سے ایک برس بڑی ہوں۔“

ماموں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟“

وہ بولی۔ ”ایک دن اماں تمام خاندان کے بچوں کی پیدائش کا حساب کر رہی تھیں۔“

پھر اس نے ماں سے کہا۔ ”کیوں اماں! تم نے کہا تھا ناں، یہ مجھ سے ایک سال چھوٹا ہے؟“

کوئی ماں اپنی بیٹی کی عمر زیادہ نہیں بتاتی۔ ممانی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو یاد نہیں ہے، کب ایسا کہا تھا؟ کیوں بیٹے! تمہاری عمر کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میں پورے سترہ برس کا ہوں۔“

انہوں نے تعجب سے کہا۔ ”اچھا.... اگر بیس بائیس کے گبرو جوان لگتے ہو۔“

ثمینہ نے ماں سے کہا۔ ”اور میں اٹھارہ برس کی ہوں۔ مگر تم کہو گی، سولہ برس کی لگتی ہوں۔“

وہ بیٹی کو غصے سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”خوامخواہ عمر کا حساب کیوں کر رہی ہو؟ ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کون چھوٹی ہے اور کون بڑا ہے؟ جاؤ، میرے بیٹے کے لیے شربت بنا کر لاؤ۔“

وہ ایک ادا سے بل کھا کر گھوم گئی۔ اس کی چال میں عجیب سی دلکشی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کمرے کے اندر جا کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں خالی دروازے کو تکنے لگا۔ ممانی میری نظروں کو تاڑ رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ”بیٹے! اندر جاؤ۔ ہمارا گھر دیکھو۔ پھر شربت پینے کے بعد اپنا سامان لے آؤ۔ یہاں تمہارا دل لگے گا۔“

میں جیسے یہی چاہتا تھا، کوئی مجھے دھکا دے اور میں کمرے کے اندر چلا جاؤں۔ ممانی کی باتوں سے حوصلہ ملا تو جھجکتا ہوا دروازے پر آیا۔ کمرے میں دو چارپائیوں پر بستر بچھے ہوئے تھے۔ ایک بڑا سا صندوق تھا۔ ضرورت کا اور بھی بہت سا سامان تھا مگر جو ضروری تھی، وہ نظر نہیں آرہی تھی۔

میں دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں ایک بڑا سا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ گھر گرہستی کے سامان کو بڑے سلیقے سے رکھا گیا تھا۔ کمرے کا ایک اور دروازہ باہر کی طرف کھلا ہوا تھا۔ میں نے وہاں آکر دیکھا، دوسری طرف باورچی خانہ تھا۔ وہ شربت تیار کر رہی تھی۔ میں اسے سر سے پیر تک دیکھنے لگا۔ سوچ رہا تھا۔ ”کیا مانو بھی ایسی ہی بھرپور ہوگئی ہوگی؟“

وہ سر جھکائے شربت کے گلاس میں چمچ ہلا رہی تھی۔ چینی کب کی گھل چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ بہت آہستہ آہستہ چمچ کو ایک دائرے میں گھما رہی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا، اسے میرے آنے کی خبر نہیں ہے۔ مگر وہ جانتی تھی اور جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔

میں اس کے پیچھے تھا۔ ایک طرف سے چلتا ہوا دوسری طرف آیا۔ ایک زاویے سے دیکھ چکا تھا۔ دوسرے زاویے سے دیکھنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اس سے کیا کہنا چاہیے۔

میں نے تھوڑی دیر بعد ایک ذرا ہمت کی تو ماموں برف لے کر آگئے۔ انہوں نے اسے دھو کر ٹکڑے کیے پھر دو ٹکڑے گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یہاں برف بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اسٹیشن سے جا کر لایا ہوں۔ اب تمہیں شربت پینے کا مزہ آئے گا۔“

آنگن سے ممانی کی آواز سنائی دی۔ وہ ماموں کو پکار رہی تھیں۔ ”اے جی! تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ بچوں کو گھلنے ملنے دو۔ بس یہاں آجاؤ۔“

وہ ممانی کے تابعدار تھے۔ فوراً ہی پلٹ کر چلے گئے۔ ثمینہ نے گلاس اٹھا کر کہا۔ ”کمرے میں چلو۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر کلیجا ٹھنڈا کرو۔“

میں کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے جھک کر گلاس پیش کیا۔ وہ قریب کیا آئی، شربت پینے سے پہلے ہی کلیجا ٹھنڈا ہوگیا۔ فائرنگ اسکواڈ کے سامنے سے گزرنے اور قانون کی گرفت سے نکل آنے کے بعد وہاں ایسا لگا کہ وقت اچھا گزرنے والا ہے۔

شام کو ممانی میری پسند کے کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ”تمہارے ماموں پان والے کے پاس بیٹھے گپیں ہانک رہے ہوں گے۔ ان کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے جاؤ۔ ذرا دل بہل جائے گا۔“

یہ دل تو اسی گھر کی چار دیواری میں بہل رہا تھا۔ میں نے بہانہ کیا۔ ”سر میں درد ہے۔ باہر نہیں جاؤں گا۔ گھر میں آرام کروں گا۔“

میں آنگن میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ثمینہ تیل کی شیشی لے کر آئی، پھر بولی۔ ”چلیں اٹھیں ظلِ سبحانی! شاہِ معظم! یہ کنیز آپ کی خدمت کرنے آئی ہے۔ یہ ہماری اماں کا حکم ہے۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ چارپائی پر میرے پیچھے آگئی۔ شیشی کو کھول کر سر پر ذرا سا تیل ڈالا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے مالش کرنے لگی۔ اس کے ہاتھوں کے لمس سے میری سانسیں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔

اس نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ”تم مجھے کیوں گھورتے رہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں تو۔ میں۔ میں تو...“

اس نے پوچھا۔ ”میں اچھی لگتی ہوں؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”بہت اچھی۔ میں تم سے بچھڑنے کے بعد بھی تمہیں دیکھتا رہوں گا۔“

"مجھ سے محبت نہ کرو۔ دو روز بعد چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔"

"جانا تو ہوگا۔ امی سے بولوں گا۔ وہ تمہارا رشتہ مانگنے آئیں گی۔"

اس نے خوش ہو کر بڑی اپنایت سے پوچھا۔ "سچ کہہ رہے ہو؟ مجھے یہاں سے دلہن بنا کے لے جاؤ گے؟"

پتا نہیں ان لمحات میں اس کا جادو کیسے سر چڑھ کر بول رہا تھا؟ مانو میرے ذہن سے میری یادداشت سے گم ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہیں اپنی دلہن ضرور بناؤں گا۔"

ماموں ریلوے واچ اینڈ وارڈ میں انسپکٹر تھے۔ رات کو ڈیوٹی پر جاتے تھے۔ صبح کو گھر آتے تھے۔ اس رات ممانی محلے کی عورتوں سے ملنے چلی گئیں۔ جاتے ہوئے بیٹی کو تاکید کی۔ "ثمینہ! دروازہ بند کر لو۔ کتے گھس آتے ہیں۔"

میں بہت ہی نادان تھا۔ یہ بات میرے پلے نہیں پڑ سکتی تھی کہ وہ جان بوجھ کر ہمیں تنہا چھوڑ دیتی ہیں۔ ان کا خیال تھا، میں ثمینہ کے سحر میں مبتلا ہو جاؤں گا تو اس سے شادی کرنے کے لیے ماں باپ سے ضد کروں گا۔ اس طرح ان کی بیٹی ایک بڑے افسر کی بہو بن کر بڑے گھر میں چلی جائے گی۔

گرمی کے دن تھے۔ بستر آنگن میں بچھائے جاتے تھے۔ وہاں تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میری چارپائی رات کی رانی کے پودے کے قریب تھی۔ میرے بعد ممانی کا بستر لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد ثمینہ کی چارپائی تھی۔ یعنی وہ ہم دونوں کے درمیان صبح تک دیوار بن کر رہنے والی تھیں۔ مگر اس وقت ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

وہ اپنی چارپائی پر بڑے ہی کافرانہ انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ چوڑی دار پاجامے پر ململ کا کرتہ غضب ڈھا رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دوپٹے کو پھیلا کر کبھی اپنے اوپر لاتی، کبھی قدموں کی طرف لے جاتی تھی۔ وہ دوپٹا چوڑی دار پاجامے پر آ کر کبھی اسے پاؤں سے کمر تک چھپا دیتا۔ کبھی وہاں سے اٹھ کر لہراتا ہوا سر کی طرف آتا اور ململ کے کرتے کو چھپا لیتا تھا۔ ایسے وقت دونوں ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں گنگنا رہی تھیں۔ مجھے کچھ کہتی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔

میری عجیب حالت تھی۔ میں چارپائی کے سرے پر بیٹھا کبھی کبھی سانس لینا بھول جاتا تھا۔ وہ جیسے قدرتی طور پر سیکھ کر آئی تھی کہ ایک اناڑی کو کس طرح دھیمی دھیمی آنچ پر پکانا چاہیے۔

میں صحیح معنوں میں پہلی بار یہ سبق پڑھ رہا تھا کہ آدمی کس طرح سحر زدہ ہو کر اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ میں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ درمیانی چارپائی کے ایک طرف سے ہوتا ہوا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ "یہاں کیوں آئے ہو؟"

مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میں بہت دور سے چلتا ہوا، دوڑتا ہوا آیا ہوں۔ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تم۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

اس نے پوچھا۔ "تو پھر......؟"

میری سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہوں۔ پتا نہیں کیسی نامعلوم سی سنسنی تھی کہ میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ دھپ سے چارپائی کے سرے پر بیٹھ گیا۔ اس نے دھیمی سرگوشی میں پوچھا۔ "تم مجھے نہیں بھولو گے نا؟"

میں سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی باتیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں بھول گیا تھا کہ کہاں ہوں؟ میرے آس پاس کی دنیا گم ہو گئی تھی۔ مجھے پھولوں میں رات کی رانی کی مہک مسحور کر دیتی ہے۔ وہ اس رات آنگن میں مہک رہی تھی۔ رات کا طلسم مجھے گم صم کر رہا تھا۔

وہ طلسمی لمحے گزر گئے تو مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ مجھے مانو کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میں چارپائی کے سرے پر بیٹھا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ واش روم میں گئی تھی۔ میں نے پکارا۔ "مانو! تم کہاں ہو؟"

وہ روتے اور سسکتے ہوئے بولی۔ "میں کس منہ سے تمہارے سامنے آؤں؟ یہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کیا ہے؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "کیوں انجان بن کر پوچھ رہے ہو؟ میں منع کرتی رہی مگر تم بہکتے رہے۔ میرے جذبات کو بھڑکاتے رہے۔ آج تم نے وہ غلطی کی ہے، جو شادی سے پہلے میرے ماں باپ نے کی تھی۔"

میں شدید حیرانی سے اُچھل پڑا۔ "یہ۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم۔ تم ایک دھندلے خاکے کی طرح دکھائی دیتی ہو۔ میں کبھی تمہارے قریب نہیں آیا۔ میں نے کبھی تمہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ آج میں نے تمہیں چھو لیا ہے؟ تمہیں پا لیا ہے؟"

"نہیں۔ تم نے خیالوں میں آ کر جھنجوڑ ڈالا ہے۔ میری پارسائی کو... میری حیا کو..."

وہ پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ کہنے لگی۔ "میں کیا کہوں، مجھے شرم آ رہی ہے۔ تمہیں نہیں آئے گی۔ میں ایسی بکھر گئی ہوں کہ خود کو سمیٹ نہیں پا رہی ہوں۔"

میں ہکا بکا سا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ تو دیکھتا آیا تھا کہ جو میرے ساتھ ہوتا ہے وہ اس کے ساتھ بھی ہوتا ہے لیکن ان لمحات میں خود غرض ہو گیا تھا۔ ثمینہ کے ساتھ جذبات کی لہروں میں بہنے کے دوران مانو کے قدرتی رابطے کو بھول گیا تھا۔

یہ ایسی جائز شکایت اور فریاد تھی، جس کا جواب فوراً نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے آئندہ دو دن اور دو راتیں وہاں گزارنی تھیں اور ثمینہ بہکنے اور بہکانے سے باز آنے والی نہیں تھی۔ میں نے جو آگ لگائی تھی، اس میں دونوں تک جلنا تھا۔ وہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اگر میں پارسا بننا چاہتا تو ثمینہ شکایت کرتی کہ فرشتہ ہی بننا تھا تو شیطان کیوں بنے؟ وہ روتی تو ماموں ممانی تک بات پہنچتی۔ پھر یہ بات میرے امی ابو تک پہنچتی۔

بات آگے بگڑتی جانے والی تھی۔ اگر بن [illegible] جاتی۔ میرے والدین ثمینہ کو بہو بنانے پر آمادہ ہو جاتے تو میں مانو کے سوا کسی کو شریک حیات بنا ہی نہیں سکتا تھا۔ بات ہر پہلو سے اُلجھ رہی تھی۔

میں نے مانو کو وہاں کے حالات بتائے۔ اپنی دونوں کی مجبوریاں بیان کیں۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم مجھے دو دنوں اور دو راتوں تک عذاب میں مبتلا رکھو گے؟ میں مر جاؤں گی۔ میری شرم مجھے جینے نہیں دے گی۔ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔"

میرا سر گھومنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مانو کی حیا کو کس طرح برقرار رکھنا چاہیے۔ اپنی بے حیائی کے عذاب سے اسے کس طرح بچانا چاہیے؟ مانو نے کہا۔ "میں جا رہی ہوں۔ اگر اب تمہاری بے شرمی کا ذرا سا بھی ردعمل مجھ پر ہوگا تو تمہیں میرے مرنے کی بھی خبر نہیں ملے گی۔"

وہ چلی گئی۔ میں اس کے اور ثمینہ کے درمیان بُری طرح پھنس گیا تھا۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ پتا نہیں ثمینہ پھر تنہائی میں ملے گی تو کیا ہوگا۔ سوچتے سوچتے میرے اندر دھواں سا بھر گیا۔ میں گھبرا کر بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ جی چاہتا تھا کہیں بھاگ جاؤں۔ ایسے ہی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ممانی آ گئی تھیں۔ میں فوراً ہی بستر پر لیٹ گیا۔ دوسری طرف کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

ثمینہ واش روم میں تھی۔ اس نے آنگن میں آ کر دروازہ کھولا۔ میں نے ممانی کی آواز سنی۔ "کیا فہیم سو گیا؟"

ثمینہ نہیں جانتی تھی کہ میں جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں۔ اس نے اپنے طور پر کہہ دیا۔ "یہ تو بڑی دیر سے سو رہے ہیں۔ مجھے گرمی لگ رہی تھی۔ میں غسل کرنے چلی گئی تھی۔"

وہ ماں بیٹی باتیں کرتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئیں۔ میں سونے کی کوشش کر رہا تھا اور میرے اندر ایک ہی سوال چیخ رہا تھا کہ کل سے کیا ہونے والا ہے؟

☆☆☆

وہ رات گزر ہی گئی۔ میں نے دوسری صبح ثمینہ کو دیکھا۔ وہ شرما رہی تھی اور جھکی جھکی نظروں سے مسکرا رہی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی شرمیلی ادائیں دیکھی تھیں۔ اگر مانو کی طرف سے فکر مند نہ ہوتا تو اس کی اداؤں سے ضرور لطف اندوز ہوتا۔

ممانی ناشتا کرنے کے بعد تصویروں کے البم لے آئیں۔ ان میں میرے بچپن کی تصویریں بھی تھیں اور وہ تصویریں بھی تھیں، جب مجھے چھٹی کا غسل کرایا گیا تھا۔ ممانی نے کہا۔ "ان دنوں میں تمہارے ماموں کے ساتھ کھڑگ پور میں تھی۔ ہم وہاں دس دنوں تک رہے۔ تمہارے چھوٹے چچا کو ہمارے سامنے ہی گھر سے نکالا گیا تھا۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا چھوٹے چچا کو گھر سے نکالا گیا تھا؟"

"ہاں۔ انہوں نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔"

"انہوں نے کیا کیا تھا؟"

ممانی نے پوچھا۔ "کیا آپا اور بھائی صاحب نے تمہیں کبھی نہیں بتایا کہ ان سے پورا خاندان ناراض ہو گیا تھا؟"

وہ میری امی کو آپا اور ابو کو بھائی صاحب کہتی تھیں۔ میں نے کہا۔ "نہیں ممانی! پلیز آپ بتائیں، چھوٹے چچا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

انہوں نے اپنی بیٹی ثمینہ کو دیکھا۔ وہ بولی ۔ "امی! آپ نے جو مجھے بتایا ہے وہ فہیم کو بھی بتا دیں۔ ویسے میں تو کہتی ہوں، کلیم چچا نے ایک معصوم لاوارث بچی سے نیکی کی تھی، کوئی غلطی نہیں کی تھی۔"

میں لاوارث بچی کے ذکر پر چونک گیا۔ مانو یکبارگی میرے سامنے آ گئی۔ میں نے ممانی کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ "بات یہ ہے کہ جس دن تم پیدا ہوئے تھے، اسی دن اس علاقے میں ایک بہت ہی معصوم سی خوبصورت سی بچی کچرا گھر میں پائی گئی تھی۔"

مانو...! میری مانو...! تیرا سراغ مل رہا ہے۔

میں ذرا کھسک کر ممانی کے قریب آ گیا۔ وہ بولیں۔ "کیا مسلمان اور کیا ہندو سب ہی اس بچی کو دیکھنے کے لیے اس کچرے میں آئے تھے۔ مسلمان کہتے تھے یہ ہماری

نہیں ہے۔ ہندو کہتے تھے کہ ہندو کبھی ایسا پاپ نہیں کرتے۔ اس پہلو سے بچی کی شناخت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو؟ وہاں کوئی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا دھرم یا مذہب بدنام ہوجائے۔"

میں بڑی لگن سے اور توجہ سے ممانی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ شہر میں یتیم خانے اور فلاحی ادارے تھے۔ لیکن دودھ پینے والے بچوں کی... اور وہ بھی لاوارث بچوں کی دیکھ بھال کا کوئی ادارہ نہیں تھا۔

پولیس والے اس کے گناہگار ماں باپ کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے بچی کو تھانے میں لے جا کر رکھا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور تھانے والوں کو پریشان کر رہی تھی۔ گناہگار پکڑے نہیں جا رہے تھے انہوں نے مجبور ہو کر شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ خدا اور بھگوان کے نام پر کوئی اس بچی کو گود لینا چاہے تو تھانے آ کر اسے لے جائے۔

تمام دن کوئی نہیں آیا۔ شام کو دو طوائفیں اسے لینے آئیں۔ سپاہی انہیں پہچانتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "ابھی جاؤ۔ کوئی شریف آدمی نہ آیا تو ہم اسے تمہارے حوالے کر دیں گے۔"

ایسے وقت کلیم چچا دو بزرگ ہندوؤں کے ساتھ وہاں آئے۔ انہوں نے کہا۔ "میرا نام کلیم الدین شریف ہے۔ میرے بڑے بھائی شہاب الدین شریف ریلوے کار خانے میں چارج مین ہیں۔ میں بچی کو گود لینا چاہتا ہوں۔ میری شرافت کی ضمانت دینے میرا کوئی اپنا نہیں آیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میں مسلمانوں کو بدنام کر رہا ہوں۔"

بزرگ نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! آپ کسی بھی ہندو کے سامنے کلیم بھائی کا نام لیں، وہ ادب سے ہاتھ جوڑے گا۔"

انسپکٹر نے اُٹھ کر کلیم چچا سے مصافحہ کیا۔ پھر بچی کو ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اتنے بڑے شہر میں کسی نے اسے قبول نہیں کیا۔ مجھے شبہ ہے کہ تم ہی اس کے باپ ہو۔"

کلیم چچا نے بچی کو سینے سے لگا کر کہا۔ "آج سے یہ میری دھڑکنوں سے لگی رہے گی۔ آپ یقین کر لیں کہ یہ میری ہی بیٹی ہے۔"

"تو پھر یہ بھی بتا دو کہ اس کی ماں کہاں ہے؟"

"جہاں بھی ہوگی، خدا کی رحمت اس پر ہوگی۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کی ماں پر کیا گزری ہوگی۔ اتنا تو جانتے ہیں کہ کوئی اپنے بدن کا گوشت نوچ کر نہیں پھینکتا۔ بہر حال مجھے ملے گی تو آپ سے ضرور ملواؤں گا۔"

"کیا واقعی اسے نہیں جانتے؟"

"نہیں جانتا۔ اس بچی کی خاطر اسے جاننا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو ملے تو بچی کے پاس لے آئیں۔ اس نے پیدا کیا ہے دودھ پلانے کا قرض نہیں چکایا ہے۔"

وہ اسے محلے میں لے کر آئے تو ایک شور اُٹھا کہ کلیم الدین شریف پاپ کی گٹھڑی اُٹھا کر لائے ہیں۔ اتو نے انہیں دروازے پر ہی روک دیا۔ بزرگوں نے کہا۔ "یہ کیسی گند اُٹھا کر لائے ہو۔ سنو سارا محلہ کیا کہہ رہا ہے؟ ہمارے خاندان میں کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔"

انہوں نے کہا۔ "یہ بچی نہ غلیظ ہے نہ گناہگار ہے۔ اس کے والدین مجرم ہیں۔ دنیا والوں کو اور آپ سب کو ان کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اس معصوم بچی سے سب ہی کو ہمدردی اور محبت ہونی چاہیے۔"

چچا کی ایک نہیں سنی گئی۔ سب ہی رشتے داروں نے کہا کہ بچی کو کہیں چھوڑ آؤ ورنہ ذات برادری سے باہر رہو۔ انہوں نے اس ننھی سی جان کو نہیں چھوڑا۔ اپنا مختصر سا سامان لے کر وہاں سے چلے گئے۔

میں نے تڑپ کر ممانی سے پوچھا۔ "کہاں چلے گئے؟ آپ تو جانتی ہوں گی؟"

"میں نہیں جانتی۔ کوئی ایک رشتہ دار بھی نہیں جانتا۔ وہ جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ ایسی جگہ جائیں گے جہاں کوئی اس بچی کو ناجائز اور لاوارث نہیں کہے گا۔"

ثمینہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ ایسی جگہ ہوں گے جہاں ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں ہوگا۔ نہ کوئی چچا کو پہچانتا ہوگا، نہ اس بچی کو ناجائز کہتا ہوگا۔"

میں نے سر ہلا کر کہا۔ "بے شک وہاں لوگ اس بچی کو ان کی اپنی بیٹی سمجھتے ہوں گے۔"

ممانی نے البم میں سے ایک تصویر نکال کر مجھے دی۔ "یہ تمہارے کلیم چچا ہیں۔"

میں نے اس تصویر کو ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے یوں دیکھا جیسے ان کے پیچھے مانو دکھائی دینے والی ہو۔ وہ دکھائی تو نہیں دی لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے پاس محفوظ ہے۔

میں نے ممانی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آپ کسی طرح معلوم کریں وہ کہاں ہوں گے؟"

"بیٹے! میں کیسے معلوم کر سکتی ہوں؟ وہ اتنے اچھے تھے کہ رشتے دار ان سے ناراض ہونے کے باوجود آج بھی انہیں یاد کرتے ہیں؟"

ثمینہ نے کہا۔ "اتنے برس گزر گئے۔ اگر زندہ ہوتے تو..."

میں نے تڑپ کر کہا۔ "وہ زندہ ہیں۔ وہ بچی بھی زندہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میں۔ میں..."

میں جوش میں بولتے بولتے رُک گیا۔ دونوں ماں بیٹی مجھے حیرانی سے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ثمینہ نے پوچھا۔ "تم کیسے جانتے ہو، وہ دونوں زندہ ہیں؟"

میں ذرا ہچکچایا پھر بات بنائی۔ "میں نے دو روز پہلے اس بچی کو خواب میں دیکھا تھا۔"

وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ ثمینہ نے پوچھا۔ "کیا ننھی سی بچی کو دیکھا ہے؟"

میں نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں۔"

وہ پھر ہنستے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں کس بچی کو دیکھا ہے۔ جو کلیم چچا کے پاس ہے وہ تو ہماری تمہاری طرح جوان ہو گئی ہوگی۔"

میں نے دل میں کہا۔ "درست کہتی ہو۔ وہ جوان ہو چکی ہے۔ اپنا حق مانگ رہی ہے۔ مجھے تم سے دور رہنے کو کہہ رہی ہے۔"

ممانی نے کلیم چچا کو مجھ سے متعارف کرا کے بہت بڑا احسان کیا تھا۔ میری منزل کا دھندلا سا راستہ دکھا دیا تھا۔ اس وقت میرا دل، میرا دماغ صرف مانو کی طرف لگا ہوا تھا۔ ممانی سے باتیں کرنے کے دوران ثمینہ بار بار مجھے پیار بھرے جذباتی انداز سے دیکھتی رہی تھی۔ لیکن میں تو مانو کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ ایسی جذباتی مسرتوں کے ہجوم میں ثمینہ میرے دل و دماغ سے نکل گئی تھی۔ سامنے ہوتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ممانی کھانا پکا کر بارہ ایک بجے تک کھا پی کر محلے پڑوس میں چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی ثمینہ نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر میرے پاس آ کر مجھے غصے سے جھنجوڑ دیا۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا ہوا...؟"

وہ بولی۔ "تمہیں کیا ہوا ہے؟ صبح سے ذرا نظر اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھ رہے ہو۔ کیا میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہوں؟"

"نن، نہیں۔ ایسی تو۔ کوئی بات نہیں ہے۔ تم... ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟"

"نہ سوچوں تو اور کیا کروں؟ تم امی سے باتیں کرتے کرتے کچھ سوچنے لگتے تھے۔ میری طرف دیکھنا بھول گئے تھے۔ کیا دوسری کوئی بلا رہی تھی؟"

"نہیں تو۔ کیسی باتیں کر رہی ہو؟ بھلا دوسری کون بلانے آئے گی؟"

"وہ جسے کلیم چچا لے گئے تھے، وہ بھی جوان ہو گئی ہے۔ دھیان اسی کی طرف لگا ہوگا۔"

"میں نے کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ میں نہیں جانتا وہ کون ہے؟ کہاں ہے اور کیسی ہے؟ پھر میں اس کے دھیان میں کیوں رہوں گا؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو صبح سے یہ دیکھ رہی ہوں کہ مجھے نہیں دیکھ رہے ہو اور اب اتنی دیر سے تنہائی ہے اور تم نے پیار سے کوئی بات نہیں کی۔ میرا ہاتھ بھی نہیں پکڑا۔"

کی شکایت سمجھا رہی تھی کہ مجھے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہیے یا پھر صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ میں اس سے محبت کر سکوں گا نہ شادی۔

عقل سمجھا رہی تھی کہ صاف گوئی مہنگی پڑے گی۔ ثمینہ خود کو ہارنے کے بعد جیتنے کے لیے زمین آسمان ایک کر دے گی۔ اپنا مقدمہ بزرگوں تک پہنچا دے گی۔

دوسرے پہلو سے یہ مشکل تھی کہ ثمینہ کو فی الحال بہلانے اور ٹالنے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑتا تو انگلی سے پہونچے تک پہنچنے والی بات ہوتی۔ اِدھر جذبات بھڑکتے تو اُدھر مانو خلاف مرضی جذباتی عذاب اور اذیتوں میں مبتلا ہو جاتی۔

میں بہت شرمندہ تھا۔ اسے تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ ثمینہ نے گھور کر پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ کیا سوچ رہے ہو؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟"

میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "وہ بات یہ ہے کہ کل رات جو ہوا، سو ہوا۔ ابھی دن کے وقت تمہارا ہاتھ پکڑوں گا تو کوئی آ جائے گا۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "یہ اندر سے بند ہے۔ میں لڑکی ہو کر نہیں ڈرتی اور تم مرد ہو کر ڈر رہے ہو؟"

اس نے حوصلہ بڑھانے کے لیے قریب ہو کر میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ قربت کی آنچ فرشتوں کو بہکا دیتی ہے۔ میرے اندر گڑبڑ ہونے لگی۔ اُدھر مانو کے ساتھ گڑبڑ ہونے والی تھی۔

اور ہونے والی بات تو ضرور ہوتی ہے۔

مگر نہیں ہوئی۔ یا حیرت...! غیبی مدد حاصل ہو گئی۔

اچانک ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ ثمینہ نے فوراً ہی الگ ہو کر اُدھر دیکھا۔ باہر سے ماموں کی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولو۔"

میری جان میں جان آئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اطمینان کی گہری سانس لی۔ فوراً ہی دوسرے کمرے میں جا کر ایک کتاب اُٹھا کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ ماموں کچھ بیمار

تھے۔ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئے۔ ان کی بیماری میرے اور مانو کے لیے باعث رحمت بن گئی تھی۔

پھر ممانی بھی ان کی تیمارداری کے لیے آگئیں۔ ثمینہ مایوس ہوگئی تھی۔ وہ ایک کمرے میں میرے ساتھ تھی۔ مگر اب آزادی نہیں تھی۔ ہمارے درمیان فاصلہ تھا۔

اس نے ناراضی سے منہ پھلا کر دھیمی آواز میں کہا۔ ”تمہارے کلیجے میں ٹھنڈک پڑگئی؟“

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“

وہ مایوسی سے بولی۔ ”آج ابو ڈیوٹی پر نہیں جائیں گے۔ ان کا بستر بھی آنگن میں ہوگا۔ مجھے رونا آرہا ہے۔“

اگر ماموں بیمار ہو کر نہ آتے تو اُدھر مانو روتی۔ وہ مظلوم تھی۔ میں نے لاعلمی میں اسے رُلایا تھا۔ یہ میرا فرض تھا کہ آئندہ اس پر ظلم نہ ہونے دوں۔ ثمینہ نے منہ پھلا کر کہا۔ ”تم ایسے چپ ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔“

”کیسے کچھ نہیں ہوا ہے؟ ماموں بیمار ہیں اسی لیے تو چپ ہوں۔“

وہ جل کر بولی۔ ”تمہیں ابو کی بیماری کی فکر ہے اور کسی بات کی فکر نہیں ہے؟“

میں نے پوچھا۔ ”اور کس بات کی فکر ہوگی؟ ہمیں ان کے لیے دعا کرنا چاہیے۔“

”میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔ ان کی بیماری ایسی تشویشناک نہیں ہے کہ دعائیں مانگی جائیں۔ ہم آج نہیں مل سکیں گے۔ کیا مجھ سے دوری اچھی لگے گی؟“

”اچھی تو نہیں لگے گی۔ لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اسی لیے تو دعا مانگنے کو کہہ رہا ہوں۔“

وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ ”اللہ کرے شام تک طبیعت سنبھل جائے اور وہ ڈیوٹی کے لیے چلے جائیں۔ آمین...“

اس نے مجھ سے کہا۔ ”آمین بولو...“

میں آمین کہہ کر دل میں بولا۔ ”یا اللہ دعا قبول نہ ہو۔“

اس رات میری دعا قبول ہوئی۔ آنگن میں ماموں کی چارپائی کا اضافہ ہوگیا۔ ثمینہ کروٹیں بدلتے بدلتے سو گئی۔ میں نے مانو کو مخاطب کیا۔ ”تم کہاں ہو؟ یقیناً سکون سے ہوگی۔ کیونکہ میں خود کو گناہوں سے بچا رہا ہوں۔“

پھر میں نے کہا۔ ”میری مانو...! میں تمہیں بہت بڑی خوش خبری سنانے کے لیے بے چین تھا۔ یہ حیران کرنے والی اور چونکا دینے والی بات سنو۔ تمہارے جو ابو ہیں وہ میرے چچا ہیں۔ میرے سگے چچا ہیں۔ ان کا نام کلیم الدین شریف ہے۔“

اس نے بڑی تکلیف سے کراہتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا اور کہا۔ ”ہاں میرے ابو کا یہی نام ہے۔ اب تو میں ان سے کہوں گی کہ وہ تمہارے ابو سے رابطہ کریں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ کیا تم تکلیف میں ہو؟“

”میں بیمار ہوں۔“

”او گاڈ...! میں اب تک کئی بار محسوس کر چکا ہوں کہ بیمار جیسا ہوں۔ لیکن چچا کے اور تمہارے بارے میں خوش کرنے والی معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ اس لیے میں بیمار احساسات کو نظر انداز کرتا رہا۔ مجھے بتاؤ' اچانک کیسے بیمار ہوگئیں؟ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“

وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ ”کیا بولوں؟ بخار کبھی اُترتا ہے۔ کبھی چڑھتا ہے۔ شام کو لیڈی ڈاکٹر نے میرے کان میں کہا۔ ”میں تمہارے فادر سے بات کروں گی۔ یہ بیماری طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ شدت اختیار کرے' تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔“

وہ جھکتے ہوئے انداز میں بولی۔ ”فہیم! یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا ہے؟ میں صاف ستھرے خیالات کی حامل تھی۔ تم نے یہ کیا کیا ہے؟ میں سنبھلنے کی کوشش کرتی ہوں' پھر بھی شیطانی تصورات جھلکتے رہتے ہیں۔ تم نے یہ کس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟“

میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ میں نے کہا۔ ”ایک غلطی ہوگئی۔ میں کیا بتاؤں' میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو بہک جاتا۔ یہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خود بہک کر تمہیں بھی بھٹکا رہا ہوں۔ ایسا لاعلمی میں ہوگیا۔ خدا کے لیے خود کو سنبھالو۔ میں یہاں سنبھل رہا ہوں۔ انشاء اللہ جان پر کھیل جاؤں گا لیکن تمہاری پارسائی کو اور مجروح نہیں ہونے دوں گا۔“

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ”میں بہت خوش ہوں۔ تم مجھے جان سے زیادہ چاہتے ہو۔ میری خاطر شیطانی خواہشات کو کچل رہے ہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں' صبح تک خود کو سنبھال لوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”رات زیادہ ہوگئی ہے۔ آنکھیں بند کرو اور سونے کی کوشش کرو۔ کل باتیں ہوں گی۔“

میں نے آنکھیں کھول کر آنگن کو دیکھا۔ رات کی رانی مہک رہی تھی۔ میرے اور ثمینہ کے درمیان ماموں اور ممانی کی چارپائیاں تھیں۔ میں نے نیم تاریکی میں اسے کروٹ لیتے دیکھا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ کباب سیخ کے مانند کروٹیں بدل رہی تھی۔

سمجھا جائے تو میں نے اس پر بھی ظلم کیا تھا۔ اس کے اندر بھی آگ بھڑکائی تھی۔

ایسے حالات ہمیں سمجھاتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان صرف فاصلہ ہی نہ رہے' پردہ بھی رہے۔

یہ لوحِ مقدر میں لکھ دیا گیا ہے کہ مرد اور عورت اخلاق اور تہذیب کے مطابق رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر نیک نام رہیں یا ذلت کی پستیوں میں گناہ کے مرتکب ہوتے رہیں۔

لازم ہے کہ جوان ہوتے ہی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں اور شرعی رشتہ قائم ہونے تک خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ نیک اور صالح رہیں۔

مانو کے والدین بہک گئے تھے' وہ کچرے میں پہنچ گئی تھی۔ شیطانی کھیل کے نتیجے میں مہیش بھی چوراہے پر پڑا ہوا پایا گیا تھا۔ دنیا میں آئے دن نہ جانے کتنی پاپ کی گٹھریاں کھلتی رہتی ہیں۔ میں اور ثمینہ بھی ایسے ہی گناہ کے مرتکب ہوئے تھے اور اپنے ساتھ مانو کی پاکیزگی کو بھی مجروح کر چکے تھے۔

اب تو میں نے کان پکڑ لیے تھے کہ جو غلطی ہو چکی ہے اسے پھر کبھی نہیں دُہراؤں گا۔ دوسرے دن ماموں کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ رات کو ڈیوٹی پر جانے کے قابل ہو گئے۔ جب دوپہر کو تنہائی میں ثمینہ سے باتیں کرنے کا موقع ملا تو میں نے کہا۔ ”ہم دونوں گناہگار ہیں۔“

اس نے چونک کر پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”سچ کو تسلیم کرو۔ جو شادی کے بعد ہونا چاہیے' وہ پہلے ہوا ہے۔ کیا ہمارا دین' ہماری تہذیب اس کی اجازت دیتی ہے؟“

اس نے سر کو جھکا لیا۔ اس وقت میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ مجھے اس سے شادی کرنے کا' اسے دلہن بنانے کا جھوٹا وعدہ کرنا چاہیے۔ میں جھوٹ بول کر ہی آئندہ گناہوں سے بچ سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم میری دلہن بننے والی ہو۔ بولو بنو گی نا؟“

اس نے نظریں جھکا کر مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ”میرا فرض ہے کہ میں اپنی ہونے والی دلہن کی عزت آبرو کو سلامت رکھوں اور شادی تک اسے ہاتھ نہ لگاؤں۔“

اس نے ذرا پریشان ہو کر سر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ پھر جھجکتے ہوئے شرماتے ہوئے سر کو جھکا لیا۔

میں نے کہا۔ ”میں کل سے سوچ رہا ہوں' مرد عورت کو اپنی زندگی کی ساری کمائی دیتا ہے۔ عورت پہلی رات اسے ایک ہی انمول تحفہ دیتی ہے اور وہ تحفہ ہے آئینے جیسی صاف و شفاف آبرو...“

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یہ آخری بار چھو رہا ہوں۔ اس کے بعد دلہن بنا کر تمہارا ہاتھ پکڑوں گا۔“

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ کسمسا رہی تھی۔ کچھ بولنا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ بھی کہتی تو وہ بات حیا کے منافی ہوتی۔ میں اپنی لفاظی سے اسے دلہن بنا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں شہنائی بجا رہا تھا۔

میں جھوٹا اور فریبی ہوگیا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مزید گناہوں سے بچنے کے لیے جھوٹ اور فریب ہی کا سہارا مل رہا تھا۔

میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ شام کو ثمینہ نے ماں سے کھسر پھسر کی۔ اس [illegible] ممانی نے ہمیں تنہا نہیں چھوڑا۔ انہوں نے میرے پاس آ[illegible] پوچھا۔ ”بیٹے! ثمینہ تمہیں اچھی لگتی ہے؟“

میں نے شرما کر گردن جھکا لی۔ انہوں نے کہا۔ ”ثمینہ کہہ رہی تھی کہ تم اپنی امی سے رشتے کی بات کرنے والے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں۔“

بہرحال ہیرا پھیری سے بات بن گئی تھی۔ چوتھے دن اسپیشل ٹرین وہاں سے گزرتی ہوئی چند منٹ کے لیے رُکی۔ امی' ابو' بھائی اور بہنیں ایک کمپارٹمنٹ میں تھے۔ میں ماموں' ممانی اور ثمینہ کے ساتھ وہاں پہنچا تو امی مجھے گلے لگا کر خوشی سے رونے لگیں۔ ابو نے ماموں اور ممانی کا شکریہ ادا کیا۔ ثمینہ اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ میری جدائی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

بدنصیبی کو اس سے کیا کہ اس کی مار کوئی برداشت کر رہا ہے یا نہیں؟ ثمینہ کو تو برداشت کرنا ہی تھا۔ میں وہاں سے گیا تو گردِ کارواں کی طرح اس کے پاس رہ گیا۔

☆☆☆

ہم نے اپنے پاک وطن کی زمین پر قدم رکھا۔ ان دنوں مسلمانوں کو سیاسی' سماجی' معاشی اور اقتصادی پہلوؤں سے زبردست چیلنج کا سامنا تھا۔ میں ایک طالب علم تھا۔ صرف درسی کتابوں کے ذریعہ وطن کی محبت اور ذمے داریوں کو نباہنے کا سبق پڑھتا تھا۔ ورنہ عشق کا سبق تو بچپن سے ہی پڑھتا آرہا تھا۔

چچا کے متعلق معلومات حاصل ہونے کے بعد مانو تک پہنچنے کا راستہ کسی قدر آسان ہوگیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے ابو کو ہم سے رابطہ کرنے کے لیے کہے گی۔

پھر اس نے بتایا کہ اس کے ابو کاروباری معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔ ایک عدالتی مقدمے کا فیصلہ ہوتے ہی وہ مشرقی پاکستان ہم سے ملنے آئیں گے۔

میں نے مانو کو اپنا موجودہ پتا بتایا۔ سترہ برسوں کے بعد پہلی بار مجھے اس کا پتا معلوم ہوا اور وہ میرے پتے سے واقف ہوئی۔ اس بار کسی قسم کی قدرتی نامعلوم سی رکاوٹیں

پیش نہیں آئیں۔ ایک ہفتہ بعد ہی ابّو کو کلیم چچا کا ایک خط موصول ہوا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

''بھائی جان! السلام علیکم!

سترہ برس سات ماہ بعد آپ کا یہ گستاخ بھائی آپ سے مخاطب ہے۔ میں نے کوئی جرم کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ پھر بھی خاندان سے خارج کر دیا گیا تھا۔ کہاوت ہے کہ پانی میں لاٹھی مارنے سے پانی الگ نہیں ہوتا۔ میں لاٹھی کھانے کے بعد بھی آپ سے الگ نہیں ہوں۔ ہاں اگر آپ کے دل میں میرے لیے اب بھی جگہ ہے تو اس خط کا جواب ضرور دیں میرا یہ خط دوسرے تمام رشتے داروں کو پڑھا دیں۔ میں یہاں ایک مقدمے میں اُلجھا ہوا ہوں۔ انشا اللہ میرے حق میں فیصلہ ہونے والا ہے۔ میں جلد ہی اپنے تمام عزیزوں سے ملنے آؤں گا۔

بھابی جان کو آداب اور تمام بچوں کو میری طرف سے پیار۔

فقط۔ آپ کا فرمانبردار بھائی
کلیم الدین شریف''

امی اور ابّو نے وہ خط پڑھا۔ ابّو نے ناگواری سے کہا۔ ''کمبخت بہت ضدی اور خود سر ہے۔ اتنی مدت کے بعد پتا نہیں کیسے ہماری یاد آئی ہے۔''

امی نے کہا۔ ''اس نے لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ وہ تو اب جوان ہو گئی ہو گی۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''میرے برابر ہو گئی ہو گی۔ یہ وہی ہے نا جو میرے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔''

امی نے گھور کر کہا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ پتا نہیں اسے کس نے کچرے میں جنا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ابّو! وہ کبھی کچرے میں تھی۔ اب تو نہیں ہے۔ اب تو میرے چچا جان کی بیٹی ہے۔ میری کزن ہے۔''

انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے دیکھا۔ پھر امی کو غصہ سے کہا۔ ''کیا اس لڑکی کا ذکر چھیڑنا ضروری تھا؟ تم عورتوں کے پیٹ میں بات اُچھلتی رہتی ہے۔''

امی نے کہا۔ ''یہ خط جس رشتے دار کے ہاتھ میں جائے گا' وہاں یہ بات اُچھلے گی۔ سب ہی پوچھیں گے' کیا کلیم کے ساتھ وہ بھی یہاں آئے گی؟ آپ کیا جواب دیں گے؟ کیا اس لڑکی کو قبول کریں گے؟ اسے گھر میں آنے دیں گے؟''

انہوں نے کہا۔ ''ابھی میں جواب لکھوں گا۔ اس سے کہوں گا کہ لڑکی کو یہاں نہ لائے۔''

اس بات سے مجھے تکلیف پہنچی۔ میں برسوں سے اس کا انتظار کر رہا تھا اور ابّو اس کا راستہ روک رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''اس لڑکی نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ کیا وہ یہاں آ کر ہمارا کوئی نقصان کرے گی؟''

انہوں نے ڈانٹا۔ ''تم بڑوں کے معاملے میں نہ بولو۔''

''میں اٹھارویں سال میں ہوں آپ کی طرح بزرگ نہیں ہوں تو بچّہ بھی نہیں ہوں۔ اتنی سی بات تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ جس کی ذات سے نقصان نہ پہنچے' اس سے دوستی اور محبت رکھنی چاہیے۔''

وہ اپنے انداز میں ڈپٹ کر بولے۔ ''بحث نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے۔''

میں چُپ چاپ کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ پتا نہیں کلیم چچا کو میرے مزاج اور میری خواہش کے خلاف کیا لکھنے والے تھے۔ میں نے اپنے ایک دوست کے گھر میں بیٹھ کر مانو کو خط لکھا۔

''میری مانو...!

تمہارے لیے پیار ہی پیار پتا نہیں یہ خط تمہارے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ یا نہیں۔ ہم بچپن سے اب تک ایک دوسرے کے قریب پہنچتے ہوئے بھی نہیں پہنچ رہے ہیں۔ تم مجھے خوابوں میں پکارتی ہو میں تمہیں خیالوں میں دیکھ لیتا ہوں۔ کبھی یقین ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پا رہے ہیں' کبھی بے یقینی سی ہوتی ہے کہ یہ سب محض بہلاوہ ہے۔ اس خط کا جواب دو گی تو یقین ہو گا کہ ہماری محبت خواب و خیال اور بہلاوہ نہیں ہے۔ یہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کی جائے گی۔ رشتے داروں سے تمہیں جو محبت ملنی چاہیے وہ نہیں ملے گی۔ اگر ایسا ہوا اور اگر کسی نے بھی تمہیں حقارت سے دیکھا تو مجھ سے برداشت نہ ہو گا۔ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔ بہتر ہے' تم ابھی نہ آؤ۔ پہلے چچا جان کو یہاں کا جائزہ لینے دو۔ حالات سازگار ہوں تو ضرور آؤ۔ میں بچپن سے انتظار کر رہا ہوں۔ اگر حالات موافق نہ ہوئے تو میں سارے رشتے ناتے توڑ کر تمہارے پاس دوڑا چلا آؤں گا۔ میں کبھی کبھی خود کو بیمار محسوس کرتا ہوں۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تم بیمار رہنے لگی ہو اور مجھ سے اپنا دکھ درد چھپا رہی ہو۔ جبکہ جانتی ہو ہمارے غم اور ہماری خوشیاں ایک دوسرے سے چھپی نہیں رہ سکتیں۔ مانو! میرے لیے خود کو سنبھالو توجہ سے علاج کراتی رہو۔ تم اپنی بیماریوں سے لڑتی رہو گی تو میں صحت مند رہوں گا۔ انشا اللہ ہم بہت جلد ملنے والے ہیں۔

فقط
تمہارے جوابی خط کا منتظر

تمہارا اور صرف تمہارا
فہیم الدین شریف''

میں نے وہ خط پوسٹ کر دیا۔ یہاں چچا جان کا خط تمام رشتے داروں کے درمیان گردش کر رہا تھا۔ تمام بزرگوں اور جوانوں کو بحث کرنے کے لیے ایک دلچسپ موضوع مل گیا تھا۔ جوانوں کے لیے موضوع اس لیے دلچسپ تھا کہ وہ بچّی جوان ہو کر آنے والی تھی۔

بزرگوں کی باتوں سے انہیں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت ہی پیاری اور بہت ہی دلکش نین نقش والی تھی۔ جوان اندازہ لگا رہے تھے کہ وہ جوانی میں اور بھی حسین اور دلنشین ہو گئی ہو گی۔

میں نے اپنے چچا زاد' پھوپی زاد' خالہ زاد اور ماموں زاد بھائیوں سے پوچھا۔ ''تم میں سے کون اسے عزّت دے گا اور اپنی شریکِ حیات بنائے گا؟''

ایک اور کزن نے کہا۔ ''خوامخواہ اس کے متعلق نہ سوچو۔ اس کے آتے ہی ہمارے بزرگ اپنی نگاہوں کا ایسا سخت پہرا بٹھائیں گے کہ ہم اپنی اُڑان بھول جائیں گے۔''

ایک کزن نے کہا۔ ''فہیم! تم اپنی کہو' اگر وہ تمہارے دل کو بھا گئی تو کیا کرو گے؟''

میں نے کہا۔ ''تم سب جانتے ہو کہ میری اور اس کی تاریخ پیدائش ایک ہی ہے۔''

سب نے کہا۔ ''ہاں یہ کون نہیں جانتا۔''

میں نے کہا۔ ''مانو بھی جانتی ہے۔''

ایک نے پوچھا۔ ''یہ مانو کون ہے؟''

''میں کلیم چچا کی لے پالک بیٹی کو مانو کہتا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اسے پہلے سے جانتے ہو؟''

''ہاں ہم بچپن سے خوابوں اور خیالوں میں ملتے آ رہے ہیں۔''

سنتے ہی سب ہنسنے لگے۔ میں چُپ چاپ مسکرا کر انہیں دیکھتا رہا۔ ایک نے کہا۔ ''خوابوں میں ملنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حقیقتاً تمہیں دیکھا نہیں ہے؟''

میں نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہم ایک دوسرے کے صورت آشنا نہیں ہیں۔ مگر آشنائی ہے۔ ایک دوسرے سے دلی لگاؤ ہے۔''

ایک اور کزن نے کہا۔ ''یعنی کہ اندھی محبت ہے۔ فرض کرو' وہ اس قدر حسین ہو کہ تمہیں دیکھنے کے بعد گھاس نہ ڈالے تو کیا کرو گے؟''

میں نے ان سب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ ''وہ صورت دیکھ کر نہیں' سیرت اور حوصلہ دیکھ کر محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ جو اس کی خاطر زمانے سے لڑے گا' وہ اسی کے گلے کا ہار بنے گی۔''

یہ طنز انہیں بُرا لگا۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیا تم والدین اور بزرگوں کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کر سکو گے؟''

''وہ لوحِ مقدر پر میرے نام لکھ دی گئی ہے۔ یہ آنے والا وقت بتائے گا۔''

اس دن کے بعد میری یہ بات پورے خاندان میں گردش کرنے لگی کہ میں کلیم چچا کی بیٹی سے عشق فرما رہا ہوں اور اس کی خاطر اپنے بزرگوں سے بغاوت کرنے والا ہوں۔

ابّو نے پوچھا۔ ''یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟''

امی نے پوچھا۔ ''تمہیں اس کچرا لڑکی سے کیا دلچسپی ہے؟''

''پلیز امی! اسے کچرا نہ کہیں۔ کلیم چچا دیندار اور عبادت گزار ہیں۔ اس نے چچا جان کی پاکیزہ آغوش میں پرورش پائی ہے۔''

''نمازی کے سائے میں رہنے سے گناہ دھُل نہیں جاتے۔''

''مانو گناہ گار نہیں ہے۔ اس کے والدین قابل ہیں۔''

ابّو نے مجھے گھور کر کہا۔ ''ہم نے سنا ہے کہ تم اسے مانو کہتے ہو۔ سچ بتاؤ' اسے کب سے جانتے ہو؟''

''مجھے اچھی طرح [illegible] ہے۔ میں بچّہ تھا' خواب میں ایک بچّی کو دیکھتا تھا۔ جب ہم بولنے کے قابل ہوئے تو اس نے کہا کہ وہ اسی دن پیدا ہوئی تھی' جس دن میں اس دنیا میں آیا تھا۔ اس کے بعد وہ روز میرے پاس آنے لگی۔ وہ کہتی ہے کہ میں بھی اس کے پاس پہنچ کر اس سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔''

امی نے کہا۔ ''وہ بکواس کرتی ہے۔ جھوٹ بول کر تمہیں دیوانہ بنا رہی ہے۔''

''میں تو جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اسے تو سچ مانیں کہ وہ میرے پاس آتی رہتی ہے۔''

''کہاں آتی ہے۔ مجھے دکھاؤ۔''

''یہ میرا اور اس کا قدرتی رابطہ ہے۔ وہ صرف مجھے دکھائی دیتی ہے۔''

ابّو نے کہا۔ ''کوئی قدرتی معاملہ نہیں ہے۔ عشق کا فتور ہے۔ فلمیں دیکھتے ہو۔ جانے کیسی کیسی کتابیں پڑھتے ہو۔ یہ کلیم بہت مکار ہے۔ اس نے پہلے تمہیں پھانسا ہے۔ پھر مدتوں بعد ہم سے رابطہ کیا ہے۔ میں نے اسے گھر سے نکالا تھا۔ آج وہ برسوں بعد انتقام لے رہا ہے۔ وہ تمہیں ہم سے چھین کر لے جانے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔''

میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں سترہ گا چھی ماموں ممانی کے گھر جانے سے پہلے تک انہیں نہیں جانتا تھا۔ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مانو چچا کے سائے میں پرورش پا رہی

ہے۔ میرا اور مانو کا پیار اور تعلق قدرتی ہے۔ چچا جان نے کوئی سازش نہیں کی ہے۔ لیکن ابّو مجھے نادان بچّہ سمجھتے تھے۔ میری بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”میری بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ آپ بھی یقین نہیں کریں گے کہ میرے اور مانو کے درمیان ایک نہ سمجھ میں آنے والا قدرتی رابطہ رہتا ہے۔“

امی نے کہا۔ ”قدرتی رابطہ نہ کہو۔ وہ جادو ٹونہ کرتی ہے۔“

”چچا جان دیندار اور عبادت گزار ہیں۔ ان کے گھر میں کسی طرح کا کالا جادو نہیں ہوگا۔“

ایسے ہی وقت میں نے گھبراہٹ سی محسوس کی۔ اچانک ہی میرا دماغ گرم ہو رہا تھا۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مانو پھر بیمار ہوئی ہے۔

اس بار بیماری کچھ شدید تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے صوفے پر گر پڑا۔ پھر میں نے سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ امی اور ابّو پریشان ہو گئے۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے پاس آگئے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟

امی میرا سر سہلا رہی تھیں۔ ابّو مجھے تھپک تھپک کر میری بیماری کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑتے ہوئے باہر چلے گئے۔

میں کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ حلق پھاڑ کر چیخنے کو جی چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بال نوچنے اور کپڑے پھاڑ ڈالنے کے جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اُدھر مانو پر دورہ پڑا تھا۔ اصل مریضہ وہ تھی۔ میں بالواسطہ متاثر ہو رہا تھا۔ اس لیے کسی قدر حواس میں بھی تھا اور حتی الامکان سنبھلنے کی کوششیں بھی کر رہا تھا۔

ابّو محلے کے ڈاکٹر کو بلا کر لے آئے۔ اس نے میری حالت دیکھی پھر کچھ ایسی دوائیں دیں کہ جنون کچھ دھیما پڑ گیا۔ اس نے امی اور ابّو سے کہا۔ ”آپ دوسرے کمرے میں جائیں۔ میں فہیم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

امی روتی اور بڑبڑاتی ہوئی گئیں۔ ”میرے بیٹے کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ وہ چڑیل جادو کر رہی ہے۔ میں کسی بڑے عامل سے توڑ کراؤں گی۔“

ڈاکٹر نے تنہائی میں پوچھا۔ ”کیا پہلے کبھی ایسا ہوا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”پہلے گھبراہٹ طاری ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی طرح کے جنون میں مبتلا ہونے والا ہوں۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں تھا۔ آج ہو گیا۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا جذباتی کتابیں زیادہ پڑھتے ہو؟“

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”میرے حالات کچھ ایسے ہیں کہ میری زندگی ایک جذباتی کتاب بنتی جا رہی ہے۔“

”اپنے حالات بتاؤ۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔“

”میں بتاؤں گا۔ آپ سنیں گے لیکن یقین نہیں کریں گے۔“

”میں ڈاکٹر ہوں۔ بعض اوقات مریضوں کے اُلٹے سیدھے بیانات سن کر مرض کی تہ تک پہنچ جاتا ہوں۔ جو بات ہے اُسے کھل کر بولو۔“

میں اپنے اور مانو کے قدرتی رابطے کے متعلق بتانے لگا کہ وہ بیمار ہوتی ہے تو میں بھی بیمار ہو جاتا ہوں۔ مجھے کبھی چوٹ لگتی ہے تو مانو کو بدن کے اسی حصے میں تکلیف پہنچتی ہے۔

پھر میں نے کہا۔ ”آپ نے مجھے جنون کی حالت میں دیکھا ہے۔ دراصل مانو وہاں جنون میں مبتلا ہوگی۔ وہ اپنے بال نوچتی رہی ہوگی۔ اپنے کپڑے پھاڑتی رہی ہوگی۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”او گاڈ...! اگر تمہارے بیان کے مطابق ایسا قدرتی رابطہ ہو رہا ہے تو وہ لڑکی ہسٹیریا کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس پر شیطانی گمراہ کن خیالات کی یلغار ہوتی رہتی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ جلد سے جلد اس کی شادی کر دی جائے۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟“

”وہ میری کزن ہے۔ لاہور میں رہتی ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ فوراً ہماری شادی ہو جائے لیکن ہمارے بزرگ ہونے نہیں دیں گے۔“

”میں تمہارے والدین کو ابھی سمجھاؤں گا۔ اگر وہ راضی نہ ہوئے تو اپنی کزن سے کہو کسی سے شادی کر لے اور تم یہاں والدین کی مرضی سے شادی کر لو۔ اس طرح دونوں کو اس مرض سے نجات مل جائے گی۔“

”نجات نہیں ملے گی۔ وہ مر جائے گی لیکن میرے سوا کسی اور کو اپنا جیون ساتھی نہیں بنائے گی۔“

امی نے کمرے میں آ کر کہا۔ ”چولہے میں جائے وہ لڑکی۔ ہم تمہاری باتیں سن رہے تھے۔ ہمیں تمہاری بیماری دور کرنی ہے۔“

ابّو نے کہا۔ ”میں کل ہی آپا کی بیٹی سے تمہارا نکاح پڑھاؤں گا۔“

میں انہیں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جبراً شادی کی جائے گی پھر میں دلہن کے ساتھ جذباتی لمحات گزاروں گا تو مانو پر پھر ہسٹیریا کا دورہ پڑے گا۔ وہ ہمارے محبوبانہ قدرتی رابطے کو نہ سمجھتے تھے اور نہ کبھی ایسے رابطے پر یقین کر سکتے تھے۔

میں نے کہا۔ ”آپ میری بیماری کی فکر نہ کریں۔ میں

کسی سے شادی نہیں کروں گا۔“

”بکواس مت کرو۔ تمہاری شادی نائلہ سے ہوگی۔“

”میں پھوپی اور پھوپا سے کہہ دوں گا کہ ان کی بیٹی میری دلہن بنتے ہی پاگل ہو جائے گی۔“

امی نے کہا۔ ”ہائے اللہ...! وہ چڑیل ہماری نائلہ کو کھا جائے گی۔“

”آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔ مانو کے راستے میں جو بھی آئے گی، وہ نقصان اُٹھائے گی۔“

میں انہیں ڈرانے کے لیے باتیں بنانے لگا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یوں جھوٹ بولنے کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ نائلہ کو میری دلہن بنانے سے باز آ گئے۔ لیکن یہ قسم کھالی کہ مانو چچا جان کے ساتھ آئے گی تو اسے گھر میں گھسنے نہیں دیا جائے گا۔

مجھے اندازہ تھا کہ مانو کے ساتھ یہی ہوگا۔ میں نے چچا جان کو خط لکھا۔ انہیں رشتے داروں کے مخالفانہ رویّے کے بارے میں بتایا اور اپنی طرف سے مشورہ دیا کہ وہ یہاں آنے سے پہلے تمام رشتے داروں سے خط کتابت کے ذریعے مانو کے حقوق منوائیں۔ اگر وہ مانو کو کلیم الدین شریف کی بیٹی تسلیم نہیں کریں، اُسے محبت اور عزّت دینے سے انکار کریں تو بہتر ہوگا کہ وہ یہاں نہ آئیں۔

میں نے وہ خط پوسٹ کیا۔ اسی دن مجھے اپنے دوست کے پتے پر مانو کا خط ملا۔ اس نے جواباً لکھا تھا۔

فہیم...! میرے محبوب...!

میں تمہارے لیے پیدا ہوئی ہوں۔ اسی لیے تمہارے چچا کے سائے میں پرورش پا رہی ہوں یہ امید ہے کہ ہم جلد ہی ملیں گے۔ لیکن میری بیماری حوصلہ پست کر رہی ہے مجھ پر ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے ہیں ڈاکٹر سکون کی دوائیں دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میرا آخری علاج شادی ہے۔“

یہاں تک خط پڑھتے ہی میرا سر جھک گیا۔ وہ تو ایک سیدھی سادی اور پاکیزہ خیالات کی حامل لڑکی تھی۔ میں اس سے متاثر ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے متاثر ہوتی تھی۔ زندگی میں اچھے بُرے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں روپا دیدی اور بندیا کے قریب سے گزرتے وقت بچّہ تھا۔ ان سے حاصل ہونے والے تاثرات بہت ہلکے پھلکے اور بے ضرر تھے۔ ان دنوں میرے ذریعہ مانو کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

شعوری طور پر پہلا دھچکا اس وقت لگا، جب میں نے اسٹور روم میں نجو کی بتائی ہوئی کتاب پڑھی تھی۔ اسے پڑھ کر میں نے جو تاثر لیا، وہی مانو نے لیا۔ پھر بھی ہم دونوں سنبھل گئے تھے۔

ہماری دنیا میں ... نے والے خاصی تعداد میں ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ بدی سے دور رہے۔ وہ نیکی اور پارسائی کے باوجود کبھی اچانک ہی گمراہ ہو جاتا ہے۔ میں ثمینہ کے معاملے میں گمراہ ہوا تو مجھے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا مانو کو اب تک پہنچ رہا تھا۔

میں نے لاعلمی میں اسے تمام ممنوعہ مراحل سے گزارا تھا۔ میں تو عملاً ایک چلّو میں سیراب ہو گیا تھا۔ وہ سمندر میں ڈوب کر بھی پیاسی رہی تھی۔ اب وہ پیاس مجھ سے تقاضا کر رہی تھی کہ مجھے جلد از جلد اس کے پاس پہنچنا چاہیے۔ میں ہی اس کے درد کا درماں تھا۔ میں ہی اس کا مسیحا تھا۔

مانو نے خط میں یہی لکھا تھا۔ ”آ جاؤ۔ جتنی جلدی ممکن ہو۔ آ جاؤ۔ تمہیں آنے کی اجازت نہ ملے تو میری خاطر عارضی طور پر بغاوت کرو۔ جبراً چلے آؤ۔ جب ہماری شادی ہو جائے گی۔ کچھ وقت گزر جائے گا تو ہمارے بزرگوں کا غصّہ اُتر جائے گا۔ وہ تمہیں معاف کر دیں گے یا میرے ابّو کی طرح تمہیں بھی ذات برادری سے خارج کر دیں گے۔ سوچ لو۔ سمجھ لو۔ تمہیں کیا کرنا ہے؟“

میں نے مختصر سا جواب لکھ دیا۔ ”میں پر تول رہا ہوں۔ کسی بھی دن پہنچنے والا ہوں۔“

اور میں نے کمر کس لی۔ میرے پاس چار سو روپے تھے۔ ان دنوں ڈھاکا سے لاہور تک ہوائی جہاز کا کرایہ صرف دو سو پچیس روپے تھا۔ میں دوسرے ہی دن وہاں سے فرار ہو سکتا تھا لیکن اچانک ہی ایک رکاوٹ پیش آ گئی۔

گاہک۔ ”کیا کہا؟ ایک پونڈ مکھن کی قیمت اسی پنس؟ سڑک کے دوسری جانب جو دکان ہے وہاں ساٹھ پنس فی پونڈ کے حساب سے مکھن مل رہا ہے۔“

دکاندار۔ ”پھر آپ وہیں سے کیوں نہیں خرید لیتے؟“

گاہک۔ ”یقیناً وہیں سے لیتا لیکن کیا کروں اس دکان پر مکھن ختم ہو چکا ہے۔“

دکاندار۔ ”ٹھیک ہے، جب ہمارے ہاں مکھن ختم ہو جائے گا تو ہم بھی چالیس پنس فی پونڈ کا بھاؤ مقرر کر دیں گے۔“

مرسلہ: محمد طاہر مجاہد، میانوال رانجھا

میں نے مانو کا خط بہت سنبھال کر چھپا کر رکھا تھا۔ لیکن کتابوں کی میز کی صفائی کرتے وقت وہ خط امی کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے اسے پڑھا۔ ابّو کو پڑھوایا پھر وہ خط بھی تمام رشتے داروں کے درمیان گردش کرنے لگا۔

یہ ہلچل پیدا ہوئی کہ وہ لڑکی مجھے بغاوت پر اُکسا رہی ہے۔ مجھے گھر سے بھاگ کر لاہور آنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ کہا جا رہا تھا کہ کچرے میں پیدا ہونے والی کے دماغ میں کچرا بھرا ہے۔ وہ ایک شریف زادے کو اس کے ماں باپ کے خلاف بھڑکا رہی ہے۔ بزرگ کہہ رہے تھے کہ کلیم کا ذہن سازشی ہے۔ اسے ذات برادری سے خارج کیا گیا تھا۔ اب وہ انتقام لے رہا ہے۔ اپنی جوان بیٹی کے ذریعے شہاب الدین شریف کا گھر اُجاڑ رہا ہے۔

ابّو نے اور خاندان کے کئی بزرگوں نے کلیم چچا کو خطوط لکھے اور انہیں لعنت ملامت کی۔ میرے لیے یہ مشکل پیدا ہوئی کہ میں دوسرے دن گھر سے نہ نکل سکا۔ ابّو اور دوسرے رشتے دار میری نگرانی کرنے لگے تھے۔

انہوں نے میری تلاشی لی تو میرے بیگ سے چار سو روپے برآمد ہو گئے۔ انہوں نے وہ رقم ضبط کر لی۔ میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میری بدنصیبی نے مجھے مانو سے بہت دور کر دیا تھا۔

میں بعض اوقات بڑی حماقتیں کرتا ہوں۔ مجھے وہ رقم گھر سے کہیں باہر چھپا کر رکھنی چاہیے۔ میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب سر پکڑ کر رو رہا تھا۔ میرے اندر ایک ہی سوال چیخ رہا تھا کہ اپنی مانو کے پاس کیسے پہنچوں گا؟

میں جیسے پاگل ہو گیا۔ چیخنے چلانے لگا۔ ”مجھے جانے دیں۔ خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ میں نہ گیا تو وہ مر جائے گی۔“

یہ تو سب ہی چاہتے تھے کہ وہ مر جائے۔ میری دیوانگی میری مجبوری ان کے حق میں تھی۔ میں نے کھانا چھوڑ دیا لیکن مانو کے لیے زندہ رہنا تھا اس لیے پھر کھانے لگا۔

ابّو نے کہا۔ ”بھوکے پیاسے رہنے سے سارا عشق ناک کے رستے نکل جاتا ہے۔“

امی کسی عامل سے کالے جادو کا توڑ کرا رہی تھیں۔ ان سب کو یقین تھا کہ میرا عشق جلد ہی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

دو دن گزر گئے۔ میں پاگل ہو رہا تھا۔ نہانا دھونا، شیو کرنا بھول گیا تھا۔ لباس میلا ہو گیا تھا۔ ننگے پاؤں چلنے پھرنے لگا تھا۔ ابّو طنزیہ انداز میں کہتے تھے۔ ”ہم بھی دیکھتے ہیں، برخوردار کب تک مجنوں بن کر پھرتے رہیں گے۔“

ایک دوست اسد اللہ میرا رازدار تھا۔ اسی کے گھر کے پتے پر مانو نے مجھے خط لکھا تھا۔ وہ میرا ہمدرد تھا۔ میری حالت پر کڑھتا رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک سو اسّی روپے تھے۔ وہ مزید رقم حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں لگا تھا۔ ایک دن اس نے کہا۔ ”اور سو روپے مل ہی گئے۔ پورے دو سو اسّی روپے ہو گئے ہیں۔ جہاز کا ٹکٹ لینے کے بعد پچپن روپے بچیں گے۔ وہاں تمہارے کام آئیں گے۔“

وہ بول رہا تھا اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مانو تک پہنچنے کا راستہ پھر آسان ہو گیا ہے۔ مجھے پتا چلا کہ اس نے اپنی سائیکل، ریڈیو اور گھڑی بیچ کر مزید سو روپے حاصل کیے تھے۔ میں اسے گلے لگا کر فرطِ مسرت سے رونے لگا۔

اس وقت مجھے یہ کہاوت یاد آئی کہ اس کے نصیب اچھے ہوتے ہیں، جسے دوست اچھا ملتا ہے۔

میں نے اسی دن شیو کیا۔ نہا دھو کر صاف ستھرا لباس زیب تن کیا تو ابّو نے قہقہہ لگاتے ہوئے امی سے کہا۔ ”دیکھو بانو! ہمارے بیٹے کو عقل آ گئی ہے۔ مجنوں گیا۔ اب یہ انسان بن کر رہے گا۔“

امی نے کہا۔ ”میری کوششوں سے انسان بنا ہے۔ بنگالی بابا بڑے پہنچے ہوئے عامل ہیں انہوں نے کہہ دیا تھا، لڑکا دو دنوں میں سدھر جائے گا۔ دیکھ لیں۔ یہی ہوا ہے۔“

ابّو نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں بیٹے! غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ تم شرمندہ نہ ہونا۔ ہم نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔“

وہ سب خوش ہو رہے تھے اور میں چپ چاپ سر جھکائے انہیں خوش کر رہا تھا۔ میں نے دوسرے دن کالج جانے کے لیے اچھا سا لباس پہنا۔ ایک کتاب اور کاپی لی پھر گھر سے نکل پڑا۔

دن کے دس بجے لاہور کی فلائٹ تھی۔ اسد اللہ ٹکٹ کے ساتھ ایئرپورٹ پر میرا منتظر تھا۔ میں نے اس کے گلے لگ کر دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ پھر بورڈنگ کارڈ لینے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب جہاز میں بیٹھ گیا اور وہ پرواز کرنے لگا تو اطمینان ہوا۔ اب مجھے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ رب راضی تو سب راضی...

میں لاہور پہنچ گیا۔ رکشا والے نے مجھے گلبرگ کے علاقے میں چچا جان کی کوٹھی کے سامنے پہنچا دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس قدر امیر کبیر ہوں گے۔ باہر بڑے آہنی گیٹ پر ایک دربان تھا۔ ہرے بھرے باغ میں ایک مالی باغبانی میں مصروف تھا۔ ایک ملازمہ نے مجھے کوٹھی کے

دروازے پر پہنچا کر کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ پھر اونچی آواز میں کہا۔ ”بی بی جی! ڈھاکا سے مہمان آئے ہیں۔ آپ کے ابّو کو پوچھ رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد ہی وہ دروازہ ایسے کھلا جیسے کالی رات کے بعد صبح آنکھیں کھولتی ہے۔ اٹھارہ برس کی چلّہ کشی کے بعد وہ نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ میں اس کے حُسن و جمال کی تعریف نہیں کروں گا۔ وہ حسین و مہ جبین نہ ہوتی، تب بھی میری مانو ہی ہوتی۔

وہ بھی شاید مجھے پہچان رہی تھی۔ ایک ذرا بے چینی سے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”میں ہوں... فہیم!“

ایکدم سے اس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ وہ فرطِ مسرت سے چکرا کر گرنے والی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ میرے بازوؤں میں لرز رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں آ گیا ہوں اور وہ سچ مچ میرے ہاتھوں میں ہے۔

پھر وہ فوراً ہی الگ ہو کر ملازمہ سے بولی۔ ”تم جاؤ۔ آج چھٹی کرو۔“

وہ پلٹ کر جانے لگی۔ اس کے جاتے ہی اس نے دروازے کو ایک دھماکے سے بند کیا۔ اسے لاک کیا۔ پھر جیسے لپک کر آئی اور میری گردن میں بانہیں ڈال کر اک جان دو قالب ہو کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

ہمارے عشق نے ہمیں بہت ستایا تھا۔ ہم مایوس ہوتے رہے تھے کہ شاید کبھی مل نہیں سکیں گے اور ہماری محبت خواب و خیال بن کر رہ جائے گی۔

اب ہمارا یہ ملاپ جیسے معجزہ ہو گیا تھا۔ ایک طویل جدائی کے بعد خوابوں کی تعبیر مل رہی تھی۔ ویسے یہ تعبیر بھی خوابوں جیسی لگ رہی تھی۔ ذرا ٹھہر ٹھہر کر یقین ہونے والا تھا۔

میری آپا نے جو بلی پالی تھی، اس کا نام مانو تھا۔ وہ بالکل ایسی ہی نرم، ملائم اور گداز تھی۔ میرے بازوؤں کی گرفت میں سینے سے لگ کر دھڑک رہی تھی اور منہ زور جذبوں کی شدت سے لرز رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا وہ پنجے مار رہی ہے۔ اس کے ناخن میری گردن میں اور پشت میں پیوست ہو رہے تھے۔ اس کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ شاید اس پر دورہ پڑنے والا تھا۔

میں نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ پھر آگے میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا کمرا کہاں ہے؟ اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ بول نہیں پا رہی تھی۔

میں اسے اُٹھائے ہوئے چلتا رہا۔ اور بڑے پیار سے جنون کو تھپکتا رہا۔ آگے ایک کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہاں کچھ اور رشتے داروں کو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ تنہا ہے اور چچا جان بھی نہیں ہیں۔

آگے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس کے تپتے اور کانپتے ہوئے وجود کو اُٹھائے اندر آیا۔ وہ سچ مچ بلی تھی۔ اس نے میرے ایک بازو میں دانت گاڑ دیے۔ میں نے سسکاری سی لی۔ پھر دروازے کو لات مار کر بند کر دیا۔

☆☆☆

چچا جان پاکستان بننے سے پہلے ہی لاہور آ گئے تھے۔ وہ کاروباری ذہانت رکھتے تھے۔ انہوں نے دن رات محنت کی اور انارکلی میں ایک چھوٹی سی دکان کر لی۔ اب وہ چھوٹی سی دکان پھیل گئی تھی اور وہ لاکھوں کما رہے تھے۔

جب مانو دودھ پیتی بچی تھی، تب انہوں نے ایک آیا اس کی دیکھ بھال کے لیے رکھی تھی۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اس کی بہترین تربیت کے لیے ایک عالمہ کو گورنس کے طور پر رکھا تھا۔ وہ ننھی سی بچی کو سینے سے لگائے تنہا آئے تھے۔ آج بھی اس کے ساتھ تنہا رہتے تھے۔

کوئی قریب و دور کا رشتے دار نہیں تھا۔ چچا جان کے چند دوست احباب کاروباری حوالے سے تھے۔ کبھی غم اور خوشی کی تقریبات میں ان کی خواتین آتی جاتی رہتی تھیں۔ کراچی ان دنوں پاکستان کا دارالسلطنت تھا۔ چچا جان وہاں گئے ہوئے تھے۔

میں جس دن وہاں پہنچا، اسی دن کوٹھی میں ٹیلیفون کنکشن لگا تھا۔ چچا جان کراچی کے ایک آفس کا فون نمبر دے گئے تھے۔ مانو نے فون پر ان سے کہا۔ ”ابّو...! بہت بڑی خوش خبری ہے۔ فہیم آ گئے ہیں۔ آج ہی آئے ہیں۔ یہ لیں، پہلے ان سے بات کریں۔“

میں نے ریسیور کان سے لگا کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے خوش ہو کر دعائیں دیں۔ پھر پوچھا۔ ”بیٹے! کیسے آئے ہو؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“

میں نے کہا۔ ”پریشانیوں کا نہ پوچھیں۔ یہاں آنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ گھر سے بھاگ کر آیا ہوں۔“

”فکر نہ کرو۔ تم اپنے ہی گھر میں آئے ہو۔ بھائی جان ناراض ہوں گے کوئی بات نہیں۔ ہم انہیں رفتہ رفتہ منا لیں گے۔“

”وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ آپ نہیں جانتے، پورا

خاندان آپ کا دشمن بنا ہوا ہے۔"

"اللہ پر بھروسا رکھو۔ انشا اللہ تمام دشمن جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔"

"آپ کراچی سے کب آرہے ہیں؟"

"جی تو چاہتا ہے' ابھی آکر تمہیں پیار کروں لیکن کچھ کاروباری مجبوریاں ہیں۔ دو چار دنوں میں آنے کی کوشش کروں گا۔"

پھر مانو نے ریسیور لے کر ان سے باتیں کیں۔ وہ بہت خوش تھی۔ خوب چہک کر بول رہی تھی۔ "ابو... فہیم آگئے ہیں۔ یہ ایک ہی جوڑا پہن کر آئے ہیں۔ میں انہیں شاپنگ کے لیے لے جارہی ہوں۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔ اٹھارہ برس پہلے آپ نے مجھے سینے سے لگا کر تمام رشتے داروں کو چھوڑ دیا تھا۔ آج فہیم نے بھی میری خاطر یہی کیا ہے۔"

وہ بول رہی تھی اور خوشی سے اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ ادھر چچا جان کہہ رہے تھے۔ "میری دعا ہے' میری بیٹی سدا خوش نصیب رہے۔ میں آتے ہی تم دونوں کی شادی خانہ آبادی کے انتظامات کروں گا۔"

وہ بولی۔ "اور میری شادی کے بعد آپ کیا کریں گے؟ آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یاد ہے۔ بس اب فون بند کرو اور فہیم کو شاپنگ کے لیے لے جاؤ۔"

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔ "ہماری شادی کے بعد چچا جان کیا کریں گے؟"

وہ اپنا سر میرے سینے پر رکھتے ہوئے بولی۔ "وہ پورے پینتالیس برس کے ہوگئے ہیں۔ انہوں نے میری خاطر اب تک شادی نہیں کی ہے۔ میں ہمیشہ ضد کرتی رہتی ہوں۔ اپنی امی لانے کے لیے ان کے پیچھے پڑی رہتی ہوں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ میری شادی کے بعد ضرور ازدواجی زندگی گزاریں گے۔"

چچا جان نے واقعی ایک گود لی ہوئی بچی کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ اپنی برادری کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کی خاطر اپنی جوانی غارت کردی تھی۔ آئندہ مانو کو میری دلہن بنانے کے بعد شاید بڑھاپے کی راکھ سے جوانی کی چنگاریاں کریدنے والے تھے۔

میری زندگی کا نیا باب کھل رہا تھا۔ ہنستی کھلکھلاتی اور مسرتیں لٹاتی ہوئی مانو زندگی کو ایک نیا حسن اور نئی دلکشی دے رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ ائیر کنڈیشنڈ کار میں بیٹھ کر لاہور شہر دیکھ رہا تھا۔ مہنگی شاپنگ کررہا تھا۔ مہنگے ہوٹلوں میں لذیذ کھانے کھا رہا تھا اور تاریخی مقامات کی سیر کررہا تھا۔

مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ دولت ہو اور محبت کرنے والی بھی ہو تو یہی مصائب سے بھری ہوئی دنیا جنت بن جاتی ہے۔

ایسی بات نہیں تھی کہ میں ہونے والی بیوی کی دولت پر عیش کررہا تھا۔ حقیقتاً چچا جان کی کمائی پر مانو سے زیادہ میرا حق تھا۔ کیونکہ وہ میرے سگے چچا تھے۔ ہم سب ایک ہی دادا کی اولاد تھے۔ ہمارا آپس میں لہو کا رشتہ تھا۔ مجھ پر یہ الزام نہیں آسکتا تھا کہ میں سسرال کی کمائی کھانے آیا ہوں۔

انہوں نے مجھے فون پر کہا۔ "بیٹے! بھائی جان اور تمام رشتے دار تمہارے لاپتا ہونے سے پریشان ہوتے رہتے۔ اس لیے میں نے خط لکھ دیا ہے کہ تم میرے پاس آگئے ہو اور یہاں خیریت سے ہو۔ میں نے خط میں فون نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ وہ کسی دن تم سے فون پر بات کرسکتے ہیں۔"

ویسے مجھے گھر والوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ابو فون پر زیادہ سے زیادہ غصہ دکھا سکتے تھے۔ مجھے جبراً یہاں سے لے جا نہیں سکتے تھے۔ اور میں کوئی بچہ نہیں تھا' بالغ تھا۔ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق رکھتا تھا اور اس سلسلے میں چچا جان قانونی طور پر میری مدد کرنے والے تھے۔

میرے لاہور آنے کے بعد امی اور ابو کس قدر پریشان ہوئے' یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ میں ان کا مختصر سا ذکر کررہا ہوں۔

میں امی اور ابو کے سامنے ایک کتاب اور کاپی لے کر کالج جانے کے لیے نکلا تھا۔ وہ مطمئن تھے۔ جب میں دوپہر کو گھر نہیں آیا تو وہ پریشان ہوئے۔ ابو نے شام کو میرے دوستوں کے گھروں میں جاکر پوچھا۔ اسد اللہ نے اور دوسرے دوستوں نے میرے متعلق لاعلمی ظاہر کی۔ رات ہوئی تو انہیں یقین ہوگیا کہ قیس لیلیٰ کی محمل کے پیچھے گیا ہے۔

وہ سب تدبیر سوچنے لگے۔ لیکن عقل کام نہیں کررہی تھی کہ گھر سے بھاگنے والے کو کیسے واپس لایا جائے؟ پھر انا اور ضد کہہ رہی تھی کہ کلیم کو ہر حال میں واپس لانا ہے اور اس لڑکی پر کیچڑ اُچھالنے کی انتہا کردینی ہے۔

انہیں دو دنوں کے بعد کلیم چچا کا خط ملا۔ انہوں نے ابو کو لکھا تھا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ فہیم ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں آیا ہے۔ آپ اسے معاف کردیں۔ وہ بہت جلد بہو کو لے کر آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوجائے گا۔"

اس خط میں فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ ان دنوں ٹیلیفون کی سہولت نہیں تھی۔ عام لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر فون کرنے کے لیے کال بک کرانے جنرل پوسٹ آفس جاتے

تھے۔ ایسی کالیں مہنگی پڑتی تھیں۔ اس کے سوا رابطے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

ابو نے کئی بزرگوں کے ساتھ جنرل پوسٹ آفس میں آکر کال بک کرائی پھر تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد ہماری کوٹھی کے فون سے رابطہ ہوگیا۔ مانو نے ریسیور کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو۔ فرمایئے؟"

دوسری طرف سے ابو نے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کلیم سے بات کراؤ۔"

"آپ کون ہیں؟ خوامخواہ غصے میں بول رہے ہیں۔ میرے ابو گھر میں نہیں ہیں۔"

"اچھا تو وہ تمہارا باپ ہے۔ تم وہی لڑکی ہو۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میں کون لڑکی ہوں؟"

"وہی جسے پیدا ہوتے ہی کچرے میں پھینک دیا گیا تھا۔"

"محترم! اس وقت آپ کی زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے ہیں' کچرا نکل رہا ہے۔ آپ اچھی طرح برش کریں پھر خوب کُلّیاں کریں۔"

"بکواس مت کرو۔ وہاں فہیم ہے۔ اس سے بولو' اپنے باپ سے بات کرے۔"

وہ ایکدم سے پریشان ہوکر بولی۔ "او گاڈ! آپ بڑے ابو ہیں؟ ہم۔ میں۔ معافی چاہتی ہوں۔ ابھی فہیم کو بلاتی ہوں۔"

اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر آواز دی۔ "فہیم جلدی آؤ۔ تمہارے ابو کی کال ہے۔"

میں غسل سے فارغ ہوکر باتھ روم سے نکل رہا تھا۔ ابو کا نام سنتے ہی دوڑتا ہوا فون کے پاس آیا۔ پھر مانو سے ریسیور لے کر کان سے لگا کر ہیلو کہا تو پتا چلا' کال ختم ہوگئی ہے۔

ابو نے چند منٹ کی کال بک کرائی تھی۔ وہ مقررہ وقت ختم ہوگیا تھا۔ مانو نے بتایا کہ انہوں نے غصہ دکھانے میں کال ضائع کردی ہے۔ پہلے ہی اپنا نام بتادیتے یا کہہ دیتے کہ فہیم سے بات کرنی ہے تو بیٹے سے خاصی باتیں ہوجاتیں۔

وہ مایوس ہوکر بولی۔ "تمہارے ابو اور سب ہی خاندان کے لوگ مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ نفرت کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔ کیا اتنی سی بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ میں مظلوم ہوں اور مجھے پیدا کرنے والے گناہگار ہیں؟"

"بعض اوقات دنیا والے سیدھی سی بات نہیں سمجھتے۔ کس کس کو سمجھائیں کہ تمہیں محبت نہیں دیتے' نہ دیں۔ نفرت تو نہ کریں لیکن کریں گے۔ جبکہ تمہاری ذات سے آج تک کسی کو نقصان نہیں پہنچا ہے۔"

مانو نے کہا۔ "اب پہنچ رہا ہے۔ میں ان کی مرضی کے خلاف تمہیں ان سے چھین رہی ہوں۔"

"میں کوئی چھیننے جھپٹنے والی چیز ہوں کہ جو چاہے مجھے اُٹھا کرلے جائے؟ میں لاکھ قسمیں کھا کر کہوں گا کہ میں اپنے دل سے اور محبت سے تمہارا اسیر ہوں تو کوئی نہیں مانے گا۔ انہیں تم سے شدید نفرت کرنے کا بہانہ مل گیا ہے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ڈھاکا سے کال ہے۔ ہولڈ آن۔"

"تھوڑی دیر بعد ابو کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون بول رہا ہے؟"

میں نے سلام کیا۔ انہوں نے جواباً کہا۔ "مردود! حرام خور! تم نے ماں باپ کی محبت کا یہ صلہ دیا ہے؟ وہ کمینہ کلیم آستین کا سانپ ہے۔ میں اسے..."

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ میرے ابو ہیں' مجھے ہزار گالیاں دیں لیکن چچا جان [illegible] لیے گالیاں نہ نکالیں۔ آپ دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ ان کو دی جانے والی گالی آپ کو بھی پڑے گی۔"

"بکواس مت کرو۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

"فون پر یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ پھر کال کا وقت ضائع کررہے ہیں۔"

وہ ذرا دھیمے پڑ گئے۔ "میں نے آدھے گھنٹے کی بکنگ کرائی ہے۔ تمہیں محبت سے سمجھاتا ہوں' پہلی فلائٹ سے واپس آجاؤ ورنہ تمہیں رسیوں سے باندھ کرلے آؤں گا۔"

"آپ آئیں گے اور ناکام ہوکر جائیں گے۔ میں ادب سے احترام سے عرض کرتا ہوں' آپ امی کے ساتھ آئیں اور میری شادی خانہ آبادی میں شریک ہوکر مجھ کو اور بہو کو دعائیں دیں۔"

انہوں نے غصہ سے بھڑک کر مانو کو گالی دی۔ میں نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر فون بند کردیا۔ مانو نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "فون گالیاں دینے اور گالیاں سننے کے لیے نہیں ہے۔"

ابو کا رویہ ظاہر کررہا تھا کہ خاندان کے تمام لوگ مانو اور چچا جان کے اور زیادہ دشمن ہوگئے ہیں۔ وہ مانو کو رشتہ دار بنانے کے معاملے میں کبھی سمجھوتا نہیں کریں گے۔

میں پریشان ہوکر سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ مانو نے

میرے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مانو۔۔۔! ہم یہاں کتنے خوش ہیں۔ یہ اچانک ہی ہمیں پتھر مارے جا رہے ہیں۔ کیا ہم لہو لہان ہو کر خوش رہ سکیں گے؟“

”خوش بختی اور بدبختی آگے پیچھے چلتی رہتی ہیں اور ہمیں ان کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہی نظر آ رہا ہے۔ ہم ہنستے کھیلتے مخالفتوں سے لڑتے رہیں گے۔“

حالات کے بچھو ڈنک مار رہے تھے اور ہم مسرتوں کو بچھونا کر رہے تھے۔ تین دنوں سے ہمارا وقت شبِ برات اور عید کی طرح گزر رہا تھا۔ حقیقتاً ہم غلطی کر رہے تھے اور ایسے وقت نمازیں بھی پڑھ رہے تھے۔ دعائیں بھی مانگ رہے تھے کہ ہماری مسرتیں سلامت رہیں۔

ایسا اکثر ہوتا ہے کہ انسان کو کھلی غلطیاں کرتے وقت ان غلطیوں کا احساس نہیں ہوتا یا وہ پروا نہیں کرتا۔ ہم شادی سے پہلے صریح گناہ کے مرتکب ہو رہے تھے اور خود کو یہ سمجھا رہے تھے کہ دو چار دنوں کی بات ہے پھر ہمارا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ ابھی ہماری غلطی کوئی دیکھنے نہیں آ رہا ہے۔

گناہ کا ارتکاب کرتے وقت یہ چند باتیں حوصلہ دیتی ہیں کہ۔۔۔۔

مانو یہ کہتی آئی تھی کہ جو غلطی اس کے نامعلوم والدین نے کی تھی وہی غلطی وہ کبھی نہیں کرے گی۔ میں نے بھی یہی عہد کیا تھا لیکن ثمینہ کے ساتھ بہک گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مانو کے اندر شیطانی جذبات بھڑکا دیے تھے۔ اسے ہسٹیریا کی مریضہ بنا دیا تھا۔

اب وہ مریضہ یہ کہنے میں حق بجانب تھی کہ غلطی نہیں کر رہی ہے۔ علاج کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ لیکن کسی مرحلے پر گناہ علاج بن جائے تو دین ایسے علاج کی اجازت نہیں دیتا۔

چچا جان کراچی سے آ گئے۔ انہوں نے مجھے گلے لگا کر میری پیشانی کو چوما۔ مجھے دعائیں دیں اور کہا کہ آج انہیں ایک بیٹا مل گیا ہے۔ بڑھاپے کی ساری فکر اور پریشانیاں ختم ہو گئی ہیں۔

مانو نے انہیں فون پر بتایا تھا۔ ”ڈھاکا سے بڑے ابو نے فون کیا ہے۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ یہاں آ کر فہیم کو جبراً لے جائیں گے۔ وہ شاید جلد ہی آنے والے ہیں۔“

چچا جان نے ہمیں تسلی دی۔ ”بھائی جان یہاں آئیں گے تو انہیں محبت سے منا لیں گے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ فہیم میرے لاکھوں روپے کا کاروبار سنبھال رہا ہے تو وہ بیٹے کے بہترین مستقبل کی خاطر مجھ سے عداوت بھول جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے باوجود وہ مانو کو بہو بنانے سے انکار کرتے رہیں گے۔ آپ نے اٹھارہ برس پہلے مانو کو ہمارے خاندان میں داخل کرنا چاہا تھا اور سب نے انکار کیا تھا۔ وہ انکار، وہ ضد اور وہ غرور آج بھی قائم ہے۔“

”جب میری بیٹی تمہاری دلہن بن جائے گی تو کوئی یہاں لڑنے نہیں آئے گا۔ بھائی جان تمہیں یہاں سے زبردستی نہیں لے جاسکیں گے۔“

انہوں نے بیٹی کو بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں جلد سے جلد تم دونوں کا نکاح پڑھاؤں گا۔ نکاح آج بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو چند منٹ میں ہو جاتا ہے لیکن یہاں تاجر برادری سے میرے گہرے کاروباری تعلقات ہیں۔ یہاں سے کراچی تک درجنوں خاندان ایسے ہیں، جنہیں اپنی خوشیوں میں شریک کرنا لازمی ہے۔ ہماری سماجی حیثیت کے مطابق دھوم دھام سے شادی کرنی ہوگی۔“

چچا جان نے دوسرے دن کہا۔ ”میں اس نیک کام میں دیر نہیں کرنا چاہتا۔ میرے دوست کہہ رہے ہیں، ایک ہفتہ کے اندر شادی دھوم دھام سے ہو سکتی ہے۔ کل دعوتی کارڈز چھپ کر آ جائیں گے۔ تم دونوں کا نکاح اگلے جمعہ کو پڑھا دیا جائے گا۔“

ہماری منزل اور قریب آ گئی۔ اسی دن ابو نے فون پر اپنا رویہ بدل دیا۔ ایسی نرمی سے بات کی کہ چچا جان حیران رہ گئے۔ ابو نے کہا۔ ”یہ پرانی کہاوت ہے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟ جب میرا بیٹا اور تمہاری بیٹی ایک دوسرے سے راضی ہیں تو ہمارا غصہ دکھانا سراسر نادانی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ ان کی شادی کب ہو رہی ہے؟ میں اس کی ماں کے ساتھ آؤں گا۔“

چچا جان خوشی سے اُچھل پڑے۔ انہوں نے کہا۔ ”بھائی جان میں بیان نہیں کر سکتا کہ آپ مجھے کیسی چونکا دینے والی خوشیاں دے رہے ہیں۔ آپ میری بیٹی کو بہو کی حیثیت سے قبول کر کے خاندان میں میرا کھویا ہوا مان مرتبہ بحال کر رہے ہیں۔“

انہوں نے بتایا کہ اسی ماہ کی پندرہ تاریخ کو ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔ ابو نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ ہماری شادی سے دو دن پہلے میری امی کے ساتھ لاہور آئیں گے۔ خاندان کے کچھ اور بزرگ بھی آنے والے ہیں۔

ہم نے کبھی نہیں سنا تھا کہ پہاڑ جھک جاتے ہیں اور دریا اُلٹا بہنے لگتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا مگر ہو رہا تھا۔ ہماری خوشیوں کو پر لگ گئے تھے۔ ہم آسمان کی نامعلوم بلندیوں میں پرواز کر رہے تھے۔

دوسرے دن چچا جان مجھے اپنے ساتھ راوی پار لے گئے۔ انہوں نے بارہ دری میں ایک جگہ بیٹھ کر کہا۔ ”بیٹے! میں تم سے ایک اہم بات کہنا چاہتا ہوں۔ آج سے چوتھے دن تم میرے داماد بن جاؤ گے۔ میرا کاروبار سنبھالو گے۔ میرے بعد سب کچھ تمہارا ہی ہوگا۔ یوں بھی تم میرے صرف داماد نہیں رہو گے۔ اس سے پہلے تم میرے بھتیجے ہو، میرے سگے بھائی کے بیٹے ہو۔“

وہ ذرا چپ ہوئے پھر بولے۔ ”ایک راز میں نے کسی کو نہیں بتایا، یہ تمہیں بتا رہا ہوں۔“

وہ پھر چپ ہوئے۔ آگے کہتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”آپ مجھ پر بھروسا کریں۔ میں آپ کے راز کا امین رہوں گا۔“

انہوں نے مجرموں کی طرح سر جھکا کر کہا۔ ”مہرُن۔۔۔ مہر النسا۔۔۔ تمہاری مانو۔۔۔ میری بیٹی ہے۔ میرا اپنا لہو ہے۔“

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ انہوں نے کہا۔ ”اس کی ناجائز پیدائش کا ذمے دار میں ہی ہوں۔“

میں حیرانی سے ان کا منہ تکنے لگا۔ حیرانی اس لیے تھی کہ وہ بچپن ہی سے صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ جوانی میں ان کے خلاف کوئی اسکینڈل نہیں تھا۔ وہ عورتوں کے روبرو نظریں جھکا لیا کرتے تھے۔ ہمارے خاندان کے بزرگ ان سے شاکی اور نالاں رہنے کے باوجود ان کی شرافت اور ایمانداری کی قسمیں کھاتے تھے۔

جب وہ ننھی سی مانو کو تھانے والوں سے لے کر اسے سینے سے لگا کر گھر کے دروازے پر آئے تو ابو نے اور خاندان کے دوسرے بزرگوں نے کہا کہ غلاظت کو باہر پھینک کر آؤ۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ غلاظت ان کی ہے۔ کسی نے ان کے چال چلن پر شبہ نہیں کیا تھا۔

میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے کہہ رہے تھے۔ ”وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ دریائے ہگلی میں ان کے کئی اسٹیمرز چلتے تھے۔ برٹش سرکار کے مال کو سمندری اور دریائی راستوں سے لانے اور لے جانے کے ٹھیکیدار تھے اور میں بڑے صاحب جان فورڈ کے مال گودام کا منشی تھا۔

”ایک دن ڈولی نے مجھے دیکھا تو مجھ میں دلچسپی لینے لگی۔ اس نے کہا۔ ”میں کلیم کے ساتھ دریا کی سیر کروں گی

اور آج سے یہ گودام میں ڈیوٹی نہیں کرے گا۔ ہمارے بنگلے کے گیسٹ ہاؤس میں رہا کرے گا۔"

باپ نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم بوٹ میں جا کر بیٹھو۔ یہ ابھی گودام کا حساب دے کر تمہارے پاس آئے گا۔"

وہ بوٹ کی طرف چلی گئی۔ اس کے باپ نے پریشان ہو کر مجھ سے کہا۔ "بے بی ذہنی مریضہ ہے۔ پچھلے دو برسوں تک زیر علاج رہنے کے بعد نارمل ہوئی ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ اسے کسی بات پر غصہ نہ آئے۔ یہ ابنارمل ہوتی ہے تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

میں نے وعدہ کیا۔ "سر! میں بے بی کے مزاج کا خیال رکھوں گا۔ اسے شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

وہ بہت اچھی تھی۔ اچھی باتیں کرتی تھی۔ کسی پہلو سے دماغی مریضہ نہیں لگتی تھی۔ لیکن وہ پہلے ہی دن مجھ میں ایسی دلچسپی لینے لگی کہ میں گھبرا گیا۔ بنگلے کے پیچھے ایک گیسٹ ہاؤس تھا۔ مجھے وہاں رہنے کا حکم دیا گیا۔ میں نے صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے ڈولی کی خدمت کے لیے رکھا گیا ہے۔ لیکن میرا ایمان ڈگمگا جائے گا۔

صاحب میری شرافت اور سچائی کا معترف تھا۔ اس نے بیٹی کو سمجھایا کہ کلیم ایک ملازم ہے۔ اس سے فاصلہ رکھا کرو۔ بیٹی نے صاف صاف کہہ دیا۔ "کلیم مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں اس سے شادی کروں گی۔"

"نہیں بے بی! وہ ہمارے اسٹیٹس کا نہیں ہے اور کرسچن بھی نہیں ہے۔ ایک انڈین سرونٹ ہے۔ ڈاکٹر نے تمہیں سمجھایا ہے کہ کبھی بے جا مطالبہ نہ کرو۔ کبھی بے جا ضد نہ کرو۔ تم باپ کی جان ہو میں تمہاری ہر جائز اور مناسب ضد پوری کروں گا۔"

"ٹھیک ہے اس سے شادی نہیں کروں گی۔ مگر اس سے دوستی کر سکتی ہوں۔ دوست بن کے تو پیار کر سکتی ہوں۔"

جان فورڈ اُلجھن میں پڑ گیا۔ اس نے سوچا' فی الحال مجھے اس سے دور کر دیا جائے۔ ڈولی میرے نہ ہونے پر روئے گی' ضد کرے گی تو اسے سمجھا منا لیا جائے گا۔ میں ایک ہندوستانی تھا۔ ایک غلام قوم کا فرد سمجھا جاتا تھا اور وہ ایک غلام سے اپنی بیٹی کا عشق برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے مجھے ایک ماہ کی تنخواہ دے کر کہا۔ "ابھی جاؤ۔ چھٹی کرو۔ تم بہت اچھا آدمی ہے۔ ہمارا بے بی کو بے بی سمجھتا ہے۔ تمہارا ضرورت ہوگا تو ہم بلائے گا۔ آج سے بے بی کے سامنے مت آؤ۔"

میں گیسٹ ہاؤس چھوڑ کر چلا گیا۔ ڈولی نے مجھے نہ پا کر اپنی ممی اور ملازموں سے پوچھا کہ میں کہاں ہوں؟ مجھے ڈھونڈ کر لایا جائے۔ انہوں نے صاحب کے حکم کے مطابق جواب دیا کہ کلیم اچانک ہی ملازمت چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

وہ غصے سے چیخ پڑی۔ "یہ جھوٹ ہے۔ کلیم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اسے بلاؤ۔ ابھی بلاؤ۔ نہیں تو میں..."

اس نے ایک پتھر اُٹھا کر پھینکا تو کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ تمام ملازم اس سے دور بھاگنے لگے۔ اس نے ماں کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا پھر دوڑتی ہوئی بنگلے کے اندر آ کر چیخنے لگی۔ گھر کا سامان توڑنے اور پھینکنے لگی۔ وہ دھیرے دھیرے خطرناک حد تک ابنارمل ہو رہی تھی۔ اسے بڑی مشکلوں سے قابو کیا گیا۔ تب تک وہ بیہوش ہو گئی۔

اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "میں نے سمجھایا تھا کہ اسے غصہ نہ دلایا جائے۔ میں علاج تو کروں گا۔ لیکن یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ کب تک نارمل ہو سکے گی۔"

وہ ہوش میں آنے کے بعد چوبیس گھنٹوں تک حواس باختہ رہی۔ اس کی یادداشت کمزور ہو گئی تھی۔ اس نے دوسرے دن خود کو پہچانا۔ اپنے والدین کو دیکھا تو میں اس کے تصور میں آیا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "کلیم... !کلیم کہاں ہے۔ اس کو بلاؤ... کلیم!"

وہ مجھے پکارتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی ماں اور نرس نے اسے زبردستی بستر پر لٹایا۔ نرس تسلیاں دے رہی تھی کہ ابھی کلیم کو بلایا جائے گا۔ ڈاکٹر نے صاحب سے پوچھا۔ "یہ کلیم کون ہے اسے بلاؤ۔"

جان فورڈ نے ڈاکٹر کو ایک طرف لے جا کر حقیقت بتائی۔ "ڈاکٹر! کلیم ایک غلام طبقے کا فرد ہے۔ بے بی اسے بوائے فرینڈ بنائے رکھنے کی ضد کر رہی ہے۔ ہم حکمران ہیں۔ بے بی کی نادانی سے یونین جیک (برطانیہ کا پرچم) کی توہین ہوگی۔"

ڈاکٹر نے سر گھما کر ڈولی کو دیکھا' وہ چیخیں مارتے مارتے' کلیم کو پکارتے پکارتے پھر بیہوش ہو گئی تھی۔ وہ فوراً ہی اسے اٹینڈ کرنے لگا۔

ڈولی کے ماں باپ ایک طرف کھڑے تشویش میں مبتلا تھے۔ وہ ایک ہی بیٹی تھی اور ان کا خیال تھا کہ وہ خوش بخت ہے۔ جب سے پیدا ہوئی تھی' باپ کو عروج حاصل ہو رہا تھا۔ وہ برطانیہ سے ہندوستان آ کر پانی کے راستے برٹش سرکار کی مال برداری کا بہت بڑا ٹھیکیدار بن گیا تھا۔

ڈاکٹر نے آدھے گھنٹے بعد انہیں اپنے چیمبر میں بلا کر

کہا۔ "ڈولی نادان ہے' ابنارمل ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ اپنی سطح سے نیچے کسی کو بوائے فرینڈ بنا رہی ہے اور ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وہ انڈین ہی اسے نارمل رکھ سکے گا۔ وہی اس کی پہلی اور آخری دوا ہے۔"

ڈاکٹر نہ کہتا تب بھی ماں باپ اس حقیقت کو سمجھ رہے تھے۔ ان کے اندر سب سے اہم سوال چیخ رہا تھا' کیا وہ بیٹی کو ایسی دوا دے سکتے ہیں' جو اسے تو سلامت رکھے مگر ان کی ناک نیچی کر دے؟

وہ ڈاکٹر اُن صاحب کا رشتہ دار بھی تھا اور راز دار بھی اس نے پوچھا۔ "یہ آپ کی ایک ہی بیٹی ہے۔ کیا یہ چاہیں گے کہ وہ ہمیشہ کے لیے پاگل ہو جائے یا مر جائے؟"

ماں نے تڑپ کر کہا۔ "نہیں۔ بچی سے پہلے میں مر جاؤں گی۔"

باپ نے کہا۔ "بے بی ہماری جان ہے۔ ہم ہر حال میں اپنی جان کی سلامتی چاہیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تو پھر وہ دوا کہاں ہے؟ اسے یہاں لے آئیں۔"

فورڈ نے کہا۔ "میرے ذہن میں یہی سوال تھا' کیا ہم رازداری سے بے بی کی ضد پوری کر سکتے ہیں؟"

"اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہی کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں دو ہی رکاوٹیں ہیں۔ ایک خوف خدا کہ وہ دیکھ رہا ہے' لہٰذا گناہ سرزد نہ ہو اور دوسرا قانون۔"

گناہگار قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنا جانتے ہیں۔ یہ طے کیا گیا کہ مجھے بنگلے کی چار دیواری میں ڈولی کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر کبھی بھید کھلنے کا اندیشہ ہوگا تو سب سے پہلے مجھے گولی مار دی جائے گی۔ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ ایک انڈین کالے آدمی نے گورے یونین جیک پر دھبا لگایا ہے۔

مجھے اعتراض کرنا چاہیے تھا' نہ کر سکا۔ ایک غلام قوم کا فرد بھلا کیا کر سکتا ہے۔ مجھے بنگلے کے ہی ایک کمرے میں قید کر دیا گیا۔ باہر ایک مسلح گارڈ موجود رہتا تھا۔ انہوں نے بیٹی سے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ صرف اس کمرے میں مجھ سے محبت کرے گی اور میرے ساتھ کہیں باہر جائے گی تو مجھے ایک باڈی گارڈ بنا کر فاصلہ رکھے گی۔

میں ایک قیدی بھی تھا اور ڈولی کی محبت پانے والا خوش نصیب معشوق بھی تھا۔ وہ تو مجھے جیسے روح کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ اس کے پیار اور دیوانگی سے ایسا لگ رہا تھا کہ ہم تا حیات کبھی جدا نہیں ہوں گے۔

جان فورڈ ایک صیاد تھا۔ اس نے مجھے باندھ رکھا تھا اور مجبوراً میرا وجود برداشت کر رہا تھا۔ ایک بار مجھے اس سے جدا کر کے دیکھ چکا تھا کہ وہ ابنارمل ہو جاتی ہے۔ وہ اسے پاگل ہوتے اور ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہوتے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

بہر حال وہ نارمل رہنے لگی۔ پہلے کچھ صحت مند ہوئی پھر کچھ زیادہ ہی صحت مند ہو گئی۔ پیٹ نکل آیا۔ ماں نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

ماں کی لاعلمی درست تھی۔ چار ماہ میں پیٹ واضح نہیں ہوتا۔ ایک دن اس کی کمر میں تکلیف تھی۔ ماں نے کمر سہلانے کے لیے ہاتھ لگایا تو انکشاف ہوا۔ ڈولی نے کہا۔ "مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تم نہیں دیکھ رہی ہو کہ میں موٹی ہو رہی ہوں؟"

وہ بچگانا ذہن سے یہ سمجھ رہی تھی کہ موٹی ہو رہی ہے۔ اس کے باپ کو معلوم ہوا تو وہ مجھ پر گرجنے لگا۔ "یو بلڈی فول! تم بچہ نہیں ہے۔ تم ہم کو پہلے کیوں نہیں بولا؟"

میں نے کہا۔ "آپ روز بے بی کو دیکھتے ہیں۔ میں نے سوچا' آپ جہاں دیدہ ہیں' خود ہی سمجھ رہے ہیں۔ یہاں جو ہوتا رہا اور اس کا جو انجام ہونا تھا' وہی ہو رہا ہے۔"

وہ مجھے دونوں ہاتھوں سے مارنے لگا۔ میں چپ چاپ مار کھانے پر مجبور تھا۔ وہاں ایک مسلح گارڈ مجھے گن کے نشانے پر لیے کھڑا تھا۔ وہ مارتے مارتے تھک کر گارڈ سے بولا۔ "عالی! اس کو باندھ کے دور لے جاؤ اور گولی مار کے پھینک دو۔"

گارڈ کا نام کرامت علی تھا۔ صاحب اسے عالی کہتا تھا۔ وہ مجھے رسیوں سے باندھ کر ایک بند گاڑی میں ڈال کر وہاں سے لے جانے لگا۔ ڈولی اس وقت ماں کے کمرے میں سو رہی تھی۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

میں نے کئی بار اسے سمجھایا تھا۔ "میرے لیے بے جا ضد نہ کیا کرو۔ اگر میں کبھی کسی کام سے چلا جاؤں تو انتظار کرو۔ مجھے آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔ لیکن بھروسا رکھنا میں آؤں گا۔ ابنارمل کبھی نہ ہونا۔"

اس نے وعدہ کیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میری موت کے بعد وہ ایک عرصے تک' کم از کم ماں بننے تک میرا انتظار ضرور کرے گی۔ خود کو سنبھالے گی۔ ابنارمل نہیں ہوگی۔

میں ایک بند گاڑی کی اگلی سیٹ پر رسیوں سے بندھا بیٹھا ہوا تھا۔ کرامت علی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہم دریائے ہگلی کے ساحلی راستے پر جا رہے تھے۔ شہری آبادی پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کس طرح راستے بدل کر جا رہا

ہے اور مجھے کتنی دور لے جانے کے بعد موت کے گھاٹ اُتارنے والا ہے۔ میرے منہ میں کچھ کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ میں کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

پھر میں نے حیرانی سے دیکھا۔ بہت دور دھیمی دھیمی سی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ مجھے کسی ویرانے کی طرف لے جانے کے بجائے چھوٹی سی آبادی کی طرف لے جارہا تھا۔

اس نے اچانک ہی ایک بڑا سا چاقو نکال کر اسے کھولا۔ گاڑی روک دی پھر اس نے میرے ہاتھوں کی رسّی ایک جھٹکے سے کاٹ دی۔ میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''آگے سترہ گاچھی کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ وہاں سے ٹرینیں گزرتی رہتی ہیں۔ یہاں سے دور چلے جاؤ۔ واپس کبھی نہ آنا۔ صاحب کی نظروں میں آؤ گے تو تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔''

میں نے شکر گزاری اور عقیدت سے اس کے گھٹنوں کو چھولیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ گورے آقا ہمیں جانوروں سے بدتر سمجھتے ہیں۔ خود کمینگی کرتے ہیں اور سزا ہمیں دیتے ہیں۔ میں آنکھوں سے دیکھتا آرہا ہوں کہ انہوں نے تمہیں قیدی بنا کر رکھا تھا اور اپنی بیٹی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔''

وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں اسٹیشن تک پہنچا کر چلا جاؤں گا۔ میرے پاس صرف تیس روپے ہیں۔ انہیں رکھو۔''

میں نے کہا۔ ''میں صرف بارہ آنے میں کھڑگ پور پہنچ جاؤں گا۔ میرے لیے صرف دو روپے کافی ہیں۔''

اس نے مجھے پانچ روپے دیتے ہوئے کہا۔ ''کھڑگ پور میں تمہارا گھر ہے اور رشتے دار ہیں۔ وہاں نہ جاؤ۔ کبھی بھید کھلے گا کہ تم زندہ ہو تو صاحب کے آدمی سیدھے وہاں پہنچیں گے۔''

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کے مشورے پر عمل کروں گا پھر اس سے کہا۔ ''میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ میری ایک التجا سنو گے؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میرا بچہ... وہ میرے بچے کو جنم دینے والی ہے۔ وہ ظالم اسے بھی مار ڈالنا چاہیں گے۔ تم نے جس طرح مجھے بچایا ہے کیا اسے بھی بچا سکو گے؟''

وہ بولا۔ ''میں نے صرف کوشش کی ہے، مدد مولا نے کی ہے۔ دعا کرتے رہو۔ میں کوشش کروں گا۔ بچانے والا صرف اللہ ہے۔''

میں وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر کھڑگ پور کے ڈسٹرکٹ مدنا پور چلا گیا۔ کرامت علی کو وہاں کا پتا بتا دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ بچے کے متعلق کوئی اہم بات ہوگی تو وہ مجھے اطلاع دے گا۔

میرے دل میں ایک پھانس گڑ گئی تھی۔ میرے گناہ کی سزا ایک معصوم بچے کو ملنے والی تھی۔ دنیا میں آتے ہی اس سے سانسیں چھین لی جانے والی تھیں۔ میں بہت شرمندہ تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی؟ جو بھی ہو مجھے اس کی سلامتی عزیز تھی۔

ڈولی کے ماں باپ ظالمانہ پلاننگ کر چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بیٹی کی زچگی بڑی رازداری سے ہو اور زچگی تک کوئی اس کا پیٹ نہ دیکھے۔ انہوں نے اسے دنیا والوں سے چھپانے کے لیے کھڑگ پور کے ایک بنگلے میں اپنی بہن کے پاس پہنچا دیا۔

صاحب کے کئی مسلمان اور ہندو کارندوں کو مجھ سے ہمدردی تھی۔ وہ ایسا دور تھا کہ تمام ہندوستانی انگریزوں سے نفرت کر رہے تھے۔ کرامت علی نے ایک کارندے رام دیال کے ذریعے اطلاع دی کہ ڈولی کو زچگی کے لیے کھڑگ پور کے ایک بنگلے میں بڑی رازداری سے پہنچایا گیا ہے۔ علی نے چٹھی لکھی تھی۔ ''کلیم! تمہاری ڈولی کے ساتھ جو دائی ماں ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ تمہیں جانتی ہے اور تم سے پیار کرتی ہے۔

ایک بار وہ بہت بیمار ہوئی تھی۔ شہر میں کرفیو لگا تھا۔ کوئی گاڑی نہیں چل رہی تھی۔ تم نے اسے بازوؤں میں اُٹھا کر اسپتال پہنچایا تھا۔ جب تک کرفیو رہا تم اسپتال میں رہ کر اس کی تیمارداری کرتے رہے۔ اب اللہ نے چاہا تو تمہیں نیکی کا پھل ملے گا۔ وہ کہہ رہی ہے، تمہارے بچے کو سلامت رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔

جب زچگی کا وقت قریب آئے گا تو میں کسی بہانے صاحب سے چھٹی لے کر تمہارے پاس آؤں گا پھر تمہارے اور دائی ماں کے درمیان رابطہ رکھوں گا۔ جب میں تمہیں اطلاع دوں تو تم کھڑگ پور چلے آنا۔''

اس کا خط پڑھ کر میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ میرے دل نے کہا، اللہ بچانے والا ہے۔ میں اپنے گناہ کا کفارہ اس طرح ادا کرسکوں گا کہ اس ننھی سی جان کو بچا کر اپنے سینے سے لگا کر اس کی طبعی عمر تک اسے اچھی زندگی دیتا رہوں گا۔

بہرحال میں کھڑگ پور آگیا۔ کرامت علی نے اطلاع دی تھی کہ زچگی آج کل میں ہونے والی ہے۔ مجھے انڈا مارکیٹ کے آس پاس رہنا چاہیے۔ وہ بچی کو وہاں لاکر

میرے حوالے کرنے والا تھا۔

علی نے اس بار چٹھی نہیں لکھی تھی۔ نہ ہی میری التجا پر اس نے ڈولی کے حالات لکھے تھے۔ شاید کوئی مجبوری ہوگی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ڈولی پر کیا گزر رہی ہے۔ شاید وہ میری نصیحت کے مطابق نارمل رہ کر میرا انتظار کررہی تھی۔

مجھے زچگی کا صحیح وقت معلوم نہیں تھا۔ جب مانو دنیا میں آئی تو اس وقت میں ایک دوست کی عیادت کے لیے اسپتال گیا تھا۔ وہ بے چارہ اللہ کو پیارا ہوگیا۔ میں اسے قبرستان میں سپردِ خاک کرنے تک انڈا مارکیٹ نہ جاسکا اور جب وہاں پہنچا تو قریب ہی کچرا گھر کے پاس لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ معلوم ہوا کہ کوئی نوزائیدہ بچی کو وہاں چھوڑ گیا ہے۔

میں نے بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے آکر ایک خوبصورت سی بچی کو دیکھا تو دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ میرے دل نے کہا۔ ''یہ میری ہے۔''

میں نے تڑپ کر بے چین ہوکر سوچا، کیا کروں؟ وہ میری بیٹی ہو یا نہ ہو میں اسے اُٹھاتا تو بچی پیدا کرکے اسے وہاں پھینکنے کا مجرم کہلاتا۔

میں پریشان ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ ایک ہی صورت تھی کہ کرامت علی سے ملنے اس بنگلے میں جاؤں، جہاں ڈولی کی زچگی کرائی گئی تھی۔ وہاں میرے لیے خطرہ تھا۔ صاحب بہادر کے کارندے مجھے دیکھ لیتے تو زندہ نہ چھوڑتے۔

میں پھر بھی ہمت کرکے اس بنگلے کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں ایک جگہ چھپ کر کرامت علی کا انتظار کرنے لگا۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہوگئی۔ تب دائی ماں نظر آئی۔ وہ بنگلے سے نکل کر کہیں جارہی تھی۔

میں نے چھپ چھپ کر اس کا پیچھا کیا۔ پھر ایک جگہ اسے آواز دی۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ فوراً ہی تیزی سے چلتی ہوئی میرے پاس آکر بولی۔ ''تم کہاں تھے۔ علی بچی کو دو گھنٹے تک ہاتھوں میں اُٹھائے تمہیں ڈھونڈتا رہا۔ بچی رو رہی تھی۔ وہ اپنی انگلی میں شہد لگا کر اسے چوساتا رہا۔''

میں شرمندگی سے سن رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''بچی کہاں ہے؟''

وہ بولی۔ ''اس کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ پولیس والوں کی نظروں میں آسکتا تھا۔ وہ مجبور ہوگیا تھا۔ آخر کیا کرتا؟ انڈا مارکیٹ کے پاس ایک کچرا گھر ہے۔ وہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر آگیا۔''

یہ سنتے ہی میرے اندر بجلی بھر گئی۔ میں پاگل ہوکر وہاں سے دوڑتا ہوا کچرا گھر کے پاس آیا۔ میری بچی وہاں نہیں تھی۔ اسے تھانے والے لے گئے تھے۔''

چچا جان بولتے بولتے چپ ہوگئے۔ میں نے کہا۔ ''آگے میں نے سنا ہے۔ آپ مانو کو تھانے سے لے آئے تھے۔ پھر اس کی خاطر اپنا گھر، اپنا شہر چھوڑ دیا تھا۔''

انہوں نے کہا۔ ''اور جس نے اسے جنم دیا تھا، اسے میں آخری سانسوں تک بھلا نہیں سکوں گا۔ آہ ڈولی...!''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولے۔ ''میرے اور ڈولی کے ساتھ عجیب حالات تھے۔ اس ایب نارمل کو پیار کی پگلی کہنا چاہیے۔ وہ عشق و محبت کا فلسفہ نہیں سمجھتی تھی۔ جانے کیوں مجھے دیوانہ وار چاہتی تھی؟''

وہ ذرا چپ ہوکر بولے۔ ''میں پوچھتا تھا، مجھے کیوں چاہتی ہو؟ وہ کہتی، میرا دل کہتا ہے تمہیں چاہوں اور میں چاہتی ہوں۔''

مجھے اس سے جدا کردیا گیا تھا۔ تب وہ ایبنارمل ہوگئی تھی۔ میرے واپس آنے کے بعد پھر خوش رہنے لگی تھی۔ جب میں اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا تھا۔ تب نہیں جانتا تھا کہ وہ کن حالات سے گزر رہی ہے۔ کئی برس بعد دائی ماں سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ ڈولی پر عجب وحشت سی طاری رہتی تھی۔ وہ اکثر چیختی اور مجھے پکارتی رہتی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا تھا، خیر خیریت سے زچگی ہوجائے تو بہتر ہے۔ ورنہ یہ ذہنی توازن کھو بیٹھے گی۔ وہ ماں بننے کے دوران نارمل رہی تھی اور دردِ زہ کی تکلیف سے گزرتے وقت چیخیں مارتی ہوئی میرا نام لیتی تھی۔

وہ عیسائی تھی۔ ہوسکتا ہے اسے اپنے گاڈ سے زیادہ لگاؤ نہ ہو۔ لیکن میں یہ سوچ کر پیار کی شدت سے تڑپ جاتا ہوں کہ عالم جنوں میں صرف میں اسے یاد رہا تھا۔''

میں نے پہلی بار چچا جان کو روتے دیکھا۔ وہ اپنے آنسو پونچھ رہے تھے۔ میں نے انہیں دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ان کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ وہ بولے۔ ''میں آخری وقت اسے دیکھ نہ سکا۔ دائی ماں نے بتایا، وہ مانو کے پیدا ہوتے ہی غائب دماغ ہوگئی تھی۔ اپنے آپ کو اور ساری دنیا کو بھول گئی تھی۔ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس نے ایک بہت ہی خوبصورت سی بچی کو جنم دیا ہے۔

بعد کی تمام باتیں دائی ماں سے معلوم ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ وہ میم صاحب جتنی گوری چٹی تھی، اتنا ہی اس کا دل بھی اُجلا تھا۔ وہ ہمیشہ بچوں جیسی معصوم زندگی گزارتی رہی۔ مجھے

پیار کرنے والی نے جب اس دنیا کو چھوڑا تو اس سے پہلے حواس خمسہ اسے چھوڑ چکے تھے۔ وہ غائب دماغ رہ کر اس دنیا سے گئی ہے۔"

چچا جان خاموش ہو گئے۔ بارہ دری میں مرد عورتیں، بچے اور بوڑھے چہل قدمی کر رہے تھے۔ پکنک منا رہے تھے۔ جس طرح بھی ممکن ہو خوشیاں سمیٹی جاتی ہیں۔ ہم سب اپنی زندگی تفریح میں گزارنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں اور زندگی ہے کہ ہر پل ہمیں صدمات سے گزارتی رہتی ہے۔

انہوں نے اطمینان کی ایک سانس لے کر کہا۔ "تمہیں اپنی روداد سنا کر دل ہلکا ہو گیا ہے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جو میری بیٹی کا جیون ساتھی ہوگا، اسے یہ حقیقت بتاؤں گا کہ مانو لے پالک نہیں ہے۔ میرے ہی جگر کا ٹکڑا ہے۔ میرا لہو ہے۔ میری جان ہے۔"

انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مجھے یقین ہے تم یہ حقیقت کسی کو نہیں بتاؤ گے... مانو کو بھی نہیں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "آپ یہ سچ مانو سے کیوں چھپا رہے ہیں؟"

انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ "وہ ان ماں باپ سے نفرت کرتی ہے، جو اسے گناہ کے راستے دنیا میں لائے اور ایک کچرا گھر میں تماشا بنا دیا۔ میں نے ایک بار اس سے پوچھا تھا کہ فرض کرو میں ہی وہ شخص ہوں، جس سے غلطی ہوئی ہے تو...؟"

تو اس نے میرے سینے سے لگ کر کہا۔ "ایسا نہ کہیں۔ ایسا میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ اتنے عظیم ہیں کہ ایک گناہ کی پوٹ کو کچرے سے اُٹھا کر سینے سے لگائے رکھا ہے۔ میری خاطر اپنے پورے خاندان کو چھوڑ دیا ہے۔"

وہ بڑے جذبے سے بول رہی تھی۔ "آپ نے مجھے ذلت سے بچانے اور جائز ثابت کرنے کے لیے ایک باپ کا نام دیا ہے۔ آپ میرے آئیڈیل فادر ہیں۔ کبھی وہ گناہگار باپ دکھائی دے گا تو اس پر تھوک دوں گی۔"

یہ آخری الفاظ سن کر میں اندر سے کانپ گیا۔ میں نے چشم تصور سے بیٹی کو ایک سائے پر تھوکتے دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ میرا ہی سایہ ہے۔ میں تو جانتا تھا۔

اور یہی ہوتا آیا ہے۔ بیٹی ایسا نہ کہتی، تب بھی گناہگار پر تھوکا جاتا ہے۔

میں نے ان لمحات میں فیصلہ کیا۔ ہمارے درمیان یہ حیا لازمی ہے کہ میں بے حیا اور گناہگار نہیں ہوں۔ وہ قابل نفرت گناہگار کوئی اور تھا۔

ہاں، یہی مناسب ہے کہ وہ کسی اور سے نفرت کرتی رہے اور مجھے ایک فرشتہ اور آئیڈیل مانتی رہے۔

کیا ہوا کہ اس نے تھوک دیا تھا۔ وہ دن رات چومتی بھی ہے۔"

چچا جان اور ڈولی جن حالات سے گزرتے رہے، ان حالات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ چچا جان کو قیدی بنا کر مجبور کیا گیا تھا اور ڈولی ایبنارمل تھی۔ جب وہ نارمل رہتی تو بچگانا ذہن کے باعث اپنی ضد منواتی تھی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ دونوں مجبور تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے، کیا جو گناہ مجبوریوں کے باعث سرزد ہو، وہ گناہ نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔ اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے نتیجے میں ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں۔

اگر ڈولی کے ماں باپ اس کا نکاح چچا جان سے پڑھا دیتے تو آج مانو گناہ کا نتیجہ نہ کہلاتی۔ یوں تجزیہ کیا جائے تو گناہ ہر حال میں گناہ ہے۔

میں نے سوچا، چچا جان شرمندہ ہیں۔ بیٹی سے حقیقت چھپا رہے ہیں۔ میں شادی کے بعد مانو کو ایک عظیم باپ کی حقیقت بتاؤں گا۔

شادی کو دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ مانو کی سہیلیاں ہر شام آتی تھیں اور رات گئے تک ہنستی بولتی اور ناچتی گاتی رہتی تھیں۔ وہ لڑکیاں اور ان کی بزرگ خواتین شادی کی رونق بڑھا رہی تھیں۔

ابّو نے کہا تھا، نکاح سے دو روز پہلے میری امی کے ساتھ آجائیں گے لیکن اب تک پہنچے نہیں تھے۔ انہوں نے فون بھی نہیں کیا تھا۔ وہاں کسی کے گھر میں فون نہیں تھا۔ ہم یہاں سے کسی کو کال نہیں کر سکتے تھے۔ خط لکھتے تو اس کا جواب آنے تک ہماری شادی ہو چکی ہوتی۔

پھر شادی کا دن آگیا۔ اس رات میرا اور مانو کا نکاح پڑھایا جانے والا تھا۔ افسوس! امی اور ابّو تو نہیں آئے۔ ایک پولیس افسر سپاہیوں کے ساتھ آگیا۔ وہ میری گرفتاری کا وارنٹ لایا تھا۔

اچانک شادی کے گھر کی فضا بدل گئی۔ قہقہوں کی جگہ حیرانی اور پریشانی نے لے لی۔ چچا جان نے پوچھا۔ "میرے بھتیجے نے کیا جرم کیا ہے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "ڈھاکا بونو گرام پولیس اسٹیشن سے لاہور پولیس کو عدالتی حکم نامہ بھیجا گیا ہے۔ فہیم الدین شریف پر یہ الزام ہے کہ اس نے اپنے باپ اور ماموں کے گھر سے بیس ہزار روپے نقد اور پچاس ہزار مالیت کے سونے کے

زیورات چرائے ہیں۔"

چچا جان نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ یہ ڈھاکا سے یہاں خالی ہاتھ آیا ہے۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک باپ نے اپنے بیٹے پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا ہے؟"

"جی ہاں۔ فہیم ان کی مرضی کے خلاف یہاں آیا ہے۔ واپس نہیں جانا چاہتا۔ اسے واپس لانے اور اس کی شادی روکنے کے لیے یہ چال چلی جا رہی ہے۔"

"آپ اپنی سچائی عدالت میں ثابت کریں۔ فی الحال تو ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔"

انسپکٹر کے حکم سے سپاہیوں نے مجھے ہتھکڑی پہنا دی۔ مانو رونے لگی۔ چچا جان نے کہا۔ "آفیسر! پلیز کچھ ایسا کریں کہ آج یہ گرفتاری رُک جائے۔ میں اپنی عزت اور اپنی بیٹی کے سہاگ کے لیے بڑی سے بڑی رقم ادا کروں گا۔ ابھی ادا کروں گا۔"

"سوری۔ ہمیں آپ کی خوشیاں برباد کرنے کا شوق نہیں ہے۔ اگر عدالت سے گرفتاری کا وارنٹ جاری نہ ہوتا تو ہم ڈھاکا کی پولیس سے نمٹ لیا کرتے۔ مجھے افسوس ہے میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

وہ مجھے لے جانے لگے۔ مانو دوڑتی ہوئی آکر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں صدمات کی شدت سے کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ اسے خاموشی سے تھپکنے لگا۔ وہ ایکدم سے پلٹ کر انسپکٹر کے قدموں میں گر پڑی۔ "فہیم کو چھوڑ دیں... انکل! فہیم کو نہ لے جائیں۔ میں مر جاؤں گی۔ اسے نہ لے جائیں۔"

وہ انسپکٹر کے پیروں کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس دو لاکھ روپے کے زیورات ہیں۔ یہ سب کے سب الزام لگانے والوں کو دے دیں۔ انہوں نے معمولی سی چوری کا الزام لگایا ہے۔ ہم اس سے کئی گنا زیادہ ادا کریں گے۔"

اس نے مانو کو قدموں سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! میں بہت مجبور ہوں۔ مجھے اپنی ڈیوٹی ادا کرنی ہوگی۔ تم حوصلہ رکھو۔ اس نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا ہے۔ معمولی سی سزا ہوگی۔ دو چار مہینے کی قید اور جرمانے کے بعد رہائی مل جائے گی۔"

چچا جان مانو کو اپنے بازو میں لے کر تھپکنے لگے۔ اسے تسلیاں دینے لگے کہ مجھے جلد ہی قانون کی گرفت سے چھڑوا لائیں گے۔ سپاہیوں نے مجھے باہر گاڑی میں لا کر بٹھایا۔ مانو دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ چچا جان نے مجھے تھپک کر کہا۔ "بیٹے! پریشان نہ ہونا۔ میں ابھی اپنے وکیل کے ساتھ آرہا ہوں۔"

میں ان سے اور اپنی مانو سے جدا ہو گیا۔ میرے خاندان والوں نے مجھے ان سے چھین لینے کی اور واپس بلانے کی بہت ہی گھٹیا اور گری ہوئی چال چلی تھی۔ ابّو نے اپنی انا اور برتری دکھانے کے لیے مجھے ہتھکڑی لگوا دی تھی۔ میں شرمندگی اور غصے سے لوہے کی ہتھکڑی کو سر پر مارنے لگا۔ سپاہیوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ میری پیشانی زخمی ہو گئی تھی۔ چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔

چچا جان نے وکیل کے ساتھ تھانے آکر میری حالت دیکھی۔ پھر کہا۔ "ایسی حماقت کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ مانو کو تکلیف پہنچے گی؟"

میں نے ایکدم سے چونک کر انہیں دیکھا۔ واقعی بھول گیا تھا کہ مانو میرے دُکھ کی شریک ہے۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے تو اسے بھی ہوتی ہے۔ اسے چوٹ پہنچتی ہے تو میں تکلیف سے بلبلا اٹھتا ہوں۔ میں نے سر جھکا کر ان سے کہا۔ "مانو سے کہیے گا، میں بہت شرمندہ ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔"

انہوں نے کہا۔ "میں تمہارا دُکھ سمجھتا ہوں۔ مگر یہ نادانی ہے بیٹے! خود کو نقصان پہنچا کر اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکو گے۔"

ان کا وکیل ڈھاکا سے آئی ہوئی فائل پڑھ رہا تھا۔ انسپکٹر نے کہا۔ "ملزم نے ڈھاکا میں واردات کی ہے۔ وہیں کی عدالت سے گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا ہے۔ اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ملزم کو ڈھاکا پولیس کے حوالے کیا جائے۔"

چچا جان نے پریشان ہو کر اپنے وکیل ملک حیات سے کہا۔ "ملک صاحب! یہ ہم پر ظلم ہوگا۔ ایک تو آج شادی نہیں ہو سکے گی۔ اوپر سے فہیم کو ڈھاکا بھیج دیا جائے گا۔ کیا ہمیں مقدمہ بھی وہیں لڑنا ہوگا؟"

وکیل ملک حیات نے کہا۔ "یہ عدالتی حکم ہے۔ اور قانوناً جہاں سے مقدمہ دائر کیا جاتا ہے، وہیں کی جیل میں ملزم کو رکھا جاتا ہے اور وہیں کی عدالت میں مقدمے کی کارروائی جاری رہتی ہے۔"

میرے بزرگوں نے مجھے بُری طرح جکڑ لیا تھا۔ آئندہ چچا جان کو ڈھاکا شہر میں رہ کر میرے لیے جنگ لڑنی تھی۔

مجھے دوسرے دن لاہور سے ڈھاکا روانہ کیا گیا۔ چچا جان بھی میرے ساتھ آئے۔ انہوں نے وہاں ایک وکیل کی خدمات حاصل کیں۔ پھر مجھے ضمانت پر رہا کرانے کی کوششیں کرنے لگے۔

میرے ابو اور خاندان کے بزرگ مجھ سے ملنے کے لیے جیل میں آئے۔ میں نے ان سے بات نہیں کی۔ انہیں دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ ابو نے کہا۔ ''مجھے نفرت اور اکڑ نہ دکھاؤ۔ بزرگوں سے معافی مانگو گے، ہمارے ساتھ رہو گے تو کل ہی رہائی مل جائے گی۔ اگر کلیم اور اس کی بیٹی کے ساتھ مرنا چاہو گے تو یہیں مرتے رہو گے۔''

میں نے ان کی باتوں کو اہمیت نہیں دی۔ منہ پھیر کر سنی ان سنی کرتا رہا۔ وہ جیل کی چار دیواری سے باہر آئے تو چچا جان سے سامنا ہوا۔ انہوں نے ابو کو سلام کیا۔ وہ منہ پھیر کر جانے لگے۔ انہوں نے راستہ روک کر پوچھا۔ ''کیوں ناحق دشمنی کر رہے ہیں۔ وہ آپ کا بیٹا ہے' جیل میں ہے۔ آپ کو ذرا بھی شرم نہیں آ رہی ہے؟''

وہ بولے۔ ''اس کا خون سفید ہو گیا ہے اور یہ تم نے کیا ہے۔ اسے ہمارے خلاف بھڑکایا ہے۔ کوئی بازاری دلّال بھی کسی کو ایسے نہ پھانستا ہوگا' جیسے تم نے بیٹی کے ذریعے اس احمق کو پھانسا ہے۔''

''آپ کا غرور بازاری لوگوں کی زبان بول رہا ہے۔ کبھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں' آپ کو بازاری دلّال سے بھی گیا گزرا ایک ایسا باپ نظر آئے گا' جو اپنے بیٹے کو ہتھکڑی لگواتا ہے اور خود کو شریف اور نیک نام سمجھتا ہے۔''

ابو منہ پھیر کر چلے گئے۔ ان سے محبت اور سمجھوتے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ مانو لاہور کی کوٹھی میں تنہا تھی۔ یوں تو گورنس' خادمائیں اور سیکیورٹی گارڈز تھے۔ لیکن اس کا اپنا کوئی نہیں تھا۔ چچا جان اس سے صبح و شام فون پر باتیں کرتے اور اسے بتاتے رہتے تھے کہ مجھے ضمانت پر رہا کرانے کے لیے کیسی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

ضمانت یہ دینی تھی کہ میں ڈھاکا شہر سے باہر نہیں جاؤں گا اور ہمیں یہ ثابت کرنا تھا کہ ہم اس شہر میں باقاعدہ رہائش اختیار کر چکے ہیں۔ بہر حال کئی پیچیدہ معاملات سے گزرنے کے بعد مجھے عارضی طور پر رہائی مل گئی۔ اس روز مانو لاہور سے آ گئی۔ ہم نے کرائے کے مکان میں رہائش اختیار کی تھی۔

وکیل نے کہا تھا' پہلی پیشی میں ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ قید ہونے کی سزا کم سے کم ہوگی پھر جرمانہ ادا کرنے کے بعد رہائی مل جائے گی۔ چچا جان دو دنوں کے لیے لاہور گئے۔ وہاں کے کاروبار کی طرف دھیان دینا ضروری تھا۔ جب وہ آئے تو مانو کوٹھی کی دیکھ بھال کے لیے چلی گئی۔ دو ماہ بعد مجھے چھ ماہ کی قید اور پچاس ہزار روپے جرمانہ ادا کرنے کی سزا سنائی گئی۔

چچا جان نے عدالت سے باہر آ کر ابو سے پوچھا۔ ''آپ کا کلیجا ٹھنڈا ہو گیا؟ اب آپ کیا کریں گے؟ میری بیٹی کو نعیم کی دلہن بننے سے روک سکیں گے؟''

ابو کو اور دوسرے تمام بزرگوں کو چپ لگ گئی تھی۔ یا تو وہ اپنی دشمنی پر شرمندہ تھے یا پھر مان گئے تھے کہ میرے جیل سے باہر آنے کے بعد وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

میری امی اور بھائی بہنوں نے عدالت کے باہر مجھ سے بات کرنی چاہی۔ میں نے کہا۔ ''اگر میں غلط ہوں تو مجھ سے دور رہو۔ اگر ہمارے بزرگ غلط ہیں اور میں چچا جان کی لے پالک بیٹی کو دلہن بنا کر نیکی کر رہا ہوں تو امی' ابو اور خاندان والوں سے بغاوت کرو۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تم سب کو لاہور لے چلوں گا...''

ان سب کے سر جھک گئے۔ وہ مجھے چاہتے تھے۔ یہ مانتے تھے کہ بزرگوں نے غلطی کی ہے۔ اس کے باوجود ان میں بغاوت کرنے کی جرأت نہیں تھی۔

جیل کی چار دیواری میں جانے سے پہلے مانو سے الوداعی ملاقات ہوئی۔ وہ رو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''حوصلہ رکھو۔ صرف چھ مہینے کی بات ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دن گزر جائیں گے۔ پھر ہم ملیں گے تو انشا اللہ کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکے گا۔''

اس نے کہا۔ ''یاد ہے' جب ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا تو خوابوں اور خیالوں میں ملتے رہتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک دوسرے کے سامنے پہنچ گئے ہیں۔''

''ہاں۔ ہم پہلے قدرتی طور پر ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے اور نامعلوم فاصلوں کے باوجود ہم ایک دوسرے کے دُکھ درد کو اور مسرّتوں کو اپنے اندر محسوس کرتے رہتے تھے۔''

کیا اب بھی ایسا ہوگا؟

کیا ان چھ مہینوں میں ہم قدرتی طور پر ملتے رہیں گے؟

میں نے کہا۔ ''میں تمہیں پکاروں گا۔''

وہ بولی۔ ''میں تمہیں آوازیں دیتی رہوں گی۔ انشا اللہ ہم دور رہ کر بھی ملتے رہیں گے۔''

ہمیں یقین تھا' جیل کی چار دیواری ہمیں نہیں روک سکے گی۔ وہ مجھ سے جدا ہو گئی۔ میں آہنی سلاخوں کے پیچھے آ گیا۔ پھر میں نے رات کو سونے سے پہلے اسے پکارا۔ ''مانو...! میری مانو کہاں ہو؟ پہلے کی طرح فاصلے مٹا کر چلی آؤ۔''

میں نے انتظار کیا۔ جیل کی کوٹھری تھی۔ نیم تاریکی تھی۔ وہ نہیں تھی۔ میں نے پھر آواز دی۔ وہ تصور میں آئی۔ مگر ایسے نہیں آئی کہ اس کی موجودگی کا گمان ہوتا۔

میں جیل کی مشقت بھری زندگی کا ذکر نہیں کروں گا۔ میرا ذکر' میری فکر تو بس وہی تھی۔ میں نے دوسرے دن اسے پکارا۔ مایوسی ہوئی۔ کسی طرح کا قدرتی رابطہ نہ ہوا۔

یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہم نے جب تک ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا۔ تب تک قدرت ہم پر مہربان تھی۔ اب ہم جسمانی طور پر مل چکے تھے۔ اس لیے وہ قدرتی سہولتیں ختم ہو گئی تھیں۔

میں نے ایک سرد آہ بھر کر سوچا' دیدارِ یار ممکن نہیں ہے۔ وہ بھی یہ سمجھ رہی ہوگی کہ چھ ماہ تک انتظار کرنا ہوگا۔

جیل میں چھ دن گزرے تھے۔ ساتویں دن اچانک ہی میری طبیعت خراب ہو گئی۔ میرا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سینے پر بوجھ ہے۔ اندر کچھ ہے۔ مجھے بار بار اُبکائی سی آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیا ہو رہا تھا۔

جیل کے ڈاکٹر نے آ کر میرا معائنہ کیا۔ بیماری کی علامات معلوم کیں پھر ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تمہارے پاؤں بھاری ہو گئے ہیں۔ ایسا تو ماں بننے والی عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔''

پھر اس نے ایک ہاتھ میری گردن پر مارتے ہوئے کہا۔ ''یہ جیل ہے۔ ڈرامابازی کرنے کے لیے تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے۔ ابھی لات جوتے پڑیں گے تو عقل ٹھکانے آ جائے گی۔''

ڈاکٹر کے جاتے ہی سپاہیوں نے میری پٹائی شروع کر دی۔ وہ کبھی یقین نہیں کر سکتے تھے کہ واقعی میں تکلیف میں مبتلا رہا ہوں۔ جیل کے سپاہی کتنے بے رحم ہوتے ہیں' یہ جیل یاترا کرنے والے ہی جانتے ہیں۔ ان ظالموں نے مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ پھر مجھے نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔

پتا نہیں میں کب تک نیم مردہ حالت میں فرش پر پڑا رہا۔ جب ذہن ذرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو مانو یاد آئی۔ پھر ڈاکٹر کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا' ایسی تکلیف ان عورتوں کو ہوتی ہے' جو ماں بننے والی ہوتی ہیں۔ ایکدم سے یہ بات دماغ میں آئی' کیا مانو کے ساتھ ایسا کچھ ہو رہا ہے؟

میں تکلیف کے باوجود اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہم نے کوٹھی میں دن رات بڑی آزادی سے اور بڑی بے لگامی سے گزارے تھے۔ ہمیں کسی کی نظروں میں آنے کا خوف نہیں تھا اور اب بے لگامی کا نتیجہ نظروں میں آنے والا تھا۔

میں نے تڑپ کر کہا۔ ''یا اللہ...! مانو کے ساتھ وہ نہ ہو' جو اس کی ماں کے ساتھ ہو چکا ہے۔

یا اللہ...! میں کیسے معلوم کروں کہ مانو کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا سچ مچ اس کے ماں بننے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں؟''

میں نہ تو فون کر سکتا تھا۔ نہ خط لکھ کر اس کی خیریت معلوم کر سکتا تھا۔ چچا جان سے امید تھی کہ وہ مجھ سے ملنے آئیں گے۔

ہمارے حالات اچانک ہی سنگین ہو گئے تھے۔ وہ تیسرے ہی دن مجھ سے ملنے آئے۔ میری حالت دیکھ کر بولے۔ ''میں نے جیلر سے معلوم کیا ہے' یہاں تم پر تشدد کیا گیا ہے۔''

میں نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں... آپ مانو کے بارے میں بتائیں؟ کیا وہ بیمار ہے؟''

وہ فوراً ہی جواب نہ دے سکے۔ ان کے چہرے سے اندرونی کرب عیاں تھا۔ میرے سوال پر ان کا سر جھک گیا تھا۔ وہ جھجکتے ہوئے بولے۔ ''وہ...وہ۔ ماں بننے والی ہے۔''

یہ خبر ایک بیٹی کا باپ سنا رہا تھا' مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔

یہ کیا ہو جاتا ہے؟ ہم کیوں بہک جاتے ہیں؟ کبھی انہوں نے غلطی کی تھی۔ آج میں نے اور مانو نے کی ہے۔ اور میں نے اٹھارہ برس کی زندگی میں کتنے ہی لوگوں کو گناہ کی دلدل میں گرتے دیکھا ہے۔

کیا اس سوال کا جواب مل سکتا ہے کہ ہم کیوں گر جاتے ہیں؟

جب گناہ ظاہر ہوتا ہے' تب ہم پچھتاتے ہیں۔ اب میں پچھتا کر کیا کر سکوں گا؟ کیا مانو کو رسوائی سے بچا سکوں گا؟

چچا جان مجھ سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ بیٹی کے ساتھ بے حیائی ہوئی تھی۔ وہ دوسری طرف منہ پھیرے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''وہ اپنی ماں کی طرح ضدی ہے۔ ڈولی میرے پیار کے آگے کسی کی نہیں مانتی تھی۔ مانو بھی تمہارے لیے پاگل ہے۔ کہتی ہے۔ تمہارے بچے کو ضائع نہیں کرے گی۔''

مجھے مانو کی خیالی سرگوشی سنائی دی۔ ''یہ ہمارے پیار کا پہلا انعام ہے۔ دنیا نہ مانے۔ میں تو اسے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔''

چچا جان کہہ رہے تھے۔ "صرف بیٹی ہی نہیں باپ بھی بدنام ہوگا۔ کسی سے نظریں نہیں ملا سکے گا۔ تم بھی اسے اپنی اولاد کہہ کر دنیا والوں کے سامنے پیش نہیں کر سکو گے۔"

ہم خسارے میں ہیں۔ چور دروازوں سے عارضی مسرتیں اور دائمی ذلتیں ملتی ہیں۔

ہم کیا کریں؟ گناہ کو کس طرح چھپائیں؟

ہم فکر میں مبتلا ہوگئے۔ اگر فوراً ہی مانو کا نکاح مجھ سے پڑھایا جاتا تو اسے ایک قیدی کے ساتھ سہاگ رات گزارنے کی اجازت نہ دی جاتی اور جب چھ ماہ بعد جیل سے باہر آتا تو وہ چھ یا سات ماہ کی حاملہ ہوتی۔ کسی بھی تدبیر سے گناہ چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔

انہوں نے کہا۔ "ہم کر بھی کیا سکتے تھے؟ میں اٹھارہ برس سے اپنی بیٹی کو چھپاتا آرہا ہوں۔ اب بیٹی کہتی ہے کہ قاضی اور گواہ نہیں تھے۔ اس نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمہیں قبول کیا تھا۔ لہٰذا وہ جسے جنم دے گی' وہ جائز ہوگا۔

ایسا دوسرے مذاہب میں ہوتا ہے۔ شادی خانہ آبادی کے لیے کسی گواہ کی موجودگی لازم نہیں ہوتی لیکن دین اسلام میں اُصول اور ضابطوں کی پابندیاں ہیں۔ نکاح کے جو اُصول ہیں' ان پر عمل کرنا لازمی ہے۔ جس رشتۂ ازدواج سے اپنی نسل پیدا ہوتی ہے' اس کی اہمیت کے لیے چشم دید گواہ اور نکاح کی تحریری سند لازمی ہے۔"

میرا اور مانو کا نکاح ہونے والا تھا لیکن ہم نے صبر نہیں کیا۔ ہوس غالب آگئی' غلطی ہوگئی۔ اب مانو یہ کہے کہ ہم نے خدا کو گواہ بنا کر ایک دوسرے کو قبول کرنے کی غلطی کی ہے تو کیا خدا کو حاضر و ناظر جان کر غلطی کی جاتی ہے؟

چور اقرار نہیں کرتا کہ اس نے چوری کی ہے۔ گناہگار نہیں مانتا کہ اس نے گناہ کیا ہے۔ چچا جان نے بیٹی سے کہہ دیا کہ مانو یا نہ مانو۔ بچے پیار سے ہو یا سچے جذبے سے کیا گیا ہو' گناہ ہر حال میں گناہ ہوتا ہے۔

انہوں نے کہا۔ "گناہ کے بعد ایک اور گناہ یہ ہے کہ بچے کی جان لی جائے۔ اپنی پارسائی کا بھرم رکھنے کے لیے ایک اور جرم کیا جائے۔ لہٰذا ہمارے ہونے والے بچے کو سلامت رہنا چاہیے۔"

انہوں نے کہا۔ "پچھلی تاریخوں میں تم دونوں کا جعلی نکاح نامہ بنوایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک اور جرم ہوگا۔ ہم ایسا کرتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ ہمیں سزا آج نہیں ملتی مگر کبھی نہ کبھی ملتی ضرور ہے۔

لہٰذا نہ ہم جعلی نکاح نامہ بنوائیں گے۔ نہ جھوٹ بولیں گے۔ نہ یہ سچ ظاہر ہونے دیں گے کہ ہماری مانو نے ایک ناجائز بچے کو جنم دیا ہے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے' ہمارا بچہ دنیا میں آئے گا تو سچ بھی سامنے آئے گا۔"

"نہیں آئے گا۔ مانو لاہور سے یہاں آکر مستقل رہائش اختیار کرے گی۔ نئے ماحول اور نئی سوسائٹی میں اس ماں بننے والی سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے یا نہیں؟ انہیں یہی معلوم ہوگا کہ اس کا شوہر پانچ یا چھ مہینے بعد جیل سے رہا ہو کر آنے والا ہے۔

لاہور میں اپنے شناساؤں سے کہا جائے گا کہ تمہارا پورا خاندان ڈھاکا میں ہے۔ اس لیے مانو یہاں رہنے کے لیے آئی ہے۔ اس طرح وہ بچہ دنیا میں آئے گا تو تنقید کا نشانہ نہیں بنے گا۔

لاہور والے سمجھیں گے کہ تم دونوں کا نکاح ڈھاکا میں ہوا ہے۔ یہاں ہمارے خاندان والے سوچیں گے کہ گرفتاری سے پہلے ہی نکاح پڑھایا جا چکا تھا۔ صرف شادی اور رخصتی کی دھوم دھام باقی تھی' جو نہ ہو سکی۔"

چچا جان نے کہا۔ "اس طرح ہونے والے بچے کو ذلت سے بچایا جا سکتا ہے۔ ہم فراڈ نہیں کریں گے۔ جعلی نکاح نامہ نہیں ہوگا۔ ہم اپنی زبان سے نہیں کہیں گے کہ نکاح کب ہوا؟ لاہور یا ڈھاکا میں ہوا؟ نہ کوئی پوچھے گا' نہ ہم اس سلسلے میں کچھ بولیں گے۔"

بڑی ہیرا پھیری کی جاتی ہے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے' ہم خود کو سمجھا رہے تھے کہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔ فراڈ نہیں کریں گے۔ جعلی نکاح نامہ نہیں بنوائیں گے۔ بڑی ایمانداری سے اپنا بچاؤ کریں گے لیکن گناہ کو تو چھپائیں گے۔ کیا ایمانداری سے گناہوں کو چھپایا جاتا ہے؟

سپاہی نے آکر کہا۔ "ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ چلو یہاں سے...."

چچا جان نے اس کے ہاتھ میں سو روپے رکھ دیے۔ وہ سلام کر کے چلا گیا۔ ملاقات کا وقت ذرا بڑھ گیا۔ انہوں نے کہا۔ "مانو دو روز پہلے اچانک ہی سخت تکلیف میں مبتلا ہو گئی تھی۔ چیخیں مار رہی تھی اور کہہ رہی تھی فہیم پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ اس پر ظلم کرنے والوں کو روکیں۔ نہیں تو میں مرجاؤں گی۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "ہاں۔ تین سپاہی مجھ پر ظلم کر رہے تھے۔ یا خدا....! میں کیا کروں؟ وہ آئندہ بھی میرے ساتھ یہی سلوک کریں گے تو مانو برداشت نہیں کر

سکے گی۔"

"تمہیں یہاں پانچ مہینے اور بیس دنوں تک رہنا ہے۔ سپاہیوں کے سامنے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ کر رہا کرو۔ میں نے ابھی جیلر کو بھاری رقم دی ہے۔ اس نے میرے سامنے سپاہیوں کو بلا کر حکم دیا ہے کہ وہ آئندہ تمہیں ہاتھ نہ لگائیں۔"

ہمیں مانو کو ایسے تشدد سے محفوظ رکھنا تھا' جو مجھ پر ہوتا تھا اور وہ اذیتوں میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ بیچارے چچا جان ہماری حفاظت اور سلامتی کے لیے تن' من' دھن سے مصروف ہو گئے تھے۔ لاہور سے ڈھاکا اور ڈھاکا سے لاہور دوڑتے پھر رہے تھے۔

ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ وہ چلے گئے۔ پھر کسی دن آنے والے تھے۔ اب میری یہی کوشش تھی کہ کوئی مجھے تکلیف نہ پہنچائے اور میں دیکھ رہا تھا کہ سپاہی مجھ پر مہربان ہو گئے تھے۔ مجھ سے نرمی سے پیش آنے لگے تھے۔ اگلے چند دنوں میں مانو مستقل رہائش کے لیے ڈھاکا آگئی۔

وہ ایک روز مجھ سے ملنے کے لیے آئی تو اسے دیکھ کر افسوس ہوا۔ وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ مرجھا سی گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر روتے ہوئے بولی۔ "خوشی سے رو رہی ہوں۔ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اس وقت خوشی ہوگی' جب تم پہلے کی طرح صحت مند ہو جاؤ گی۔"

"میں اپنا خیال رکھتی ہوں۔ دوائیں کھاتی ہوں۔ میں پہلے جیسی ہو جاؤں گی۔ تم ہمارے بچے کی باتیں کرو۔ ابو نے ایسی زبردست پلاننگ کی ہے کہ کوئی اس کی پیدائش پر انگلی نہیں اُٹھائے گا۔"

میں نے کہا۔ "اللہ کرے ہمارے بچے کو عزت اور محبت ہی محبت ملے۔ جب میں رہائی پا کر آؤں گا تو اس کی پیدائش کا وقت قریب آچکا ہوگا۔"

وہ چہک کر بولی۔ "میں حساب لگا چکی ہوں۔ تم جولائی کی آخری تاریخوں میں یہاں سے نکلو گے اور ہمارا بیٹا اگست میں ہوگا۔"

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ بیٹا ہوگا؟"

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "میں ماں ہوں۔ بیٹا چاہتی ہوں تو بیٹا ہی ہوگا۔"

وہ جب تک میرے سامنے رہی' مجھے بھولتی رہی۔ صرف ہونے والے بیٹے کی باتیں کرتی رہی۔ رخصت

خدا کی رحمت

ایک دفعہ ایک عورت کا بچہ گم ہو گیا، بڑی تلاش کے بعد اسے اپنا کھویا ہوا جگر گوشہ مل گیا۔ اس نے لپک کر اسے سینے سے لگایا اور فرطِ جذبات سے بار بار اس کا منہ دیکھتی اور خوب پیار کرتی۔ اس وقت رسول کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا۔ "کیا خیال ہے تمہارا کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟" سب نے کہا۔ "نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے اپنے بیٹے سے محبت ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اس سے کئی گنا زیادہ محبت ہے، وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کے بندے دوزخ کی آگ میں جلیں۔"

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل بہاولپور

ہوتے وقت بولی۔ "شاید اب ملنے نہ آسکوں۔ پیٹ نکل آئے گا۔ ابو باہر نکلنے نہیں دیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اپنا خیال رکھو۔ ہم کبھی جدا نہ ہونے کے لیے پانچ ماہ بعد ملنے والے ہیں۔"

وہ چلی گئی۔ اس کے بعد پھر نہ آسکی۔ میں ایک ایک دن گن گن کر گزارنے لگا۔ گزرنے کو تو صدیاں گزر جاتی ہیں۔ یار سے ملنے کی بات ہو تو ایک لمحہ بھی پہاڑ بن جاتا ہے۔ پھر بھی رینگتے رینگتے چار ماہ گزر گئے۔

ان دنوں ایک قومی ہیکل غنڈا سزا پانے کے لیے جیل میں آیا۔ میرے ساتھی قیدیوں نے بتایا کہ وہ بہت خطرناک مجرم ہے۔ اس کی زندگی زیادہ تر جیل میں ہی گزرتی ہے اور وہ یہیں بیٹھ کر چرس کا دھندا کرتا ہے۔ درجنوں بدمعاش اور منشیات فروش اس سے ملنے کے لیے جیل میں آتے رہتے ہیں۔

دوپہر کو کھانے کے وقت اس سے سامنا ہوا۔ میں نے جھک کر اسے سلام کیا۔ ایک قیدی نے میرے بارے میں اسے بتایا۔ "یہ بے چارہ شریف آدمی ہے۔ چوری کے جھوٹے الزام میں سزا کاٹ رہا ہے۔"

سب اسے عثمان دادا کہتے تھے۔ اس نے بڑی

اپنایت سے میرے شانے پر ہاتھ مارا۔ ایسا فولادی ہاتھ تھا کہ میں ایک طرف جھک گیا۔ شانے کی ہڈی دُکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ ”جرائم کی دنیا میں شریف مارے جاتے ہیں۔ کبھی بچ بچ چوری کرواور دیکھو، نہ پولیس پکڑے گی، نہ سزا ملے گی۔ سپاہی تمہیں سلام کریں گے۔ چلو آ ہی گئے ہو تو سزا بھگتو۔ کوئی سپاہی پریشان کرے تو ہم سے کہنا۔ ہم اسے بانس کی طرح سیدھا کردیں گے۔“

مجھے کسی سپاہی سے شکایت نہیں تھی۔ میں عثمان دادا کی باتوں سے مطمئن ہو گیا تھا۔ آئندہ مجھے اس کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچنے والی نہیں تھی۔ میری مانو خیر خیریت سے رہنے والی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ جیل میں چرس کہاں چھپا کر رکھتا ہے؟ اور کس طرح اپنا دھندا جاری رکھتا ہے؟ اس سلسلے میں اسے جیلر کی سرپرستی حاصل تھی۔

ایک روز اچانک ہی کمشنر اور سول کورٹ کا جج سرپرائز چیکنگ کے لیے وہاں آپہنچے۔ جیل خانے کا عملہ ایکدم سے بوکھلا گیا۔ اپنا قبلہ درست کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں لگ گیا۔ ایسے وقت جیلر عثمان دادا کے کام نہیں آسکتا تھا۔

عثمان دادا چرس سے بھرا ہوا ایک تھیلا چھپانے کے لیے بھاگتا ہوا باورچی خانے کی طرف آیا۔ میں وہاں چار قیدیوں کے ساتھ کھانے کے جھوٹے برتن دھو رہا تھا۔ اس نے ہمارے سامنے تھیلا رکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے کسی بڑی دیگ میں یا کسی بھی بڑے برتن میں چھپاؤ۔ جلدی کرو۔“

وہ بولتا ہوا وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔ اس کا حکم سب ہی قیدی مانتے تھے لیکن اس وقت سب ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے قیدیوں کو کھلے میدان میں آکر قطاروں میں کھڑے ہونے کا حکم دیا جارہا تھا۔ میرے ساتھ کام کرنے والے قیدی حکم کی تعمیل کے لیے بھاگتے چلے گئے۔ میں نے پوچھا۔ ”اس تھیلے کو کہاں چھپاؤں؟“

کسی نے جواب نہیں دیا۔ سب نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ باورچی خانے کا دروازہ بند تھا۔ جن بڑے دیگوں اور برتنوں میں تھیلے کو چھپانا تھا، وہ مقفل تھے۔ میں نے سوچا، میں بھی تھیلا چھوڑ کر چلا جاؤں۔ ایسے وقت عثمان دادا پھر دوڑتا ہوا ادھر سے گزرا۔ اس نے تھیلے کو دیکھ کر مجھے گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”تُو نے ابھی تک اسے نہیں چھپایا؟“

میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کہاں چھپاؤں، دروازہ بند ہے؟“

ایسے وقت مجسٹریٹ چند سپاہیوں کے ساتھ ہماری طرف آرہا تھا۔ یہ بات یقینی ہوگئی کہ وہ مال کے ساتھ پکڑا جائے گا۔ اس نے غصے سے پاگل ہوکر میرے منہ پر ایک اُلٹا ہاتھ مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر اس نے پیٹ میں ایسا گھونسا مارا کہ میں تکلیف کی شدت سے بلبلاتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ وہ گھونسا نہیں تھا جیسے ہتھوڑا تھا۔ ایسا لگا کہ پیٹ پھٹ گیا ہے۔

جب میری حالت ایسی ہوگئی تھی تو مانو پر کیا گزری ہوگی؟

یا اللہ...! رحم... اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ اپنے کمرے میں چچا جان کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ ایکدم سے حلق پھاڑ کر چیخنے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر جھکنے لگی۔ چچا جان اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھے۔ تب تک وہ فرش پر گر پڑی۔

انہوں نے اس پر جھک کر پوچھا۔ ”میری بچی! میری جان! تمہیں کیا ہورہا ہے؟“

وہ فرش پر تڑپ رہی تھی۔ تکلیف کی شدت سے چیخیں مار رہی تھی۔ پھر چچا جان نے گھبرا کر دیکھا۔ اس کے نیچے فرش پر لہو بہہ رہا تھا۔ سات مہینے کا حمل پانی ہو رہا تھا۔ وہ تڑپ گئے۔ فوراً ہی دوڑتے ہوئے کمرے سے باہر آئے۔ انہوں نے کام کرنے والی ایک بوڑھی اور ایک جوان ملازمہ رکھی تھی۔ جب انہیں مانو کی حالت کا پتا چلا تو وہ دوڑتی ہوئی محلے پڑوس میں گئیں۔ وہاں سے عورتوں کو بلایا۔ انہوں نے مانو کو اُٹھا کر باہر لا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا پھر چچا جان نے گاڑی کو تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے بیٹی کو اسپتال پہنچا دیا۔

یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میری مانو کیسے کیسے عذاب سے گزرتی رہی۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا۔ ”یہ نہیں بچے گی۔ پھر بھی ہم اسے بچانے کی کوشش کریں گے۔“

اسقاطِ حمل سات ماہ گزرنے پر ہو تو ماں اور بچے کی زندگی خطرے میں ہوتی ہے۔ وہ اسپتال پہنچتے پہنچتے نیم مردہ ہو گئی تھی۔ نہ وہ بول سکتی تھی، نہ سن سکتی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ اس کا جسم رہ رہ کر جھٹکے کھا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ زندگی اسے دھکے دے دے کر موت کی طرف لے جا رہی ہے۔

میں جیل کے اسپتال میں تھا۔ میرا جسم بھی ہلکے ہلکے جھٹکے کھا رہا تھا۔ اپنی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیسی نا قابل برداشت تکالیف سے گزر رہی ہوگی؟ جیل کے ڈاکٹر

نے رپورٹ لکھی کہ مجھے ایسی اندرونی چوٹیں لگی ہیں کہ جیل کے باہر پولیس اسپتال کے ڈاکٹر ہی میرا علاج کرسکیں گے۔

مجھے بھی اسپتال پہنچا دیا گیا۔ مانو کو آپریشن کے دوران بیہوش کیا گیا تھا۔ وہ تمام تکالیف سے بے حس اور بے نیاز ہو گئی تھی۔ اِدھر میں بے حسی اور بیہوشی جیسی حالت سے گزر رہا تھا۔

اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ حمل ساقط ہو گیا ہے اور بیچاری میجر آپریشن سے گزر رہی ہے اور اس کی بیہوشی کے باعث میں تکالیف سے بے نیاز بھی تھا اور عجیب سی بے چینی اور پریشانی بھی محسوس کر رہا تھا۔

وہ دن گزر گیا۔ پھر رات گزرنے لگی، مجھے مانو کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ چچا جان بھی مجھ سے ملنے نہیں آرہے تھے۔ ان کے نہ آنے سے اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ یقین ہو رہا تھا کہ اُدھر معاملہ بہت سنگین ہے۔ پھر ایک دن وہ ملنے آئے۔ میرے پاس بیٹھ کر بولے۔ ”وہ بھی اسپتال میں ہے۔ یا اللہ...! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”وہ اسپتال میں ہے...؟ اسے کیا ہوا ہے؟ میں تین دنوں سے عجیب حالات سے گزر رہا ہوں۔ محض اندازہ کر رہا ہوں کہ وہ نا قابل برداشت مصیبتوں اور تکلیفوں سے گزر رہی ہے۔ میری مصیبت پیٹ کی تکلیف سے شروع ہوئی تھی۔ کیا اس کے پیٹ پر بھی اثر ہوا تھا؟“

انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر بتایا کہ وہ کس طرح اچانک ہی چیخیں مارتی ہوئی پیٹ پکڑ کر فرش پر گر پڑی تھی۔ حمل ضائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ بچہ تو گیا۔ شاید اسے بھی نہ بچا سکیں گے۔ لیکن معجزہ ہو گیا۔ وہ سانسیں لے رہی ہے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ”اگر سانسیں لینے کا نام زندگی ہے تو وہ زندہ ہے ورنہ مر چکی ہے۔“

میں لرز گیا۔ ”چچا جان! اس کے مرنے کی بات نہ کریں۔ میں مر جاؤں گا۔“ میں نے ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ ”وہ کس حالت میں ہے؟“

”وہ بولتی ہے، نہ سنتی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ اپنے باپ کو دیکھتی ہے مگر پہچانتی نہیں ہے... وہ کوما میں ہے۔“

وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولے۔ ”اچھا ہے کہ ہر طرح کے دُکھ درد کے احساسات سے عاری ہے۔ یہاں تم پر کوئی کتنا ہی ظلم کرے اب وہ تمہاری تکلیف محسوس نہیں کرے گی۔“

میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں، وہ کوما سے نکل آئے گی؟“ پھر سے ہنسنے بولنے لگے گی؟ چچا جان! اب ہمارے اچھے دن آرہے ہیں۔ میری رہائی کے لیے صرف پچیس دن رہ گئے ہیں۔“

انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر بڑی توجہ سے علاج کر رہے ہیں اور میں دن رات اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا ہوں۔ میں دولتمند ہوں مگر کتنا مجبور ہوں۔ میرے پاس بیٹی کے لیے دعاؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

وہ بھیگی آنکھیں پونچھنے لگے پھر میرا ہاتھ تھپک کر بولے۔ ”مجھے مانو کے پاس جانا ہے۔ اگرچہ وہ مجھے دیکھتی ہے، نہ میری آواز سنتی ہے۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ ابھی جاؤں گا تو وہ میرے گلے لگ کر بولنے لگے گی۔“

میں نے چچا جان کو دیکھا۔ جاتے جاتے ان کی آنکھیں پھر بھیگنے لگی تھیں۔ میں اسپتال کے بیڈ پر چاروں شانے چت پڑا چھت کو تک رہا تھا۔ مانو کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔

میری مانو...! تم موت سے لڑ رہی ہو۔ زندگی اور موت کی درمیانی دہلیز کوما میں ہو۔ اِدھر میں ہوں۔ اِدھر آجاؤ مانو...! اس نفرت بھری دنیا میں محبت کرنے والوں کی ضرورت ہے... آجاؤ۔ یہ نفرت کی کیسی انتہا ہے کہ تمہیں پیدا ہوتے ہی کچرے میں پھینک دیا گیا؟ جب بھی تمہاری زندگی میں مسرتوں کے لمحات آتے ہیں، دنیا والے نفرت کے پنجے مارنے لگتے ہیں۔

اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہارے پاس آنے والا ہوں۔ ایک بار اور حوصلہ کرو اور موت سے لڑتے ہوئے کوما سے نکل آؤ۔

میں اپنی پیٹ کی تکلیف سے لڑ رہا تھا۔ پندرہ دنوں کے بعد کچھ افاقہ ہوا تھا۔ میں اُٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ جی چاہتا تھا، وہاں سے چلتے ہوئے مانو کے پاس پہنچ جاؤں۔ چچا جان نے تیسرے دن آکر خوش خبری سنائی کہ وہ دیکھنے اور سننے لگی ہے۔ اس نے چچا جان کو دیکھتے ہی میرا نام لیا تھا۔ ”فہیم...! وہ، وہ کہاں ہیں؟“

انہوں نے مانو کو بتایا کہ میں بھی اسپتال میں ہوں۔ مجھے چھ دنوں بعد رہائی ملنے والی ہے۔ وہ خوش ہو گئی تھی مگر زیادہ بول نہیں پا رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ کوما سے نکل آئی تھی۔

میں یقین سے سوچ رہا تھا کہ ہمارے بُرے دن گزر

چکے ہیں۔ بدنصیبی ہمیشہ نہیں رُلاتی، خوش نصیبی کا بھی دور آتا ہے اور وہ آرہا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اب کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو ہم نہیں سوچتے، وہ سامنے آجاتا ہے اور جن خوشیوں کو سمیٹنے کے لیے بانہیں پھیلاتے ہیں، وہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔

میری رہائی سے پہلے مانو گھر آگئی تھی۔ ابھی زیادہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں لیٹی یا بیٹھی کتابیں پڑھتی رہتی تھی۔ اس حد تک تو صحت یاب ہو چکی تھی کہ اُٹھ کر میرے گلے لگ سکتی تھی۔

رہائی کے دن چچا جان سینٹرل جیل کے باہر کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا پھر گاڑی میں بٹھا کر ڈھاکا کے نئے مکان میں لے آئے۔ وہ گھر کے اندر پہنچ کر ڈرائنگ روم میں رُک گئے۔ پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مانو کا کمرا اُدھر ہے۔“

میں سمجھ گیا، وہ ہم دونوں کو تنہائی میں ملنے کا موقع دے رہے تھے۔ میں اس کمرے کی طرف آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دور ہی سے نظر آئی۔ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔

ہم نے ایک مدت کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا۔ طویل جدائی کے بعد محبوب سے ملنے کی، اسے گلے لگانے کی تڑپ کیسی ہوگی...؟

وہ مجھے دیکھتے ہی تڑپ کر بستر سے اُٹھی۔ پھر تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ میں بھی مانو کہتا ہوا اس کی طرف لپکا...

شتاب آ کہ نہیں تاب اب جدائی کی!

میں آیا۔ قریب پہنچا اور... اور...“ دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا“۔

اس نے ایک دھڑاکے سے دروازے کو میرے منہ پر بند کر دیا۔

میرے سامنے وہ نہیں تھی۔ بند دروازہ تھا۔ میں دم بخود رہ گیا۔ میرے لیے تڑپنے اور مچلنے والی سے ایسی توقع نہیں تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔ ”مانو...! یہ کیا...؟ تم نے دروازہ کیوں بند کر دیا...؟“

مجھے قریبی کھڑکی سے اس کی آواز سنائی دی۔ ”میں یہاں ہوں۔“

میں تیزی سے چلتا ہوا وہاں پہنچا۔ کھڑکی پر دبیز پردہ پڑا تھا اور وہ پردے کے پیچھے تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے دروازہ کیوں بند کر دیا؟“

اس کی بیمار سی آواز سنائی دی۔ ”ہمارے درمیان دروازہ کھولنے کا رشتہ کیا ہے؟“

یہ ایسا سوال تھا کہ میں ہکا بکا سا رہ گیا۔ وہ بولی۔ ”ہم نکاح سے پہلے نامحرم ہیں۔ آج جو پردہ کیا ہے، پہلے کرتی تو ہم بے حیائی سے نہ گزرتے۔

ہم کیوں بہک گئے تھے؟

ہمارے درمیان بہکنے اور بہکانے والی باتیں کیا ہیں؟

عورت کا جلوہ مرد کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ مرد کی شخصیت اور اس کی مردانگی عورت کو پاگل کر دیتی ہے۔

عورت کی آواز بھی ایسی دل کو چھونے والی ہوتی ہے کہ مرد اسے دیکھے بغیر ہی اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔

یہی بہکاوا ہے۔ آج کے بعد تم میری آواز بھی نہیں سنو گے۔

ہم نکاح سے پہلے کیوں بہک جاتے ہیں؟ یہ یاد کیوں نہیں رکھتے کہ شرعی اجازت کے بغیر ایک دوسرے کے لیے ممنوعہ ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ استعاروں، کنایوں اور مثالوں سے سمجھایا ہے کہ پرہیز کرو۔ جو ممنوعہ ہے، اس سے پرہیز کرو......گریز کرو۔“

وہ اچانک روتے ہوئے بولی۔ ”فہیم...! اگر ہم غلطی نہ کرتے۔ اگر نکاح تک ایک دوسرے کے لیے ممنوعہ رہتے تو ابھی ہماری گود میں وہ بچہ ہنستا کھیلتا رہتا۔“

وہ پردے کے پیچھے سسک سسک کر رو رہی تھی۔ ”میرے ماں باپ نے مجھے مار ڈالنے کے لیے کچرے میں پھینک دیا تھا۔ میں تو بچ گئی لیکن ہم نے اپنے بچے کو مار ڈالا ہے۔“

وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ”ہم اپنے بچے کے قاتل ہیں... ہم قاتل ہیں فہیم...! کیا اب بھی ہمیں عقل نہیں آئے گی؟“

میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اپنی مانو سے دور ہو گیا۔ اس کی آنسو بھری آواز کہہ رہی تھی۔ ”میں نے دروازہ لاک نہیں کیا ہے۔ کیا نکاح سے پہلے اسے کھول کر آؤ گے؟ گناہ کا دروازہ جب چاہو کھل سکتا ہے۔ اسے کھولنا یا نہ کھولنا اور اسے معتبر رکھنا ہماری صوابدید پر ہے۔“

میں اور پیچھے ہٹ گیا۔ اُلٹے قدموں چلتا ہوا اس دروازے سے دور ہو گیا جسے بہ آسانی کھول سکتا تھا۔